عبدالعزیز خالد نمبر

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات پنجاب، بلوچستان، آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۹۴۵ | ٹیلی فون نمبر ۶۰۱۶۶

ماہنامہ لاہور

تحریریں

ایڈیٹر

زاہدہ صدیقی

جلد ۵	مارچ، اپریل سنہ ۱۹۷۵ء	شمارہ ۳، ۴

سالانہ چندہ: ۲۵ روپے

عام شمارہ: ۲ روپے

موجودہ شمارہ: ۱۲ روپے

مقام اشاعت: ——— چوک اُردو بازار لاہور

ذیلی دفاتر: ۱-۷/۳ سلطان پورہ لاہور۔ ۲۔ سرکلر روڈ پسرور (سیالکوٹ)

HaSnain Sialvi

ترتیب

اداریہ	پہلی تحریر	زاہدہ صدیقی	۱۶
ابتدا	حمد	عبدالعزیز خالد	۲۱
	نعت	عبدالعزیز خالد	۲۳
نظمیں	بُوٹا اک رس بھرا صداؤں کا	عبدالحمید عدم	۲۵
	عبدالعزیز خالد تقریر کر رہے ہیں	شورش کاشمیری	۲۶
	وہ رسالت مآب کا شاعر	غلام رسول اَزہر	۲۸
	اے عزیزِ خالد شیریں بیاں	کبیر انور جعفری	۲۹
	عروسِ آگہی	ذوقی مظفر نگری	۳۰
	خطاب	خیال امروہوی	۳۱
	شاعرِ معجز بیاں	قمر صدیقی	۳۳
	عبدالعزیز خالد	رؤف شیخ	۳۵
	عبدالعزیز خالد	عالمتاب تشنہ	۳۶
	عبدالعزیز خالد	تاج سعید	۳۷
	نظم	رب نواز مائل	۳۸
	فعل الشعر	اصغر علی شاہ	۳۹
	عبدالعزیز خالد	اصغر علی شاہ	۴۱
	بنام عبدالعزیز خالد	صوفی فقیر محمد	۴۳
	مینارِ عظمت	زہیر کنجاہی	۴۴
	حدی خواں	سحر رومانی	۴۵
	مینارِ ادب	بشیر رحمانی	۴۶
	عبدالعزیز خالد	شاہدہ رفیع	۴۷
	عبدالعزیز خالد	اسلم یوسفی	۴۹
	خالد — ملک الکلام	تحسین فراقی	۵۰
	نذرِ خالد	غلام حیدر مرزا	۴۸
	جنونِ عشق	عبدالوحید بیگ	۵۱
	مردِ قلندر	گفتار خیالی	۵۲
	عبدالعزیز خالد	سرور بجنوری	۵۳

حصہ	عنوان	مصنف	صفحہ
پہچان		ڈاکٹر وزیر آغا	۴
		عارف عبدالمتین	۵
		سیف زلفی	۲۶
عکسِ شخص	عبدالعزیز خالد سے میرا پہلا رابطہ	آغا صادق	۷
	وہ اور اس کی پہلی نظم	میرزا ادیب	۹
	عبدالعزیز خالد	عارف عبدالمتین	۱۲
	غالب لائبریری اور عبدالعزیز خالد	مرزا اظفر الحسن	۵
	عبدالعزیز خالد	انور	۷
	مہرنامہ	کامل القادری	۸
	عبدالعزیز خالد کی ایک خاص عادت	ارشاد احمد حقانی	۰
	عبدالعزیز خالد ایک سرکاری افسر	ارشاد احمد حقانی	۳
	خالد کی شخصیت — میرے تاثرات	ضیاء الرحمن ضیا	۷
	دربارۂ خود	عبدالعزیز خالد	۹
مطالعہ فکر و فن	عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی	سید وقار عظیم	۳
	عبدالعزیز خالد — ایک مخترع نعت نگار	ڈاکٹر سید عبداللہ	۵
	عبدالعزیز خالد — میری نظر میں	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱
	اردو شاعری کا عقابِ اعظم	سید ضمیر جعفری	۵
	عبدالعزیز خالد کی غزل گوئی	عارف عبدالمتین	۰
	خالد کی شاعری کی سب سے بڑی کمزوری	عبدالصمد صارم	۰۵
	روپ روپ	ابن انشا	۰۷
	برگِ بہار	رفیق خاور	۰۹
	خالد اپنے اشعار کے آئینے میں	محمد عبداللہ قریشی	۷
	خالد کی انفرادی خصوصیات	انور رومان	۲۱
	شاعرِ فردا	جمیلہ ہاشمی	۲۳
	کلامِ خالد - بصارت و بصیرت کا سنگم	سلیم بے تاب	۲۵
	زبانِ خالد	کامل القادری	۲۹
	عبدالعزیز خالد — ایک نیا آہنگ	رشید نثار	۵
	قلبِ تپیدہ کی ایک مثال	مبارک اکمل گیلانی	۸
	خالد کی رباعی گوئی	آصف ثاقب	۵۵

عبدالعزیز خالد کی شاعری	وزیری پانی پتی	۱۶۰
فارقلیط سے پرواز عقاب تک	اکبر کاظمی	۱۶۶
خالد کی مختصر ترین نظمیں	خواجہ اعجاز احمد بٹ	۱۶۹
عبدالعزیز خالد اپنے آقا و مولا کی بارگاہ میں	ریاض حسن چوہدری	۱۷۳
خالد کا فن	عذرا مسعود	۱۷۸
خالد سخن — خالد	آرام ساہوی	۱۸۵
عبدالعزیز خالد کے نام	محمد خالد اختر	۱۹۱
خالد کی آسان شاعری	خالد بزمی	۱۹۲
عبدالعزیز خالد کی شاعری	عبدالرؤف عروج	۲۰۲
عہد حاضر کا عظیم و منفرد شاعر	چاکر خان بلوچ	۲۰۴
عبدالعزیز خالد	عفت موہانی	۲۰۸
سیدنا محمدؐ کے دو سراپا نگار — خالد و محسن	سید یونس شاہ	۲۱۲
خالد اور خارجی تعلقات حسن	تحسین فراقی	۲۱۹
عبدالعزیز خالد	نادم سیتاپوری	۲۳۱
عبدالعزیز خالد	سید شمیم اختر	۲۳۱
عبدالعزیز خالد — شاعروں کا شاعر	نسرین حبیب	۲۳۲
خالد آشفتہ نوا	اکرام ہوشیارپوری	۲۳۴
خالد — ایک بحر بیکراں	عاصم صحرائی	۲۳۹
ایک بیدار مغز شاعر	ارشد کمال	۲۴۲
خالد کی شاعری کا سرسری جائزہ	سعیدہ چوہدری	۲۴۴
خالد — ایک تجدید پسند شاعر	طلعت قادری	۲۴۶

مطالعہ کتب

فارقلیط	احسان دانش	۲۴۹	رئیس احمد جعفری	۲۵۰
	مالک رام	۲۵۰	حکیم محمد سعید دہلوی	۲۵۱
	یونس احمر	۲۵۱	حسن مثنیٰ ندوی	۲۵۳
	سید قاسم محمود	۲۵۸	سجاد رضوی	۲۵۸
	ذوالفقار تابش	۲۵۸	محمود سروش	۲۵۸
	زاہدہ صدیقی	۲۵۹		
برگ خزاں	ڈاکٹر خان رشید	۲۶۱	ابن فرید	۲۶۲
	امریک آنند	۲۶۲	نسیم گل	۲۶۲

عنوان	نام	صفحہ	نام	صفحہ
گلِ نغمہ	رفیق خاور	۲۶۳	وفا راشدی	۲۷۰
	مخمور سعیدی	۲۷۰	تاج سعید	۲۷۱
	انیس خورشید	۲۷۲	ضیاء الدین برنی	۲۷۲
لحنِ سرمد	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	۲۷۶	اعجاز فاروقی	۲۷۶
	انور سدید	۲۷۷	فرمان فتح پوری	۲۷۷
زنجیرِ رمِ آہو	گوپال متل	۲۷۹		
	ابن انشا	۲۸۰	نصیر انور	۲۸۱
	غلام احمد پرویز	۲۸۳	محمد احمد	۲۸۴
	عبداللہ علیم	۲۸۵	انجم اعظمی	۲۸۸
	وفا راشدی	۲۸۸	قمر سلطانہ	۲۸۸
	محمد اکبر الدین احمد	۲۸۹	شفیع عقیل	۲۸۹
	ابنِ فرید	۲۹۰	جوہر میر	۲۹۱
	رخشندہ برلاس	۲۹۱		
کفِ دریا	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۹۵	ابن فرید	۲۹۶
نمکِ موج	سید عابد علی عابد	۲۹۷	ضیاء جالندھری	۲۹۷
	جمیل جالبی	۲۹۸	وزیری پانی پتی	۲۹۹
	ڈاکٹر اسلم فرخی	۳۰۰		
دشتِ شام	افسر آذر	۳۰۵		
مزمورِ میر مغنی	انور سدید	۳۰۷		
	مشتاق مفتی	۳۰۸	فرمان فتح پوری	۳۰۸
سرودِ رفتہ	جعفر طاہر	۳۰۹	جمیل جالبی	۳۰۹
	وقار انبالوی	۳۱۶	اختر انصاری اکبر آبادی	۳۱۰
	مخمور سعیدی	۳۱۱	جون ایلیا	۳۱۱
سلویٰ	میرزا ادیب	۳۱۷		
ورقِ ناخواندہ	رفیق خاور	۳۲۸	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۳۳۴
	سجاد نقوی	۳۳۵	نازش حیدری	۳۳۵
پروازِ عقاب	ڈاکٹر وحید قریشی	۳۳۷	ڈاکٹر احسن فاروقی	۳۴۰
	ظہیر کاشمیری	۳۴۰	طالب احمد	۳۴۱
	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	۳۴۲	فتح محمد ملک	۳۴۳
	اظہر جاوید	۳۴۵		

ملاقاتیں — انٹرویوز

ذوالفقار تابش	۳۴۷	اکرام رانا
کامل القادری	۳۵۳	نذیر ناجی
ضیاء شاہد	۳۶۰	ہارون الرشید
حفیظ صدیقی	۳۷۰	سلطان شاہد

خیالات

احسان دانش	۳۸۱	ڈاکٹر سید صفدر حسین
عبدالعزیز میمن	۳۸۱	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
رشید احمد صدیقی	۳۸۲	علی عباس حسینی
قتیل شفائی	۳۸۳	ڈاکٹر محمد حسن
اسد القادری	۳۸۴	مجتبیٰ حسین
نادم سیتاپوری	۳۸۵	شاذ تمکنت
علی محسن صدیقی	۳۸۵	باقر مہدی
ریاض احمد	۳۸۵	محمد کاظم
آفاق صدیقی	۳۸۶	غلام ربانی عزیز
زبیر رضوی	۳۸۶	عبدالسلام خورشید
عنوان چشتی	۳۸۶	فروغ احمد
اختر حسین رائے پوری	۳۸۸	سید حرمت الاکرام
نظیر صدیقی	۳۸۸	سلمان الارشد
سید محمد باقر شمس	۳۸۸	ڈاکٹر آغا افتخار حسین
خالد احمد	۳۸۸	سعید احمد اکبرآبادی
رشید امجد	۳۸۹	راحت افزا بخاری
مظفر شکوہ	۳۸۹	ڈاکٹر وارث کرمانی
بشیر نیاز	۳۸۹	فائزہ صدیقی

انتظاریہ

عبدالعزیز خالد کے لئے ایک نظم		اقبال ساجد
عبدالعزیز خالد - کچھ شخصی تاثرات		حفیظ صدیقی
ایک کریم انسان ، ایک عظیم شاعر		مقبول جہانگیر
عبدالعزیز خالد کا اردو بازار		عاصی کرنالی

تاثرات

مولانا کوثر نیازی	۴۰۳	علامہ علاؤالدین صدیقی
سردار جعفری	۴۰۳	شاہد احمد دہلوی
علامہ نیاز فتح پوری	۴۰۴	مولانا رازق الخیری

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی	۴۰۴	مولانا سعید اشرف ندوی	۴۰۵
شان الحق حقی	۴۰۴	رئیس امروہوی	۴۰۴
ڈاکٹر محمد حسن	۴۰۵	آل احمد سرور	۴۰۵
عبدالحمید صدیقی	۴۰۵	شفقت کاظمی	۴۰۵
شاذ تمکنت	۴۰۵	آغا شیر احمد خاموش	۴۰۶
مشفق خواجہ	۴۰۶	مولانا ماہر القادری	۴۰۶
حبیب اشعر	۴۰۶	ط ۔ انصاری	۴۰۶
نعیم صدیقی	۴۰۷	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	۴۰۷
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۴۰۸	نصراللہ خاں عزیز	۴۰۸
مکین احسن کلیم	۴۰۸	جیلانی کامران	۴۰۸
مقبول الٰہی	۴۰۹	انور سدید	۴۰۹
اختر انصاری اکبرآبادی	۴۰۹	اقبال سلیم گاہندری	۴۰۹
جون ایلیا	۴۱۰	انور گوئندی	۴۱۰
جانباز مرزا	۴۱۱	راز سنتوکھ سری	۴۱۱
وفا راشدی	۴۱۱	شریف رزمی	۴۱۱
ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی	۴۱۲	ڈاکٹر آغا افتخار حسین	۴۱۲
رفیق خاور جسکانی	۴۱۲	افسر ماہ پوری	۴۱۲
ارشد ملتانی	۴۱۳	قمر تسکین	۴۱۳
باقر مہدی	۴۱۳	پرکاش فکری	۴۱۳
آغا سہیل	۴۱۳	محمود الرحمٰن	۴۱۳
ریاض احمد	۴۱۴	قمر سلطانہ	۴۱۴
عفت موہانی	۴۱۴	ن ۔ خاتون	۴۱۴
ناصر زیدی	۴۱۴	شفیع عقیل	۴۱۵
زاہدہ حنا	۴۱۵	اختر امان	۴۱۵
شمس کنول	۴۱۵	حسن کمال	۴۱۵
انور شعور	۴۱۶	حمید کوثر	۴۱۶
ظفر علی ہادی	۴۱۶	اختر ضیائی	۴۱۶
اعجاز احمد	۴۱۶	سرفراز صدیقی	۴۱۶

پہلی تحریر

عبدالعزیز خالد نمبر آپ کے سامنے ہے۔ ہم نے حد درجہ ناساعد حالات کے باوجود ایک معقول نمبر پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا تعین تو پڑھنے والے ہی کر سکیں گے۔

ابتدا میں یہ نمبر ۷۰۰ صفحات پر مشتمل تھا مگر حالات نے ہمیں اسی کو کم صفحات میں سمیٹنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں ہم بہت سے اچھے مضامین خارج کرنے اور بہت سے شامل کردہ مضامین کو مختصر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے لئے ہم تمام لکھنے والوں سے معذرت خواہ ہیں۔ وہ مضامین جو کلی طور پر خارج ہوئے، کسی مناسب موقع پر شائع کئے جا سکتے ہیں لیکن جن مضامین کے کچھ حصے خارج ہوئے وہ بہر حال ضائع گئے جس کا ہمیں افسوس ہے۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ جہاں اختصار کیا گیا ہے وہاں لکھنے والے کے اصل مطالب کو بحال رکھا گیا ہے۔ اور اس میں ذرا بھی ترمیم و اضافہ نہیں کیا گیا۔

ہم نے عبدالعزیز خالد نمبر کا اعلان کرتے ہوئے اسے قد آور لکھنے والوں کے، خصوصی مطالعہ کے سلسلے کی پہلی کڑی قرار دیا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ مختلف وقفوں کے بعد یکے بعد دیگرے اسی نوع کے نمبر شائع کئے جائیں جن کے مطالعہ سے پڑھنے والے باری باری، سبھی اہم لکھنے والوں سے شناسائی حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے کی پہلی ہی کڑی شائع کرنے تک ہم جن کٹھن مراحل سے گذرے ہیں ان کے باوجود ہمارے ارادوں میں وہی پختگی ہے جو ابتداً میں تھی۔

عبد العزیز خالد

ارشاد حقانی

عبدالعزیز خالد

اکرام سانبوی

زاہدہ صدیقی

جمیلہ ہاشمی

ریاض چوہدری

عذرا مسعود
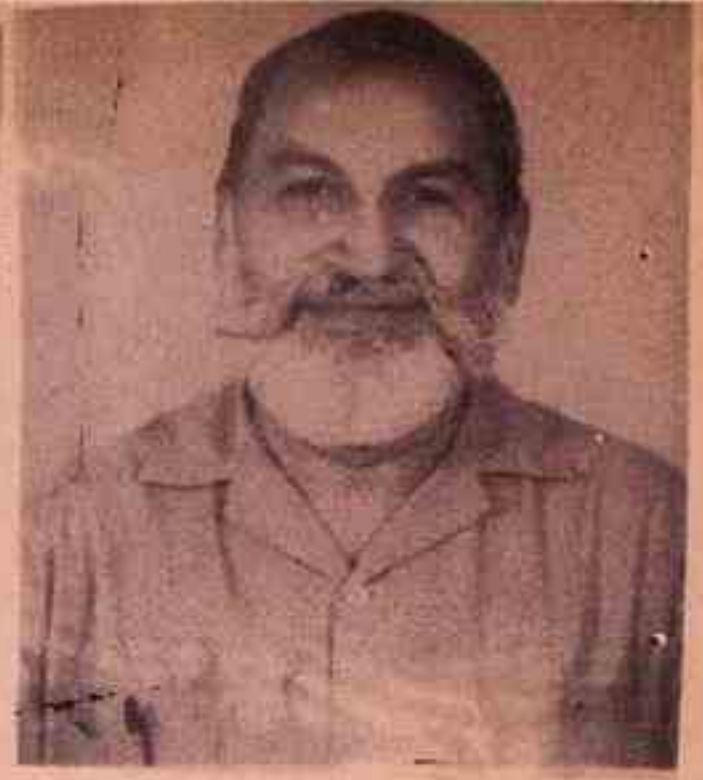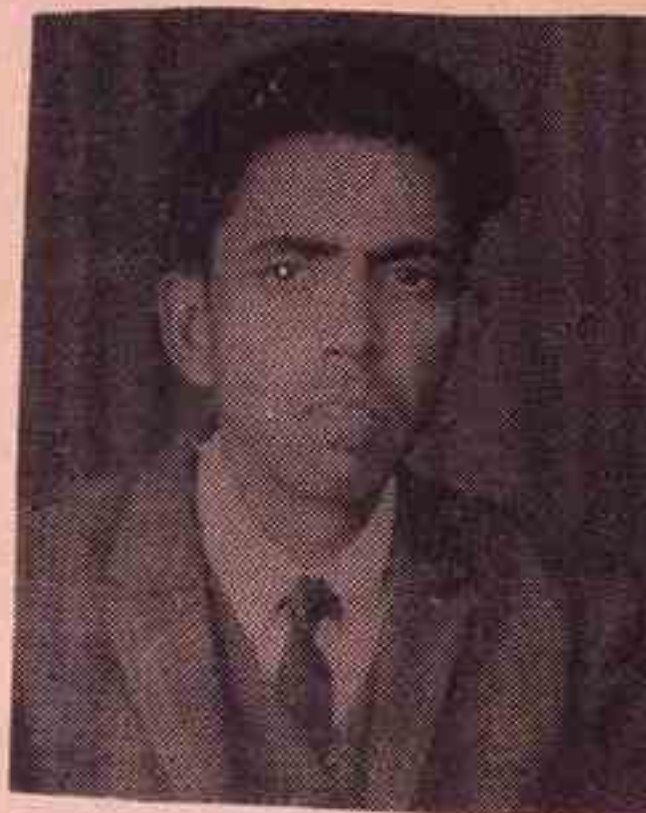
آغا صادق

عارف عبدالمتین

غلام رسول ازہر

اعجاز فاروقی

اصغر علی شاہ

مبارک اکمل گیلانی

عبدالعزیز خالد

ارشاد حقانی

زاہدہ صدیقی

جمیلہ ہاشمی

اکرام سانبوی

عذرا مسعود

ریاض چوہدری

آغا صادق

عارف عبدالمتین

غلام رسول ازہر

اعجاز فاروقی

اصغر علی شاہ

مبارک اکمل گیلانی

خالد بزمی

رب نواز مائل

ضیاالرحمان ضیا
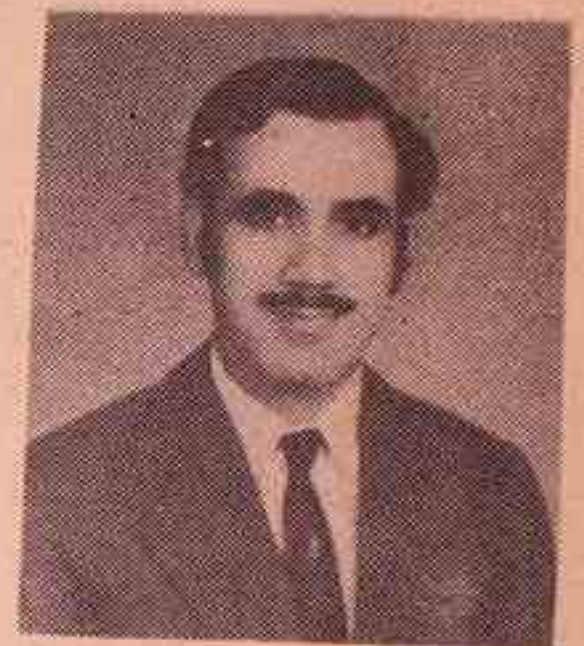
احسان دانش ۔ حفیظ صدیقی

عبدالعزیز خالد کے ساتھ ایک شام (حلقہ ارباب ذوق سیالکوٹ)
کے سامعین کا ایک منظر

عبدالعزیز خالد

ہَلّلُویَاہ

(خدا کی ستائش کرو)

وُہ ربّ اِنس و جان ہے جَلّ جلالُہٗ
سُبحان و مُستعان ہے جَلّ جلالُہٗ
بے کیف و کم اَلآنَ کما کانَ کے بوصف
روز اس کی اور شان ہے جَلّ جلالُہٗ

یہ بحرِ کائنات ہے بے حدّ و بے قیاس
ہر تارہ بادبان ہے جَلّ جلالُہٗ
ہر جا خَلا مَلا میں کھوے سے کھوا چھلے
ہر ذرّہ اِک جہان ہے جَلّ جلالُہٗ

عزّت ازار اس کی، ردا اس کی کبریا
قادر ہے قہرمان ہے جَلّ جلالُہٗ
موجود ہے مگر کہیں آتا نہیں نظر
کیا شانِ بے نشان ہے جَلّ جلالُہٗ

سب حمد ہے اسی کے لئے اور کیوں نہ ہو
سب کا وہ پاسبان ہے جَلّ جلالُہٗ
اس قاہر و کریم و رحیم و عظیم کی
ہر آن تازہ آن ہے جَلّ جلالُہٗ

یہ خلدِ آرزو جسے کہتے ہیں زندگی
جس کا یہ ارمغان ہے جَلّ جلالُہٗ
ہو تنگنائے دہر کہ پہنائے لامکاں
ہمّت کی اِک اُڑان ہے جَلّ جلالُہٗ

حق کو کبھی چھپائیں نہ ہم خوفِ خلق سے
خالق پہ ہم کو مان ہے جَلّ جلالُہٗ

نومید ہوں نہ رحمتِ پروردگار سے
مشفق ہے مہربان ہے جلّ جلالہٗ

وہ عالمِ غیوب ہے دانائے جزو کُل
ہر شے کا رازدان ہے جلّ جلالہٗ

اس رَبّ بے نیاز کے ہم ہیں نیاز مند
ہم جسم ہیں وہ جان ہے جلّ جلالہٗ

ذکرِ خدا ہی اصل میں ہے اشرف الحدیث
باقی تو داستان ہے جلّ جلالہٗ

اُترا ہے آسماں سے زمیں سے اُگا نہیں
فرمانُ البیان ہے جلّ جلالہٗ

اُس کے کلام پر ابداً اعتماد ہے
کیا زور کیا اُٹھان ہے جلّ جلالہٗ

شیریں ہے کس قدر سخن اس ذوالجلال کا
کیا رس ہے کیا رسان ہے جلّ جلالہٗ

جو حرف بھی رقم ہے کتابِ حیات میں
حکمت کی ایک کان ہے جلّ جلالہٗ

ایسی بھی کوئی رمز ہے جو مندرج نہیں
ہر بات بے تکان ہے جلّ جلالہٗ

اس کے وظیفہ خوار ہیں لیتے ہیں اسکا نام
ہر موئے تن زبان ہے جلّ جلالہٗ

(حرام کام سے اُمّت کو روکنے والا)

اے شمال والے جنوب والے دبور والے صبا
شش جہت پھیلی ہے خوشبوئے نگارِ دلربا

دل کے کرتے ہیں تمنا جس کی ستارے صبح کے
آخرِ شب مجھ کو بھی یارب جھلک اس کی دکھا

الفس و آفاق جس کے نور سے ہیں مستنیر
کہکشاں اک نقشِ پا جس صاحبِ معراج کا

بے سرو ساماں پہ کھولا جس نے رازِ کُن فکاں
جس نے جانِ ناتواں کو قُم سے قائم کر دیا

خالدِ بیچارہ و ناکارہ و ننگِ انام
ہے ازل سے جس کے ہجرِ لم یزل میں مبتلا

کون ہو اس کی نگاہِ کارفرما کا حریف؟
وحیِ ناطق کی ستائش کا ہو کیونکر حق ادا

لذتِ دیدارِ خوباں ہے بقدرِ ماحضر
میری حدِ وسع سے باہر ہے مدحِ مصطفیٰؐ

کس زباں سے شکوۂ اندوہِ دل تنگی کروں
اس زباں سے جو ہے دائم محوِ تسبیحِ دفا؟

اس طرح محوِ تکلّم مجھ سے ہوتا ہے سروش
آشنا سے گفتگو کرتا ہے جیسے آشنا

حسرتِ عرضِ تمنّا کو ملا اذنِ بیاں
قصۂ کوتاہئ قسمت بنا حرفِ دُعا

ہر طرف جلوہ ہے تیرا ہر طرف تیرا ظہور
اسمِ اعظم ہے ترا اسم اے امامِ انبیا!

کِس سے نسبت دُوں تجھے کِس سے تجھے تشبیہہ دوں
اے کبیرِ کبریا اے رحمتِ ہر دو سرا!

تیرے پاس آیا ہوں کشکولِ گدایا نہ لئے
کر فقیرِ راہ کی حاجت روا اے بادشاہ!

بعد مرنے کے مرے میرا سخن باقی رہے
اے حبیبِ خالق اِقرا باسْمِ ربّک

عبدالحمید عدم

بوٹا اک رس بھری صداؤں کا

نام ہی اس قدر عزیز نہیں
خلق بھی بے نظیر ہے تیرا
سوچ میں ہے مٹھاس پھولوں کی
علم بدرِ منیر ہے تیرا

زندگی تو مطالعے کا فقط
اک ذرا سا قلیل وقفہ ہے
کِس قدر مختصر مگر کتنا
دلربا اور جمیل وقفہ ہے

عطر اشیا کی خُو میں ہوتا ہے
غیر تصنیف ہو نہیں سکتی
ہے حقیقی خوشی وہی جس کی
کوئی تعریف ہو نہیں سکتی

لعل و گوہر کی اک پٹاری سے
ایک چٹکی نبات بہتر ہے
سینکڑوں قیمتی کتابوں سے
اک محبت کی بات بہتر ہے

پہلی بار ایک شخص سے مل کر
جو مسرّت نصیب ہوتی ہے
علم کیا اس کا انکشاف کرے
وہ عجیب و غریب ہوتی ہے

کتنے جُھرمٹ بھی ہوں ستاروں کے
تجھ سا خندہ جبیں نہیں ملتا
تیرے اخلاص میں جو رہتا ہے
وہ اُجالا کہیں نہیں ملتا

شورش کاشمیری

عبدالعزیز خالد تقریر کر رہے ہیں

فردوسِ شاعری کے غنچے کھلے ہوئے ہیں
الحاد و زندقہ کے بخیے اُدھڑ رہے ہیں
فکرِ نظر کے موتی الفاظ میں جڑے ہیں

عبدالعزیز خالد تقریر کر رہے ہیں

لیلائے فکر زلفِ پیچاں بنا رہی ہے
ماضی کے ہمہموں کی آواز آ رہی ہے
شاید کوئی غزالہ ملہار گا رہی ہے

عبدالعزیز خالد تقریر کر رہے ہیں

الفاظ کی کھنا کھن سیلِ رواں کا نقشہ
افکار کی بلندی ہفت آسماں کا نقشہ
شعر و سخن کی لہریں اُردو زباں کا نقشہ

عبدالعزیز خالد تقریر کر رہے ہیں

(۲)

لہجہ کے بانکپن میں تیغِ رواں کی شوخی
الفاظ کے جلو میں عمرِ رواں کی شوخی
عذرا کا حُسنِ کامل، جانِ جہاں کی شوخی

عبدالعزیز خالدؔ تقریر کر رہے ہیں

اقبالؔ کا تصور، غالبؔ کی خوش نوائی
حافظؔ کی میگساری، سعدیؔ کی پارسائی
زہد و ورع کا نغمہ رندوں سے آشنائی

عبدالعزیز خالدؔ تقریر کر رہے ہیں

اپنے ہوں یا پرائے مسحور ہو رہے ہیں
اِس سحر سے مطالب مغرور ہو رہے ہیں
دار و رسن کے شیدا منصور ہو رہے ہیں

عبدالعزیز خالدؔ تقریر کر رہے ہیں

میں ہوں خطیب، فنِ گفتار جانتا ہوں
ہر ایک معرکہ میں سینے کو تانتا ہوں
ان کے کمالِ فن کی عظمت کو مانتا ہوں

عبدالعزیز خالدؔ تقریر کر رہے ہیں

غلام رسول ازہر

وہ رسالت مآبؐ کا شاعر

حسنِ معنی کا خالقِ اعلیٰ
وہ عزیزِ سخن، گراں مایا

رنگ و بو کا حبیب عنبر دست
خوش نفس، اہلِ دل کا سرمایا

فکر و فن کا امامِ بے ہمتا
پرتوِ شوق کا حسیں سایا

ایک درویش لعل گدڑی کا
ایک سلطان منعم و مولا

خاکِ پائے علیؓ ولایت میں
چار سُو اُس کے فقر کا چرچا

اُس کی آواز کیسی جاں پرور
اس کا نغمہ بلالؓ کا نغما

پرچمِ لا الٰہ اُٹھائے ہوئے
خالدِ وقت، نعرہ زن نکلا

دم بدم اُس پہ رحمتوں کا نزول
وہ حدی خوانِ وادیٔ بطحا

ہر گھڑی چشمِ باوضو سے رواں
باادب سوئے گنبدِ خضرا

وہ رسالت مآبؐ کا شاعر
شاعرِ صاحبِ کتابِ ہدیٰ

میرے صاحبؐ کے فیض سے ازہر
لحظہ لحظہ قریبِ جان ہوا

کیپٹن انور جعفری

اے عزیزِ خالدِ شیریں نگار

اے عزیزِ خالدِ شیریں نگار
تیرے اندازِ بیاں میں جلوہ گر
آسماں تک نظم کی اونچائی ہے
شعر کے آنگن میں بھیرِ و نغمہ ریز

اے عزیزِ خالدِ شیریں نگار
نغمگی ایسی ہے جس پر ہر غزل
وست مرتے میں ہو جب تیرا قلم
رکھتی ہیں تو نے کتابیں بے شمار
پڑھتے ہو جب محفلوں میں جھوم کر
تیرے بولوں میں ہے "پروازِ عقاب"

اے عزیزِ خالدِ شیریں نگار
تو خدیوِ موجۂ بحرِ خیال
نظم کا ماتھا بھی تجھ سے ضو فگن
نام تیرا دہر میں عرشِ بریں

اے عزیزِ خالدِ شیریں نگار
تیری لے یوں زمزمہ پرواز ہے
دوستوں میں بنتا ہے مستی کا ساز
دو جہاں کے پار بھی چرچا ترا
نظم کا ہر شعر یزداں در کمند
تیرے شعروں میں تنوع دلپذیر

اے عزیزِ خالدِ شیریں نگار
جھومتی شعروں میں ہے فصلِ بہار
رہتی ہیں سرشاریاں شام و سحر
اللہ اللہ کس قدر زیبائی ہے
جس کے ہر نقطے میں "تمر" ہے عطر بیز
ہنس رہی ہے "تال" میں فصلِ بہار
گنگنا اٹھتی ہے "مشلِ بیربل"
کام دیتا ہے "عصا" کا دمبدم
جھومتا ہے جن میں انجامِ بہار
چومتی ہیں لبِ عروسانِ سحر
مست ہو جاتے ہیں جن پر شیخ و شاب
تو زبانِ اردو کا پروردگار!
آبِ زمزم، آبِ زر، آبِ زلال
شعر کی زلفیں بھی تجھ پہ ہیں مگن
چومتا ہے جس کو ہر فرد امیں
مست ہو تجھ پہ رنگیوں ہرنوں کی ڈار
ہو جہاں انجام، پھر آغاز ہے
اس قدر میٹھا ترا ناز و نیاز
ایسے ہے اس پار بھی چرچا ترا
نغمۂ جبریل سے بھی ہے بلند
کہہ رہا ہے کون یہ اللہ کبیر
جھومتی ہے خلد میں تیری بہار

ذوقی مظفر نگری

عروسِ آگہی

فکر کی تابندہ لہریں ہیں شعاعِ طور ہے
تیری نعتوں میں رواں دریائے رنگ و نور ہے
پاک ہے تیری زباں، تیرا تخیّل با وضو
تیرے فن پاروں میں ہے سوز و گدازِ آرزو
تُو ہے سوداؔ کی تمنا، تُو ہے غالبؔ کی مراد
کر دیا ہے تُو نے روحِ شاعرِ مشرق کو شاد
بحرِ مشکل کا شناور عالمِ علم البیاں
موجِ تشبیہات کے سینے پہ رہتا ہے رواں
کس قدر پُر سوز ہے تیرا یہ اندازِ غزل
گرمیٔ اشعار سے پتھر بھی جاتے ہیں پگھل
خون کے صحرا سے جب گزرا ترا ذوقِ سعید
تُو نے صنفِ نظم کو بخشا ہے اک رنگِ جدید
تیری تمثیلات ہیں حرف و صدا کی آبرو
تیری لوحِ فن پہ ہیں اَنمٹ نقوشِ جستجو
سج گیا ہے علم و فن سے تیرا قصرِ زندگی
کیوں نہ چُومے تیری چوکھٹ کو عروسِ آگہی
پڑھ کے تحریریں تری ذوقیؔ نے لکھا ہے گماں
تیرا فن بھی جاوداں ہے اور تُو بھی جاوداں

—

خیال ابھرتے

افصح الفصحا اشعر الشعرا حضرت عبدالعزیز خالد سے

مخزن الافکار قاموس لسان عبقری
مرجع الہام و چرخ ہفتم دیدہ وری

کون جانے کون سمجھے گوہر نایاب کو
"قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

تیری شمشیر تعمق قاطع تحت الثریٰ
تیری پرواز خرد بالا ز اوجِ مشتری

لفظ استادہ ہیں تیرے سامنے صف باندھ کر
تو سلیمانِ معانی شاعری تیری پری

دیدنی ہوتا ہے الفاظ و معانی کا افق
منعکس ہوتا ہے جب تو مثل مہر خاوری

سحرِ ابلاغ سخن قطبین پہ چھایا ہوا
یہ ہے تاثیرِ بلاغت یہ ہے فن ساحری

تیری مشکوٰۃ تخیل سے ہوا کشف الغطا
کیوں نہ ہو جب شاعری "جزویست از پیغمبری"

شعر وہ سمجھے ترا ہوں جس میں ذوق و معرفت
رمز وہ جانے ترا جس میں ہو فکرِ انجگری

تجھ میں ہے حسان بن ثابت کی روح باصفا
تیری براقی سے شرمندہ ہے عقل عامری

انوری ہوتا تو لیتا تجھ سے درسِ آگہی
مفتخر ہوتا تلمذ پہ جو ہوتا عنصری

ہیچ ہے تیرے مقابل فرخی کا طمطراق
گُل ہوا عرفی سے شاعر کا چراغ شاعری

تیری ہر تالیف ہے ہم رنگ شمس بازغہ
تیرے کالائے ہنر کا عصر نو ہے مشتری

تنگنائے شعر میں وسعت ہے تیری بیکراں
تیرا اسلوب سخن تجدید کی جادوگری

الغرض ہرچہ بہ گردم کمتر از معیارِ تست
مختصر این است تو از فکرِ من بالاتری

باہمہ این حسن و اوصافِ گراں قدر و جمیل
بچ گیا کیوں تیرے ناوک سے جہانِ زرگری؟

جانے کیوں تیری نگاہِ نقد سے محفوظ ہے؟
پست و بالا کا تفاوت خون کی سوداگری

جب تری پرواز ہے ناسوت سے جبروت تک
دام میں کیوں کر نہ آیا بندۂ خاکستری؟

کیوں تری کلکِ قلم نے دل نہ چیرا وقت کا؟
کیوں نہ آئی حیطۂ تحریر میں جبر گری؟

انقلابی فکر کیوں ٹھہری نہ موضوعِ سخن؟
جبکہ شاعر کا قلم ہے ذوالفقارِ حیدری

سیکڑوں آہنگ نکلے شعر کی مزمار سے
ڈھل سکی لیکن نہ آدم زاد کی نوحہ گری

زندگی کی اصل آویزش نہ عنواں بن سکی
بحث کی زد میں ہے یوں تو علمِ چرخِ چنبری

آسماں سے آگ برسی وقت نے تھوکا لہو
ایک شہر آشوب تو ہوتی ذرا بپتا بھری!

کیوں نہ وحشت مشربی پر نقد ٹھہرا جزوِ فن
کیوں نہ ٹھہری لائقِ تنسیخ دریوزہ گری

کچھ تو اُن کی شان میں ہوتا جو ہیں رجعت پسند
کچھ نہ کچھ اُن کے بھی حق میں جو ہیں آدھے نیچری

صوفیانِ خانقاہی کا بھی ہوتا احتساب
مفتیانِ دیں پہ بھی تقریظ ہوتی نشتری

خود غرض اہلِ سیاست پر بھی ہوتے تبصرے
احتسابی زد میں آتی کہتری و مہتری

تہران
۹ مارچ ۱۹۷۰ء

قمر صدیقی

شاعرِ معجز بیاں

(نذرِ عبدالعزیز خالد)

تیرا فن انسانیت کے اوج کا آئینہ دار
تو سمجھتا ہے مزاجِ شاعری کے پیچ و خم

تیرے قرطاس و قلم ہیں تیری عظمت کے نقیب
اے کہ الہام آشنا، شائستۂ فکرِ بلیغ!

لفظ ہیں تیرے غلام اور بندشیں تیری کنیز
تو فصاحت کا صحیفہ، منبعِ ذہنِ رسا

ارضِ ہستی پر منقش ہیں ترے فکر و نظر
بانکپن ہے کس قدر تیری ہر اک تصنیف میں

"منحمنا" "داغِ دل کا زر" کہ "پروازِ عقاب"
تجھ سے رخشندہ عروسِ شاعری کے خال و خد

ماورائے ذات ہو کر جب اٹھایا ہے قلم
سحر آگیں، پُرفسوں، تاثیر زا تیرا کلام

استعارے نظم جب تو نے کئے واقم ہوئے

ہیں ترے اشعار تابندہ، درخشاں، زرنگار
تجھ سے خورشیدِ سخن ہے تابناک و تابدار

تیری کشتِ فہم و دانش ہے بہار اندر بہار
آج ہے پیغمبرانِ شعر میں تیرا شمار

ایک اک مصرع ترا شبنم صفت ہے آبدار
نقطۂ حرفِ بلاغت، آگہی کا اعتبار

تیرے افکارِ تیقن آفریں گردوں شکار
اک تسلسل، اک تواتر، ایک مرکز، اک مدار

اِن میں ہے جلوہ فگن تیرا شعورِ باوقار
ہر ادب پارے کو تُو نے کر دیا ہے شاہکار

بے خودی اور ہوش کو تو نے کیا ہے ہمکنار
بار بار اُس نے پڑھا جس نے پڑھا ہے ایک بار

کتنی تشبیہات کو تو نے کیا ہے پائیدار

مشکبار و عطر آگیں ہے دبستانِ سخن — گونجتے ہیں تیرے نغموں سے محبت کے دیار

نعت ہو یا نظم ہو، رنگِ رباعی یا غزل — سب میں قائم ہے تیری طبعِ درخشاں کا نکھار

کتنی پھلجھڑیوں کا مسکن ہے ترا شہرِ نوا — کوئی مثلِ ماہتابی، کوئی مانندِ انار

دوسروں کی روشنی سے جل رہے ہیں کچھ دیئے — تو ہے لیکن منفرد، کچھ بھی نہیں ہے مستعار

آج اُس کردار کا ہر انجمن میں ذکر ہے — ابتدا سے جو رہا ہے تیری فطرت کا شعار

جب ترے جذبِ دروں کے دائرے بڑھنے لگے — کر لیا عقل و خرد نے اپنا دامن تار تار

تجھ کو حاصل ہے بصیرت اور ادراکِ خودی — اے کہ دانائے حقیقت، نکتہ رس، یاروں کے یار!

ہم نے دیکھی ہے تری سطوت، ترا جاہ و جلال — ہم نے دیکھا ہے تجھے تختِ سلیماں پر سوار

سادہ دل، سادہ نظر، سادہ صفت، سادہ مزاج — لیکن اقلیمِ شعور و آگہی کا تاجدار

کون سا نکتہ ہے جو تجھ پر نہیں ہے منکشف — کون سا ہے رمز جو تجھ پر نہیں ہے آشکار

قریۂ جاں ہے معطر تیرے نُطقِ فیض سے — تو اک ایسا پھول ہے جو زینتِ ہر شاخسار

جن کو تیرے میکدے سے ایک جرعہ بھی مِلا — عمر بھر محسوس کرتے ہیں وہ اِک تازہ خُمار

زخم جب انسانیت کے تجھ کو آئے ہیں نظر — مُضطرب پایا ہے تجھ کو، تجھ کو دیکھا اشکبار

کتنے ہم آہنگ ہیں تیرے یہاں قول و عمل — صاف ستھرا ذہن ہے جس میں نہیں ہے اِنتشار

چھوٹی باتیں دِل میں رکھنا تیری فطرت ہی نہیں — صاف کہہ دیتا ہے تو، دِل میں نہیں رکھتا غبار

جو تجھے پہچان کر وابستہ تجھ سے ہو گئے — تیری شمعِ شخصیت پر وہ ہوئے پیہم نثار

کیسے ممکن ہے ترے حلقہ بگوشوں میں کمی — کھینچتا ہے دُور سے تیری ارادت کا حصار

جگمگاتا ہی رہے تیرا شبستانِ خیال — مُسکراتا ہی رہے تیرا گلستانِ وقار

خالدِ معجز بیاں، شیریں سخن عبدالعزیز
تیرے مدّاحوں میں شامل ہیں قمر سے خاکسار

رؤف شیخ

عبدالعزیز خالدؒ

ہتھ بنھ غلام نیں لفظ تیرے تیری باندی اے ازلوں زبان خالدؒ
لہجہ قادر کلامی دا شاعری وچ جادوگری اے تیرا بیان خالدؒ
تیرے فن دا رنگ نویکلا اے توں ایں شعر تے ادب دا مان خالدؒ
سدا روپ سنواریں توں ددھراں دا تیرا فکر رہے سدا جوان خالدؒ

تیری سوچ اڈاریاں ماردی اے راہواں دسدا اے تینوں خیال خالدؒ
اُچا ذہن تے سُچّا سبھا تیرا توں ایں جگ تے اپنی مثال خالدؒ
لو ونڈدا رہنا ایں ویلیاں نوں تیرا اُچ تے رہندا اے کمال خالدؒ
سدا چمکیں توں شعر دے انبراں تے تینوں آوے نہ کدی زوال خالدؒ

تشنے عالمتاب

عبدالعزیز خالد

ازل کا حسن ہے تیرے قلم کی رعنائی
ترے حضور ہیں صف بستہ علم و دانائی

نفس نفس ترا صہبائے آبگینہ گداز
عطا ہوئی ہے تجھے شہرِ دل کی دارائی

کیا ہے وقت کو تو نے اسیرِ دامِ خیال
شعور و فکر کو بخشی ہے تو نے بینائی

کہاں مفر ہے تجھے کربِ آفرینش سے
ہے تیری فکر میں روزِ ازل کی پیدائی

رمِ حیات کو دی تو نے تندیِ رفتار
بساطِ بزمِ ہنر تیرے دم سے گرمائی

لکھی ہے شعر میں تاریخِ فکر و فن تو نے
ترے قلم میں ہے حسنِ جہانِ دانائی

ہر ایک بات پہ اک بات دل نشین تری
ہر ایک نکتہ پہ یہ تیری خامہ فرسائی

ترے اشاروں پہ چلتی ہے وقت کی دھڑکن
ہے سجدہ ریز ترے در پہ زعمِ آقائی

ہے ایک صنعتِ پرکار شاعری تیری
ہر ایک لفظ میں شان و شکوہِ دارائی

ہے کاسہ لیس فلاطون بھی ترے در کا
کمال ہے یہ تری علم و فن میں یکتائی

ہیں نبضِ وقت کی دھڑکن پہ انگلیاں تیری
طبیبِ عصر عجب ہے تری مسیحائی!

سفر مجاز و حقیقت کا تیری رندی میں
بہ یک نظر مجھے یہ بات تو نے سمجھائی

ہیں میرے دیدہ و دل فرشِ راہ تیرے لئے
کہ اہلِ دل پہ ہے لازم تری پذیرائی

تاج سعید

عبدالعزیز خالد

لفظوں کے گورکھ دھندے میں
پھنسا ہے ہر کوئی بھائی!
لیکن یہ لفظوں کی مایا
کس کے کام ہے آئی
؟

ان لفظوں سے ہر کوئی کھیلے
من کا بھید بتائے
لیکن اس کے انت، اتھاہ کا کھوج نہ پائے
ان شبدوں کے کھیل کو جان گیا ہے گیانی
جس کی جٹا دھاری کے نیچے بائیبل ایک پرانی
نرمی، گرمی، سختی سستی لفظوں کی وہ جانے
لفظوں کی انجیل کھڑی ہے ہر دم اس کے آگے

لیکن اس گیانی نے اب تو بھید انوکھا پایا
کڑوے بول ہی ہر اک من میں زہر کی گانٹھیں بو بیٹھیں
من میں میٹھے بول پریم کا امرت یوں ٹپکاتے ہیں
جیسے میٹھا ٹھنڈا پانی
من کی پیاس مٹاتا ہے
جیسے برکھا کی رم جھم میں دھرتی کا رنگ دُھلتا ہے
جیسے سات سروں کا جادو شعروں کو چمکاتا ہے

رنگ نوا زمانے

نظم

نگارِ صبحِ طلب کا پل پل
تمام وقفے تمام شکلیں
صدا و حرف و خیال ہوتے
جو شب سے چھینیں تو آج کیونکر
یہ شب ہنوئی، یہ شب سنائی

نگہ نگہ کو محیطِ غم ہے
وہ طرزِ پاکِ نبی کا شاعر
بشکلِ عبدالعزیز خالدؔ
سحر کے روشن ہو چہار، صورت
ہزار آنکھوں میں خیمہ زن ہے
عجیب جادو سا اُس کا فن ہے

احسن علی شاہ

فحل الشعر

کیوں قصیدہ تو باوجود اپنی وسعتوں کے تمام اقسام کے قوافی عظیم شاعر
کی مدح کرنے سے تنگ ہوتے ہیں
گر ہو طرزِ بیاں مسدس تو شخص مذکور کا ہر اک وصف صد جہت، بندِ ستۃ مصرع
میں اک صفت کی جہات کا تذکرہ، یہ ناممکن العمل ہے
اگر ہو اسلوب مثنوی کا تو خوف ہے۔ شاہنامے جیسی طویل مدحت، ہزاروں
موضوع والی نظمِ ثقیل کو کون کان دے گا۔
جدید ہیئت میں چند الفاظ لکھ کر ہیں کیوں نہ پھر اعتراف کر لوں۔ کہ
اس کی توصیف و مدح لکھنے سے ہاتھ عاجز ہیں، اس کو سننے سے کان
قاصر ہیں، اس کے پڑھنے سے آنکھیں تھکتی ہیں، دل میں ہم سب کے چور ہیں۔
کہ زبان اس کی اک ایسا قاموس جو لسان العرب کی صورت کے صدہا
دریاؤں کو نگلتا ہے۔
اس کا زورِ بیاں کہ جیسے پہاڑی ندی کا تیز دھارا فراز سے بجلیوں کی
سرعت کے ساتھ سوئے نشیب آتا ہے۔
آبشاروں کی نغمگی اور کوہساروں کا سا تفکر عریض دریاؤں جیسی وسعت
سمیٹے اس کا کلام موزوں ہے۔
جتنی اصنافِ شاعری ہیں۔ تمام ہی سر جھکائے، ہاتھوں کو باندھے
اس کے اشارے کی منتظر کنیزوں کی طرح دربارِ اشعرِ شاعراں میں
حاضر ہیں۔
اس کے اشعار کا خزانہ تو گنجِ قاروں سے بھی
فزوں تر ہے۔

گر اساطیرِ اوّلیں کا ہو ذکر تو حدّ انتہا ہے۔ کہ مرسلین پر اترنے والی
کتابیں، اہلِ ہنود کے کل نظم پرانے، ہمہ تصانیف اہلِ یونان و روم
و چین اور داستان ہائے اہلِ ایران و مصر، ایّامِ جاہلیت میں سارے
اہلِ عرب کے قصّوں کو شخصِ واحد نے چاٹ رکھا ہے۔ اپنے اشعار
میں وہ ان کا حوالہ دیتا ہے۔ اس کی نظموں سے یہ روایاتِ کہنہ زندہ ہیں۔
اپنے افکارِ تازہ میں وہ جدید ہم عصر شاعروں میں مقامِ یکتائی پر فائز
کھڑا ہے۔

وہ فکرِ اسلام کا مبلغ ہے دینِ توحید کا پرستار، احمد مصطفیٰؐ کا
شیدا ہے نعت گوئے وحیدِ حسّانِ عصرِ نو ہے
نہ انتہا اس کے علم کی ہے نہ شعر ہی کے لئے عدد ہے۔
جب ابتدائے شباب کی ہی کمائی چوبیس ہے۔ تو پیری کی انتہا تک
مزید کیا کچھ نہیں کہے گا۔ کہ نام نامی ہے اس کا عبد العزیز خالد

اصغر علی شاہ

عبد العزیز خالدؒ

پھونک اے شاعرِ خزاں مایوس
ہو گیا اور عالمِ محسوس

شش جہت میں ورق ورق ہو کر
منتشر ہے بہار کی قاموس

عنبریں ہیں بہاروں کے انفاس
کیف و مستی میں گلستاں کے نفوس

کچھ تحیّر کی بات ہے کہ گیاہ
ناظریں ہیں کئے بلند رؤوس

آبِ انہار بہرِ نظارہ
چھپ کے آیا ہے صورتِ جاسوس

اوس ہے رشحۂ شرابِ طہور
پھول جیسے حسینوں کے کؤوس

لال چہرے گلوں کے نعرے لگا
فوجِ لالہ نکالتی ہے جلوس

کبھی کو گردن گھما گھما دیکھیں
شجر و پودہ، سائباں محبوس

سرو و صندل، سفیدہ و شمشاد
ساگوان و صنوبر و آبنوس

کس کے اجلال میں ہوئے طائر
تاشے، باجے، نفیر، نے، ناقوس

صلصل و سار و عندلیب و ہزار
کبک و دُرّاج و تیہو و طاؤس

ہمہ تفریح و شادمانی نقیب
ہمہ رقص و سُرود سے مانوس

کس کی آمد ہے بنتِ موسیقی
صوت و آہنگ کا پہن ملبوس

حاشیوں پر سجا قوافی گل،
بن کے موزون شاعری کی عروس

چار ساعت سے منتظر ہے یہاں
کہ یہیں پر بچھا ہے تختِ جلوس

اس کا جو ہے مبالغے کے بغیر
نوشۂ نظم، نغمگی ناموس،

وہ کہ ٹھہرا لغات کی اقلیم
وہ کہ لفظوں کا بحرِ اوقیانوس

کل علوم و فنون کا مصباح
صاف شفاف فکر کا فانوس

عارفِ فرقہ ہائے اہلِ ہنود
عالمِ فتنہ ہائے اہلِ مجوس

مُسلمِ خاص طٰہٰ و یٰسین
مومنِ خاص قادر و قدوس

وقف ہے وہ مبلّغِ توحید
بہرِ رّدِ عقائدِ معکوس

فکرِ اقبال کا وہ پرچارک
ہے ندائے حجاز کا ناقوس

مہرِ تابانِ آسمانِ شعر
گم ہوئے جس میں شاعری کے شموس

وہ علومِ فرائض کا بقراط
حکمتِ نظم کا وہ جالینوس

اُس کی تاریخ میں بدیعِ زماں
اُس کے جغرافیے میں بطلیموس،

دنگ فردوسی ہو اگر دیکھے
رزمِ افراسیاب و کیکاؤس

مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل
تھے کبھی اُس کے ابتدائی دروس

اَب وہ خالد ہے رہ گئی ہو کر
شاعری جس کے جسم میں محبوس

اُس پہ قربان مدحتوں کے نقود
اور نچھاور محبتوں کے فلوس

صوفی فقیر محمد

عبدالعزیز خالد

لکھ اے قلم تو سلامِ صوفی! بنامِ عبدالعزیز خالد!
پڑھ اے زباں تو کلامِ احسن! کلامِ عبدالعزیز خالد!

حلیف کیسا؟ حریف کیسا؟ سوال کیا ہے؟ مجال کیا ہے؟
کہ اوج پر ہے بلند تر ہے، مقامِ عبدالعزیز خالد

تمام ناموں سے بڑھ گیا ہے، یہ نام ناموں سے چڑھ گیا ہے
وہ شان رکھتا ہے جان رکھتا ہے، نامِ عبدالعزیز خالد

زبان اپنی، بیان اپنا، یقین اپنا، گمان اپنا
کہ منفرد ہے، جدا ہے سب سے، کلام عبدالعزیز خالد

قلم ہے کس کا رہینِ اردو، چمن چمن ہے زمینِ اردو
ہوا ہے زیب جبینِ اردو، دوامِ عبدالعزیز خالد

زمیں سے پرواز جا رہی ہے، فلک سے آواز آ رہی ہے
کہ ہے بلاغ المبین پیہم، پیامِ عبدالعزیز خالد

یہ صوت کیا ہے؟ نہیں ہے شے کچھ، کہ ماسوائے دہن بھی ہے کچھ
کہ ماورائے سخن بھی ہے کچھ، پیام عبدالعزیز خالد

قدیم بھی ہے، جدید بھی ہے، کہ دید بھی ہے شنید بھی ہے
نوید بھی ہے، مزید بھی ہے، کلامِ عبدالعزیز خالد

یہ کیا تنظر ہے، یہ کیا اثر ہے؟ یہ کیا کرشمہ ہے، کیا ہنر ہے؟
کہ رند و صوفی تمام ہیں مستِ جامِ عبدالعزیز خالد

—

ذہین کنجاہی

مینارِ عظمت

اپنے مسلک کی تجھے عظمت ملی
تیرا مسلک
منفرد اسلوب
لحنِ زندگی
اور تجدیدِ زبانِ سرمدی
تیری عظمت
مسندِ خورشید اوجِ آگہی
مشرق و مغرب تیرے آفاق
تیرا بانکپن
بحر و بر کی وسعتیں تیرے ہر افکار کی رفتار ہیں
تو تناسب کا نیا آغاز ہے
تو مکاں، دشت و زماں سے ماورا
فکر کار ہوار لیکر بیکراں رفتار سے سے گامزن
یہ تری رفتار
تیری ندرتِ افکار
اردو شاعری کی اک نئی آواز ہے
اس نئی آواز کے ہر زیر و بم پہ
وقت کی تحریر
دل کی دھڑکنیں آباد ہیں
تیری عظمت کے سہانے گیت گانے کیلئے آزاد ہیں

سحر رومانی

حدی خواں

وہ حال کے سرد طاقچوں میں

عظیم ماضی کی جلتی شمعوں کو یوں سجاتا ہے

جیسے تاروں کا قافلہ کہکشاں کی راہوں پہ گامزن ہو

یہ قافلہ، وقت کے اندھیروں میں نور بن کر رواں دواں ہے

شعور کی منزلِ فروزاں ہے اس کی منزل

ہے اس کا سالار وہ حُدی خواں،

کہ جس کے ہونٹوں پہ شعر بھی ہیں حقیقتوں کا لباس پہنے

اگرچہ وہ شعر گو ہے، لیکن صداقتوں کا پیامبر ہے

حسین اقدار کے حریری جواں بدن پر صداقتوں کی یہ جگمگاتی قبا

اُسی کے لطیف نغموں کے تار بُنتے ہیں،

روز و شب کی مسافتوں میں

شعور کی منزلِ فروزاں کچھ اور نزدیک آگئی ہے

کہ قافلے کی جرس کی آواز پر حُدی خواں کی گرم آواز چھا گئی ہے۔

بشیر رحمانی

مینارِ ادب

خاتمِ دوراں کے تابندہ نگیں
تیرا فن ہے تیری عظمت کا امیں
جس میں رقصاں ہے نگارِ زندگی
روح کو جس سے ملی ہے تازگی
اللہ اللہ یہ تیری شانِ غزل
فکر کی جھیلوں پہ لفظوں کے کنول
زندگی ہر موڑ پر دمساز ہے
تو فضائے نظم کا شہباز ہے
خونِ دل سے نعت جب کی ہے رقم
حمد کے غنچے بھی چٹکے بیش و کم
ترجمے تیرے جمالِ ماہتاب
نثر تیری پیکرِ حسن و شباب
تیری تمثیلات بھی ہیں بے مثال
ہے تیرا حسنِ رباعی لازوال
تیری تصنیفات شہکارِ ادب
تیری شخصیت ہے مینارِ ادب
تو نے بخشی ہے جنوں کو وہ بہار
منتظر تھا جس کا صحنِ لالہ زار

شاہدہ رفیع

عبدالعزیز خالد

گلگونۂ شفق ہے گلستانِ عروسِ شعر
ہے لحظہ لحظہ حشر بداماں عروسِ شعر

ذرّہ ترے سخن کا ثریا جناب ہے
تابانیوں میں رشکِ گلِ آفتاب ہے

فکرِ رسا اسیرِ رخِ شش جہات ہے
ناخن گرہ کشائے قبائے حیات ہے

تیغِ قلم حریفِ ہلالِ سپہر ہے
مضمونِ شوق ہمسرِ تقدیرِ مہر ہے

اِک شورِ الاماں ہے صریرِ قلم کے ساتھ
فکرِ رسا کو رشتہ ہے شمعِ حرم کیساتھ

ہے دانشِ فروغِ تخیل سے رشکِ ماہ
لعلِ بہائے معنیِ خوش رنگ کی ضیا

مضموں میں سوز و ساز و تب و تابِ ہر نفس
دل موجہائے نور سے سیماب ہر نفس

اوجِ تخیلات کی کیا دیجئے مثال
مضمونِ شب میں طرۂ لیلیٰ کا ہے جمال

کہنا ہر ایک بات دفورِ یقیں کے ساتھ
تفسیرِ آیہائے قرآنِ مبیں کیساتھ

ہر جنبشِ قلم میں ہے تابانیِ حجاز
دیکھے کوئی شعورِ ثنا خوانیِ حجاز

ٹھہرے گا رخشِ خامۂ زریں رکاب کیا
ذوقِ ثنائے ختمِ رسل کا حساب کیا

کیسے رُکے گی بارشِ کیفِ تجلیات
چھیڑی ہے تُو نے رنگِ رخِ مصطفےٰ کی بات

تیرا کلام ہے کہ خیالِ چمن کی شاخ
سلکِ دُرِ سخن ہے کہ لعلِ یمن کی شاخ

رکھے گا کشش جہت سے جنوں متصل تجھے
جامِ جہاں نما ہے "زرِ داغِ دل" تجھے

محشر بدوشِ خامۂ زریں نگار ہے
"برگِ خزاں" پہ نقشِ فروغِ بہار ہے

ویران میکدہ ہے تو گریاں سبو سبو
کیا چیز ہے یہ "ماتمِ یک شہرِ آرزو"

سرگرمِ شوق توسنِ رنگیں خرام ہے
کس درجہ دل فروز ترا "دشت شام" ہے

ہے کلک موجِ بحرِ فصاحت میں بے قرار
انوارِ ذہن سے کفِ دریا ہے آب دار

بکھرے ہیں لالہ رنگ تمناؤں کے سحاب
اقلیمِ شعر ہے کہ طلسمِ فضائے خواب

ہر شعر مثلِ تارِ حریرِ دو رنگ ہے
کیا اتصال کوثر و تسنیم و گنگ ہے

فکرِ حجاز و حکمتِ یوناں کے برگ و بار
ہر لحظہ تیری شاخِ تخیل سے آشکار

تیغِ قلم کو رنگِ فصاحت سے دے کے آب
تو نے کیا ہے شعر کو ہم رشکِ آفتاب

عقلِ رسا بھی حسنِ بلاغت پہ دنگ ہے
میں کیا کروں کہ جامۂ الفاظ تنگ ہے

غلام حیدر رمزؔ

نذرِ غالب

علامہ اقبالؒ نے پیامِ مشرق میں چار نابغۂ روزگار شعرا پر ان کے کلام اور فکر و فلسفہ پر ایک ایک جامع شعر ارشاد فرمایا ہے ان میں مرزا غالب پر خود انہی کا شعر ہے علامہ نے اسی شعر کو معیار قرار دے کر اسی زمین میں تین شعر خود کہے ہیں۔ آخری شعر اس ناچیز کا ہدیۂ عقیدت۔

"براؤننگ"

بے پشت بود بادۂ سرجوشِ زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

"بائرن"

از منتِ خضر نتواں کرد سینہ داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

"غالب"

تا بادۂ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

"رُومی"

آمیزشے کجا گہرِ پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

(پیامِ مشرق)

"خالد"

از تاک برگذشتم و جوشِ مئے حیات
از "رُوحِ عصر" گیرم و در ساغر افگنم

اسلم یوسفی

عبدالعزیز خالد

اے عزیزِ فن شرف افزائے بزمِ آگہی
تیری لے میں نغمہ پیرا عندلیبِ شاعری

تیرا اعجازِ نوا سنجی اثر انداز ہے
تیری فکرِ عرش پیما آئینہ پرداز ہے

تو سرِ بزمِ سخنداں زیور آرائے غزل
تو شبابِ علم و دانش تو متاعِ بے بدل

نطق کو سو ناز تیرے لہجۂ گفتار پر
تیری "کلکِ موج" ابرِ دجلہ افشانِ ہنر

ظرفِ حرفِ خوش ادا "سازِ گلِ نغمہ" بنا
رشتۂ "تحریر" زنجیرِ رمِ "آہو" رہا

راہِ "دشتِ شام" میں تجھ کو ہے کس کی جستجو
تیرے جوہر سے "دکانِ شیشہ گر" کی آبرو

تیرا لحن سرمدی بانگِ "سرودِ رفتہ" ہے
تیری تقریرِ حسیں ہم پایۂ گلدستہ ہے

"منحمنا" کی صدائے دل نشیں آتی رہے
کان کے صحرا میں جوئے انگبیں آتی رہے

نعت گوئی سے تری ایمان تازہ ہو گئے
جو غبارِ رہگزر تھے رشکِ غازہ ہو گئے

ندرتِ مضموں تری قدرت سے باہر تو نہیں
قامتِ سروِ سہی تیرے برابر تو نہیں

رزم گاہِ نقد میں تو خالدِ جرار ہے
تو سپاہِ لفظ و معنی کا علمبردار ہے

تحسین فراقی

خالد — ملکُ الکلام

بربطِ عصر ہے، شہرودِ نوا ہے خالد
سازِ ایام کا آہنگِ بقا ہے خالد
لحنِ داؤد ہے، ہاتف کی ندا ہے خالد
طاقِ تخلیق کا خود کار دیا ہے خالد
گلشنِ فکر میں غنچوں کی صدا ہے خالد
گلبنِ شعر میں کلیوں کی حیا ہے خالد
نکہتِ باغِ صفا، موجِ صبا ہے خالد
نغمۂ شوق ہے، گلبانگِ انا ہے خالد
راکبِ رفرفِ افکارِ علا ہے خالد
صانعِ دھر کی انمول کلا ہے خالد
قامتِ قدر پہ پھولوں کی قبا ہے خالد
قالبِ جبر پہ شیشے کی صدا ہے خالد
داورِ فکر ہے، لفظوں کا خدا ہے خالد
جانِ فن، جانِ سخن، جانِ غنا ہے خالد
رنگِ احساس پہ ساون کی گھٹا ہے خالد
چرخِ جذبات پہ تاروں کی سبھا ہے خالد

معدنِ علم بھی ہے، مجمعِ سحّار بھی ہے
کاشیٔ فکر بھی ہے، کعبۂ اذکار بھی ہے

حسنِ صورت بھی یہاں، حسنِ معانی بھی یہاں
حسنِ اظہارِ خیالات داغانی بھی یہاں
طرزِ بہزاد بھی، پیرایۂ مانی بھی یہاں
حافظ و صائب و خیام و قاآنی بھی یہاں
امرؤالقیس کی آزاد بیانی بھی یہاں
ابی سُلمی کے قصیدے کی روانی بھی یہاں
تلسیٔ ہند کے اقوالِ شہانی بھی یہاں
عکسِ اقبال بھی ہے، رمزِ فغانی بھی یہاں

طرزِ محسن بھی ہے، حسان کا اسلوب بھی ہے
فکرِ سحبان و سنائی اسے مرغوب بھی ہے

دیومالا بھی ہے، ٹیگور کے نغمات بھی ہیں
گیت سلمان کے، قرآن کے آیات بھی ہیں
آسکر وائلڈ کی تمثیل کے لمعات بھی ہیں
ارضِ یونان کی سیفو کے مقالات بھی ہیں

کون سا نغمۂ سرمد نہیں بیدار یہاں
میں کہاں، تبصرۂ خالدِ پیکار کہاں

عبد الواحد ملک

جنونِ عشق

خالد کی شاعری پہ ہے پیغمبری کا ظِل
روئے ادب پہ شعر ہر اک خوشنما ہے تِل

خُلقِ محمدیؐ کی جھلک دیکھنی ہو گر
خالد کو اس کے شہر کراچی میں آ کے مِل

درویش طبع گردشِ دوراں سے بے نیاز
محکم ہے جیسے سر زمیں میں ہے پابگِل

موجِ ہوا سے صورتِ لالہ ہے سُرخ رُو
کرنوں کی ایک چٹکی سے جاتا ہے گُل یہ کھِل

کہنے لگے وہ مجھ سے کلفٹن پہ ایک بار
سُن دیکھ بول اور نہ اپنی جگہ سے ہِل

دامن ہے چاک چاک گریباں تار تار
وہ چاہے گر تو آنکھ جھپکتے میں جائیں سِل

حاضر ہیں علم و آگہی اس کے حضور میں
اس کو جنونِ عشق ہے کہتے ہیں اہلِ دل

گفتار خیالی

عبد العزیز ــــ مردِ قلندر

بشر سے عشق و محبت بھی اک عبادت ہے
تعصبات سے بچنا دلیلِ عظمت ہے
نہ وسوسوں کا کسی طور قلب و جاں میں گذر
کسی غنیم کا خطرہ نہ بادشاہ کا ڈر!
نہ قصرِ خواب کی پروا نہ شانِ جاہ و حشم
نہ عز و جاہ کا شہرہ نہ اہتمامِ نعم
نہ جامِ جم کی تمنا نہ حرصِ دام و درم
نہ علم و فکر کا غرہ نہ اپنی ذات کا غم
وہاں خلوص دکھائیگا کیا بشر اپنا
جھکا رہا ہو جہاں آسماں بھی سر اپنا
نہ کوئی اس کا عدو ہے نہ کوئی اس کا رقیب
یہود ہو کہ مسیحی امام ہو کہ خطیب
فقیرِ بے سر و ساماں ہو یا امیر و غریب
نظر میں اُس کی سبھی آدمی حبیب و لبیب
چراغِ فقر سے روشن ہیں اُس کے احساسات
ہر ایک بات میں پنہاں ہیں اس کی صد آیات
سمجھ سکیگا قلندر کو کب ترا ادراک
ہے تیری عقل زمیں بوس، وہ سرِ افلاک

سرور بجنوری

عبدالعزیز خالدؔ

آئینۂ فصاحت عبدالعزیز خالدؔ
گنجینۂ بلاغت عبدالعزیز خالدؔ

اشعار کا ذخیرہ عبدالعزیز خالدؔ
افکار کا جزیرہ عبدالعزیز خالدؔ

اک باکمال شاعر عبدالعزیز خالدؔ
دانائے عصرِ حاضر عبدالعزیز خالدؔ

دریائے عشق و مستی عبدالعزیز خالدؔ
ہیں کیا عظیم ہستی عبدالعزیز خالدؔ

اک ذی اثر سخنور عبدالعزیز خالدؔ
اک بے کراں سمندر عبدالعزیز خالدؔ

عرفان کی زباں ہیں عبدالعزیز خالدؔ
حکمت کے ترجماں ہیں عبدالعزیز خالدؔ

پروانۂ رسالت عبدالعزیز خالدؔ
دیوانۂ نبوّت عبدالعزیز خالدؔ

مدّاحِ مصطفیٰؐ ہیں عبدالعزیز خالدؔ
اک بندۂ خدا ہیں عبدالعزیز خالدؔ

بادہ گسارِ ایماں عبدالعزیز خالدؔ
کیف و سُرور کی جاں عبدالعزیز خالدؔ

پہچان

وزیر آغا

وہ جب باادب باملاحظہ خدام کی دورویہ قطاروں میں سے گزر کر اپنے باوقار اور سنجیدہ دفتر میں قدم رکھتا ہے تو چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے، نفاست پسند اس قدر ہے کہ اگر کسی اچھے بھلے ایئر کنڈیشنڈ ریستوران کے ویٹر کے لباس پر معمولی سا داغ دھبہ بھی دیکھ لے تو کراہت سے منہ دوسری طرف کر لیتا ہے اور پھر شاذ ہی دوبارہ اس ریستوران میں قدم دھرتا ہے لیکن اس سارے ظاہری بورژوائی رویے کے باوجود وہ بباطن ایک درویش صفت انسان ہے۔ اُس سے گفتگو کیجیے تو وہ معاشرے کی بُرائیوں اور ناہمواریوں کی اس شدّومد سے مخالفت کرے گا کہ ردِّ عمل کے طور پر آپ شاید ان برائیوں کی حمایت میں سینہ سپر ہو جائیں اصول اور ضابطے کی پابندی اُس کی فطرت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ دولت والوں کا احتساب کرتا ہے اور دولت جمع کرنے کے عمل کو ایک پست انسانی اقدام قرار دیتا ہے اور اس سلسلے میں کسی رو رعایت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ تاہم اس سارے سنجیدہ انہماک بھاری بھرکم شخصیت اور دفتری عمامے کے باوجود یہ شخص اندر سے ایک مردِ قلندر ہے جو جاہ و حشمت منصب اور دولت کو نوکِ پا سے ٹھکرا کر محض سورج کی روشنی کی تمنا کرتا ہے کہ روشنی ہی ازل ہے اور روشنی ہی ابد ہے!

بورژوائی عمل اُس کی کتابوں کے بار سنگھار سے بھی عیاں ہے۔ دبیز ملائم کاغذ، نفیس اور مہنگی کتابت، اعلیٰ ترین عبارت، خوشنما جلد، تزئین اور آرائش کا خاص اہتمام۔ بس یُوں لگتا ہے، جیسے یہ کتابیں، کتابت اور طباعت کے کٹھے پھیٹے اور صبر آزما مراحل سے نہیں گزریں بلکہ بنی بنائی کسی فیکٹری کے ذہن سے ٹپکی ہیں مگر اس سارے رکھ رکھاؤ اور تکلف، نمود و نمائش اور تزئین و آرائش کے باوجود ان کتابوں کے بطون سے جو شخصیت برآمد ہوتی ہے وہ حد درجہ سادہ اور بے تکلف ہی نہیں بلکہ خاک میں خاک ہو جانے کے مسلک کی داعی بھی ہے۔ یہ ایک ایسی مرنجاں مرنج، پُر اعتماد اور رجائی نقطۂ نظر کی حامل شخصیت ہے جسے اپنے چاروں طرف انتشار، تخریب اور بے راہروی تو نظر آتی ہے لیکن جسے یقین ہے کہ وہ سحر اب کچھ زیادہ دُور نہیں جب خیر، شر پر مکمل فتح حاصل کرے گا اور زندگی پھولوں کی سیج بن جائے گی۔ اس کی شاعری اسی روزِ سعید کو قریب تر لانے کی ایک سعیٔ جمیل ہے۔

بظاہر وہ ایک مجموعۂ اضداد ہے۔ سماجی سطح پر، شخصی سطح پر لیکن سب سے زیادہ فن کی سطح پر! اور فن کا یہ عالم ہے کہ وہ اس دیار میں داخل ہوتا ہے تو اسے الفاظ دست بستہ خدام کی طرح کھڑے ملتے ہیں، وہ جب قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو الفاظ اپنی سرگوشیاں بند کر کے ہمہ تن انتظار بن جاتے ہیں اور وہ اپنی اس قلمرو میں ایک بے تاج بادشاہ کی طرح حکومت کرنے لگتا ہے۔ وہ تالی بجاتا ہے تو ہزاروں الفاظ یک زبان ہو کر لبیک کہتے ہیں اور وہ آگے بڑھ کر ان میں سے بعض کو آنے کا اشارہ کرتا ہے اور بعض کو قریب آنے سے منع کر دیتا ہے لیکن چونکہ فطرتاً رحمدل ہے اس لئے اکثر و بیشتر زیادہ سے زیادہ الفاظ کو باریابی کا موقع عطا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری کھچا کھچ بھرا ہوا ایک ایسا دربار ہے جس میں ملک ملک کے سفیر درجہ بدرجہ بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ پُر تکلف پُر وقار اور گھمبیر فضا شروع سے آخر تک مسلط رہتی تو وہ شاید کبھی ایک بلند پایہ شاعر کے مقام تک نہ پہنچ سکتا لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ وہ جب پورے دربار کو مخاطب کرتا ہے تو اس کا لہجہ بلند آہنگ اور بارُعب ہوتا ہے

مگر دوسرے ہی لمحے جب وہ اپنے شانے پر فن کی دیوی کے نرم و نازک ہاتھ کا دباؤ محسوس کرتا ہے اور عقب کے ریشمی پردے کی طرف منہ کر کے کچھ کہتا ہے تو اُس کے لفظ لفظ سے ملائمت اور کوملتا اور شیرینی قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکتی ہے - یکایک اس کی باتیں ملائم ہو جاتی ہیں، کرخت لہجہ ایک مدھم سی سرگوشی میں ڈھل جاتا ہے اور بھاری بھرکم افکار، محبت کی میٹھی میٹھی باتوں کے سامنے دم بخود ہو جاتے ہیں، چنانچہ یہ کہنا کچھ ایسا غلط نہ ہوگا کہ وہ سماجی نظم و ضبط کا زندانی ہونے کے باوجود ایک آزاد مردِ درویش، گھمبیر اور سنجیدہ شخصیت کے باوجود کومل اور نرم و نازک اور بلند بانگ شعری لہجے کے باوجود ایک عجیب سی گھلاوٹ اور غنائیت کا مظہر ہے۔

عارف عبدالمتین :

وہ ہمارے عہد کے اُن لاتعداد فن کاروں میں سے نہیں ہیں جن کی شخصیت اور فن میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ برصغیر پاکستان و ہند کے حسن کاروں کی اس مختصر سی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو شخصیت اور فن کے عدم تفاوت کی وجہ سے ممتاز ہے - جس کے ہاں فن شخصیت کی رفعتوں کا امین ہے! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دِلدادۂ مذہب ہیں اور مذہب فکر و عمل کے تضاد کو کسی حالت اور صورت میں برداشت نہیں کرتا!-

اُن کا تصور مذہب انفعالی نہیں جو فرد اور معاشرے کو جمود و خمود کا شکار کرتا ہے، بلکہ فعّال ہے، جو سوسائٹی اور اس کے اراکین کو ترقی پسندانہ خطوط پر استوار کرتا ہے اور یوں انسانیت کو بحیثیت مجموعی فروغ و ارتقا سے ہمکنار کرتا ہے -

وہ دلگداز عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، لہٰذا وہ ایک طرف اپنے کردار کو اسوۂ حسنہ کے دلآویز سانچے میں ڈھالنے کی جدّ و جہد میں مصروف ہیں تو دوسری طرف اُردو ادب کے نعتیہ ذخیرے میں گرانقدر اضافے کا موجب بن رہے ہیں -

وہ ان دنوں انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے پر فائز ہیں مگر یہ عہدہ انہیں کوئی طرۂ امتیاز مہیا نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس یہ امر اس عہدے کے لیے سرمایۂ افتخار فراہم کرتا ہے کہ اُن جیسا نابغۂ وقت اس کے بارِ گراں کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ مذکورہ عہدہ اپنے اندر ایسی بے شمار ترغیبات رکھتا ہے، جو ہماری موجودہ کرپٹ سوسائٹی میں بڑی اہمیت اختیار کر چکی ہیں مگر اُن کی متقی و مستغنی طبیعت نے ان ترغیبات کو کبھی لائقِ اعتنا نہیں سمجھا!

وہ ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں اور کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں - اُردو، انگریزی اور عربی زبان و ادب سے انہیں خصوصی مناسبت ہے، جس کا بڑا شائستہ اظہار اُن کی تخلیقی کاوشوں سے بالعموم ہوتا رہتا ہے۔

وہ کم آمیز ضرور ہیں مگر مردم بیزار ہرگز نہیں بلکہ اس کے برعکس اولادِ آدم سے شفقت و محبت کا سلوک روا رکھتے ہیں اور احترامِ آدمیت کو جزوِ ایمان گردانتے ہیں - ہر چند کہ اُن کا پیشہ انسانوں کو شک کی نظروں سے دیکھنے کی لاشعوری تربیت دیتا ہے وہ انسانوں کے بارے میں حُسنِ ظن کی دولت سے مالا مال ہیں کہ دینِ معاشرے کو حسنِ ظن ہی پر استوار کرتا ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ شخصیتوں کے جھول اُن کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں، وہ اُنہیں ایک ہی نظر میں بھانپ لینے کا ملکہ رکھتے ہیں!

وہ منکسر المزاج ہیں اور نمود و نمائش سے فطرتاً گریز کرتے ہیں، مشاعروں سے عمومی اجتناب ان کے اسی میلانِ طبع کا نتیجہ ہے!

وہ دوستوں کی صحبت کو کبھی اپنی سنجیدگی سے گرانبار نہیں بناتے بلکہ اپنی شگفتہ مزاجی اور شگفتہ بیانی سے اُسے سبک اور شاداب بناتے ہیں، احباب کے دُکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، اور اپنے فن کی بجائے اُن کے فن پر گفتگو کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی تحسین میں کسی قسم کے بُخل سے کام نہیں لیتے بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ فراخ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہیں -!

الغرض وہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں جس پر زندگی اور فن دو تو ناز کر سکتے ہیں۔!

سیف زلفی

ہمارا آج کا مہمان شاعر تقریباً سترہ اٹھارہ کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے۔ ان شعری مجموعوں میں تمام ہی اصنافِ سخن بکھری پڑی ہیں، جو شاعر کے فن اور کمال کا اعلان کرتی ہیں۔ ہمارے آج کے شاعر کی حیثیت کرکٹ کے اس کھلاڑی کی سی ہے جو آل راؤنڈری وکٹ کھیلتا ہے اور میدان میں اپنی دھاک بٹھا دیتا ہے۔

ہمارا شاعر بھی تمام ہی اصناف سخن پر عبور رکھتا ہے۔ اور قاری کو اپنی وسیع النظری۔ علمیت اور عظمتِ فن کا احساس دلاتا جاتا ہے۔ ہمارے شاعر کے اچھے قاری جانتے ہیں کہ اس نے شاعری میں ہیئت کے کیسے کیسے انوکھے اور اچھوتے انداز جنہیں آج کی اصطلاح میں "تجربے" کا نام دیکر لوگ اپنی انفرادیت اور جدیدیت کا ڈھول پیٹتے ہیں" مگر ہمارے مہمان شاعر کے لئے یہ "تجربے" ضرورت کی حیثیت رہیں جس کے سہارے وہ زبان کو وسعت دیتا ہے، ہمارے آج کے مہمان کا غزل سے رشتہ روایتی ہے فکری طور پر اس کی غزل سے "ماڈرن سینسیبلٹی" کہیں کہیں جھانکتی نظر آتی ہے کہ وہ غزل کو میر سے لے کر۔ اصغر گونڈوی کے انگ انگ میں دیکھنا ہی پسند کرتا ہے اور اس محبوبہ کو اس نئے دَور کے (ٹیڈی ازم) سے ہی دور رکھتا ہے۔ غزل میں اس کا لہجہ اس کے پیش رو شعرا کا لہجہ ہے۔

نظم میں وہ افادیت کا قائل ہے۔ اس کے خیال کی جلو میں بیکراں معانی۔ محاکات، تلمیحات اور واقعات جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

وہ نعت گو نہیں بلکہ تاجدار یثرب و بطحا کا عاشق ہے اس کا قلم سچائی کے موتی اگلتا ہے۔ اس صف میں اس کا کلام ایک بھرپور قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ترجمہ ـــــ اس کی فطرت شعری کا جزو ہے۔ وہ اپنے بے پناہ مطالعے اور گھمبیر علمیت کا ترجمہ ترجمہ ہی کو سمجھتا ہے اور اس نے تراجم کے ذریعہ اردو زبان کو دوسری زبانوں سے آشنا ہی نہیں کیا" بلکہ دوسری زبانوں کے خیالات والفاظ کو اردو زبان میں ایک مقام دیا ہے۔

ہمارے اس مہمان شاعر پر برسوں سے صرف ایک اعتراض چلا آرہا ہے" کہ وہ "مشکل گو اور مشکل پسند ہے"!
مگر میں کہتا ہوں کہ نہ وہ مشکل گو ہے اور نہ مشکل پسند بلکہ معاملہ یوں ہے کہ عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ جو اردو زبان میں غریب" ہیں" مگر ان الفاظ کے ساتھ ان کی اپنی زبان میں غرابت کا شمہ بھر تصور بھی وابستہ نہیں، ہمارا مہمان شاعر ان الفاظ کو بلا خطر، بلا جھجک اور برمحل استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔ اور ہم ان الفاظ سے ناآشنائی کی بنا پر ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں" مگر میرے نزدیک فکر کا ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ یہ غریب ہمارے شہر میں بار بار نظر آئیں گے تو غریب شہر نہیں کہلائیں گے" بلکہ اسی شہر کے باشندے بن جائیں گے۔ ہمارا شاعر اس اعتراض سے باخبر بھی ہے اور چوکنا بھی۔ لہذا وہ جواباً خاموشی سے شعر میں ایسی عوامی زبان اور روزمرہ بھی لکھ جاتا ہے کہ جگہ جگہ سہل ممتنع کا گمان گزرتا ہے۔

ہمارا مہمان ادب کے لہجہ میں گفتگو کرتا ہے۔ وہ زبان کو وسعت اور نئی لغت دینا چاہتا ہے۔ اس کے ترجمے اردو شاعری کو نئے خیالات اور اسلوب کو نیا موڑ دے رہے ہیں۔ اس کے ہاں کلاسیکی عرب شاعری کی بے باکی اور ساتھ ہی ساتھ شرافت کی سادگی ملتی ہے۔
وہ موسیقیت کا گیان اور تال سُر کا دھیان رکھتا ہے۔ اس کے ہاں غنائیت کُلّا نی محسوس ہوتی ہے۔ اسلامی اقدار تو اس کے خون کا حصہ ہیں" مگر دوسرے مذاہب کی مائی تھالوجیز سے وہ خوب واقف ہے۔ یہ وسیع النظری اس کی دن رات کی کاوش اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے

آغا صادق

عبدالعزیز خالد سے میرا پہلا رابطہ

میری زندگی کا ایک نہایت خوشگوار موڑ وہ نقلِ مکانی ہے جب مارچ ۱۹۴۱ء میں محکمہ نہر کو خیرباد کہہ کر میں اپنے آبائی گاؤں ڈھیریاں متصل شاہ کوٹ ضلع جالندھر سے قریب ننگل انبیا میں بحیثیت مدرس اسلامیہ ہائی سکول سے وابستہ ہوا۔ اسے خوش قسمتی کہیے یا حسنِ اتفاق کہ اس مضافاتی ادارے میں بھی کسی قدر ادبی فضا میسر آگئی۔ جو عموماً بڑے بڑے شہروں ہی میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ چودھری رحمت علی ناز، تش، منظور سعید احمد اور نعمت علی ایسے باذوق اساتذہ و تلامذہ کا سنگم غنیمت تھا اس لیے ہم نے (ننگل کی رعایت سے) جنگل میں منگل منانے کا بیڑا اٹھا لیا اور چند ادبی نشستوں کا انعقاد، گردونواح کے پڑھے لکھے احباب میں ادبی ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

اس تعلیمی ادارے میں قیام کے دوران میں دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن جب میں مدرسے کی لائبریری میں گیا تو وہاں ایک دبلے پتلے طالب علم کو دیکھا جو کتابوں کی ایک الماری کے سامنے کھڑا اپنے مذاق کی کتابوں کی تلاش میں تھا، میری آمد پر وہ میری طرف متوجہ ہوا، اگرچہ وہ کسی جماعت میں میرا شاگرد نہیں تھا مگر جذبۂ احترام کے تحت (جو اس مکتب میں دوسرے مکاتب کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا) یہ خصوصی توجہ طلبہ کا عام رجحان [illegible] میں نے اس سے پوچھا کہ برخوردار تمہیں کس شاعر کا کلام زیادہ پسند ہے تو اس نے غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور جگرؔ کا نام لیا۔ میں نے ازراہِ شوخی ان مشاہیر شعرائے کرام سے متعلق اس کی معلومات کا جائزہ لینا چاہا تو اس سے ان سب کے متعلق ماہرانہ تنقید اور ان کے طرزِ کلام کے بارے میں خوب جچے تلے تبصرے سن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ یہ تیرہ سالہ طالب علم عبدالعزیز خالد تھا۔ اس عمر میں جبکہ عام طلبہ کا شین قاف تک درست نہیں ہوتا عبدالعزیز خالد کی وسعتِ معلومات، شستہ و پختہ ادبی ذوق اور آبِ رواں کی سی پاکیزہ گفتگو میرے لیے عجوبے سے کم نہ تھی۔

اس رابطے کا دوسرا اہم واقعہ عبدالعزیز کے شوقِ عروض دانی کا اظہار تھا۔ چونکہ اس وقت بھی مجھے اس علم سے گہرا لگاؤ تھا اگرچہ میری کتاب [illegible] کی تالیف کئی سال بعد ہوئی مگر اس فن کی بہت سی کتابوں کے مطالعے اور ذاتی سوچ بچار سے اس پر مجھے اچھا خاصا عبور حاصل ہو چکا تھا۔ میں نے [illegible] شوق کی تسکین کے لیے عروض کی مبادیات سمجھانے کی حامی بھر لی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی بے حد انتہا نہ رہی کہ اس نے چند روز میں عروض ایسے مشکل فن کے دقائق و غوامض جذب کر لیے۔ چنانچہ اس نے اپنی نظم میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے جس کا ایک مصرعہ کچھ اس قسم کا ہے ؎

یہاں میں نے آغا صادق سے "فعلن فعولن فعولن" کے اسرار سیکھے

(بہ تغیرِ الفاظ)

اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس طالب علم کی خداداد ذہانت اور فراست ایک دن ضرور ایک عظیم علمی اور ادبی نابغے میں ڈھل کر رہ جائے گی چنانچہ اسی مدرسے میں دو بار اس کا مظاہرہ ہوا، ایک بار اس وقت جب ۱۹۴۲ء میں وہ مڈل سکول کے امتحان میں صوبے بھر میں اوّل رہا اور دوسری بار اس وقت جب ۱۹۴۴ء میں میٹرک کے امتحان میں وہ صوبے بھر میں تیسرے نمبر پر آیا جبکہ اوّل و دوم رہنے والے امیدواروں کے نمبر اس کے نمبروں سے [illegible] چھ سات زیادہ تھے۔

دونوں موقعوں پر نمایاں کامیابی اس کی شہرت و مقبولیت کا پیش خیمہ بن گئی۔

بقول حافظ شیراز ؎

من از آں حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

عبدالعزیز خالد سے میرا مستقل اور متصل رابطہ اس کی تصنیفات کی اشاعت کے دوران میں بھی قائم رہا ہے اگرچہ اس نے کبھی مجھ سے شعر میں اصلاح نہیں لی مگر اس کے ادبی ذوق کو نکھارنے اور اس کی ادبی تخلیقات کی سمت متعین کرنے میں اس کے میرے ساتھ قریبی مراسم کا کسی قدر حصہ ضرور ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے کچھ عروضی تجربوں اور انتخابِ الفاظ سے مجھے اختلاف رہا۔ چنانچہ زیرِ داغِ دل کی اشاعت پر میں نے اس کا برملا اظہار بھی کیا تھا مگر اس اختلاف نے کبھی مناظرے یا مناقشے کی شکل اختیار نہیں کی (عیسیٰ بدینِ خود موسیٰ بدینِ خود)

اب جبکہ عبدالعزیز خالد شہرت و مقبولیت کی بلندیوں کو چھو چکا ہے تو میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ یہ مقام اسے اپنے تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ، مختلف زبانوں پر عبور، وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم کی بدولت حاصل ہوا ہے، اس میں کسی استاد کی نکتہ سنجیوں اور موشگافیوں کا چنداں دخل نہیں۔ البتہ اس کے اساتذہ کے لئے اس کی عظمت باعثِ عزو افتخار و مباہات ضرور ہے۔ اس کے باوجود اس کی سعادت مندی قابلِ داد ہے کہ اس مقامِ شامخ پر پہنچ کر بھی اس نے اپنے اساتذہ کے احترام میں کمی نہیں کی۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء مرع

فاش می گویم و از گفتۂ خود دل شادم!

میرزا ادیب

وُہ ــ اور اس کی پہلی نظم

ترکِ مے ممکن ہے، ترکِ عشق بھی
شاعری لیکن ہے میری زندگی

اگر کوئی شاعر اس بات کا دعویٰ کرے اور وہ شاعر بھی سچا شاعر ہو تو کون اس کے دعوے کو جھٹلا سکتا ہے؟۔ ترکِ مے بہت پیچیدہ معاملہ ہے۔ اسی لئے تو میرزا داغ نے کہا ہے ع چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ سے لگی ہوئی

اور عشق کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ مشکل ہے مگر جب ہمیں اس امر کا یقین ہو کہ کہنے والا شاعری کو اپنی زندگی تصور کرتا ہے اور اگر شاعری اس کے لئے ممنوع قرار دی جائے تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گا تو ہم اس کے اعلان کو ایک ناقابلِ شکست صداقت کا اظہار سمجھیں گے اور اس صداقت کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیں گے لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ شاعر نہ شراب پیتا ہے اور نہ اس کے شب و روز آہِ سحری اور نالۂ نیم شبی سے آشنا ہیں تو پھر یہ معاملہ کیا صورت اختیار کر لے گا؟

اسے حسنِ اتفاق کہیئے یا سوءِ اتفاق کہ میں ایسے شاعر سے واقف ہوں۔ اسے اردو کا منفرد شاعر کہنا قطعاً کوئی مبالغہ نہیں اور یہ اس لئے کہ وہ واقعی ایک منفرد شاعر ہے۔ وہ جیسی شاعری کر رہا ہے ــــ وہی شخص کر سکتا ہے جو اس جیسے دل و دماغ کا مالک ہو۔ اس کی شاعری اُردو ادب کی تاریخ کے ایک نہایت تابناک باب کی حیثیت رکھتی ہے اور اس باب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، لیکن اس کا یہ دعویٰ! ــــ اس کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟

کیا اس نے کبھی شراب پی ہے، میرا خیال ہے کبھی نہیں۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے بھی نہیں، صرف چکھنے کے لئے بھی نہیں۔ کیا وہ اپنی زندگی کے کسی دور میں عاشق بھی رہا ہے؟ جن لوگوں نے اس کے حالات لکھے ہیں۔ انہوں نے اس کی زندگی کے اس پہلو کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس نے اپنے عشق کو مشکِ نافہ بننے ہی نہیں دیا۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟۔

مگر میں اس کے اس دعوے کو صحیح مانتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاتا، اور یہ مانتے ہوئے بھی کہ اس کا عشق ــــ اس قسم کا عشق ہے ہی نہیں جس کی نغمہ سرائی تمام دنیا کے شاعروں نے کی ہے۔ کبھی ہوگی کوئی کسک سی جو شاید اب بھی ہو لیکن یہ عشق کی وہ سوزندہ کیفیت تو نہیں جس سے دل و دماغ میں سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے۔

میں اس کے دعوے کو صحیح کیوں مانتا ہوں؟ آپ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں، اور میں اس کی وجہ بھی بتا سکتا ہوں۔

یہ شاعر، ذریعہ معاش کی خاطر ایک ایسے پیشے سے تعلق رکھتا ہے جسے شاعری سے کوئی تعلق ہی نہیں بلکہ جو صحیح معنیٰ میں شاعری کُش بھی ہے۔ جب وہ اپنے دفتر میں آتا ہے تو وہ ہندسوں کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔

ہندسے ــــ چھوٹے چھوٹے سے ہندسے، بڑے بڑے ہندسے۔ انہی ہندسوں کے اَن گنت پیچ و خم اور انہی ہندسوں کے پیچ و خم کے گرد و پیش اسے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کی باریک بینی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایک لمحے کی بھی چوک ہو جائے

تو بندے اپنا رنگ دکھا جاتے ہیں اور پھر اسے اپنے کسی افسر بالا کے علاوہ اپنے ضمیر کے سامنے بھی شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شطرنج کے ایک انتہائی ماہر کی طرح اسے بندسوں کی بازیگری دیکھنی پڑتی ہے ؎

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

اس کی دفتری زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی حواس گُسل مصروفیت میں بسر ہوتا ہے۔ اور جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اس کے اعصاب جواب دے چکے ہوتے ہیں۔ تھکاوٹ سے اس کا بُرا حال ہوتا ہے۔ اسی حالت میں وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے جو بہ حیثیت ایک فرض شناس شوہر اور ایک شفیق باپ کے اُس پر عائد کی گئی ہیں ــــ اور جب اس کے آرام کا وقت آتا ہے تو وہ چپ چاپ اٹھتا ہے ــــ اپنے کمرے میں جاتا ہے اور دنیا و مافیہا سے یکسر بے نیاز ہو کر، زندگی کے ہر سود و زیاں سے دل و دماغ کا رابطہ ختم کر کے، سب کچھ بھول کر، سب کچھ فراموش کر کے فکرِ سخن میں محو ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں ساری رات بھی بیت جائے تو وہ کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرتا۔

ایک ایسا شاعر جو شاعری کو حقیقتاً اپنی زندگی سمجھتا ہے ــــ جو شاعری کی خاطر اپنے آرام اور راحت کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ کیا وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے انکار کر دے گا؟ نہیں ــــ اور یقیناً نہیں!

میں اس شاعر کو مدت سے جانتا ہوں۔ اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ زیرِ تعلیم تھا۔

ایک روز سہ پہر کے قریب میں "ادبِ لطیف" کے دفتر میں نئے شمارے کے لیے مضامین ایک فائل میں رکھ رہا تھا کہ کاتب آئے تو اس کے حوالے کر دوں۔ اتنے میں ایک نوجوان آیا۔ اور اس نے مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر ایک لمبا سا کاغذ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا

"یہ کیا ہے؟"

"نظم ہے جی۔ ادبِ لطیف کے لیے"

"اچھا" اور میں یہ سوچ کر کہ کوئی طالب علم ہے اور شہرت کے شوق میں ابتدائے عشق کی کوئی چیز چھپوانے کے لیے لے آیا ہے، اس سے مزید گفتگو مناسب نہ سمجھی اور وہ چلا گیا۔

دوسرے دن وہ پھر آ گیا۔

"آپ نے نظم پڑھی؟"

"نہیں پڑھ سکا"

"اچھا پرسوں حاضر ہوں گا۔"

میرا خیال تھا اس نے ایڈیٹر کے رویّے سے اندازہ کر لیا ہو گا کہ اس کی نظم کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

تیسرے دن وہ پھر آ گیا

"جی ــــ وہ میری نظم؟"

میں نے چاہا کہ دراز کھول کر کاغذ نکالوں اور واپس کر دوں۔

"ابھی آپ مشق جاری رکھیے ــــ آئندہ کبھی آپ کا کلام چھپ جائے گا۔" بالکل ایڈیٹروں والی معذرت میں نے کی۔

کاغذ جو نکالا تو یونہی پہلے شعر پر نظر پڑ گئی ــــ پھر دوسرا شعر پڑھا ــــ پھر تیسرا اور اب میری نظر تھی کہ نظم کے

ایک ایک شعر سے گذرتی چلی جا رہی تھی اور دل تھا کہ اپنے "مدیرانہ رویتے" پر پشیمان ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے نظم پڑھ ڈالی۔

نوجوان استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ نظم آپ کی ہے؟"

"جی؟"

"میرا مطلب ہے یہ نظم آپ نے ہی لکھی ہے؟"

"جی — جی — ہا — آں — آپ کا — کیا مطلب — ہیں — ہیں — ہیں!"

"آپ تشریف رکھیے!"

نوجوان سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کی نظمیں کہاں کہاں چھپی ہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

"کئی نظمیں کہی ہیں — ہیں — ہیں!"

"میں نے پوچھا ہے چھپی کہاں ہیں؟"

"کہیں بھی نہیں۔"

میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اٹھ بیٹھا اور سلام علیکم کہہ کر چلا گیا۔

یہ نوجوان بعد میں وہی شاعر بنا جو دن بھر ہندسوں کی دنیا میں رہتا ہے اور رات رات جاگ کر فکرِ سخن کرتا ہے اور جس کو اپنی شاعری اتنی عزیز ہے کہ وہ کہتا ہے ؎

ترکِ مے ممکن ہے، ترکِ عشق بھی
شاعری لیکن ہے میری زندگی

کیا مجھے یہ بھی کہنے کی ضرورت ہے کہ یہ موجودہ دور کا نامور اور بلند پایہ شاعر عبدالعزیز خالدؔ ہے اور مجھے یہ فخر ہے کہ میں نے اس کی پہلی نظم شائع کی تھی۔

عارف عبدالمتین

عبدالعزیز خالدؒ

عبدالعزیز خالد صاحب کے ساتھ گزاری ہوئی شام کو میں نے ہمیشہ رعنائیوں کے اعتبار سے شامِ اودھ کو مات کرتے ہوئے محسوس کیا ہے لیکن جب مجھے ان کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھنے کا حکم دیا گیا تو فوراً اس مسرت میں ایک شدید کرب کی لہر دوڑ گئی۔ اس نئی ذہنی کیفیت کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کیوں کہ میں نے تو خالد صاحب کی ذات یا شاعری پر قلم اٹھانے کو ہمیشہ طمانیتِ قلب کے حصول کا ذریعہ تصور کیا ہے۔ اس صورتِ حال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ تعمیلِ ارشاد کیلئے چند ساعتوں کی جو مہلت ارزانی فرمائی گئی وہ خوفناک حد تک مختصر تھی جس میں خالد صاحب کی ارفع کاوشوں کا ان کے استحقاق کے مطابق اعتراف کر سکتا تھا اور نہ اپنی متفکرانہ اور تنقیدی کوششوں کے ساتھ انصاف برت سکتا تھا، لہٰذا میں اپنے معروضات اس گزارش کے ساتھ پیش کرنے پر مجبور ہوں کہ قارئین کرام انہیں مقالہ سمجھتے ہوئے مطالعہ نہ فرمائیں بلکہ عبدالعزیز خالد صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں میرے چند ایسے تاثرات کے طور پر قبول فرمائیں، جنہیں میں نے ارتجالاً قلم بند کر کے ایک ایسی عاقبت نااندیشانہ جسارت کا اظہار کیا ہے جس کا جواز صرف اس محبت میں تلاش کیا جا سکتا ہے جو مجھے خالد صاحب کے کردار اور ان کی تخلیقات سے ہے!

میں اب تک اپنی زندگی کی چوالیس منزلیں طے کر چکا ہوں، اس سفر کے دوران بہت سے ادباء و شعراء میرے ہم سفر رہے ہیں۔ ان میں سے کئی بچھڑ چکے ہیں، بہت سے ہنوز ہم عناں ہیں اور متعدد نئے شریکِ سفر ہو رہے ہیں مجھے ان سے جتنے فن کاروں کے کردار اور ان کی نگارشات کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا ہے اور یہ بات مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑتی ہے کہ میں اپنے ملک کے قلم کاروں کی اکثریت کے ہاں شخصیت اور فن کی ہم آہنگی کا ادراک نہیں کر سکا۔ اگر کسی فن کار کا فن بڑا ہے تو اس کی شخصیت چھوٹی ہے اور اگر کسی فن کار کی شخصیت قدآور ہے تو اس کے فن کا درجہ پست ہے۔ ہاں البتہ اس شاہراہِ حیات پر چند معزز ہمراہی ایسے ضرور میسر آئے جن کی شخصیت اور فن دونوں میں عظمت کا جوہر قدرِ مشترک کے طور پر رواں دواں پایا اور عبدالعزیز خالد صاحب ان چند معزز ہمراہیوں میں سے ایک ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں شخصیت کی عظمت سے میری مراد ان کے عہدے یا منصب کی بلندی نہیں بلکہ میں یہاں اوصافِ حمیدہ کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ اس وضاحت کو میں نے یہاں اس لئے ضروری تصور کیا ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں دنیوی وجاہت کو شخصیت کی عظمت کا پیمانہ قرار دے دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں اعلیٰ انسانی اقدار کو میزان بنانے کے اس صالح رویہ کو ترک کر دیا گیا ہے جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا اور جس کی بدولت ہمارے معاشرے کے ہر شعبہ میں عظیم شخصیات کا ظہور آج کل کی طرح ایک حادثہ نہ تھا بلکہ ایک معمول تھا۔

ہر چند کہ عبدالعزیز خالد صاحب محکمہ انکم ٹیکس کے ایک ممتاز عہدے پر فائز ہیں تاہم جب آپ انہیں ملیں گے تو آپ کو ان کے لباس ان کی چال ڈھال اور ان کے اندازِ تکلم کسی سے بھی اس امر کا اندازہ نہ ہو گا کہ وہ اس برادری سے متعلق ہیں، جس کے تقریباً سبھی رکن اپنے پرتکلف لباس، چال ڈھال اور تحکمانہ اندازِ تکلم کے باعث دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے برعکس خالد صاحب آپ

کر سادہ لباس میں درویشانہ چال ڈھال اور انکسار آفریں اندازِ تکلم سے آراستہ نظر آئیں گے اور اب اُن کی ظاہری صفات کے سبب ان سے قریب ہونے کی آرزو کو اپنے سینے میں بیدار ہوتا ہوا محسوس کریں گے اور اگر آپ کو واقعی اُن کے نزدیک آنے کا موقع مل جائے تو آپ ان کی باطنی خوبیوں کا شعور حاصل کر کے ان سے پیار کرنے لگیں گے بلکہ ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور آپ اس احترام کے سوتے اس محبت سے پھوٹتے ہوئے محسوس کریں گے جو عبدالعزیز خالد صاحب کو اپنے خالقِ حقیقی، اس کی مخلوق اور اس کے تمام پیغمبروں سے بالعموم اور رسولِ اکرم ﷺ سے بالخصوص ہے اور جس محبت کی تپش نے اُن کے دل و دماغ کو اس التہابی کیفیت سے ہمکنار کر دیا ہے جس کی آنچ ان سے ملنے اور انہیں پڑھنے والا شدت سے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو اس میں ہر آن پگھلتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پگھلاؤ کا یہی عمل اس ارتفاع کے نفوذ کا امین ہے جس نے عبدالعزیز خالد صاحب کی شخصیت اور فن کو وہ دلآویزی بخشی ہے جو اُن کی برسوں کی ذہنی ریاضت کا مسحور کُن حاصل ہے!

دراز قد، بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں، چوڑی پیشانی اور لانبی پتلی انگلیوں والے عبدالعزیز خالد علم و عرفان کی دولت کو بڑی مستعدی سے سمیٹنے اور اس سے بھی زیادہ مستعدی سے اسے لٹانے کے قائل ہیں اور ان کے کردار کے اس درخشاں پہلو میں ان کی تیز گفتاری کا راز مضمر ہے۔ بیشتر حضرات کے لہجے کی لکنت اس امر کی مظہر ہوتی ہے کہ وہ یا تو خود اعتمادی سے محروم ہیں یا اُن کے پاس کہنے کے لئے مناسب مواد موجود نہیں مگر دورانِ گفتگو عبدالعزیز خالد کی خفیف اور دل نواز سی لکنت آپ کو ہر وقت احساس کراتی ہے کہ ان کے پاس کہنے کے لئے اتنا کچھ ہے کہ زبان اس کے پُر اعتماد اظہار سے قدم قدم پر عاجز نظر آتی ہے۔ ان کی بسیار نویسی اور زود نگاری کا بھید بھی اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے وہ اگر ترسیلِ علم و عرفان کے اس قدر قائل نہ ہوتے اور دوسروں کو اپنے سرمایہ آگہی میں شریک کرنے کے لئے اس قدر مضطرب نہ ہوتے تو بھی اتنی چھوٹی عمر میں اتنا بڑا ذخیرہ شعر و سخن مہیا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔

عبدالعزیز خالد صاحب کی فعال شخصیت ہر گوہر ہی نہیں تنوع پسند بھی ہے اور ان کی یہ تنوع پسندی مواد اور ہیئت دونوں پر محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑی جرأت اور بے باکی سے زندگی کے بہت سے اہم اور نازک موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور ایسا کرتے ہوئے حسبِ ضرورت مختلف اصنافِ سخن مثلاً مختصر نظم، طویل نظم، منظوم ڈرامہ، غزل، رباعی وغیرہ کو نہایت کامیابی سے استعمال کرنے کی سعی کی ہے!

بہت سے ناقدین کو میں نے اکثر عبدالعزیز خالد صاحب کے سلسلہ میں اس امر کا شاکی پایا ہے کہ وہ مشکل اور غیر مانوس الفاظ و تراکیب کا وافر استعمال کرتے ہیں اور اُن کے ہاں فارسی عربی اور سنسکرت کے بڑے اجنبی پیکرِ اظہار کو بروئے کار لانے کی شعوری کاوش کا سراغ ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی یہ شکایت عبدالعزیز خالد کی اس نایاب خوبی پر پردہ ڈالنے کی ایک ارادی یا غیر ارادی کوشش کی حیثیت رکھتی ہے جسے ہم قادر الکلامی کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے کلام کا یہ پہلو سادہ اور سلیس زبان کے عادی قارئین و سامعین کے لئے بسا اوقات الجھن کا باعث ہوتا ہے مگر یہاں اولاً تو یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ ان الفاظ و تراکیب کا استعمال خالد صاحب کی کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے بلند اور پیچیدہ افکار کے ابلاغ کے ضمن میں ناگزیر ضرورت کی لاشعوری پیداوار ہوتا ہے اور ثانیاً ان کی شاعری کے اشکال پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر چند عظیم شاعری ایک عظیم سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہے اور ہم جائز طور پر سخنور سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ لب کشائی کے وقت سامعین کی سطح پر اتر آئے تاکہ اس کے کلام کی تفہیم کے راستے میں کوئی دشواری حائل نہ رہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بڑا شاعر اس مطالبہ کا احترام کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تاہم اس مطالبہ کو سو فی صدی قبول کر لینا اس کے لئے عملاً ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اس کی ایک حقیقی مجبوری اس کے لئے زنجیرِ پا کا کام دے رہی ہوتی ہے۔ اس کا علمی تبحر، اس کی ژرف نگاہی، اس کا احساس ہی اور اس کے وسیع تجربات اسے ایک ایسی ذہنی سطح بخش دیتے ہیں جو اس کے سامعین کی ذہنی سطح سے بہت ارفع و

بلند ہوتی ہے۔ ذہنی سطح کے اس اختلاف کو نتیجہ کے طور پر شاعر کو مبہم و مشکل سمجھ کر معتوب قرار دے دیا جاتا ہے۔ منصور نعرۂ انا الحق بلند کرنے کے جرم میں تختۂ دار کی زینت بنا دیا جاتا ہے اور یہ محسوس نہیں کیا جاتا کہ منصور کے نعرے کی معنویت کو سمجھنے کے لئے منصور کے عرفان کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اگر یہ عرفان عام نہیں تو اس کی ذمہ داری منصور پر عائد نہیں ہوتی!

یہ صورت حال اس وقت زیادہ افسوسناک ہو جاتی ہے جب ہم ٹی۔ ایس ایلیٹ کو تو اس کے جلۂ فکری اور لسانی اشکال کے باوجود انگریزی کا ایک عظیم شاعر تسلیم کرتے ہیں مگر عبد العزیز خالد کو اس جرم کی پاداش میں گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔

سوچنے کا محل ہے کہ کیا ہمارا یہ رویہ ہماری غلامانہ ذہنیت کا غماز تو نہیں ؟!

مرزا ظفر الحسن

غالب لائبریری اور عبدالعزیز خالد

— میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب میری یہ تقریر سن رہے تھے۔ گورے چٹے صحت مند قد آور سادہ لباس کم سخن اور افسر مزاج۔ نہ انہوں نے کوئی سوال کیا اور نہ ہی گفتگو پر اپنے کسی ردِ عمل کا اظہار۔ میں سمجھا ادب اور غالب سے لاتعلق ہیں اس لئے میں نے بھی ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اتنے میں گاہندری صاحب آئے اور کہا کھانا تیار ہے چلئے۔ ہم سب اُٹھے اور ہمارے ساتھ وہ صاحب بھی۔ بوفے تھا، سب کھڑے بلکہ چلتے پھرتے کھا رہے تھے چند منٹ بعد وہ صاحب میرے قریب آئے اور فرمایا میرا نام خالد ہے۔ میرے کچھ رسائل ہیں جو میں غالب لائبریری کو دینا چاہتا ہوں۔ آپ کل صبح میرے دفتر ٹیلی فون کر لیجئے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا انشاء اللہ کل ضرور زحمت دوں گا۔

مجھے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ یہ کون خالد ہیں۔ موصوف نے اپنا پورا نام بھی نہیں بتایا اور تعلقاتِ عامہ کے اصول کا تقاضا یہ نہ تھا کہ میں اُن سے پوچھوں کہ بھئی اپنا پورا اتا پتہ بتائیے کہ آپ کون خالد ہیں کس دفتر میں کیا کام کرتے ہیں اور آپ کا ٹیلی فون نمبر کیا ہے۔ پوچھتا تو ضرور اُن کی پاکوئی اور ہوتا تو اُس کی انا کو ٹھیس لگتی کہ لو پوچھتے ہیں یہ کہ غالب کون ہے؟ میں نے خالد صاحب کی نظر بچا کر اُسی وقت معلوم کر لیا کہ یہ حضرت عبدالعزیز خالد ہیں، شاعر کئی کتابوں کے مصنف اور انکم ٹیکس کے محکمے سے وابستہ۔ کتابیں حاصل کرنا ایک ہنر ہے۔ اُس وقت تک میں ہنرمند نہیں بنا تھا۔ بلکہ اس کا چسکا بھی نہیں پڑا تھا۔ کتابیں دینے یا نہ دینے والوں کی پہچان عام مردم شناسی سے مختلف ایک جوہر ہے، اور ابھی میں جوہری نہیں ہوا تھا، اس لئے کوئی رائے قائم نہ کر سکا کہ خالد صاحب کیا کب اور کس طرح دیں گے۔ اب تو ایک لیچڑ کی طرح پیچھے پڑ جاتا ہوں کہ کتابیں دیجئے۔ جلدی اور بہت سی دیجئے اس وقت بس یونہی سی ایک بات خالد صاحب نے کہی، میں نے سن لی اور گھر آگیا۔

دوسرے دن صبح نو بجے ٹیلی فون کیا تو موصوف نے کہا

"جی ہاں ایک گھنٹے بعد رسائل کی چھانٹی کرنے کے لئے میں گھر چلا جاؤں گا۔ آپ تین بجے لینے کسی آدمی کو بھیج کر رسالے منگوا لیجئے"!

اس جواب نے مجھے قدرے سنجیدہ بنا دیا کہ ہاں کچھ ملنے والا ہے، میں نے اپنے دفتر کے دو اصحاب عبدالجبار اور یعقوب عباس سے دو بجے کہا تم دونوں ذرا رک جاؤ تم سے ایک کام لینا ہے۔ جبار اور یعقوب عباس نے صد سالہ برسی کے زمانے میں اور اُس سے پہلے ادارہ یادگار غالب کا بہت اور ہر طرح کا کام کیا تھا اس لئے انہیں بھی اِس ادارے سے دلچسپی تھی۔ وہ رک گئے، میں گھر گیا کھانا کھا کر آدھے گھنٹے میں لوٹا اور جبار کو بھیجا کہ سوسائٹی میں خالد صاحب کا گھر دیکھ آئیں اور پوچھ لیں کہ رسائل یا کتابیں لینے کے لئے کب تک پہنچیں۔ جبار نے واپس آکر بتایا کہ فوراً کسی کو بھیج کر منگوانے کے لئے کہا ہے اور یہ بھی کہ بہت سے رسالے ہیں اس لئے شام ہونے سے پہلے منگوا لیں تاکہ شبنم یا بارش ہو جائے تو اس سے خراب نہ ہوں۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایک تو اس شخص نے جبار سے یہ نہیں پوچھا کہ ظفر صاحب کہاں ہیں اور خود کیوں نہیں آئے؟ دوسرے

یہ بات کہ بہت سے رسالے تو کوئی بات نہ ہوئی آخر کتنے بہت سے ہیں، سو پچاس بھی بہت سے کہلائیں گے اور ہزار دو ہزار بھی۔

موٹر نکلوائی جبار کو ساتھ لیا اور پہنچا سوسائٹی گھنٹی بجائی، اپنا نام بتایا، دو ایک منٹ میں جواب آیا خالد صاحب صحن میں ہیں آپ کو وہیں بلا رہے ہیں۔ دو ایک کمروں سے ہوتا ہوا پہنچا تو دیکھا خالد تہمد باندھے بنیان پہنے برابر والے کمرے سے مجلد رسائل صحن میں اس طرح پھینک رہے ہیں جس طرح کوئی کاٹ کباڑ باہر پھینکتا ہو اُن کا صحن رسائل سے پٹا پڑا تھا۔ وہ زمین کا صحن نہیں بلکہ رسائل کا فرش دکھائی دے رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ رسائل ہیں کہ رسائل ملنے کا کوئی خواب ہے کیا واقعی یہ سب غالب لائبریری کو ملنے والا ہے؟

خالد نے مجھے ڈرائنگ روم میں واپس کیا اور جلدی منہ ہاتھ دھو کر آئے اور چائے منگوائی وہ چائے پیتے ہوئے مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے اور مجھے جلدی تھی کہ فوراً دفتر بھاگ کر دو چار آدمیوں، ٹرک، موٹر یا گدھے گاڑیوں کا انتظام کروں تاکہ سینکڑوں ہزاروں رسائل فوراً اٹھوا سکوں۔

پہلے خفیف سا خدشہ یہ ہوا کہ خالد کی نیت نہ بدل جائے کیونکہ آج تک تو کسی نے اتنا بڑا خزینہ کسی کو اس طرح دیا نہیں تھا۔ پھر یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ پے در پے کئی کمروں کے رسائل اپنے صحن میں اہل خانہ کا اس طرح پھینک دینا تو آسان کام ہے مگر انہیں اٹھا کر دوبارہ اُن ہی کمروں میں رکھنا اتنا کٹھن کام ہے کہ خالد کی نیت اگر بدل بھی گئی اور دینے سے انکار بھی کر دیا تو وہ انہیں آج تو واپس کمروں میں نہیں رکھ سکیں گے۔ چونکہ صحن ہی سے گذر کر باورچی خانے اور غسل خانے وغیرہ جا سکتے ہیں اور ان رسائل نے سارے راستے بند کر دیئے ہیں اس لئے خالد چاہیں گے آج ہی کوئی اٹھائے جائے۔

مجھے جب اطمینان ہو گیا کہ یہ رسائل غالب لائبریری ہی کو ملیں گے تو جلدی جلدی چائے پی دوبارہ دفتر گیا، رسالے اٹھوا کر اپنے کمرے میں ڈلوائے، دوسرے دن صبح سویرے دفتر گیا انہیں کیمرے کے نقطۂ نگاہ سے سجایا، گیارہ بجے سجاوٹ ختم ہو گئی تو عبدالعزیز خالد اور پیر حسام الدین راشدی کو دفتر تشریف لانے کی زحمت دی تا کہ کچھ تصویریں بنوا سکوں۔ دونوں حضرات آئے کئی تصویریں لی گئیں جو میں نے ادارۂ یادگار غالب کے ایک پریس نوٹ کے ساتھ اشاعت کے لئے کراچی کے اخبارات کو بھجوا دیں۔ افسوس کہ سلور اسٹوڈیوز جس کے فوٹو گرافر نے تصویریں لی تھیں۔ چند ماہ پہلے نذرِ آتش ہو گیا اور ان تصویروں کے نگیٹو بھی ضائع ہو گئے۔ ورنہ رسائل کا انبار دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے تھے کہ ہمیں کتنا قیمتی تحفہ ملا۔

رسائل کے نام گنوانے ان کے شماروں کی تعداد بتانے یا رسائل کی قدامت پر کوئی سرسری اظہار خیال کرنے سے بہت زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عبدالعزیز خالد غالب لائبریری کے اوّلین معطی ہیں۔ آپ سے پہلے کسی نے کوئی کتاب یا رسالہ بطور عطیہ نہیں دیا تھا۔

دوسرے یہ کہ خالد ہی کے اس گرانقدر عطیہ کے بعد مجھے خیال ہوا کہ غالب لائبریری کے لئے رسائل بھی جمع کئے جائیں۔ آج جو غالب لائبریری کے شعبۂ رسائل میں گیارہ ہزار شمارے جمع ہیں اُس کی خشتِ اوّل عبدالعزیز خالد ہی نے رکھی، بلکہ میں انہیں اِس کتب خانے کے شعبہ رسائل کا معمارِ اوّل قرار دیتا ہوں۔

ادارۂ یادگار غالب کی تاریخ میں خالد کا نام زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ اس معمارِ اوّل اور اوّلین معطی کے تمام عطایا پر جو مہر لگائی گئی ہے وہ ناظرین کو ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ یہ عطیات اُس وقت ملے جب غالب لائبریری یا تو ایک خیالی منصوبہ تھا یا ایک خالی عمارت کا نام۔

انور

عبدالعزیز خالد

پیدائش جنوری ۱۹۲۷ء بمقام جالندھر

عبدالعزیز خالد کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد لاہور آگئے اور سنہ ۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ اقتصادیات جیسے خشک موضوع سے ہٹ کر انہوں نے اردو اور انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، بنگالی اور مغربی زبانوں کے اعلیٰ ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کی ادبی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ۵۲ء میں ان کی پہلی نظم "راہ و رسم منزلہا" ساقی کے سالنامہ میں چھپی۔ اسی سال ان کا پہلا منظوم ڈرامہ "حریر رنگ گل" کے عنوان سے "ماہ نو" میں شائع ہوا۔ ۹، ۱۰ سال کے مختصر سے عرصے میں انہوں نے غیر معمولی شہرت اور کامیابی حاصل کی، اس کا سب سے بڑا سبب ان کے منظوم ڈرامے ہیں۔ وہ تنہا شاعر ہیں جنہوں نے اردو شعر میں نہایت سلیقے سے ڈرامہ سمویا۔ ان کی ڈرامائی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف کلاسیکی ادب کے تراجم پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ بیشتر ان موضوعات پر اپنی تخلیقات کی بنیادیں استوار کی ہیں۔

عالمی ادب کا انہوں نے بے پناہ مطالعہ کیا ہے — اس مطالعہ کے دوران جن چیزوں سے وہ متاثر ہوئے ہیں انہیں شعری قالب میں بڑی حسن و خوبی سے ڈھال دیا ہے۔ اس کی زندہ مثال ان کی تصنیف "سلومے" ہے جو اصل سے ہٹ کر ایک بلند پایہ تخلیقی کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ عبدالعزیز خالد مشکل پسند شاعر ہیں۔ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر ایک مخصوص و منفرد رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے ان کے الفاظ کا انتخاب موضوع کی گہرائی اور گیرائی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ان کا ادبی نقطہ نظر بڑا صحت مندانہ ہے۔ وہ انسان کو رجائیت اور عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان کی عظمت اور شکوہ کا عکس ہے۔ یہ حقیقت ان کو اپنے کرداروں کے لئے پر شکوہ الفاظ تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ زندگی کو ایک ڈرامے کی شکل میں دیکھتے ہیں اور دنیا کو ایک اسٹیج — اسی لئے منظوم ڈرامہ ان کی محبوب صنف ہے۔ یوں ان کی شاعری میں کافی تنوع ہے۔ ڈرامے کی طرح وہ نظمیں اور غزلیں بھی مخصوص انداز میں لکھتے ہیں۔

ایک ایسی جانی پہچانی شخصیت سے جو ادبی معاملات میں رائے دیتے ہوئے قطعاً رعایت نہیں کرتی، شعرِ خالد کی تعریف سُن کر میں چونکا:

"خالد صاحب کی خدمت میں سلام شوق عرض کریں اور کہیں کلام بالاستیعاب پڑھنے کے لیے وقت نہ ملا۔ جزوِ "جزوِ" چند صفحات دیکھے۔ آرزو ہے کہ زیارت نصیب ہو، مجتہدینِ فکر و نظر کی زیارت بھی کمی فکری و نظری گناہوں کو دھو ڈالنے کا باعث ہوتی ہے۔ نیز آرزو ہے کہ اللہ تعالےٰ تھوڑی فرصت دے تو تمام تصانیف بالاستیعاب پڑھوں۔" (ایک خط ۷ر فروری ۱۹۶۹ء)

مولانا مہر کو جو لوگ قریب سے نہیں جانتے، وہ مندرجہ بالا عبارت کی معنویت اور اہمیت کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں چھ سات سال (۱۹۵۸ - ۶۴ء) شب و روز مولانا کی خدمت میں رہا ہوں۔ انہیں مطالعہ کرتے، لکھتے، گم صُم بیٹھے، آم توڑتے، قصائی کی دوکان سے گوشت خریدتے، صبح کے وقت سیر کرتے، بٹیر ذبح کرتے اور پارچہ بناتے، سرگرمِ سخن، صدارت کرتے، تقریر کرتے، یہاں تک کہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے بھی دیکھا ہے۔ مولانا آزاد کی علالت کی خبر سُن کر ہی وہ بے انتہا آزردہ ہو گئے تھے اور جب اُن کے وصال کی خبر ملی تو ضبط کا یارا نہ رہا، اُن کی حالت اتنی غیر ہو گئی تھی کہ مجھے اُن کی جانب سے اندیشہ سا رہنے لگا تھا۔

مولانا کو میں نے قریب سے دیکھا ہے اور ہر رنگ میں دیکھا ہے، وہ سراپا شفقت تھے، نہایت فیاض، لیکن شعر کی تعریف کم ہی کرتے تھے، وہ رائے دینے میں محتاط، بے انتہا بخیل بلکہ روکھا اور بے مروّت کہا جائے تو یہ الفاظ بھی ہلکے ہوں گے۔ اور میرے چونکنے کی یہی وجہ تھی۔

پھر ایک ایسا دن آیا کہ خالد صاحب سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی اور ہم دونوں مولانا مہر کی خدمت میں پہنچے:

اتوار کی نرم دوپہر تھی، مولانا حسبِ معمول اپنے مطالعے کے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کی میز پر اردو، فارسی، عربی، انگریزی لغات اور دوسری کتابیں یوں سجی ہوئی تھیں کہ کسی نئے آنے والے کی نظر اُن پر پڑ ہی نہیں سکتی تھی۔

میں چق اٹھا کر اندر گیا، مولانا کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُن کے چہرے پر مسرت پیدا ہوئی اور انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"ارے قادری صاحب! آپ کہاں تھے؟ کب آئے!"

"پرسوں" میں نے کہا "اور یہ دیکھیے میں کسے لیے ہوئے آیا ہوں" میں نے چق اٹھا دی۔ مولانا نے دروازے کی طرف دیکھا اور محوِ حیرت رہے، خالد صاحب اندر آئے تو مولانا نے اُن سے مصافحہ کیا اور میں نے یوں تعارف کرایا "یہی ہیں عبدالعزیز خالد جن کے اشعار آپ کو بہت پسند ہیں۔"

"بیٹھئے" مولانا نے فرمایا "آپ نے بہت کرم کیا جو انہیں لیتے آئے، یہ مجتہدِ فکر و نظر ہیں۔ امام وقت ہیں، انہوں نے اردو ادب میں نئی جہت اور نئے امکانات پیدا کئے ہیں۔"

خالد صاحب نیچی نظریں کئے بیٹھے تھے، میں نے موضوع تبدیل کرنے کے لئے کہا "واقعی!"

"قادری صاحب" مولانا مہر نے فرمایا "شعر کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے، لوگوں کو یہ احساس ہی نہیں کہ شعر میں جذبے کی صداقت کو اوّلیت حاصل ہے، خالد صاحب کے کلام میں جذبے کی شدت کے ساتھ ساتھ تفکر کی رفعت بھی موجود ہے، اور اس خوبی نے میرے دل کو ان کی جانب کھینچا ہے۔ یہ شاعری کیا کرتے ہیں، علم و فکر کو جذبے میں ڈھالتے ہیں۔"

"آپ نے ان کی تمام تصانیف پڑھ ڈالیں ہیں کیا؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔

"ہاں" مولانا مہر نے کہا "اب فارقلیط اور سختنا ہی کو لیجئے، ایک ایک شعر عشقِ رسول ﷺ کا مظہر ہے۔ یہ صرف نجات ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے بھی بلند پایہ تخلیق ہے، ایسی عمدہ اور روح پرور مطول نعتیں تو فارسی و عربی میں بھی موجود نہیں۔ پھر زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ان کا کلام کشش رکھتا ہے، وہ اپنے چمنستانِ شعری کی روش بندی میں سب سے علیحدہ اور منفرد و یکتا نظر آتے ہیں۔"

"مولانا! بہت سے لوگ بلکہ بلند پایہ نقاد بھی خالد صاحب کی زبان پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ انہیں مشکل پسند کہتے ہیں۔ لغت نگاری کی پھبتی کستے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا!" مولانا مہر نے بڑی حیرت سے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے "ابھی لوگ ان کے مقام کو نہیں سمجھتے۔ غالب رحمتہ اللہ علیہ پر بھی یونہی لوگ آوازہ کستے تھے، لیکن اس سے بددل نہیں ہونا چاہیئے، کلام پاک کی آیات کو جس خوبی سے خالد صاحب نے سمویا ہے اور تضمین کی ہے، اس کا جواب نہیں، میں تو اس سے محظوظ ہوا۔ پھر ان کے کلام میں اس دور کے شعرا کا نہ ڈھیلا پن ہے اور نہ ابہام و ایہام، وہ نہایت خوبصورتی سے مفاہیم کا ابلاغ کرتے ہیں۔ البتہ ہندی اور سنسکرت کے بوجھل الفاظ سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے، اب یہ زبان سمجھنے والے نہیں رہے، اس کے علاوہ تو میں کوئی ایسی بات ان کے کلام میں نہیں پاتا۔"

خالد صاحب نے موضوعِ سخن بدلنے کی کوشش کی لیکن مولانا مہر ہم لوگوں کی موجودگی سے بے نیاز کلامِ خالد کے حسنِ بیان میں ڈوبے رہے۔ انہوں نے کہا "میں ستائش نہیں کرتا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اقبالؒ کے بعد کہیں میری نظر ٹھہری ہے تو یہ ان کا کلام ہے، قوتِ بیان بھی ہے اور ایک ایسی صداقت بھی جو بڑے فنکار ہی میں ہوتی ہے۔ "غبارِ خاطر" کے عنوان سے جو نظمیں کہی ہیں وہ نہایت اثر انگیز ہیں۔ انہیں میں نے بار بار پڑھا ہے اور ہر مرتبہ ایک نئی لذت پائی ہے۔"

اور پھر مولانا خاموش ہو گئے، شاید "غبارِ خاطر" نے ذہنی رُو کو مولانا ابوالکلام آزاد کی جانب پھیر دیا تھا۔ انہوں نے بے قرار ہو کر پوچھا "میں نے پانی کے لئے تو پوچھا ہی نہیں، آپ کچھ پئیں گے؟"

خالد صاحب نے نفی میں جواب دیا اور پھر مولانا نے خالد صاحب سے لاہور میں آمد کی وجہ دریافت فرمائی، اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ تبدیل ہو کر آئے ہیں تو مولانا نے کہا کہ پھر تو ملاقات ہوتی رہے گی۔ پھر میری جانب متوجہ ہوئے "کب تک ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ آپ پھر آیئے۔" میں نے مولانا مہر کو مختصر جواب دیا، کیونکہ میں ان کی آراء سے خوب واقف تھا، اب وہ تھک گئے تھے تخلیہ کے خواہاں تھے، ہم مولانا سے رخصت ہوئے لیکن ان کی آواز ذہن میں گونجتی رہی۔ "خالد مجتہد فکر و نظر ہے۔" اور مجتہدینِ فکر و نظر کی زیارت بھی کئی فکری و نظری گناہوں کو دھو ڈالنے کا باعث ہوتی ہے۔"

ارشاد احمد حقانی

عبدالعزیز خالد کی ایک خاص عادت

فارسی کا مشہور مقولہ ہے "کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی" میری دانست میں جناب عبدالعزیز خالد کے کردار کی جو خصوصیات ان کی کامیابی کی ضامن اور سبھی معاون بنیں ان میں سے ایک ان کی یہ مسلسل کوشش اور مستقل خواہش ہے کہ اپنی سرگرمی اور دلچسپی کے ہر میدان میں کمال کے حصول کو مطمع نظر بنایا جائے ان کی پوری زندگی کسب کمال کی جدوجہد کی ایک مسلسل داستان ہے اور وہ اس مقصد کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی کے دوران اور اس کے فوراً بعد جس قسم کی ریاضت کو سالہا سال تک اپنا معمول بنائے رکھا اس کا کچھ ذکر میں اپنے سابقہ مضمون میں کر چکا ہوں۔ ایک طویل عرصہ تک وہ دنیا کی تمام دلچسپیوں سے کٹ کر مطالعہ اور مجاہدہ میں منہمک رہے ہیں لیکن ان کے اندر ہمیشہ یہ مخلصانہ احساس شدت کے ساتھ موجود رہا ہے کہ اپنی زندگی میں وہ کچھ نہیں کر سکے اپنے تہی دست و تہی دامن ہونے کا ذکر ان کا ایک مستقل موضوع ہے۔ فی الحقیقت یہ کیفیت ان کے کردار کی اس نمایاں ترین خصوصیت کا مظہر ہے کہ کمال (Perfection) کے حصول کے لئے جہد مسلسل ایک مقدس فریضہ ہے۔

حصولِ کمال کی خواہش صرف ان کی علمی و شعری سرگرمیوں تک محدود نہیں تمام شعبہ ہائے زندگی میں یہ ان کا شعوری نصب العین ہے حتیٰ کہ جسمانی صحت و تندرستی کے معاملہ میں بھی وہ اعلیٰ ترین معیار کے حصول سے کم تر پر مطمئن نہیں ہوتے اور اس کی خاطر ہر طرح کا انضباط اور ایثار خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ اگر خالد کو مطمئن اور قائل کر دیں تو صحت کی حفاظت اور برقراری کے لئے کوئی خاص عادت یا کوئی مخصوص غذا مفید یا مضر ہے تو وہ کسی قسم کی ہچکچاہٹ اور پس و پیش کے بغیر اپنے طرزِ عمل کو اس صورت حال کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنا لیں گے کوئی خاص غذا ترک کرنی ہو یا کسی چیز کا استعمال اختیار کرنا ہو تو وہ کسی قسم کی کمزوری یا قوت ارادی کے ضعف کا اظہار کئے بغیر اپنے معمولات فوراً تبدیل کر لیں گے اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل ان کے ایک دوست نے عوامی جمہوریہ چین سے واپسی پر ان سے ذکر کیا کہ اس ملک میں کوئی شخص کچا پانی استعمال نہیں کرتا بلکہ ہر آدمی ابلا ہوا پانی پیتا ہے۔ خالد نے اس عادت کی حکمت اور مصلحت پر گفتگو کرنے کے بعد جب یہ محسوس کر لیا کہ یہ ایک اچھا طریقہ ہے تو اسی دن سے ابلا ہوا پانی استعمال کرنا شروع کر دیا حالانکہ اتفاق سے ان دنوں موسم گرما پورے عروج پر تھا اور گرم پانی پینے پر طبیعت آسانی سے آمادہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن خالد کے اندر کسب کمال کی جو خواہش شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے اس کے سامنے اس کی طبیعت کی مزاحمت کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور وہ بڑی آسانی سے ایک طویل عرصہ تک ابلا ہوا پانی استعمال کرتا رہا۔

جسمانی صحت کے لئے ورزش، سیر، غسل وغیرہ کی افادیت سے آگاہ ہونے کے باوجود ہمارے اکثر ادیب، شاعر، سرکاری ملازم اور فی الجملہ عام تعلیم یافتہ حضرات ان چیزوں کا کوئی اہتمام نہیں کرتے لیکن خالد سال کے تمام موسموں میں صبح کاذب کے وقت اٹھنے کا عادی ہے اور ورزش اور غسل کا اہتمام پوری باقاعدگی سے کرتا ہے۔ بعض اوقات موسم سرما کے عروج کے دنوں میں جب صبح کے وقت وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا اور صرف ایک پاجامہ پہن کر ورزش کرتا ہے تو اسے دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے اور بعض کمزور دل اصحاب یہ پیشین گوئی کرنے سے بھی باز نہیں رہتے کہ اس شخص کو دنیا کی کوئی طاقت نمونیہ سے نہیں بچا سکتی لیکن وہ نہ صرف ان پیشین گوئیوں کو ہنس کر ٹال دیتا ہے بلکہ اپنی عادت پر پوری مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہتا ہے اور گرم

بستر کو ایک لمحہ کی ہچکچاہٹ کے بغیر چھوڑ کر اپنا معمول شروع کر دیتا ہے۔

خالد اس قدر آسانی کے ساتھ یہ انتہائی صبر آزما معمول کس طرح جاری رکھتا ہے بعض لوگوں کو اس پر حیرانی ہوتی ہے لیکن میرے لئے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ اس کی وجہ اس کے کردار اور شخصیت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں کمال کے حصول کے لئے ہر طرح کے ضبطِ نفس کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور کمال کے اعلیٰ مدارج سے کمتر پر وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔

جسمانی صحت کے میدان میں اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے حصول کی کوشش کا ایک اور واقعہ سنیئے۔ مطالعہ کے دوران خالد نے یہ رائے قائم کی کہ یوگا ورزش کا طریقہ جسمانی اور دماغی صحت اور توانائی کے لئے مفید ہے یہ رائے قائم ہونے کے بعد اس نے اس موضوع پر دستیاب کتابیں خرید کر پڑھ ڈالیں نہ صرف پڑھ ڈالیں بلکہ ان میں بیان کردہ ورزشوں کو اپنا معمول بنا لیا۔ اس معمول کو باقاعدگی سے نبھایا اور اس بات کی مطلقاً پرواہ نہیں کی کہ کوئی اسے خبط کہتا یا سمجھتا ہے۔ سفر ہو یا حضر، خالد سر کے بل کھڑے ہونے کی ورزش کرے گا اور کسی کی موافق یا مخالف رائے کو کوئی اہمیت نہیں دے گا اس لئے کہ قائل ہو چکا ہے کہ یہ ایک اچھی ورزش ہے اور دماغی صحت کے لئے مفید ہے۔

یہ امر سامعین کے لئے باعث دلچسپی ہوگا کہ جب میں نے خالد کی لائبریری میں یوگا پر کچھ لٹریچر دیکھا تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس موضوع پر آپ کے پاس کتنی کتابیں ہیں کہنے لگے "اکیس" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا اس سے کم یا زیادہ کیوں نہیں۔ کہنے لگے جب مجھے اس موضوع سے دلچسپی پیدا ہوئی تو میں کراچی میں تھا اور وہاں اس وقت اس موضوع پر اکیس ہی کتابیں دستیاب تھیں۔ جو سب کی سب میں نے خرید لیں اور بھی کوئی کتاب موجود ہوتی تو میں وہ بھی خرید لیتا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ خالد کسی بھی معاملہ میں نیم دلانہ اور نامکمل دلچسپی یا کوشش کا قائل نہیں۔

غذا، پھل اور دوا کے بارے میں خالد کا رویہ یہ ہے کہ جو چیز ضروری اور مفید ہے اس کا اہتمام بہرحال کیا جانا چاہیئے اور طبیعت کی مزاحمت کو کوئی وزن نہیں دینا چاہیئے۔ آپ خالد سے کہہ دیں کہ فلاں پھل کا استعمال فلاں شکل میں اور فلاں وقت مفید ہے تو خواہ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کی لذت میں کمی ہو جائے، خالد اس کو اسی طرح استعمال کرے گا جس طرح زیادہ مفید ہو۔ گویا افادیت کو لذت پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہے گی۔

اس تفصیل سے جہاں خالد کی حصول کمال کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس کی منقیانہ طبیعت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ وہ خواہشات کی غلامی کی کمزوری سے حیرت انگیز حد تک پاک ہے اور اس کا فکر و عمل اس کی عقل اور اس کے نظریات کا تابع ہے۔ اس درجہ کا ضبطِ نفس اور انضباطِ عادات آسان بات نہیں لیکن جب اعلیٰ مقاصد پیش نظر ہوں اور انسان ہر حال میں بلندیوں تک پہنچنے کا جذبہ رکھتا ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

جسمانی صحت و تندرستی کے میدان میں کمال کے حصول کی خواہش جہاں ایک طرف خالد کی اس مزاجی کیفیت کی مظہر ہے کہ وہ کسی بھی معاملہ میں اعلیٰ ترین اور عمدہ ترین سے کمتر پر مطمئن نہیں ہوتا وہاں اس کی ایک وجہ جو اس کے تحت الشعور میں کام کر رہی ہے کہ وہ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہے وہ قدرت سے کم از کم اس قدر مہلت کا طالب ہے جو اسے شعر و فن کی دنیا میں ایسے لازوال کارناموں کی تکمیل کا موقعہ دے دے جو اسے واقعی خالد فن غیر فانی اور تاج بقائے دوام کا مستحق بنا دیں۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ ہر جذبے اور جسمانی عیش و آرام کی ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہے اسی وجہ سے اس نے اپنی روزمرہ زندگی کو اصولوں کا پابند بنایا ہے اور اپنی جسمانی صحت و تندرستی کی حفاظت بھی پوری سختی سے کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں بڑے کام کرنے والوں کو اس نوع کی قربانی پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور اپنی تمام مصروفیات اور پسند ناپسند کو اپنے مقصد کے تابع بنانا پڑتا ہے۔

علمی و ادبی میدان میں حصول کمال کی خواہش خالد کے اندر اور نمایاں اور قوی ہے۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ اپنے مخصوص میدان میں وہ غیر معمولی محنت کرتا ہے میرا خیال ہے کہ اردو زبان کا کوئی قابل ذکر شعر جو قیام پاکستان سے پہلے چھپا ہے یا اب پاکستان میں دستیاب ہے خالد کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ اردو کی تمام قدیم و جدید شاعری پر اس کی نظر ہے کسی بھی نئی چیز کے آنے پر اس کو پڑھنے اور حاصل کرنے کے لئے خالد اس طرح بے قرار ہوتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ دنیا بھر کے ادب کے ادب عالیہ تک اس کو ماہرانہ رسائی حاصل ہے اور ہر قابل ذکر چیز اس کی نظروں کے سامنے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے

میدان کی ہر جزیئے سے واقف ہوئے بغیر وہ حصولِ کمال کی کوشش کما حقہٗ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دوران مطالعہ یا دوران گفت گو خالد کو اگر کوئی علمی ودینی یا ادبی ولسانی مسئلہ یا اشکال پیش آ جائے تو وہ فوراً اس کو حل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے اور جب تک ذہن مطمئن نہ ہو جائے وہ آرام سے نہیں بیٹھتا۔ اس بے چینی کا ایک دلچسپ اظہار ایک دفعہ اس طرح ہوا کہ خالد ایک لفظ کی تحقیق میں معروف تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سر کے مخصوص لباس (وسما) کے لئے عربی لفظ کیا ہے۔ عمامہ اور بعض دوسرے الفاظ اس کے سامنے تھے لیکن وہ ان پر مطمئن نہ تھا اور کسی موزوں تر لفظ کی تلاش میں تھا۔ اس نے چند منٹ کے اندر لاہور کے تمام ممکن ذرائع سے رابطہ پیدا کیا لیکن جب اس کے باوجود اس کا اطمینان نہ ہوا تو اس نے فوراً فون پر کراچی سے رابطہ پیدا کیا اور ایک صاحب علم سے بات کر کے جب تک اپنی تسلی نہیں کر لی، اپنی جستجو جاری رکھی۔

اپنے مسودات کو بہتر سے بہتر بنانے کا کام تو ہر مصنف کی طرح وہ ان کے پریس جانے تک جاری ہی رکھتے ہیں لیکن جونہی ان کی کوئی کتاب پریس سے آتی ہے وہ اس پر نظرِ ثانی کا کام شروع کر دیتے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش ایک لامتناہی عمل کی طرح جاری رہتی ہے وہ اکثر کہتے ہیں کہ میرا اصل مسودہ طباعت کے بعد سامنے آتا ہے۔ یوں تو ان کی لائبریری ہر لحاظ سے گراں مایہ اور شاندار ہے لیکن لغات سے ان کی دلچسپی والہانہ شیفتگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور وہ ہر لفظ کی تحقیق کا حق اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس کے بعد مزید جستجو کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

خالد کے نزدیک حصولِ کمال کی کوشش ایک ادیب کا مقدس فریضہ ہے اور وہ اس میں کمال لذت محسوس کرتے ہیں۔

وہ اکثر کہتے ہیں کہ فن کار کے لئے لگن اور یکسوئی شرطِ لازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بغیر کوئی فن کار کبھی اوجِ کمال پر نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ احساس بھی شدت سے ہے کہ جونہی کسی کو اپنے کامل ہونے کا زعم ہو جاتا ہے، اس کا ارتقاء فوراً رک جاتا ہے۔

خالد کے نزدیک حصولِ کمال کی جدوجہد ایک جہادِ مسلسل ہے اور وہ کامل شرح صدر کے ساتھ اس جہاد کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

ارشاد احمد حقانی

عبدالعزیز خالد ـــــ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے

ایک شاعر، ایک ادیب اور ایک انسان کی حیثیت سے جناب عبدالعزیز خالد کے مقام اور مرتبہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا
گیا ہے اور اہل فکر و نظر آئندہ بھی ان سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے۔ خود راقم نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بعض پہلوؤں پر دو تین
مواقع پر اپنے مشاہدات بیان کئے ہیں۔ لیکن آج کی صحبت میں میں ان کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس سے ان کے ادیب دوستوں
اور ان کی شاعری کے مداحین کی بہت بڑی تعداد کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتی، میری مراد ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے جناب عبدالعزیز خالد کے انداز کار اور
معیارِ کارکردگی سے ہے۔ مجھے انہیں گزشتہ بائیس تیئس سال کے دوران ایک انکم ٹیکس آفیسر سے کمشنر انکم ٹیکس تک کے مناصب پر کام کرتے دیکھنے کا موقع
ملا ہے۔ میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ خالد ایک انتہائی دیانت دار اور فرض شناس، نہایت لائق، ہمدرد، خدا ترس اور عوام دوست افسر ہے۔ وہ نڈر
اور جری ہے۔ اور اس کا رجحان ہمیشہ کمزور بے وسیلہ افراد کی حمایت کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسی پالیسیوں کا دل سے مخالف رہا ہے جن کا مقصد
ارتکاز زر ہو اور جو وسیع تر معاشرتی انصاف کے نصب العین کے منافی ہوں، اسی طرح اپنے ماتحتوں، بالائی افسروں اور پبلک کے ساتھ اس کا معاملہ
(Dealing) افسر شاہی کی عام روش سے یکسر مختلف ہے وہ اپنے ماتحت کو ان معنوں میں ماتحت نہیں سمجھتا، جن میں بالعموم بڑے افسر سمجھتے ہیں۔
وہ اپنے قریبی احباب کے سامنے بھی اکثر اپنی اس رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اور اپنے ماتحتوں کے سامنے بھی برملا کہتا ہے، کہ سرکاری عہدہ و منصب بذاتِ خود
کسی آدمی کے لائق احترام ہونے کیلئے کافی نہیں، اصل چیز انسان کی دیانت اور اس کا کردار ہے، عہدوں کا فرق تقسیم کار سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا،
ایک چھوٹا افسر دیانت دار اور فرض شناس ہے تو وہ اس بہت بڑے افسر سے زیادہ لائق احترام ہے، جو بڑی کرسی پر براجمان ہونے کے باوجود دیانت و اہلیت
کی صفات سے بہرہ ور نہیں ہے۔

اس خیال کا اظہار تو بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ لیکن خالد نہ صرف دل کی گہرائی سے اس کی صداقت کا قائل ہے بلکہ اس کا مبلغ بھی ہے۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے حال ہی میں ان کے بعض ماتحتوں نے ایک معاشرتی ڈرامہ سٹیج کیا۔ خالد نے ڈرامہ کے کرداروں کو اپنے دفتر میں طلب کیا
اور دل کھول کر ان کی حوصلہ افزائی کرنے اور پانچوں میں زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور آگے بڑھنے کی تلقین کرنے کے علاوہ بڑی وضاحت سے انہیں
سمجھایا کہ انسان کی عزت، عظمت اور مقام و مرتبہ کا انحصار اس کی اخلاقی حالت اور اس کے کردار اور کارکردگی پر ہے، نہ کہ عہدہ و منصب پر، خالد نے
ان سے کہا: "میں کمشنر کی کرسی پر بیٹھا ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض اس کرسی پر بیٹھنے سے میں آپ لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ معزز ہو گیا
ہوں۔ ہم سب کارکن ہیں اور ہم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو بہتر اخلاق اور بہتر کردار کا مالک ہے۔ اور جو کسی بھی میدان میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔"
میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے کہ کمشنر ہوتے ہوئے وہ اپنے دفتر کے درجہ چہارم کے ملازمین تک کو بعض اوقات کرسی پر بیٹھ کر بات کرنے اور کھانے
کے لئے کہہ دیتا ہے۔ یہ چیز ان ملازمین کے لئے باعث حیرت ہوتی ہے جب کہ دوسرے افسر صاحبان کی اکثریت در پردہ اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، انہیں
اپنے افسر اعلیٰ (BOSS) کا یہ عوامی انداز ایک آنکھ نہیں بھاتا لیکن خالد اس متکبرانہ ردعمل کی مطلق پروا نہیں کرتا اور اپنے سوچے سمجھے راستے پر گامزن رہتا ہے۔

اپنے ماتحتوں کی مجبوریوں اور ضرورتوں کا خالد اکثر خیال رکھتا ہے۔ اور حتی الامکان ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان کی طرف سے نااہلی، بددیانتی، کام چوری اور فرض ناشناسی کے مظاہرے کو سخت ناپسند کرتا ہے اور اگر اسے اطمینان نہ ہو جائے کہ غفلت کی وجہ کوئی حقیقی مجبوری تھی تو وہ اس کا نوٹس بہرحال لیتا ہے۔ افسر شاہی نظام کا ایک پرزہ ہونے کے باوجود خالد اس کی خامیوں اور برائیوں کا شدید احساس رکھتا ہے۔ اور جب کسی افسر کو پبلک کے ساتھ بے رحمی، بے رخی اور رعونت کا مظاہرہ کرتے دیکھتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے۔ ایک دفعہ اپنے ماتحت کی طرف سے ایک ایسے ہی مظاہرے کے بعد اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ارشاد! لوگ نوکر شاہی کے خلاف جو شکایت کرتے ہیں وہ بالکل درست ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ بڑے ظالم اور سنگدل ہیں۔ انہیں عوام کی مشکلات کا کچھ احساس نہیں۔"

پھر خود ہی تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد کہا۔ "اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے افسروں کی غالب اکثریت کی کل کائنات ان کی ملازمت اور ان کا رعب و دبدبہ ہے۔ ان کی شخصیت اور انا کی تسکین (Fulfilment) کا کوئی دوسرا میدان نہیں، اس لیے یہاں وہ اپنے اختیارات کا ضرورت سے زیادہ اظہار (Over assertion) کر کے اپنی انا کی تسکین کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کسی دوسرے میدان میں بھی کوئی کارکردگی یعنی (Accomplishment) دکھا سکتے ہوں، تو ان کی بے رحمی اور مردم بیزاری میں کچھ نہ کچھ کمی آ جائے اور وہ لوگوں کے ساتھ ایسا سنگدلانہ رویہ اختیار نہ کریں۔"

خالد کی یہ تشخیص بہت حد تک درست ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ خود ایک مشفق و خلیق افسر ہے کیونکہ اس کی شخصیت کی (Fulfilment) کا ایک دوسرا وسیع میدان موجود ہے اور قدرت اس میدان میں اس پر خاصی مہربان ہے۔

خالد جب کسی دفتر میں نیا نیا تبدیل ہو کر جاتا ہے تو ابتدائی دو چار روز کے دوران اس کے ماتحتوں اور ساتھیوں کے لئے اس کا انداز کار نیز معاملات اور انسانوں کے بارے میں اس کا نقطۂ نگاہ (Approach) خاصا نیا، حیران کن بلکہ ناقابل فہم ہوتا ہے لیکن جلد ہی وہ تمام لوگ جو انسانیت اور شرافت کے طلب گار اور قدردان ہوتے ہیں۔ اس کے گرویدہ اور مداح ہو جاتے ہیں۔ البتہ اکڑی ہوئی گردنوں والے کبھی اس سے خوش نہیں ہوتے۔

اپنے اعلیٰ افسروں کے ساتھ خالد کا رویہ ہمیشہ خودداری اور باوقار ہوتا ہے۔ وہ نہ تو غیر ضروری عجز کا مظاہرہ کرتا ہے اور نہ خوش اخلاقی (Courtesy) کے تقاضوں کو نظر انداز کرتا ہے، میرا اندازہ ہے کہ انتہائی قسم کے اعلیٰ افسر دل میں اس سے کبھی خوش نہیں ہوتے ہوں گے۔ اگرچہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ اپنے بعض اعلیٰ افسروں کے ساتھ اس کے تعلقات انتہائی خوشگوار اور دوستانہ ہیں۔

پبلک کے ساتھ معاملہ کرتے وقت خالد ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتا ہے۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ مددگار (Helpful) ثابت ہو سکے۔ اور اس تک رسائی بالکل آسان ہو، یہی وجہ ہے کہ اس کی اپنی دفتر کو ہدایت ہوتی ہے۔ کہ جو شخص بھی مجھ سے ملنے کی خواہش کرے اسے اندر آنے دیا جائے، نیز اُسے غیر ضروری انتظار کی زحمت کبھی نہ دی جائے۔ اُسے جونہی کسی ملاقاتی کی چٹ دی جاتی ہے وہ فوراً اسے بلا لیتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی اہم تر کام میں مصروف نہ ہو، وہ اکثر کہتا ہے کہ آپ اگر کسی آنے والے کا کام نہیں کر سکتے تو کم از کم اُسے یہ اطمینان تو دلا سکتے ہیں۔ کہ اس کی بات ہمدردی سے سنی گئی ہے اور ساتھ ہی اسے سمجھا سکتے ہیں کہ اس کا کام کیوں نہیں ہو سکتا۔ کمشنر انکم ٹیکس لاہور کا عہدہ ایسا ہے کہ کام کی زیادتی سر کھجانے کی فرصت نہیں دیتی، لیکن اپنے فرائض کی حسن و خوبی، بجا آوری کے ساتھ ساتھ خالد ملاقات کے لئے آنے والوں کو پوری طرح مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگرچہ اسے اکثر اوقات غیر متعلق اور بعض اوقات بے معنی باتیں سننی پڑتی ہیں لیکن وہ بڑے صبر سے یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ اور پیشانی پر بل نہیں ڈالتا۔ بعض اوقات اس کے پاس بیٹھے ہوئے نسبتاً چھوٹے افسر بے صبری یا بدمزگی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ تحمل کا ثبوت دیتا ہے، اور ملاقاتی کو مطمئن کر کے واپس کرتا ہے۔

ایک افسر کی حیثیت سے خالد کی کارکردگی نہایت اطمینان بخش ہے وہ کام کو بڑی تیزی اور بڑی مہارت سے نمٹاتا ہے۔ دفتری زبان میں اس کا Disposal بہت شاندار ہے، جب کوئی تصفیہ طلب معاملہ اس کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ تو وہ فوراً اس کے اس محور یا نکتے پر پہنچ جاتا ہے جو فیصلہ کن ہوتا ہے، یہ بات اس کے ذہن رسا کا زندہ ثبوت ہے کہ جونہی کوئی فائل اس کے سامنے آتی ہے۔ وہ فوراً ایسا سوال کرتا ہے جس پر سارے معاملے کے تصفیہ کا دار و مدار ہوتا ہے۔ کسی کا جو ماتحت پوری تیاری کے بغیر اس کے سامنے آتا ہے وہ فوراً پکڑا جاتا ہے، کیونکہ خالد بات کرنے سے پہلے سارے معاملے پر حاوی ہو چکا ہوتا ہے۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کوئی ماتحت افسر یا وکیل گفتگو کا آغاز غیر ضروری باتوں سے کرتا اور غیر متعلق سوالوں اور بحثوں میں الجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن خالد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے اس سوال پر لے آتا ہے جو زیر غور مسئلہ میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ خالد اکثر شکایت کرتا ہے کہ وکیل صاحبان یا دفتر کے عملہ کے لوگ پوری تیاری کے بغیر معاملات اور فائل لے کر آ جاتے ہیں اور غیر ضروری تضیع اوقات کا باعث بنتے ہیں۔ خالد نے جس روز کمشنر انکم ٹیکس لاہور کے عہدے کا چارج سنبھالا تھا اس روز مجھے تھوڑی دیر کے لئے اس سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ اگرچہ اس روز وہ اپنی ملازمت کے معروف ترین منصب پر فائز ہوا تھا لیکن وہ بڑے اعتماد سے کام کر رہا تھا۔ صرف چند روز بعد اس کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ پورے کام پر کلیتہً حاوی تھا۔ اور بالکل پرسکون (Relaxed) انداز میں بڑے بڑے فیصلے کر رہا تھا۔ اصل میں خالد کے قوائے ذہنی پوری طرح توانا ہیں، ان پر اضمحلال کا ہلکے سے ہلکا پرتو بھی نہیں پڑا۔ اس لئے اس کی قوت کار تجربہ کی بھٹی میں سے گزرنے کے باعث بہت بہتر ہو گئی۔

پیش آمدہ معاملات اور مقدمات میں اس کا نقطۂ نظر (Approach) بڑا غیر روائتی ہوتا ہے۔ وہ افسر شاہی کے عام طور طریقوں کے مطابق رسوم و قیود کا پابند نہیں۔ وہ ہر معاملہ میں تعمیری، ہمدردانہ اور فیصلہ کن رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ جب بھی اور جہاں بھی کسی کی جائز مدد کر سکتا ہے فوراً کر دیتا ہے۔ "افسرانہ بخل" اس کو چھو تک نہیں گیا۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ کسی معاملہ میں وہ ابھی اور اسی وقت کسی کو جائز فائدہ پہنچا سکتا ہے بلا تاخیر اور شرح صدر کے ساتھ ایسا کر دیتا ہے۔ اس کی اس عادت سے وہ افسر ناخوش ہوتے ہیں۔ جنہوں نے مددگار (Helpful) ہونے کا سبق سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ پبلک کے افراد بھی حیران رہ جاتے ہیں کہ ایک بڑا افسر بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

ٹیکس کی مقدار اور سرکاری واجبات کا فیصلہ کرنے میں وہ جہاں حکومت کے مفاد اور قواعد و ضوابط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے وہاں اس بات کا بھی خاص اہتمام کرتا ہے کہ پبلک کے کسی آدمی کے ساتھ بلا وجہ زیادتی نہ ہو، اگر فریق متعلقہ کوئی اوسطاً معمولی درجہ کا انسان ہو تو خالد کی رگ ہمدردی ضرور پھڑکتی ہے اور وہ اس پر بوجھ ڈالنے سے پہلے خوب اطمینان کر لیتا ہے کہ اس کا فیصلہ انصاف اور رحم دلی کے تقاضوں کے عین مطابق ہو اور شخص متعلقہ پر ناروا بوجھ نہ پڑے۔

ایک دفعہ ایک ایسا نوجوان اس کے سامنے پیش ہوا۔ جس کے ذمے ٹیکس کی خاصی رقم واجب الادا تھی، اس نے بتایا کہ تشخیص منصفانہ نہیں ہوئی۔ اور اس کا والد اسی صدمہ سے جاں بحق ہو گیا ہے، خالد نے جرح کرتے ہوئے پوچھا: "والد کب فوت ہوا تھا؟" اس نے کہا "۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جس روز پاکستان نے بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے"۔ یہ بات سن کر خالد نے قاعدے کے تحت زیادہ سے زیادہ رعایت اس نوجوان کو دے دی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا کہ یہ نوجوان کچھ بناوٹ سے کام لے رہا معلوم ہوتا تھا اور آپ نے کچھ زیادہ ہی نرمی کر ڈالی، خالد نے کہا "اس شخص کا والد عین اس روز فوت ہوا، جس روز پاکستان کو بہت بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا، ہو سکتا ہے وہ کوئی نیک آدمی ہو، اور ملکی شکست کا صدمہ بھی اس کی موت کے اسباب میں سے ہو، اس لئے قانون کے تحت زیادہ سے زیادہ رعایت اس شخص کو دے دی ہے۔ اس نے اگر جھوٹ بولا ہے تو اس کا وبال اس کے کندھوں پر ہے"۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قومی و ملی درد و رکھنے والے افراد سے خالد کو ایک خاص محبت ہے۔ اور وہ ان کا بڑا قدردان ہے۔ محض یہ بات کہ ایک شخص پاکستان کے عظیم المیہ کے دن جاں بحق ہوا، خالد کے نزدیک چونکہ بہر حال یہ امکان ظاہر کرتی ہے کہ وہ شخص درد ملی رکھتا تھا اس لئے اس کا اور اس کے اہل خاندان کا لحاظ کیا جانا چاہیئے۔ یہ انداز فکر ایک ایسے شخص کا ہی ہو سکتا ہے جسے خود حب الوطنی اور درد ملی کا بہرہ وافر ملا ہو۔

خالد کو سفارش کرنے اور سفارش ماننے سے دلی نفرت ہے۔ میری رائے میں وہ پاکستان کے ان سرکاری ملازمین میں شاید سر فہرست ہے جنہوں نے اپنی ملازمانہ زندگی میں کم سے کم سفارش کی ہے یا مانی ہے۔ وہ فیصلے ہمیشہ (Merit) کی بناء پر کرتا ہے۔ اور کسی کا ناجائز اصرار اس کے مزاج کے یکسر منافی ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے اس کے دفتر میں کچھ آسامیاں خالی تھیں، بھرتی کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں، ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی، خالد کو بہت بڑی اور بہت اونچی سفارشوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس نے جو طریق کار اختیار کیا تھا، اس سے سر مو انحراف نہیں کیا اور

صرف واقعی اہل اور مستحق افراد کو منتخب کیا۔ اس کے پاس بعض اوقات محکمانہ امتحانات کے پرچے آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سفارشات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ انصاف اور غیر جانب داری کے تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور نہ صرف سفارش ماننے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ اس بات پر سخت برہمی کا اظہار کرتا ہے کہ لوگ خود انصاف کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ جتنے بڑے آدمی کی طرف سے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش ہوتی ہے، اسے اتنا ہی زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے جو لوگ چھوٹے چھوٹے معاملہ میں حق و انصاف کے تقاضے ملحوظ رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، ان سے بڑے اور اہم تر معاملات میں دیانت و امانت کی روش اختیار کرنے کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ سفارش سے خالد کی نفرت اکثر اوقات مشکلات اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے اور اس کے بعض بے تکلف احباب کو اس سے شکایت بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ اسے بے تعلقی، عدم دلچسپی یا ہمدردی کے فقدان پر محمول کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے اصول شکنی کئے بغیر خالد اپنے احباب کی ہر ممکن مدد کے لئے ہمیشہ تیار ہوتا ہے۔ احباب تو در کنار مدد اور ہمدردی کے معاملہ میں وہ احباب اور غیر احباب کی تمیز کا قائل نہیں، جہاں اور جب بھی کسی کے لئے مددگار ثابت ہونا اس کے لئے ممکن ہو، وہ ہمیشہ مطالبہ اور تقاضا کے بغیر ایسا کرتا ہے لیکن اگر معاملہ اصول شکنی اور ناجائز مدد یا سفارش کا ہو تو پھر دوست اور غیر دوست یکساں ہیں اور وہ ایک خاص حد سے آگے جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ آپ اگر بے اصولیاں کرتے ہیں اور کسی کی ناجائز حمایت کر کے دوسروں کے ساتھ بے انصافی کرتے ہیں تو پھر آپ کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ اصولوں کی بات کریں۔ دوسروں کی غلط روش پر تنقید کریں اور اپنی تحریروں میں اعلیٰ اقدار اور ارفع مقاصد کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کریں اور ان کی تبلیغ کریں۔ یہ دونوں باتیں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔ آپ اگر روش عام کے مطابق سب کچھ کرنا، کرانا اپنے لئے جائز رکھتے ہیں تو پھر اصولوں کی بات کرنا چھوڑ دیں۔ قوم و وطن اور دین و مذہب سے محبت اور وابستگی کا دعوے بند کر دیں۔ دوسرے لفظوں میں خالد قول و فعل کے تضاد کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا عمل واقعی ان کے نظریات کا تابع ہے۔ وہ جن باتوں کو صحیح سمجھتا اور کہتا ہے ان پر عمل بھی کرتا ہے۔ وہ بے اصولیاں کرتے ہوئے اصول کا درس دینے والوں میں سے نہیں ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ جو لوگ زندگی کی عملی مشکلات پر نگاہ رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ دنیاوی لحاظ سے ایک انتہائی مصروف زندگی گزارنے والے شخص کے لئے قول و فعل کے تضاد سے بچنا کس قدر مشکل ہے۔ وہی خالد کی مذکورہ کیفیت کے سچے قدردان ہو سکتے ہیں۔

اصول اور Merit کی بنا پر فیصلہ کرنے کی خواہش بعض اوقات خالد کو نہایت نازک صورت حال سے دوچار کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ پاکستان کے مشہور رہائشی خاندانوں میں سے ایک کا کیس اس کے سامنے پیش تھا جس کا اس وقت کے سربراہ مملکت کے ساتھ خصوصی تعلق سمجھا جاتا تھا۔ خالد نے فیصلہ میں وہ موقف اختیار کیا جو اس کے نزدیک انصاف اور عوام دوستی کے تقاضوں کے مطابق تھا اور رائے دے دی کہ یہ ادارہ ٹیکس کی ایک بہت بڑی چھوٹ کا حق دار نہیں۔ فیصلہ لکھ دیا گیا، لیکن ایک دوسرا اعلیٰ تر افسر جو زیادہ "حقیقت پسند" تھا، اس فیصلہ کا "بار گراں" اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا اور اس نے ایک "محفوظ" راستہ اختیار کر کے اپنی جان بچالی، لیکن خالد نے وہی کچھ لکھا جو اس کی دانست میں صحیح تھا۔ اہل ثروت کے معاملات Cases کا فیصلہ کرتے وقت خالد کا رویہ تحقیقی، تفتیشی، اور تنقیدی ہوتا ہے اگرچہ اس میں نہ تو غیر ضروری سختی کا پہلو موجود ہوتا ہے، اور نہ ہی اس میں Sympathetic understanding کا فقدان ہوتا ہے، لیکن ان کی جرح کا مقصد واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اصل حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں اور حقائق کو چھپانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے ایسے کسی فریق کا وکیل اگر لفاظی یا عیاری سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے تو خالد فوراً گرفت کرتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو اس کو دبانے Snub کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا لیکن اگر متعلقہ افراد سیدھے طریقے سے حقائق بیان کرنے پر آمادہ ہو جائیں (جو کہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے) تو ان کا رویہ یکدم نرم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس نچلے متوسط طبقہ کا کوئی فرد ان کے سامنے پیش ہو تو خالد بالعموم غیر ضروری طور پر سخت گرفت نہیں کرتے بلکہ ان کا رجحان قواعد و ضوابط کے اندر رہتے ہوئے شروع ہی سے نرمی کی طرف ہوتا ہے۔

میری رائے میں ان کی مذکورہ خصوصیات ان کے کردار، نظریات اور فلسفۂ زندگی کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ وہ چونکہ زندگی میں بعض ابدی صداقتوں کے علمبردار اور پیروکار ہیں، اور یہ صداقتیں ان کے دل و دماغ میں متمکن ہیں، ان سے ان کی وابستگی سطحی اور نمائشی نہیں، اس لئے عملی زندگی میں ان کے رویہ پر ان کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی

ضیاء الرحمٰن ضیاء

خالد کی شخصیت — میرے تاثرات

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں عبدالعزیز خالد صاحب کو اس حد تک جانتا تھا کہ یہ کوئی ممتاز شاعر اور بہت بڑے عالم ہیں۔ عالم کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ اس وقت مجھے خالد صاحب کی جو چیزیں پڑھنے کو ملیں ان میں عربی اور فارسی کے علاوہ کچھ ایسے مشکل الفاظ بھی شامل تھے جو تقریباً میری سمجھ سے باہر تھے۔ اس لئے اس وقت اپنی کم علمی کا احساس ہونے کے ساتھ ان کے لئے جو لفظ میرے ذہن میں ابھرا وہ عالم کا تھا۔ پھر ان کی معرکۃ الآرا کتاب "فارقلیط" کی دھوم بھی سنی اور انعام ملنے کی خبر بھی۔ اس دوران میں مجھے ان کی کوئی کتاب تو نہ مل سکی، البتہ "دیارِ پاک" جیسی طویل نظمیں پڑھنے کو ملیں جن سے ان کی قادر الکلامی اور علمی مہارت کا بخوبی اظہار ہوتا تھا۔

بہت عرصہ بعد ایک نجی کام کے سلسلے میں میرا کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں میں ایک مجموعۂ نظم و نثر ترتیب دے رہا تھا اور مذکورہ مجموعے کے لئے اہلِ قلم کی نگارشات بھی جمع کر رہا تھا۔ کراچی میں احباب سے ملاقات کے دوران ایک صاحب نے اس سلسلے میں عبدالعزیز خالد کا نام بھی لیا۔ میرے لئے یہ ملاقات کا اچھا موقعہ تھا۔ یا یوں کہیے کہ اچھا "بہانہ" تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ موصوف محکمہ انکم ٹیکس میں اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ دل میں علمیت کا رعب تو پہلے تھا ہی۔ اب افسریت کے رعب نے ان کی بارعب شخصیت کے تاثر کو اور گہرا کر دیا۔

پہلی ہی ملاقات کے دوران خالد صاحب نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ متعدد موضوعات پر مسکرا مسکرا کر تیزی سے بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ گفتگو نہایت عالمانہ اور سلجھی ہوئی اور وسیع النظری کی مظہر۔ جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں بیٹھا رہوں اور اس سرچشمۂ علم و ادب سے فیض یاب ہوتا رہوں۔

بات شاید ایک آدھ ملاقات سے آگے نہ بڑھتی جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ لیکن ایک تو پہلی ملاقات نے اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ دوسرے کچھ عرصہ بعد ہی خالد صاحب سرکاری کام کے سلسلے میں سکھر تشریف لائے اور دوسرے حضرات سے ملاقات کے دوران مجھے بھی تلاش کیا۔ ہم نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی شام رائٹرز گلڈ کے زیرِ اہتمام مقامی ہوٹل میں خالد صاحب کے ساتھ ایک ادبی شام کا اہتمام کیا۔ اس مخصوص ادبی نشست میں جس کی صدارت ڈاکٹر احسن فاروقی نے کی مقامی اہلِ قلم نے شرکت کی۔ تقریب کے بعد خالد صاحب کے ساتھ ایک اور نجی محفل جمی اور یوں ایک بار پھر وہ بلیغ گفتگو سننے کو ملی۔ اس کے بعد خالد صاحب سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رہا۔ پھر یوں ہوتا کہ میں جب بھی کراچی جاتا خالد صاحب سے ضرور ملتا۔ یوں متعدد ملاقاتوں کے ذریعے ان کو زیادہ سے زیادہ جاننے اور قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

عبدالعزیز خالد نہایت وسیع القلب، وسیع النظر اور صاف گو قسم کے آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین بھی ان کے خلوص اور اخلاق کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ خالد صاحب کسی اچھی چیز کی تعریف کے سلسلے میں کسی اتنیاز، جانبداری یا بخل سے کام نہیں لیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اگر کوئی فن کار کوئی اچھی چیز تخلیق کرتا ہے تو آپ اس کی تعریف اس کی زندگی ہی میں کر دیجئے۔ ممکن ہے آپ کی معمولی سی تعریف

سے اس کی حوصلہ افزائی ہو۔ اور وہ اس سے بہتر چیز تخلیق کر سکے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی اہلِ قلم کی کسی تخلیق نے ان کو متاثر کیا۔ تو انہوں نے اس اہلِ قلم سے باقاعدہ تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی خط یا فون کے ذریعے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ بات ان کے بلند مقام اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔

خالدؔ صاحب کی شاعری میں الفاظ اور احساس کی مکمل ہم آہنگی ہے۔ انہوں نے اپنے احساس کی ترجمانی کے لئے جس زبان کے جن الفاظ کو موزوں پایا۔ استعمال کیا۔ اس نے ان کی شاعری کو مشکل تو ضرور بنا دیا لیکن حُسنِ بیان اور حُسنِ شعر میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا۔ اس کی الفاظ کے ذریعے سچی تصویر کھینچ دی اور یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے الفاظ کی مصوّری کی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ خالدؔ صاحب نے یہ مشکل پسندی کیوں اختیار کی؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شہرت حاصل کرنے کے لئے۔ لیکن شہرت حاصل کرنے کے تو بہت سے طریقے ہیں اور پھر شہرت تو کئی سستے طریقوں سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کہ یہ شہرت خالدؔ صاحب کو بہت مہنگی پڑی۔ لیکن یہاں سوال شہرت کا نہیں۔ در اصل خالدؔ صاحب کے مزاج اور موجودہ طرزِ شاعری میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی۔ اس لئے انہوں نے اپنے لئے ایک الگ راہ اختیار کی۔ انہوں نے اُردو شاعری کو نئی آواز اور نئی لے دی جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اب رہا دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کا مسئلہ، تو اردو زبان میں اتنی وسعت اور گنجائش ہے۔ کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ بآسانی سموئے جا سکتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے۔ یہی اردو زبان کی ترقی کی علامت ہے۔

ان کے کلام کی طرح ان کا خطِ تحریر بھی منفرد ہے جس میں ایک خاص طرز ہونے کے ساتھ ایک سلیقہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو اس کے پڑھنے میں کسی قسم کی دقّت یا دشواری پیش آئے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ کہ میں نے "ادارہ فکر و فن" کی ایک تقریب کی صدارت کے لئے خالدؔ صاحب کو خط لکھا۔ جب اس خط کا جواب آیا تو ہماری ایک رکن ادارہ نے خالد صاحب کا وہ خط یہ کہتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا کہ اس "نسخے" کو آپ ہی پڑھیئے۔ انہوں نے تو خیر یہ بات از راہِ مذاق کہی۔ لیکن غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ انہوں نے لاشعوری طور پر ان کے خطِ تحریر کی یکسانیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی۔ کیونکہ قدیم زمانے میں طبیب جو نسخہ لکھا کرتے تھے ان میں بھی یہی یکسانیت اور سلیقہ نمایاں ہوتا تھا۔

خالد صاحب نے اُردو کو اپنی عملی زندگی میں پورے طور پر رائج کر رکھا ہے۔ ان کے نام کی تختی سے لے کر کار کے نمبر تک ہر چیز اُردو میں نظر آئے گی۔ یہاں تک کہ خطوط کے پتوں پر ہندسے بھی اردو میں تحریر کرتے ہیں۔ تلفّظ کے معاملے میں وہ نہایت سخت ہیں۔ کوئی کسی لفظ کا ذرا غلط تلفّظ ادا کرے فوراً ٹوک دیں گے۔ ان کو شکایت ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگ عام لفظوں کے تلفّظ بھی غلط طریقے پر ادا کرتے ہیں۔

وہ کتابوں کے رسیا ہیں۔ کوئی کتاب کہیں بھی چھپی ہو۔ ان کے ہاں ضرور ملے گی۔

یہ سب کتابیں اور رسائل ان کے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی طرح خوبصورتی یا فیشن کے طور پر نہیں رکھتے۔ اور نہ دورانِ گفتگو اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کا بار بار حوالہ دیتے ہیں۔ خالدؔ صاحب کا مطالعہ لامحدود اور مشاہدہ عمیق ہے۔ وہ کبھی اپنے آپ پر اپنے خیالات عائد نہیں کریں گے بلکہ آپ کی رائے سننے کے بھی متمنّی رہیں گے۔

خالد صاحب نہایت با اصول آدمی ہیں۔ زندگی کے معمولات کو وہ نہایت خوش اسلوبی سے نبھاتے ہیں۔ وہ ایک ذمہ دار افسر، مثالی باپ اور مخلص دوست ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی نہایت پُر سکون اور قابلِ رشک ہے۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ موجودہ نظامِ تعلیم سے ان کو شکایت ہے کہ وہ ناقص ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "بچے اپنے مذہب، ثقافت اور زبان سے خاطر خواہ واقفیت حاصل نہیں کر پاتے"۔ سرکاری فرائض نہایت دیانتداری سے انجام دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی دباؤ کو برداشت نہیں کرتے۔ احباب کے معاملے میں وہ بے پناہ مخلص ہیں۔ جس سے ملتے ہیں کھلے دل سے ملتے ہیں اور ایک بار ملاقات کے بعد ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد

بیاں اپنا

بندہ عاجز شاعر عبدالعزیز خالدؔ آپ سے مخاطب ہے۔ میں جنوری ۱۹۲۷ء میں ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کے موضع پرجیاں کلاں میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں پڑھائی کی چیٹک لگ گئی۔ کتابیں ہیں میری سمیر و ندیم۔

کھیل کود سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ آجکل البتہ جوگنگ اور یوگا کا شوق ہے۔ پرائمری میں آزاد کی قصص ہند ہمارے نصاب میں شامل تھی۔ کتاب کیا تھی ایک رنگا رنگ متحرک مرقع تھا۔

جس جا کہ سراپے میں نظر جائے ہے اس کے — آتا ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر ہو

ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی حنائی انگلیوں سے جادو کے جھروکے وا کر رہا ہے جیسے بادِ بہاری کی گدگدی سے ذہن کے دریچے کھل رہے ہیں جیسے ان دیکھی دنیاؤں، انجانے ساحلوں، گنجان جنگلوں، اونچے پہاڑوں، گہرے سمندروں اور بوقلموں خوابوں کے پرفسوں جزیرے حدِّ نظر بلکہ حدِّ خیال تک پھیلے ہوئے دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ دل پہلی دفعہ لذتِ اضطراب، فشارِ آرزو اور افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے سے آشنا ہوا۔

اس زمانے میں ممتاز و بے نظیر حاتم طائی، گل بکاؤلی کے قصوں اور امیر حمزہ اور الف لیلہ کی داستانوں نے ایسا شبخون مارا کہ آج تک دل دست قاتل کو دعائیں دیتا ہے ع کردیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے بغداد کی راتوں کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بولتا ہے اور

ع طلسم ہوش ربا ہے دکانِ بادہ فروش

یہ قصے ستاروں اور ستاروں سے آگے جہانوں پر کمندیں پھینکنے کی دعوت دیتے ہیں، قوتِ متخیلہ کو مہمیز کرتے ہیں، اڑن کھٹولوں کل کے گھوڑوں، طلسماتی قالینوں اور دیووں کے شانوں پر بٹھا کر پرستانوں کی سیر کراتے ہیں اور یوں دل و دماغ میں ایک مختلف احساس، ایک رستا خیز جذبات برپا کرتے ہیں اور ہمارے اندر کے کولمبس، ابن بطوطہ، سندباد اور یولی سس کو از خواب گراں خیز از خواب گراں خیز کی صلا دیتے ہیں۔

الہ دین کے چراغ، تختِ سلیمان اور کحل جامِ جم پر قادر ہو کر ایک آدمی خود کو کتنا آزاد کتنا آسودہ اور کتنا وسیع و وقیع محسوس کرتا ہے۔ یہ عرفانِ ذات کی پہلی منزل ہے۔!

اساطیری اور داستانی ادب امکانات کا تخیلات کا، عزم و عمل کا مشکلات کے سامنے سینہ سپر ہونے کا۔ ظلم سے نبرد آزمائی کا، مظلوم کی دستگیری اور زندگی کی ہمہ ہمی و سرمستی کا ادب ہے۔

یہ روح کی مادے پر فتح کا جشن ہے۔ یہ زمان و مکان کی تسخیر کا منشور ہے اس میں انسان چارسو کی قید سے نکل کر لامکاں سے ہم آہنگ ہو کر کن فیکون کی سرگوشیاں سنتا ہے۔

بچوں کی تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے ان کے جذبۂ تحیّر کی برانگیختگی و تسکین کے لئے انہیں اس سرچشمے سے جی بھر کر سیراب

پانچویں جماعت میں، میں اسلامیہ ہائی سکول ننگل انبیا میں داخل ہو گیا۔ اس سال ایک سکھ ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز سالانہ معائنے کے دوران مجھ سے حالیؔ کے شعر

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

کی تشریح سن کر کہنے لگا: جی چاہتا ہے اس لڑکے کو ڈبیا میں بند کر کے جیب میں ڈال کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔

ان حوصلہ افزا کلمات سے قدرتاً طبیعت میں ایک جوش، ایک ولولہ اور حرارہ پیدا ہوتا ہے کچھ کرنے کا، اس حسنِ ظن کو حقیقت میں بدلنے کا، وابستہ توقعات پر پورا اترنے کا۔ یہ باتیں ایک آدرش کی طرح ہوتی ہیں۔ جو کنارِ افق سے ہمیں اشارے کر کے اپنے قریب بلاتی ہیں۔ اور ہمیں قریب آتا دیکھ کر یک لخت بدن چرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ایک عشوہ گر کی طرح تیز ترک گامزن منزل تو دور نیست کا نغمہ شیریں کانوں میں گھولتے ہوئے — اپنے مہربان استادوں، قاضی خوشی محمد اور چودھری رحمت علی نازش کی ہدایت پر درسِ حیات مولفہ چودھری محمد اکبر مطالعے میں آئی تو

تو کہے بتخانۂ آذر کھلا

یہ DUTY اور SELF-HELP قسم کی کتاب ہے۔ اس کی طرز پر میں نے بھی ایک سلسلۂ مضامین لکھا۔

آٹھویں جماعت میں آغا صادق حسین صادق سے تعارف ہوا۔ وہ ہمارے سکول میں فارسی کے معلم تھے شعر کہنے کا شوق پانچویں چھٹی جماعت ہی سے ہو گیا تھا۔ اپنی کوتاہ لڑکپن کے جولین کے ساتھ آغا صاحب کے سامنے رکھی تو بولے: لیکن یہ تو وزن سے خارج ہے سمجھ میں نہ آیا کہ یہ وزن کیا ہوتا ہے اور یہ داخل خارج کا مسئلہ کیا ہے۔

عروض و تقطیع کی واقفیت ہو جانے پر باقاعدہ مشقِ سخن شروع کر دی۔ صبح و شام فرصت کے لمحات اسی فکرِ لذیذ اس مصروفیت شیریں میں کٹنے لگے —

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میٹرک میں گایا کا (آ) THE PROPHET OF THE DESERT اور ملٹن کی PARADISE LOST نظر سے گزرے تو جیسے آسمان پر ایک نیا ستارہ نکل آیا۔ سمندر میں ایک نیا جزیرہ ابھر آیا، خلدِ گم گشتہ کی تلاش آج بھی ہے اس کتاب کو پڑھ کر اس کے جلال و جمال کو دیکھ کر میرے اندر اس کا جواب لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ برسوں گزر گئے لیکن آج بھی کبھی کبھی شب تنہائی میں یہ داعیہ اچانک شاعر کی خلوت میں در آتا ہے اور عجیب انوٹ سے پوچھتا ہے۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں؟

انہی دنوں انگریزی نظمیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس ذوقِ خود نمائی نے بہت نظمیں لکھوائیں۔ ایک ہم سبق دوست نرنجن سنگھ سے مل کر گورمکھی سے ملتی جلتی ایک نئی زبان کی ابجد بھی ایجاد کی — مگر شعلۂ مستعجل بود

۱۹۴۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں آ گیا۔ لاہور کی فضا میں ایک عجیب کیفیت، ایک عجیب سرور، خمار اور تحریک تھی۔ میں اقبال سے بہت متاثر تھا اور آتے ہی سب سے پہلے اس کے مزار پر سلام کے لئے حاضر ہوا۔

بر سرِ تربتِ ما چوں گزری ہمت خواہ کہ زیارت گہِ اربابِ ہمم خواہد بود

شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کو بھی دیکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ پھول کے دفتر میں انہیں اکڑوں بیٹھے لکھتے اور مٹھائی سے شوق کرتے دیکھا۔

اس زمانے میں فارسی نظم و نثر میں بہت خامہ فرسائی کی ذرا شعور آیا تو معلوم ہوا کہ زبانِ غیر میں فکرِ شعر۔

والا مضمون ہے۔ اس لئے اپنی توجہ اور توانائی صرف اردو شعر تک محدود کر دی اس احساس کے ساتھ

تراش از تیشۂ خود جادہ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است

کالج میں ہم چار دوستوں کا حلقہ مشہور تھا۔ یہ خاکسار زکریا ساجد، سلیم فاروقی (اب ڈاکٹر) اور ارشاد احمد حقانی۔ ارشاد جواب کالج کا پرنسپل اور ایک بیدار مغز سیاسی مبصر ہے۔ وفاداری بشرط استواری کا زندہ پیکر ہے اور عبدالعزیز سے بھی بڑھ کر محرم خالد۔

ریواز ہوسٹل کے متصل اہل حدیث کی مبارک مسجد ہے۔ اس مسجد میں اس وقت مولانا محمد حنیف ندوی روزانہ نماز مغرب کے بعد درس قرآن دیا کرتے تھے ان کا نورانی چہرہ، بصیرت افروز نستعلیق لہجہ اور سانچے میں ڈھلا انداز بیان ہمارے لئے بڑی کشش کا باعث تھا۔ اس لئے ہم ان کے درس میں شریک ہوتے، وہاں علامہ حسین میر کاشمیری کے چٹکلوں سے بھی محفوظ ہونے کا وافر موقع ملتا۔

پروفیسر رفیق خاور نے بزم ترجمہ کا ڈول ڈال رکھا تھا جس کی روح رواں جناب جیلانی کامران و برادران تھے۔ اس بزم کے لیے میں نے متعدد ایکا نکی ڈراموں، تنقیدی مضمونوں اور نظموں کا ترجمہ کیا۔ لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سے اقبال کے لیکچروں پر اکثر گفتگو رہتی۔ پروفیسر علم الدین سالک بڑی دلچسپ شخصیت اور حیرت انگیز حافظے کے مالک تھے۔ میری رہائش ہیلی ہوسٹل میں تھی۔ ناصر کاظمی بھی اسی ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہ مجھ سے تین سال سینیئر تھے لیکن میری ان سے بے تکلفی ان کی ہمایوں کی ادارت کے زمانے میں ہوئی۔

اس زمانے کی ایک عزیز یاد شیخ سر عبدالقادر سے ملاقات اور ان کے متبسم مہربان اور شفیق چہرے کی یاد ہے۔ میں نے رچرڈز کے The Principles of Literary Criticism کا ترجمہ کیا تو ایک دن مسودہ لے کر ان کی ٹمپل روڈ کی کوٹھی میں جا پہنچا۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ کتاب دیکھی تعریف کی اور اس کا دیباچہ لکھنے کا خیال بھی ظاہر کیا بانگ درا کے دیباچے کا بھی ضمناً ذکر آیا ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک ابو الاثر حفیظ جالندھری گلے میں مفلر لپیٹے، ہاتھ میں بریف کیس جھلاتے اشانے اچکاتے شاد کا یہ شعر گنگناتے

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں — تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں

آن وارد ہوئے پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ایک اور خوشگوار یاد قائد اعظم سے ۱۹۴۶ء میں انعامات لینے کی ہے مجھے بار بار انعام لینے آتے دیکھ کر آہستہ سے بولے Young Brainy boy! You are appropriating all the prizes leave some for the others.

پروفیسر حمید احمد خاں نے اقبال پر میرا ایک مضمون پڑھا تو کہنے لگے: اتنی صحیح اور اچھی اردو تم سے پہلے صرف محمود نظامی کی دیکھی۔ کالج میگزین کر یسنٹ بھی کئی سال میرے سپرد رہا۔ میں اس دوران میں Young Speakers' Union سے متعلق اور پھر کالج یونین کا سیکرٹری بھی رہا۔ مگر تقریر کی لیاقت پیدا نہ ہو سکی۔

جب پاکستان بنا تو میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ کیمپوں کی بے سرو سامانی میں موت کی ارزانی بھی دیکھی اور زندگی کی گرانجانی بھی دسمبر ۱۹۵۰ء میں انکم ٹیکس میں ملازم ہو کر کراچی چلا گیا۔ مارچ ۱۹۷۱ء تک کا زمانہ اس عروس البلاد کی نمناک، خواب آلود، شوریلی اور نشیلی فضاؤں میں گزرا یہ دل خالد کو اب تک وہ شبستان یاد آتے ہیں۔ درمیان میں دو سال کے لئے سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے دیس میں بھی گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ حیدر آباد ہی میں پہلی دفعہ علامہ عبدالعزیز میمن سے ڈاکٹر بلوچ موجودہ وائس چانسلر حیدر آباد یونیورسٹی کی معیت میں ملاقات ہوئی۔

مجھے عربی سیکھنے کا شوق تو شروع ہی سے تھا لیکن کبھی اس کی باقاعدہ تحصیل کا موقع نہ مل سکا۔ ہنگامی جذبے کے تحت شروع کرتا جذبہ سرد پڑتا جاتا تو دوسرے کاموں میں الجھ جاتا لیکن حیدر آباد میں مجھے اس دیرینہ شوق کو کسی حد تک پورا کرنے کا موقع مل گیا۔

اس شوق فضول میں کچھ ایسی دیدہ ریزی کرنا پڑی کہ آنکھیں خراب ہوگئیں اور ایک ہندو ڈاکٹر کے اذیت ناک طریقہ علاج ہی سے شفایاب ہو سکیں لیکن بہر بر کار محبت اس ذوق و شوق سے جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ پڑھنے والوں نے میری تحریروں میں عربی کا عمل دخل دیکھ کر صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کر دی۔

اس عمل میں کسی ریا یا بناوٹ کا دخل نہیں تھا بلکہ یہ ایک حقیر سی پر خلوص کوشش تھی، اپنی جڑوں تک پہنچنے کی۔ اپنے ماخذ تک رسائی کی۔ اپنی گمشدہ میراث کی بازیافت کی بیہر ملکہ عبدالمطلبؓ کی طرح دبے ہوئے چشمۂ زمزم کو پھر سے برآمد کرنے کی۔

کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے آپ سے بھاگ کر اپنے ماضی اور اپنے ورثے کی نفی کر کے کوئی فرد یا جماعت اپنی تکمیل نہیں کر سکتی۔ اپنی تشخص کو نہیں پا سکتی بلکہ رفتہ رفتہ اپنا نام اور اپنی پہچان تک کھو دیتی ہے۔

اس کی نشو و نما اس کے اپنے طبعی ماحول، اپنی مانوس آب و ہوا، اپنے مالوف احوال و ظروف ہی میں ہو سکتی ہے۔ اپنے مقدر سے فرار کس حد تک ممکن ہے؟

جس طرح ہم اپنی جغرافیائی اور سیاسی حدود کی مسلسل جان و مال سے حفاظت کرتے ہیں۔ ایسے ہی ذہنی، فکری اور جذباتی سرحدوں کا دفاع بھی لازم ہے بلکہ لازم تر ہے۔

ہمارا معاشرہ خوردہ فروشی، تاویل و تسویل، جذباتی شکست و ریخت اور فکری اضطراب و انتشار کے برزخ سے گزر رہا ہے۔

علم سے بے اعتنائی ہمارا شعار ہے۔ ہم کتاب اور صاحب دونوں کو ایک مد فضول سمجھتے ہیں لیکن تاریخ عالم گواہ ہے کہ علم اور علم سے محبت ہی عزت و عظمت، ترقی اور پیش رفت کا زینہ اور پیمانہ ہے جب تک علم سے ہمارا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے استوار نہیں ہوگا کسی مربوط، نتیجہ خیز انقلاب انگیز تخلیقی عمل کے ظہور کا امکان نہیں۔

حال کی دریافت اور مستقبل کی شناخت کے لئے ماضی کا عرفان ناگزیر ہے روایت کی کھوپڑی ہی سے جدت کا انکھوا پھوٹتا ہے۔ درخت کے تنے کو اس کی جڑیں ہی سیراب کرتی ہیں۔ جڑیں جتنی گہری، لمبی، مضبوط اور گھنی ہوں گی تنا اتنا ہی تناور شاداب اور شاندار ہوگا۔

اس لئے موسمی نہیں بارانی نہیں بلکہ دوامی اور دائمی نہروں سے چمن فکر کی آبیاری کی ضرورت ہے تاکہ یہ خزاں کے آسیب سے محفوظ رہے۔ اپنے اسلاف، اپنی میراث اور اپنے بطون و اعماق تک رسائی کے لئے عربی سے اعتنا کئے بغیر گزارہ نہیں۔ اس اُمّ الألسنہ میں وہ جوامع الکلم محفوظ ہیں جو امت مرحومہ کے لئے حیات نو کی نوید ہیں خدا کے آخری پیغام کی حامل بھی یہی زبان ہے۔ اس کے توسط سے ہم ارمغان حجاز وصول کر سکتے ہیں۔

مقام شکر ہے کہ اس کوشش ناتمام میں مجھے اس خیر الانام کی ثنا خوانی کا شرف ارزانی ہوا۔

وہ دانائے سُبُل ختم الرُّسُل مولائے کل جس نے — غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

لیکن — کہاں نعت و نام رسولِ تہامی ! — کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

بایں ہمہ اس رحمت تمام کے صدقے

پیمبر کہے : انی لست بشاعر

کہ یہ مرتبہ میرے مملوک کا ہے — وہ مملوک جس کو میں کہتا ہوں خالد

جو سلطان اقلیم حرف و نوا ہے

خواجۂ کونین کی غلامی سلطانی نہیں تو کیا ہے۔

بقول شاعر :- رات تھوڑی ہے اور سانگ بہت — (اب اجازت دیجئے خدا حافظ)

(ریڈیائی تقریر)

سید وقار عظیم

عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی

نعت گوئی شاعری کی بڑی مقدس اور پاکیزہ روایت ہے، یہ سچ ہے کہ اس مقدس اور پاکیزہ روایت کی تقریباً چودہ سو سالہ تاریخ میں عربی، فارسی اور اردو کے صدہا شاعر ایسے ہیں، جنہوں نے نعت گوئی کو محض عقیدت مندی کے اظہار اور حصولِ ثواب کا ذریعہ بنایا اور اس لئے نعت کی صورت میں جو شاعری کی اس کا انداز عموماً بڑا رسمی سا ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عقیدے کے اظہار اور حصول ثواب کی بنا پر ظہور میں آنیوالی اس شاعری میں ایسے جواہر بے بہا کی بھی کمی نہیں جن کی چمک دمک اور آب و تاب ابدی ہے، حسان بن ثابت اور بوصیری کے لازوال نعتیہ قصیدے عربی میں، خسرو، جامی اور قدسی کا کلام فارسی میں اور امیر محسن، ظفر علی خاں اور اقبال کا نعتیہ کلام اردو میں نعت گوئی کی روایت کا ایسا عزیز سرمایہ ہے، کہ اُسے ہر زمانے میں سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا جائے گا۔

ہمارے اپنے زمانے میں نعت گوئی کو بہت سے ایسے محرکات ملے کہ شاعروں نے اسے بطور خاص اپنا وظیفہ حیات بنایا، بہزاد لکھنوی، حافظ لدھیانوی، سلیم احمد، رحمٰن کیانی، مجید امجد، اور جعفر طاہر کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور ان ناموں کے ساتھ ایک اور نام بھی یقیناً قابل ذکر ہے اور وہ نام ہے عبدالعزیز خالد کا، عبدالعزیز خالد کو حضور سرورِ کائنات کی ذات والا صفات سے جو قلبی مناسبت ہے اس کا اظہار ان کے کلام میں مختلف صورتوں میں ہوا ہے۔

لیکن ان مختلف صورتوں میں سب سے دل کش صورت ان مختصر نعتوں کی ہے۔ جن میں کہیں قصیدے کا رفیع اور بلیغ لہجہ ہے اور کہیں غزل کا دلگداز اور پرسوز آہنگ اور کہیں ان دونوں کا ایسا امتزاج جس میں دو لہجے اور دو آہنگ مل کر ایک تیسری طرح کا حُسن پیدا کرتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی شاعری کو کبھی کبھی مُغلق الفاظ و تراکیب کی اَدق شاعری کہا گیا ہے، لیکن اس اَدق شاعری کا تجزیہ کیجئے، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس شاعری میں مُغلق الفاظ و تراکیب کی موجودگی نتیجہ ہے اس دقتِ فکر و نظر کا جو عبدالعزیز خالد کی شاعری کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت ہے۔

عبدالعزیز خالد کے کلام میں دقتِ فکر و نظر اور اغلاقِ اظہار میں لازم و ملزوم کا جو منطقی رشتہ ہے اسے ان کی نعتوں کے حوالے سے دیکھیں تو یہ بات آئینے کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ان کے اسلوب اور فکر و احساس میں کتنا قریبی اور کتنا گہرا تعلق ہے۔ خالد کی نعتیہ نظموں کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ ان نظموں کا ہر شعر ایک کوزہ ہے جس میں معنی کے نہ جانے کتنے دریا موجزن ہیں، اس وقت وہ نظم میرے سامنے ہے، جس کا ایک شعر یہ ہے۔

شمار کرنے چلیں اس کی خوبیوں کا اگر ؟
تو ساتھ چھوڑ دیں تھک کے نیل، سنکھ، پدم

ہر شعر ایسا ہے، جس میں محبوب رب المشرقین والمغربین کے وہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں جن کی شہادت قرآن نے دی ہے اور پھر جن کی تائید سرورِ کائنات کے اسوۂ حسنہ سے ہوتی ہے۔ نظم میں وہی رفعت، وہی شکوہ اور وہی دبدبہ ہے، جس سے قصیدہ قصیدہ بنتا ہے۔ ہر شعر میں ایک مہتم بالشان حقیقت بیان ہوتی ہے اور ہر شعر میں اس مہتم بالشان حقیقت کو اظہار کا مہتم بالشان پیرایہ ملا ہے۔ حقیقت اوق ہے اس لئے لسے ادا بھی اوق الفاظ میں ہونا چاہیئے پوری نظم میں لفظوں کا وفور ہے، ہر لفظ نیا اور معنی اور تاثیر کے اعتبار سے آپ اپنا جواب ہے، مشکل زمین میں، مشکل خیالات مشکل الفاظ میں بیان ہوئے ہیں، لیکن شعروں کی روانی میں کہیں فرق نہیں آیا کہ یہ روانی شاعر کے احساس اور خلوص کے اُس جوش کی عطا کی ہوئی ہے جسے عشق رسولؐ نے اس کے قلب میں جاگزیں کیا ہے۔

عبدالعزیز خالد کی نعتوں کی تشکیل تین اجزا سے ہوئی ہے، رسول اللہؐ کے وہ اوصاف حمیدہ جن کی شہادت قرآن نے دی، حیاتِ طیبہ کے وہ اقوال و اعمال جنہیں ثقہ راویوں نے مرتب اور محفوظ کیا اور رسولؐ کی محبت اور عقیدت کا سرمایہ جو ہمارے ایمان کا جزو لازم ہے شاعر نے ان تینوں اجزا کے میل سے جو مرقع بنایا ہے اس میں ذاتِ رسولؐ کے اُن سب پہلوؤں کا عکس موجود ہے، جن کی پیروی میں انسانیت کی فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔

خالد کی نعتیہ نظموں میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو ان کے عام اسلوب سے مختلف اس سہل ممتنع کا نمونہ ہیں، جس میں معنی و بیان ہم آہنگ و ہم نوا ہو کر فضا کو نغمے سے معمور کر دیتے ہیں۔ جس نعت کی طرف میرا اشارہ ہے، اس کا مقطع ہے۔

کلیم وادیٔ ایمن اُسی کا جویا تھا، اُسی کی خالد عبدالعزیز کو ہے لگن عبدالعزیز خالد جو بصیری، حسان، جامی و خسرو اور محسن و اقبال کے دکھائے ہوئے جادۂ محبت پر گامزن ہے، جب قصیدے کا رنگ چھوڑ کر غزل کی راہ چلتا ہے تو نعت موسیقی کے تاروں میں ڈھل جاتی ہے ؎

اُسی کی موجِ تبسم بہارِ لالہ و گل
اُسی کا طرزِ تکلم نوائے مُرغِ چمن!
صبا کو مست خرامی سکھائی ہے کس نے؟
وظیفہ خواں ہے کس کا غزالِ دشتِ ختن؛

میں اسے ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کرشمہ سمجھتا ہوں

ڈاکٹر سید عبداللہ

عبدالعزیز خالدؔ مخترع نعت نگار

خالدؔ کے کلام کا عمومی مزاج ان معنوں میں اسلامی ہے کہ اس نے اپنی نظموں میں اسلام اور تاریخ اسلام کی عظمت کو اپنا موضوع بنایا ہے ..... لیکن یہ مجازی لَے سب سے زیادہ اس کی نعتوں میں منعکس ہوئی ہے ، اس وقت فارقلیط اور منحمنا کے نام سے اس کی دو طویل نعتیں ہمارے سامنے ہیں۔

نعت کا فن نیا نہیں۔ اس کا آغاز خود زمانۂ رسول پاک میں ہو چکا تھا۔ کعب بن زہیرؓ ، لبیدؓ ، عبداللہ بن رواحہؓ اور حسانؓ بن ثابتؓ سب سے بڑے اور اولین مداح رسولؐ تھے۔ ان کے بعد عربی ، فارسی ، حتیٰ کہ اردو (بلکہ بہت سی اور زبانوں) میں یہ سلسلہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ اس سارے عرصے میں نعت کا فن مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا رہا اور نعت نگاری کے متعدد طریقے ایجاد ہوئے۔ ان میں ایک طریقہ حسان بن ثابت کا ہے ..... ایک طریقہ خاقانی کا ہے۔ ایک طرز جامی کی ہے۔ ایک انداز حافظ کا ہے جس میں غزل کے اندر ، غزل کے مزاج کے مطابق رمز و ایما کے ذریعے مدح رسولؐ کی گئی ہے۔ اردو میں ایک رنگ شہیدی کا اور ان کے علاوہ ایک خاص رنگ محسن کاکوروی کا ہے۔ پھر احمد رضا خان ، اکبر ، حفیظ جالندھری ، حالی ، ظفر علی خان ، اقبال ، بہزاد ، دلو رام کوثری وغیرہ اور جدید ترین نعت نگاروں (حفیظ تائب ، حافظ لدھیانوی ، اعظم چشتی ، قمر میرٹھی) وغیرہ کے اپنے اپنے رنگ ہیں اور خوب ہیں۔

بایں ہمہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ خالدؔ نے نعت نگاری کا ایک انداز خاص ایجاد کیا ہے اور جس طرح وہ ایک خاص الخاص اسلوب کا موجد ہے اسی طرح وہ نعت نگاری میں بھی مخترع و مجتہد ثابت ہوا ہے۔ وہ اپنی کتاب فارقلیط کے خاتمے میں اس کا ذکر خود کرتا ہے ؎

روایت سے تجدید کی سوتیں پھوٹے
وہی ہے مجدد جو خود آشنا ہے

چنانچہ اس مجدد اسلوب نے جس طرح تعمیر الفاظ کا ایک نیا فن ایجاد کیا ہے اسی طرح مدح رسولؐ کا بھی ایک نیا ڈھنگ نکالا ہے ، ایک نئی روش ، ایک نئی تکنیک ہمیں دی ہے۔

نعت نگاری میں عموماً شدید جذبات محبت سے کام لیا جاتا ہے جیسا کہ ابن الفارض نے اپنی نظموں میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کے ملے جلے مگر عشق کی صرف ایک ہی قسم کو حقیقی قرار دیا ہے اور وہ ہے عشق رسولؐ۔ ابن الفارض بیان کے استاد اور معاصر ابن العربی کی ترجمان الاشواق کا خاص اثر معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کا انداز بھی یہی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ نعت میں چند خاص مضامین مروج ہیں : سلام و درود انسانوں اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ و تحیات ، آپؐ کی اور خدا کی حقیقت میں حرف میم کا فاصلہ ، خاک حجاز سے محبت ، مدینہ پہنچنے کا شوق ، دیار حبیب ہی میں مر جانے کا اشتیاق ..... کبھی سراپے رسولؐ کا وصف ، کبھی خلق عظیم کی تعریف وغیرہ وغیرہ — اور جدید تر دور میں آپؐ کے احسانات انسانیت پہ ، قومی مصائب میں امداد کی درخواست ، شفاعت کی درخواست اور اس نوع کے دیگر مضامین باندھے جاتے ہیں۔

۱؎ اگر خالدؔ کی زبان استعمال کروں تو کہوں گا ، القابلت الأتمم

خالد کی نعت ان سب سے منفرد ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس میں شاعر کی کوشش یا آرزو یہ معلوم ہوتی ہے۔ محبت کا ہر جذبہ، مدح و وصف کا ہر طریقہ اظہار کا ہر پیرایہ سرورِ کائنات کے قدموں میں ڈال دیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وصف کے ہزار رنگ پھول آپؐ پر نچھاور کر دیئے جائیں۔ خالد نے اپنی نعتوں میں کسی جذبے کو بچا کر نہیں رکھا۔ دل کی ساری کائنات آپ کے حضور پیش کر دی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیکڑوں اشعار لکھے ہیں مگر تشنگی ہنوز باقی ہے اور اقرار کیا ہے کہ

کہاں نعت و نامِ رسولِؐ تہامی
کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

خالد کی نعت دوسری طرزوں سے یوں جدا ہے کہ اس کا دامن جذبات سے واقعات تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا میدان وصفِ رسولؐ سے آگے بڑھ کر تاریخ اسلام کی آگے کی منزلوں تک جا پہنچا ہے۔ چنانچہ اس میں جہاں آنحضرتؐ سے متعلق واقعات ہیں وہاں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے متعلق افکار بھی ہیں۔ بلکہ خلافت راشدہ کے بعد کی خلافت اور ملوکیت اور احساسات اسلامی کے عروج و زوال کے تاثرات بھی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالد کی نعت پھیل کر، تاریخ اسلام اور تذکرہ مدوجزر قومی بن گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ نعت کا نیا تصور ہے۔

سابقاً یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ خالد کا شوقِ نعت، بے تاب و بے حساب ہے جس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس میں نعت گوئی کی ہر طرز کا پیوند لگا ہوا ہے، یہاں تک کہ ہندی کے عاشقانہ لہجے بھی ہیں جو محسنؔ کاکوروی کی مشہور نعت سے زیادہ ہندی آمیز ہیں۔ خالد کی نعت میں اصنامیات کے پیوند بھی آتے ہیں اور شاعر کے شوقِ بے باک کا اظہار کر جاتے ہیں جس کے لئے اس نے خود بھی معذرت کی ہے:

دل ایک رندِ کافر ہے اشعار مومن
نہاں و عیاں میں عجب تفرقہ ہے
پیمبر کہیں: اِنّی کُنتُ بِشاعر
کہ یہ مرتبہ میرے مملوک کا ہے
وہ مملوک، جس کو "میں کہتا ہوں" خالد
جو سلطانِ اقلیم حرف دنوا ہے

منحمنا کا انداز بھی یہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس میں تعداد اشعار کم ہے، میدان بھی محدود ہے اور نار تقلیط کے مقابلے میں اس میں ٹھہراؤ، سکون اور تغنگی زیادہ ہے لیکن منحمنا کا خاتمہ پاکستان کے لئے دعا پر ہوتا ہے کہ اب یہی خطۂ ارض، شاعر کی "حجازی" آرزوں کا مرکز و محور ہے

یہی دعا ہے الٰہی، بنامِ پاک نبیؐ
دیارِ پاک رہے دائما خوش و خرم

منحمنا کا نصف اول ثنائے خواجہ (نعت رسولؐ) پر مشتمل ہے اور نصف ثانی زمانے کے بدلے ہوئے افکار و اقدار پر تشویش سے لبریز جس میں اپنی قلبی حالتوں پر بھی تبصرہ ہے۔ نصف اول کے خاتمے پر ثنائے خواجہؐ کا حق ادا نہ ہو سکنے پر عذر پیش کیا ہے

صفات بوقلموں، لَا تُعَدُّ لَا تُحصیٰ ثنائے خواجہؐ سے معذور ہیں زبان و قلم

اس کے بعد دوسرا باب آتا ہے جس میں ملت کو امید کا پیغام دیا ہے

کہ یہ غم زدہ ہے: لَا تَخَفْ وَلَا تَحزَن ہے منزلِ احدیت کا جادہ اطہر کم

آخری دو بابوں میں ملت کی اخلاقی کمزوری، مغرب پرستی اور بے اخلاقی کو زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ انہیں نبی اکرمؐ کے صراط مستقیم پر واپس آ کر تجدید عہد کرنی چاہیے کیونکہ دنیا بھر کے صلیبی اور زناری ان کی تخریب کے درپے ہیں۔

منحمنّا میں براہ راست شخصی غم کے حوالے بڑے پرخلوص اور الم آمیز ہیں مگر ان سب کا مدعا کوئی ذاتی فریاد نہیں بلکہ یہ بھی قومی جذبوں کا اظہار ہے ہاں اپنے لئے بھی رحمت پروردگار سے کچھ مانگا ہے :

دعا ہے عاجز و عاصی کی یا الٰہی مسئولی ۔۔۔ کر اپنے دامن رحمت میں سیأت کو ضم
کمینہ خادم خدام عاشقان رسولؐ ۔۔۔ ہے نعت و نام نبیؐ ، مایۂ مباہاتم
ہے خضر راہ مری ایسے ملک کی موسیقی ۔۔۔ وگرنہ مجھ کو کہاں درکِ مُعرّب و مُنجّم

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خالد کی نعت کے مضمون و موضوعات سے متعلق ہے لیکن یہ یاد رہے کہ خالد کے اسلوب خاص کے باعث ، اس کی عام نظموں کی طرح ، اس کی نعتیہ نظموں کے معانی تک رسائی صرف کسی کسی کے بس کی بات ہوگی ، اس لئے یہ اور بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خالد کی نعت کی حقیقت ، مقصد اور قوت ابلاغ کے بارے میں خاص توجہ سے بحث کی جائے ۔

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ خالد معانی سے زیادہ تاثر (IM RESSION) کا شاعر ہے یعنی وہ قاری کو تاثر کے راستے سے معانی تک پہنچاتا ہے ، یہ اس کا خاص فن ہے کہ وہ قاری کو اپنی عبارتوں کے خارجی صوت و آہنگ اور الفاظ کی ظاہری شان و شوکت سے (معناً نہیں صوتاً) متوجہ کرکے ، اسے اپنے معانی کے فہم و غور و فکر کی طرف بلاتا ہے ۔ جو کوئی اس کے معانی تک پہنچ گیا اسے تاثر کے ساتھ خیالات و افکار کی دولت بھی مل جاتی ہے ، مگر جسے خیالات و افکار سے کچھ حصہ نہ مل سکا وہ کم از کم تاثر سے بہرہ مند ہو جاتا ہے ۔ اور اس میں بھی خالد کچھ زیادہ نقصان میں نہیں رہتا ۔

خالد کی اس خارا شگافی پر بعض لوگ متعجب ہوتے ہیں لیکن اجتہاد کی دنیا میں ہر اسلوب روا ہے ۔ خود فن کی قلمرو میں تاثریت - IMPRE-SSIONISM) اور اظہاریت (EXPRESSINISM) اور تجرید کی تحریکیں ہر کسی کے علم میں ہیں اور جدید لسانی تشکیلات کے تجربے تو اتنے انوکھے اور عجیب و غریب ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ۔ ذہنی خود کاری (AUTOMATISM) کے عجائبات سے کون واقف نہیں کہ اس کی اختراعات ربط منطقی تک سے بھی بے نیاز ہیں خالد تو ان انحرافات میں سے کسی ایک کا بھی مرتکب نہیں ہوا ، وہ صرف " غیر معمولی " اور غریب و نادر اسلوب کا گنہ گار ہے ۔ اس سے بے ربطی اور منطقی بدنظمی کا کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا ۔

بہر حال خالد ایک مجتہد کی حیثیت سے " صوت کاری " اور تاثر میں اعتقاد رکھتا ہے ۔ اور اس کے واسطے سے تخیّل کو دعوتِ عمل دیتا ہے ۔ اس کی یہ دعوت یوں بھی بے جا نہیں کہ وہ موجودہ دور کے قاری کی " شب کور " آنکھ کو ماضی کے اندھیروں کے اندر سے گزشتہ عظمت کے نقشے دکھانا چاہتا ہے ۔

خالد کی نعت میں بھی صوت کاری ہے اور تاثر انگیزی کا وہی اسلوب ہے جو اس کی باقی شاعری میں ہے ۔

باقی شاعری کی طرح ، فارقلیط اور منحمنّا میں بھی شاعر کا اسلوب چند عناصر سے عبارت ہے ۔

پہلا عنصر ہے سبک عرب ، دوسرا عنصر ہے سبک اساطیری (اضافیاتی ادبی زبان اور حکماء[1] العرب کا سا انداز بیان) تیسرا عنصر ہے سنگلاخ

آخری " عظمت تراشی اور " فخامت ایجادی " جو خالد کی سب کتابوں میں ہے اور جس کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے ۔

سبک عرب کیا ہے ؟ شاعری کے وہ لہجے اور زبان و بیان کے وہ پیرائے جو عرب شاعروں (خصوصاً عہد جاہلیت کے شعرا) کے کلام

---

[1] ان میں سے اکثر سجع میں دانش کی باتیں کیا کرتے تھے ۔ یہ قبل از اسلام کے دانشمندان عرب تھے ۔

میں ملتے ہیں، مثلاً ریگستان میں سفر کرتے ہوئے، اپنے دو دوستوں سے خطاب و مکالمہ، محبوبہ کی یاد، کھنڈروں اور پرانی خیمہ گاہوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کا تذکرہ اور دوسرے احوال و مقامات . . . فارسی کے بہت سے شاعروں نے اپنی شاعری میں اس رسم کی تقلید کی، مثلاً منوچہری، سعدی، حافظ اور جامی وغیرہ نے یہ انداز بھی اپنایا۔ بلکہ حاضر میں ظفر علی خاں اور اقبال نے صرف اس حد تک رسم کا تتبع کیا کہ انھوں نے قرآن مجید کی آیات کے اجزا یا عرب شعرا میں کسی کے شعر یا مصرعے کی تضمین کی۔

مذکورہ شاعروں کے کلام میں عربی تلمیحات، حدیثیں اور آیتیں بقدرِ نمک ہیں۔ لیکن خالد کے یہاں نصف یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں . . اور جیسا کہ قدرتی تھا نعت میں اس سبب عربی کے لیے گنجائش بقدرِ وافر موجود بھی تھی، اس لیے اس کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ بلکہ اس میں توسیع یوں ہوئی ہے کہ عرب اور اسلام کے رجال و شخصیات کے علاوہ، اس میں مقامات و امکنہ کی تلمیحات بڑی تعداد میں موجود ہیں اور نعت کی مناسبت سے اس میں، ان رجال و اماکن کی طرف بھی اشارے ہیں جن کا رسولِ مقبول کی زندگی سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ بلکہ اس میں تاریخ العرب اور ایام العرب بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کبھی اس نے دیکھا نہ تھا ایسا منظر — اٹھا تو تو غورث پڑا کانپتا ہے
شریکِ تجارت تراقیس سائب — تجھے آشکار و نہاں دیکھتا ہے
بچھا در پہ ام سلیم و ملیکہ — جگانے کو قُم قُم حبیبی کہا ہے
تجھے حکمِ تبلیغ بما انزل کا — معلم بنا کر تو بھیجا گیا ہے
شتابان ہیا من کل فج عمیق — دلِ مرد آہن تو آہن رہا ہے
تہادوا تحابوا پیامِ اخوت — ترے دل میں بحرِ کرم بہہ رہا ہے

آنحضرت کے اوصافِ حسنہ کے سلسلے میں خصوصیت سے عربی جملے (جو آئینہ حدیثوں اور اقوالِ اسلاف کا حصہ ہیں)، بڑی کثرت سے استعمال ہوتے ہیں، ان میں عربیت کی پوری شان ہے۔

کثیر المکارم، کریم المساعی — نمائندۂ حضرتِ کبریا ہے
ضلیع اشکل العین ابیض — نہ تابِ نظارہ، نہ تابِ ثنا ہے
ہے ضرب المثل خافض الطرف اکحل — یہ اثمد کا سرمہ بھی کحلِ دجیٰ ہے
کریم العصارہ، شریف الارومہ — تو فخرِ انام و حبیبِ خدا ہے

چند اور ترکیبیں دیکھیے:

۱۔ کریم السجیہ، جمیل الطویہ
۲۔ طلیق اللسان فصیح البیان

ان مثالوں سے خالد کے کلام میں سبکِ عرب کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے . . . اور یہ نتیجہ نکالنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ عربیت کے اس عنصر نے نعت کے مضامین سے زیادہ اس خارجی فضا کو زندہ کیا ہے، جو قدرتی طور سے رسولِ عربی کے ماحول کے قریب تھی۔ فارقلیط اور منحمنا دونوں میں یہ کیفیت موجود ہے . . . حضرت رسولِ کریم عرب کی پوری تاریخ کا مرکز و محور بن جاتے ہیں . . . سب اگلے پچھلے واقعات شعاعوں

۱؎ فخامت یعنی عظمت، ضخامت وغیرہ

کا درجہ رکھتے ہیں جن کا منبع اور مظہر آفتاب نبوتؐ ہے

خالدؔ نے اس پر اکتفا نہیں کی۔۔۔ انہوں نے اس میدان کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ نعت کے قماش میں اساطیری ادب کے پیوند بھی لگا دیئے ہیں اور اس سے عظمت کا افق قریب سے بعید کے دائرے میں جا پہنچا ہے۔

مولٹن MOULTON نے بائبل کی ادبی قدر و قیمت کا یہ عنصر دریافت کیا ہے کہ اس میں رزمیہ کے عناصر موجود ہیں اور اس کے خصائص ادبی میں خاص طور سے یہ بتایا ہے کہ یہ عناصر ان تمام حصوں اور عبارتوں میں موجود ہیں، جن میں انداز تبشیر اور پیش گوئیاں ہیں اور رجال کا ذکر ہے اور ان کے غیر معمولی (محیرّ العقول) اوصاف شجاعت و صداقت کا بیان ہوتے ہیں۔

بائبل اگرچہ بائبل ہے اور ہم بوجہ احتیاط تقدس اس کا کسی بڑے سے بڑے شاعر کے کلام سے موازنہ نہیں کرنا چاہیں گے۔۔ لیکن بائبل کے اثر و عکس کے حوالے سے بات کرنے میں شاید کوئی امر مانع نہ ہو۔

خالدؔ کے اس نعتیہ کلام میں رزمیہ (EPIC) اسپرٹ یا اس کا وہ انداز بطور خاص نمایاں ہے۔ جو کسی صحیفے کا عکس لیے ہوئے ہے۔ خصوصاً جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر خود بھی ان اثرات کا، خصوصاً عہد نامہ قدیم و جدید کا معترف ہے۔

اس اساطیری عنصر کی مزید توسیع کرتے ہوئے خالدؔ نے یونانی اور ہندو دیومالا کی تلمیحات کو بھی شامل کر لیا ہے۔۔ اور خاص یہ کر ذرا سا خطرہ مول لے کر، خالدؔ نے اپنے شوق بے اختیار میں، نعت میں ہند و اصنامی زبان اور لہجہ بھی استعمال کر لیا ہے۔

یہ سب کچھ انہوں نے تاثر کو گہرا کرنے کے لیے، یا رنگ کو زیادہ شوخ کرنے کے لیے کیا ہے۔ تاکہ نعت میں اسراریت (MYSTRY) عظمت اور تخیلی رومانیت، ہیبت و حیرت اور جلال و جمال کے سب ذائقے جمع ہو جائیں۔

(ELBIN LESKY) نے اپنی تازہ ترین کتاب (AHISTORY OF GREEK LITERATURE) میں یونانی اصنامی ادب کے بارے میں بلاغت (RHETORIC) کے غلبے کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں رزمیہ نگار اور ڈرامہ نگار اور شاعر یہ چاہتے تھے کہ قدرت کے تمام اوصاف ان کے ہیرو میں جمع ہو جائیں تاکہ قوم بھی اس قسم کے سب اوصاف کو اپنے اندر جمع کرنے کے لئے انہیں اپنا نمونہ بنا سکے۔ خالدؔ کے یہاں بھی یہ غرض و غایت نظر آتی ہے۔

اب وہی خارا تراشی اور سنگلاخ آفرینی، سو یہ خالدؔ کی نعت تک محدود نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نعت میں خصوصاً منقبت میں کرختی و درشتی اور گراں سنگی بھی سے تاثر سے زیادہ ادب کی سنجیدگی اور محبت کی مٹھاس ہے جو نسبتاً ملائم لفظوں کی غنائی کیفیتوں میں ظاہر ہوتی ہے اور کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابن العربی کی ترجمان الاشواق اردو میں لکھی جا رہی ہے۔ ابن العربی کے یہ اشعار دیکھئے۔

نَعَلِّلَنِیْ عُوجا بالکَثِیبِ وَ عَرِّجَا — علی لَعْلَعٍ، واطلُبْ میاہَ یَلَمْلَمِ

بِاَنَّ بِہا مَنْ قَدْ عَلِمْتَ اَوْ مَن لَھم — صِیامِی وحَجِّی وا عتمادِی و مَوسِمِی

فلا أنسَ یوماً بالمحصَّبِ مِن مِنًی — وبالمَنحَرِ الأعلی أموراً، وزمزمِ

ونادِ القِبابَ الحُمرَ من جانبِ الحمی — تحیۃَ مُشتاقٍ إلیکُم مُتَیَّمِ

وَ نادِ سُعاد والرّبابَ و زینبَ — وھندٍ و سلمی ثم لُبنی و زمزمِ

ترجمان الاشواق کے حوالے سے اب خالدؔ کے یہ اشعار دیکھئے:

حمود و حامد و احمد، محمد و محمود

کریم و منیب، کرام و مکرم و اکرم

درود بر نبی آخر الزمان کہ جو ہے

سلیم و صاحب اسلام و سالم و اسلم
فضیل و فاضل و افضل ، مفضل و مفضال
جمال و تجمیر کا منبع ، و معدن و منجم

بساط حب : امکاں ہے فرشِ پا انداز
شفیق شمائل و گل طلعت و بہار شمیم

ان اشعار میں خارا تراشی کا فن ملائمتوں کا جویا معلوم ہوتا ہے ۔ جہاں آنحضرتؐ کی عظمت کا قصر مقرنس تعمیر کیا جا رہا ہے وہاں آپؐ کے خلق کریم کا خوشگوار اور سکون بخش تاثر بھی دینا مقصود ہے ۔ اس کے پہلو بہ پہلو شاعر کی نہ بجھنے والی پیاس ۔ یا شوق محبت و عقیدت بھی ہے جو ایک لفظ پہ قانع نہیں ہوتی بلکہ ایک لفظ کے صدہا اشتقاقات مہیا کرتا ہے اور اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتا ۔ شاعر کے جذبِ رسول پاکؐ کے بارے میں لاانتہا ئیں اور وسعت طلب ہیں ۔

اور پھر شاعر کو اپنی ایجاد کا ڈر بھی ہے ، اس نے "احیائے مصطفویہ" کی خاطر عظمت و ضخامت کے جن تخیلی نقوش احساس کو ابھارنا اپنا مقصد ٹھہرا لیا ہے یہی تقاضا اسے عظمتوں کے عظیم سے عظیم ، اور ضخیم سے ضخیم تصورات کی بازآفرینی پر بھی مجبور کر رہا ہے (. . . . . وہ اذہان کو عظمت کے نقش واثر سے جبر دینا چاہتا ہے جو کبھی تھی اور اب نہیں . . . . اور اس کے لیے وہ مروجہ "سمت نظم" اسلوب کو ترک کر کے اپنے اجتہاد سے ایک "جہیر الصوت" ، طرز بیان اختراع کرتا ہے تاکہ قلوب اور اذہان محومیت ، اور ارزلیت اور دنبوئی ہمت کے بجائے اقدار عالیہ اور حکمت متعالیہ سے مانوس ہو سکیں ۔ بلاشبہ یہ سنگلاخ آفرینی ہے لیکن ظاہر ہے کہ جن ادوار میں لوگ افکار و معانی کے بارے میں بے حس ہو جاتے ہیں اور بعض مادیات و محسوسات سے دل لگا لیتے ہیں ان میں ایسے شاعر ضرور آتے ہیں جو معقولات کے بجائے محسوسات کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں . . . . وہ صرف حس کی تسکین کرتے ہیں ، ابلاغی معانی سے واسطہ کم رکھتے ہیں . . . . . خالد بھی ان معنوں میں حس کا شاعر ہے ۔ گراں سنگ الفاظ کا شاعر جو سہل انگاری سے اکتا گیا ہے ، محاورہ عام سے اس کا جی بھر گیا ہے ، وہ نادر محاورہ اختیار کر کے ندرت اور جدت کا نیا راستہ کھولتا ہے ، خاقانی نے یہی کیا تھا بیدل اور غالب نے یہی کیا اور ایک حد تک اقبال نے بھی یہی کیا ۔ اگرچہ اس موقعہ پر خالد کا ان سے موازنہ کرنا مقصود نہیں بہرحال عظمت کی جستجو خالد کا محبوب نصب العین ہے ۔ مگر نعت تو ، با ادب با ملاحظہ ہوشیار کا مطالبہ کرتی ہے اس لئے اس کی نعتوں میں اس کے اصل رنگ کا ملائم ترین اور خوشگوار ترین رنگ نکھر آیا ہے کیونکہ خطاب حضرت رسول پاکؐ سے ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں بلند آواز سے بات کرنے میں بھی بے ادبی کا احتمال ہے !

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

عبدالعزیز خالد میری نظر میں

حضرت خالد کے سترہ مجموعہائے شعر میں سے دس گیارہ میرے پاس بھی ہیں جو خود خالد صاحب نے اپنے دستخطوں سے مجھے مرحمت فرمائے تھے اور جو میرا بیش بہا سرمایہ ہیں ان کے مطالعہ سے جو تاثر میں نے لیا وہ یہ ہے :

اوّل : خالد کو حضور ختمی مرتبت سے بے پناہ عقیدت و محبت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر مومن کا دل اس دولت (محبت) کا امین بن جائے۔ اُن کی نعت گوئی کا انداز ہی ایسا ہے کہ سامع (یا قاری) متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اقبال کے دس مجموعہائے شعر کا اساسی نکتہ ہے ، خودی و صفات خودی یعنی علم و عشق ، جنہیں اقبال نے سینکڑوں ، دلکش ، رنگین ، بوقلموں اور متنوع شکلوں ، رُخوں ، لہجوں ، لحنوں ، بحروں اور زمینوں میں پیش کیا تھا۔ اور خالد کا بنیادی موضوع ہے "عشق رسول" آپ کے دو مجموعے جو صرف نعت و تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ منحمنّا اور فارقلیط ہیں۔ منحمنّا میں تقریباً ساڑھے چار سو اشعار ہیں اور فارقلیط میں ۱۳۹۴۔ منحمنا کا قافیہ ہے ، بجم ، خم ، آدم ، حرم ، کرم وغیرہ اور فارقلیط کا 'دیا ، کیا ، خدا ، جدا ، گدا وغیرہ

منحمنّا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

محمدؐ! انجمنِ کن فکاں کا صدر نشین — محمدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم
محمود و حامد و احمدؐ محمدؐ و محمود — کریم و میر کرام و مکرم و اکرم
جمیل و اجمل و کامل ، مکمل و اکمل — ستم زدہ بشریت کا محسنِ اعظم
مے طہور سے سرشار پُرخمار آنکھیں — ہے ماورائے بیاں جن کے کیف کا عالم
وہ جس کے طلعتِ تاباں سے روشنی لے کر — ہے نور بخشِ سحرِ لیلِ مظلم و اقتم

اب فارقلیط کے کچھ اشعار سُنیئے :

شہنشاہِ لولاک و مولائے سدرہ — تو میرے تخیل سے بھی ماورا ہے
تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں — تو صلِّ علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے
چمکتی ہے بجلی سی ابرِ سیہ میں — ترا چہرہ زلفوں میں تو دے رہا ہے
وقارِ سکوت اور حسنِ تکلم — تجھے دینے والے نے کیا کیا دیا ہے

دیکھا آپ نے کہ کس طرح خالد حضورؐ کی ذات و صفات میں ڈوب کر گنگناتا ہے۔

دوم : خالد تاریخ عالم کا بہت بڑا عالم ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونان ، بابل ، مصر ، روما اور ہند کے واقعات اُس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں اور وہ جس واقعہ کو چاہتا ہے قید بحر و وزن میں لے آتا ہے مثلاً"

ل پہلے ۶۵ صفحات صرف نعت کے ہیں اور بعد کے صفحات میں وعظ و فلسفہ ہے۔

۱۔ پکارا تجھے فاطمہ بنت مُرنے

یہ فاطمہ ایک کاہنہ تھی جس نے حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کو شادی سے پہلے کہا تھا کہ اگر تم مجھ سے مباشرت کرو تو میں تمہیں ایک سو اونٹ دوں گی۔ آپ نے انکار کر دیا اور اس تقاضے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی

رأیتُ نور النبوۃ فی وجھک فاردت ان یکون ذلک فی

(فارقلیط صد ۲۵۵)

(مجھے آپ کے چہرے میں نورِ نبوت جھلکتا نظر آیا اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس نور کے ظہور کا واسطہ بنوں)

۲۔ اُٹھا تو غورث کھڑا کانپتا ہے

"غورث بنو محارب سے تعلق رکھتا تھا۔ غزوۂ ذات الرقاع میں حضورؐ دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے محو استراحت تھے کہ غورث آپ کے سر پہ جا پہنچا اور حضور کو جگا کر پوچھنے لگا کہ بتا تجھے اب کون بچائے گا، فرمایا "اللہ"۔" وہ چکر کھا کر گر پڑا اور حضورؐ نے تلوار سونت کر پوچھا "بتا اب تجھے کون بچائے گا"۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا اور حضورؐ نے فرمایا "جاؤ میں بدلہ نہیں لیا کرتا"۔ (بخاری و تلقیح ابن الجوزی)

۳۔ اُدھر سیف بن ذی یزن آرہا ہے

سیف یمن کا ایک سردار تھا۔ جب یمن پر حبشہ والے قابض ہو گئے تو اس نے کسریٰ سے فوجی امداد لے کر یمن کو آزاد کرا لیا تھا۔ یمن پر حبشہ کے چار گورنروں نے بہتر سال حکومت کی تھی پہلا ارباط تھا، دوسرا ابرہہ، تیسرا یکسوم بن ابرہہ اور چوتھا مسروق بن ابرہہ تھا۔

(سیرت ابن ہشام بحوالہ فارقلیط صفحہ ۲۶۴)

۴۔ فضالہ کے سینے پہ دستِ مبارک جو قاتل تھا پل بھر میں عاشق بنا ہے

فتح مکہ کے بعد حضور کعبہ کا طواف فرما رہے تھے۔ کہ اُن کی نظر فضالہ بن عمیر لیثی پر پڑ گئی۔ فضالہ حضور کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ آپ نے پوچھا "فضالہ! کیا سوچ رہے ہو؟" کہنے لگا کچھ نہیں میں تو اللہ کو یاد کر رہا ہوں" فرمایا "فضالہ! توبہ کرو۔ ساتھ ہی دستِ مبارک اُس کے سینے پر رکھ دیا اور فضالہ فوراً ایمان لے آیا۔ (ابن ہشام بحوالہ فارقلیط صد ۲۶۷)

۵۔ ع یہ زہرہ کی ہم شکل ماگندیہ ہے۔

ماگندیہ ایک برہمن لڑکی تھی۔ جسے اس کا باپ مہاتما بدھ کے پاس لے گیا اور درخواست کی کہ وہ اسے اپنی زوجیت میں لے لیں۔ آپ نے جواب دیا کہ یہ ناپاک جسم پاؤں سے بھی چھونے کے قابل نہیں (فارقلیط ۲۹۳)

خالد کے اشعار میں کئی ہزار تلمیحات ہیں۔ فارقلیط کے صرف دو صفحات (۲۲، ۲۳) میں ان کی تعداد ۱۸ ہے۔ یعنی شیخ الاباطح، بنتِ اہدم، ابوطالب، آمنہ بنتِ وہب، ثوبیہ، بنو زہرہ، سعیر، طور، تیماں، فاران، شعب، صفا، ابراہیم، کلیم، جغفانی، مجمّی اور سلیمان۔

سوم: خالد آیات، احادیث اور امثالِ عرب کو اشعار میں اس بے تکلفی و روانی سے استعمال کرتا ہے کہ اُس کے کمالِ فن پہ حیرت آتی ہے۔ چند مثالیں حاضر ہیں۔

ا۔ وکنّا نخوض مع الخائضین (فارقلیط صد ۵۸)

ب۔ شتابان ہیں من کلِّ فجٍّ عمیق (ر ر صد ۶۴)

ج۔ تو لب پہ قوموا الیٰ ربکم کی (فارقلیط صد ۲۸)

د۔ واشکو الی اللہ بثّی وحزنی (ر ر صد ۹۱)

اِن تمام آیات کا وزن ہے۔ فعولن فعولن فعولن فعولن

چہارم: جس طرح کائنات میں گلشن بھی ہیں اور صحرا بھی، پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ آگ بھی ہے اور پانی بھی، اسی طرح کلامِ خالد بھی دو متضاد صفات کا مظہر ہے۔ کہیں اُسکے کلام میں لطافت، سلاست، شگفتگی، تازگی اور روانی ہے اور کہیں اغلاق، تاکید اور گرہ در گرہ اشکال۔ دونوں اصناف کے نمونے دیکھئے۔

لطافت: فرماتے ہیں:

(ا)
نیلگوں بحرِ شفق پوش کی پہنائی میں — جھلکی بینائے سحر کشتیٔ مہ ڈوب گئی
کہکشاں ماند ہوئی قرمزی موجیں ابھریں — رات بھر ذہن میں افکارِ پریشاں کا ہجوم
(دکانِ شیشہ گر)

یہ تو تھا کلامِ خالد کا ایک رُخ، اب دوسرے رُخ کے چند اشعار دیکھئے:

یہ آلودۂ معصیت، مست طامح — صریع الغوانی ہے، کفر آشنا ہے
شریکِ حیات اُس کی اتم وحبیبہ — حصانٌ جلیع علیٌ زوجہا ہے
سلیمیٰ و زرّینہ بلقیس و عذرا — دل اُن سے طلبگارِ جامِ ولا ہے
(فارقلیط)

خالد کے ایک چوتھائی اشعار میں اسی قسم کا اِغلاق پایا جاتا ہے۔ منحنّا کے ابتدائی ۱۵ صفحات (۸-۲۲) میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔
نغم، مغنّم، انغم، تشید، باربدی، مجّم، کلمانی، طلیعہ، مجاق وکلف، بارسمِ الملبّسم، نسِم، اتتم، ویژگان، تفصیل، منجّم، تدید، عکرٖ، معکّم، متقادم، مغشّم، قیان، گگہ وزیم، پرترم، پرنرم، جگادن ہار، تنت چھن، الم۔

اِس اغلاق کا کوئی فائدہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ اس کے نقصانات سے انکار نہیں ہوسکتا۔

(ا) اِس اِغلاق سے سینکڑوں اشعار ناقابلِ فہم ہو گئے ہیں۔ معمولی قابلیت کا آدمی انہیں کیا سمجھے گا۔ متعدد اشعار میری سمجھ میں بھی نہیں آئے۔

(ب) اگر کوئی شاعر صاحبِ پیغام بھی ہو تو مشکل پسندی اُس کے پیغام کو عام نہیں ہونے دیتی۔

(ج) علمائے معانی کے ہاں کلامِ فصیح وہ ہے جو نامانوس و ثقیل الفاظ سے پاک ہو۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت خالد کے مغلق اشعار فصیح ہیں؟

اس کا جواب جناب ماہر القادری نے یُوں دیا ہے:

"بعض مقامات پہ اُن کی شاعرانہ بلندیوں کو دیکھ کر وجدان لطف و آسودگی محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کلام کی پستیوں، کمزوریوں، بے ربطیوں اور سپاٹ اندازِ بیاں سے ذوق و وجدان تلملا کے رہ جاتے ہیں، اور طبیعت خاصی بدمزہ ہوجاتی ہے۔۔۔ ۔۔۔۔ خالد کی شاعری میں تلمیحات کی اتنی فراوانی اور کثرت ہے کہ اُن کی کتابیں تلمیحات کا ایک جنگل نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔ آدمی انہیں پڑھتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ شاعری کی کسی کتاب کی بجائے نثر کی کتاب کے انڈکس کو پڑھ رہا ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ شاعری کیا ہوئی۔ یہ تو لوگوں پر اپنی معلومات کی دھونس جمانے کی سعیٔ نامشکور ہے۔"

(سیارہ — عبدالعزیز خالد نمبر حصہ اوّل ص۵۳)

حضرت ماہر القادری کے بنیادی خیال سے تو مجھے کسی حد تک اتفاق ہے لیکن تلخ اندازِ بیاں سے قدرے اختلاف ہے۔ پھر خیال آتا ہے کہ دونوں صفِ اوّل کے مشاہیر، ملت کے لئے سرمایۂ ناز اور اقلیمِ شعر و حکمت کے فرمانروا ہیں، فرق یہ کہ حضرت ماہر عمر میں بڑے ہیں اگر بڑا بھائی چھوٹے بھائی کو کوئی تلخ بات کہہ بھی دے تو یہ معیوب نہیں۔

سید ضمیر جعفری

اُردو شاعری کا عقابِ اعظم

اگلے روز جب لاہور سے جناب صفدر محمود نے یہ اطلاع دی کہ پاکستان نیشنل سنٹر "پروازِ عقاب" کی اشاعت پر ایک تکریمی تقریب کا اہتمام کر رہا ہے اور ہماری خواہش ہے تم اس تقریب میں عبدالعزیز خالد کی شاعری پر مقالہ پڑھو، تو میں دل ہی دل میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ میں نے سوچا میں تو اُن کی بعض کتابوں کے نام پڑھتے ہجے املا کی چولیں بھی درست نہیں رکھ سکتا، اُن کی شاعری پر مقالہ کیا خاک لکھ سکوں گا، سو میں نے عرض کیا: خالد صاحب میرے نہایت محترم اور عزیز دوست ہیں۔ میرا اپنا بہت جی چاہتا ہے کہ اس تقریب میں حاضر ہو کر اپنی باہیں اُن کے گلے میں ڈال دوں، مگر آپ جانتے ہیں کہ شعروں کو تنقید کی چھاننی میں چھاننے پھٹکنے کا ہنر مجھے نہیں آتا۔ پچھیرے کے درشت سے گزرنے کی توقع عبث ہے۔ ہاں اگر کچھ لکھا جا سکا تو "پرواز" اور "عقاب" دونوں کے بارے میں کچھ رلی ملی باتیں لکھ لاؤں گا۔ "پرواز" کم ہوگی "عقاب" زیادہ ہوگا۔

سیاست کی دنیا میں تکریم وارادت کی بنا پر لیڈروں کو القاب دینے کا رواج ایک مدت سے رائج ہے۔ ایک دو "شیر" ہر عہد میں موجود رہے ہیں۔ "شاہین" بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کچھ دوسرے چرند پرند بھی ہوں گے۔ اس تکلف سے پراگر برگزیدہ شعرا کو بھی القاب دیئے جائیں تو میرے خیال میں عبدالعزیز خالد کو اُردو شاعری کا "عقابِ اعظم" کہنا کچھ غلط نہ ہوگا، بلکہ مجھے اندیشہ ہے اگر ہم نے کوتاہی برتی تو عربی، فارسی والے ان کو اپنا عقاب بنا لیں گے کیونکہ اپنی تخلیقی جولانگاہ میں وہ زیادہ تر عربی، فارسی پر ہی جھپٹے ہیں، اُردو کی طرف تو یونہی جھپٹنے کے وقت بسیرے کے واسطے لپکتے ہیں، مگر ہم اُردو والوں کو اُن کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ یہ عقاب جب بھی اُردو کی طرف آتا ہے عربی اور فارسی کے بہت سے کار آمد الفاظ بھی دُور دُور سے مار لاتا ہے۔

عبدالعزیز خالد، محاسن و مقاصد سے لدا پھندا شعر کہتے ہیں۔ پاکستان کے سینئر شعرا میں وہ اپنا الگ مسلک بلکہ مصلّیٰ رکھتے ہیں اور جس جگہ وہ بیٹھے ہیں اُن کے آگے کوئی دوسرا بیٹھا ہوا نظر نہیں آتا اور جس سنگلاخ راستے پر وہ چل رہے ہیں، اُن کے پیچھے چلنے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ یوں بھی "عقاب" ہمیشہ تنہا اُڑتا ہے تلیروں یا مرغابیوں کے مانند غول باندھ کر نہیں اُڑتا۔ آپ دو عقابوں کو ایک ساتھ سے چھوڑ کر دیکھئے، ایک دائیں کو نکل جائے گا، دوسرا بائیں کو۔ اپنے معاصر اور ہم چشم پرندوں میں عقاب اونچی، ملبی اور تند و تیز پروازوں کے لئے ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ یہی امتیاز عبدالعزیز خالد کو اپنے معاصر شعرا میں حاصل ہے۔ اُن کی شاعری بلند آہنگ بھی ہے، بلند پرواز بھی اور تیز رَو بھی۔ "عقاب" جہاں گشت پرندہ ہے۔ اس کو پرندوں کا "ابن انشا" کہنا چاہیئے۔ جو عقاب صبح کے وقت چولستان کے صحرا میں کسی ٹیکری پر بیٹھا تھا، کچھ عجب نہیں کہ عراق سے آیا ہو۔

خالد کی پروازِ فکر کی رینج (۱۹۸۸ء) بھی نیل سے تا کاشغر پھیلی ہوئی ہے، بلکہ اب تو یہ عقاب ویت نام کی طرف بھی جا نکلا ہے۔ تہذیب و فن، فلسفہ و فکر، بصیرت و حکمت، تاریخ و تمدن، الغرض کائنات اور انسان کا کون سا عنوان ہے جو اس کے بال و پر کے نیچے نہ آیا۔ کہیں کہیں تو بصیرت ہی بصیرت میں عبادت کا سرور بھی میسر آجاتا ہے اور کبھی کبھی تاریخ سے گزر کر جغرافیے میں بھی چلے جاتے ہیں، مگر یہ نہ سمجھیے کہ وہ پرواز کی تیزی یا تندی میں تاریخ کے چوکھٹے سے نکل جاتے ہیں۔ جیسا کہ بعض اوقات جیٹ ہوائی جہاز اُترتے وقت رن وے سے آگے نکل جاتے ہیں۔ خالد کے بارے میں یہ بات سوچی بھی نہیں جا سکتی تا کیونکہ اپنے فن پر اُن کو ایک قسم کی مطلق و جو عملی بکمال و کامل دخل حاصل ہے۔ ان کا شعر ایک وقت دل پر بھی دستک دیتا ہے اور دماغ پر بھی۔ ان کا شعور دراصل وہیں جاتا ہے جہاں وہ اس کو بھیجتے ہیں۔ یہ

نہیں کہ کئی دوسرے شعرا کی طرح اشعر دل کی طرف رجوع کریں اور وہ جگہ میں تراز و ہو جائے۔ یا زیادہ سے زیادہ کوچۂ یار میں جا کر بیٹھ رہے کہ ع

مرنا تری گلی میں ، جینا تری گلی میں

ان کے فن و فکر کے مختلف شاداب اور وسیع اُفقوں کا کما حقہٗ تجزیہ کرنا فضلائے تنقید کا منصب ہے۔ میرے ذاتی احساسات میں جو تاثر سب سے زیادہ گہرا ہے ، وہ ان کے شعر میں "چونکاہٹ" کا عنصر ہے۔ وہ اپنے قاری کو شروع سے آخر تک "پابہ پا" یعنی ON THE TOE رکھتے ہیں۔ مجھے ان کی کوئی ایسی نظم یاد نہیں آ رہی جو پڑھنے کے بعد اچھا خاصا ہوم ورک نہ دے گئی ہو۔

میں جن دنوں خالد صاحب کو صرف ان کی نظموں کے ذریعے ہی سے جانتا تھا ، مجھے اُن سے ملتے ہوئے کچھ ڈر سا لگتا تھا۔ ان کی نظمیں دیکھ کر گمان ہوتا کوئی عرب شاعر ہے جو ایران میں سے ہوتا ہوا ہمارے ہاں آ نکلا ہے۔ بعض اوقات الفاظ کی سطح مرتفع اس قدر دشوار ہوتی کہ آدمی پہلے مصرعے پر ہانپ کر بیٹھ جائے۔ ان کے جاں نثار قارئین کے متعلق ہم نے روایت سنی تھی کہ وہ بے چارے ان کی تصنیفات کو پہلے کئی کئی روز تک اپنے بک شیلف میں مولانا محمد حسین آزاد کے لکھے ہوئے اردو کے قاعدوں کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں کہ شاید اُن کی صحبت میں بیٹھنے سے یہ قدرے آسان ہو جائیں۔

بہر کیف ہمارے ذہن میں ان کا "امیج" (IMAGE) ایک نہایت ثقہ اور مستعلیق بھرے بھرے اور بھلے چنگے عالم فاضل شخص کا تھا کہ ہم ان کی جو تیاں تو سیدھی کر سکتے تھے ، مگر اُن کے گلے سے لپٹ کر قہقہہ لگانے کا حوصلہ رکھتے تھے اور نہ آرزو۔ دراصل ہم طبعاً کمزور اور بے توفیق لوگوں میں سے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے گھٹنوں پر آ کر جانول ڈال جائیں ، لیکن خالد صاحب اپنی نظموں کی تیزی و تہہ داری ، گونج گمک اور طول زماں سے ، اُن مستعد اور چوکس لوگوں کے زمرے میں دکھائی دیتے تھے جو اگر اوپر اٹھ جائیں تو زمینوں اور آسمانوں میں نہیں سماتے اور اگر زمین پر رینگنے لگیں تو جا بجا اللہ لوک کے مرشدوں کی طرح ، دن بھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کچھ یہ وہم سا بھی تھا کہ اُن کی گفتگو کا ترجمہ کون کرے گا؟ پہلی مرتبہ جب میں نے کسی رسالے میں ان کی تصویر دیکھی ، تو غزالوں جیسے سبک ، سڈول ، گلبدن سا نوجوان دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہلکا پھلکا ، متبسم شخص "غزل الغزلات" کا شاعر ہو سکتا ہے۔

یہ تو ابتدا کی بات تھی۔ بعد میں جب ہمیں اپنے دوستوں مشتاق احمد یوسفی ، ابن انشا اور کرنل محمد خاں کی وساطت سے ان کے بارے میں یہ اطلاع ملنے لگیں کہ خالد صرف شاعر کے طور پر ہی قدرے مشکل ہیں ، آدمی کے طور پہ نہایت آسان ہیں تو ہمارا خوف کچھ کم ہوا۔ اور جب دسمبر ۱۹۷۱ء میں ایک روز اسلام آباد میں وہ اچانک میرے دفتر میں تشریف لے آئے ، تو ان سے مل کر جی نہال ہو گیا۔ ان کے چہرے پر عرفی فارسی کی ایک سلوٹ بھی تو نہ تھی۔ شاعری جتنی سنجیدہ تھی ، باتیں اتنی ہی شگفتہ شوخ ، پر تکلف ، پُر سکون اور مرصع ، خود سادہ ، درویش منش اور کھلے کھلے۔ شاعری میں فولاد ، زندگی میں ریشم ہی ریشم ، بلکہ ان کے الفاظ میں حریر و پرنیاں۔ خالد اس وقت اٹھارہ کتابوں کے مصنف (پرواز عقاب ان کی انیسویں کتاب ہے) اور اٹھارہ ہی محکموں کے سربراہ تھے۔ اکثر ادیبوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ آدھ سیر ہوں تو اپنے کو ڈیڑھ سیر بتلاتے ہیں۔ خالد کے انکسار کا یہ حال ہے کہ حالانکہ ان کی ایک ایک کتاب ڈیڑھ ڈیڑھ سیر کی ہو گی ، لیکن وہ اپنے آپ کو آدھ سیر بھی نہیں کہتے

کتابوں کی بات پر یاد آیا کہ آپ نے مجھے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ (SET) عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے ، مگر جب کبھی راولپنڈی آتے ہیں ، معذرت کر دیتے ہیں — "او ہو ، یار ، میں اس مرتبہ ہوائی جہاز سے آیا ہوں" — یوں بھی وہ کتابیں درآمد کرتے ہیں ، برآمد نہیں کرتے۔ ان کے پاس کتابوں کا نہایت وسیع اور وقیع ذخیرہ ہے۔ علم نے ان کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ ان کا بس چلے ، تو رکابیوں ، دیگچیوں وغیرہ کو اٹھوا کر ، باورچی خانے میں بھی کتابوں کے شیلف رکھوا دیں۔ ان کے گھر کو "دولت خانہ" کی بجائے "کتب خانہ" کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔

عبدالعزیز خالد کی علمی و ادبی پیداوار کی مقدار اور معیار کو دیکھ کر ہمیشہ حیرت ہوتی کہ یہ شخص مضامین نو بہ نو کے انبار لگانے کے لیے اتنا وقت ، اتنی یکسوئی کہاں سے نکال لاتا ہے۔ ملاقات ہوئی ، تو میں نے سب سے پہلے یہی سوال پوچھا کہ حضرت آپ اپنی اس قدر معروف زندگی میں اتنا کچھ لکھ کیسے لیتے ہیں؟ آپ جیسے معروف شخص کو ایسی وزن دار شاعری کی اٹھارہ کتابیں لکھنے کے لیے اٹھارہ برس جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ اس پر وہ بس مسکرا دیئے۔ وہی کار آمد والی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ جو اُن کا زیور بھی ہے اور زرہ بھی ؎

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے لائق
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

جب ان کو قدرے تفصیل سے دیکھا، تو اندازہ ہوا کہ اگرچہ سرکاری طور پر تو آپ کبھی قید نہیں ہوئے، مگر رضاکارانہ طور پر ایک "زنجیر رم آہو" اپنے پیروں میں ڈال رکھی ہے۔ خالد ان نابغوں میں سے ہیں جن کو قدرت بصیرت کے ساتھ ساتھ عزم و ہمت کا بھی وافر جوہر عطا کر دیتی ہے۔ یہ لوگ بچپن سے نکلتے ہیں، شاہراہ حیات کے تمام موڑ، پل، پگڈنڈیاں اور سنگ میل گن لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ سفر کی سمت ان پر بالکل واضح ہوتی ہے، بلکہ منزل کا نقشہ بھی ہر وقت سامنے رہتا ہے۔ شرافت خالد کی اساس، ملازمت معاش اور شاعری پیاس ہے۔ بوچی منہ کے بقول:

اک سیدھا سادا سائیں، بے لوث کھرا شخص

وہ چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ افلاک سے نالوں کا جواب بھی آنے لگ گیا۔ یعنی اشعار ان پر اترنے شروع ہو گئے اور لگتا تو یوں ہے کہ عبدالعزیز خالد نے اسی وقت اس لائن میں "عزیز جہاں" ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کی زندگی بہرحال اسی محور پر گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ روٹی ایک وقت کھاتے ہیں، شعر دو وقت کہتے ہیں۔ اپنا وزن کبھی بڑھنے نہیں دیتے تاکہ شعر کا وزن بڑھ سکے۔ گھر میں آنے کے بعد، گھر سے باہر کم ہی نکلتے ہیں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بیگم، بچے یا ملازم سنتے ہیں خود دل کی گھنٹی پہ کان لگائے رکھتے ہیں۔ ہر وقت کچھ پڑھ رہے یا لکھ رہے ہوتے ہیں۔ اردو ادبیات کی ذیل میں لکھا گیا شاید ہی کوئی لفظ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگا مگر جب خود کچھ لکھتے ہیں تو تمام تر اپنی فیکٹری کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نئے نکور، نادر، جڑاؤ، مرصع۔ ان کی تحریریں دیکھ کر بعض اوقات یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ دوسروں کی تحریریں پڑھتے ہی نہیں۔ الفاظ ان کے ذہن میں دھان اور گیہوں کی طرح اگتے ہیں۔ ان کے معمولات اور مشاغل کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ان کی شاعری کی سپلائی لائن میں کوئی خلل نہ آنے پائے۔ مثلاً صبح نہار منہ ورزش میں وہ سر کے بل کھڑے ہوتے ہیں، تو اس لئے کہ ان کا شعر اپنے قدموں پہ کھڑا رہ سکے۔ دوسری جنگ عظیم میں، پہلی جنگ عظیم کا ایک معمر و بیزار گزیٹیڈ اسحاق ہمارے یونٹ میں "سویلین آفس بوائے" کے طور پہ کام کرتا تھا۔ اس کے تجربات کا نچوڑ یہ تھا کہ توپ کے نیچے زمین جتنی سخت ہوگی، گولہ اتنا ہی اونچا جائیگا۔ خالد صاحب بارہ مہینے زمین پہ سوتے ہیں تاکہ ان کا شعر آسمان کی خبر لا سکے۔ وہ زندگی میں لذت سے زیادہ افادیت کے قائل ہیں۔ مونگ پھلی چھلکے سمیت تناول فرماتے ہیں۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ رات کو دو چار کتابیں تکیے کے نیچے ہوتی ہیں۔ ملازمت غالباً اس لئے کرتے ہیں کہ بال بچوں کے علاوہ اپنے کتب خانے کا پیٹ بھر سکیں۔ خالد ان اصحاب خیر میں سے ہیں جو خود تشنہ رہتے، مگر زندگی کو سیراب کر جاتے ہیں

ترجمے کے فن میں خالد خاص میلان و ملکہ رکھتے ہیں۔ سیفو ہو یا ٹیگور وہ اصل مصنف کی انگلی پکڑ کر نہیں چلتے، بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی روح پر ایک نظر ڈال دیتے ہیں۔ ان کا ترجمہ رسمی یا آئینی نہیں ہوتا، ذوقی اور تخلیقی ہوتا ہے۔ غیر زبان کی کافرسے کافر نظم کو مسلمان کر کے وہ اسے کچھ اس چاؤ چوچلے سے اپنے ادبی معاشرے میں جذب کر لیتے ہیں کہ نظم نووارد تو ہوتی ہے، اجنبی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تو وہ دوسری زبان کی نظموں کو گویا بیاہ کر اپنے روپ میں مستقل لے آتے ہیں۔

گذشتہ برس جب اسلام آباد میں ان سے ملاقاتوں کا سبب ہوا، تو ترجمے کی طرف ان کا میلان بہت بڑھا ہوا تھا۔ "پرواز عقاب" کی پروازیں تازہ تازہ اڑ رہی تھیں۔ راولپنڈی کی ادبی محفلوں میں جب کبھی کلام پیش کرتے، انہیں تراجم میں سے ایک آدھ پرواز سنا یا دکھا دیا کرتے۔ ایک لمبی پرواز تو ان کی زبان سے ہم نے عین ایک ایسے مقام پر سنی کہ عقاب اگر نشیمن بناتے ہیں، تو اسی جگہ بنانا چاہیے۔ یہ پشتو کے غیر فانی شاعر خوشحال خان خٹک کا مزار تھا۔ ان دنوں ترجمے کی ان کی لگن سے اندازہ ہوتا تھا کہ بوچی منہ کے بعد وہ بعض دوسرے مصنفین کا رخ بھی کریں گے اور ان کی آؤٹ پٹ کی رفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ انشاءاللہ بہت جلد، انگریزی کی کوئی قابل توجہ کتاب شعر ترجمے کی محتاج نہ رہے گی۔ میری طرح کے ذہنی طور پر پسماندہ قارئین کو تو یہ توقع بھی ہو چلی تھی کہ خالد صاحب لگے ہاتھوں بعض اپنی کتابوں کا بھی ترجمہ کر ڈالیں گے۔

قدرت نے خالد صاحب کو غیر معمولی طور پر زرخیز ذہن بخشا ہے، مگر اس کو جلا، ان کی لگن اور تپسیا سے ملی ہے۔ ان کی زندگی، شعر و ادب کی برومندی کے لئے ایک مجاہدے کا سا انداز رکھتی ہے۔ وہ جس ریاضت سے اپنے باغِ سخن کی آبیاری کرتے ہیں، اس کا ثمر یہ ہے کہ ان کے باغ میں کچا ثمر لگتا ہی نہیں۔ اپنی تیز بینی اور تیز رفتاری کی بے پناہ صلاحیت کے صدقے میں مہینوں کا کام دنوں میں نمٹا دیتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے ان کے ہمراہ ایک سفر میں ہوا۔

اتوار کی ٹھٹھری ہوئی صبح تھی کہ اچانک خالد صاحب تشریف لائے۔ ارشاد فرمایا: "چلو آج خوشحال خان خٹک کے مرقد پر حاضری دے آئیں۔" یہ میری بھی ایک دیرینہ آرزو تھی۔ پشاور آتے جاتے اکوڑہ خٹک سے گزرتے وقت دل ہمیشہ مزار کی سمت جھک جھک جاتا، مگر مزار سڑک سے چند میل ہٹ کر دامنِ کوہ میں واقع ہے۔ ادھر ہمارے پاس کبھی وقت نہ ہوتا اور کبھی حوصلہ نہ ہوتا۔ اب تو یہی سوچ رہے تھے کہ شاید مزار خود ہی کسی وقت سڑک پر آ جائے ایسے میں خالد صاحب جب یہ تجویز لے کر آئے، تو گویا کنواں پیاسے کے پاس چل کر آ گیا۔ ہم جیسے بیٹھے تھے، اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لئے۔

گھر سے نکلتے ہی ارشاد فرمایا: "کہو، تو سلطان رشک کو بھی ساتھ لیتے چلیں۔ دوستوں کے بغیر سفر بے مزہ ہوتا ہے۔"

میں نے عرض کیا: "بے شک"

اب سلطان رشک شہر کے ایسے گنجان تجارتی علاقے میں رہتے ہیں کہ اُدھر جائیں تو ایسا لگتا ہے کہ سارا شہر اسی علاقے میں رہتا ہے۔ بار برداری کے تمام ریڑھوں، ٹھیلوں، ٹرکوں، اونٹوں اور گدھوں کا ہیڈ کوارٹر اسی علاقے میں واقع ہے۔ بوریوں، کنستروں میں جو سامان باہر سے راولپنڈی میں آتا ہے، پہلے یہیں آتا ہے۔ نکلتا ہے تو یہیں سے نکلتا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ موٹر کی سواری کے خوگر ہو جاتے ہیں وہ انبوہِ عوام میں چلنے پھرنے کے آداب بھول جاتے ہیں اسلام آباد کے میرے ایک دوست نرنکاری بازار میں گھی کا کنستر لینے گئے تو لوٹتے پہ کنستر کھا کے آئے۔ مجھے ڈر تھا کہ خالد صاحب وہاں کسی ریڑھے سے نہ ٹکرا جائیں۔ مگر خالد صاحب تھے کہ ریڑھوں اور ٹھیلوں وغیرہ کے ہجوم میں اکبر الہ آبادی کے مشہور و معروف "آبِ لوڈر" کی طرح گزرتے چلے جا رہے تھے۔ سرکتے ہوئے اور سمٹتے ہوئے، لچکتے ہوئے اور لپکتے ہوئے۔ ایمرجنسی ہو تو خالد صاحب سوئی کے ناکے میں سے بھی گزر سکتے ہیں۔ وہ اگر بڑے شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے اتھلیٹ ہوتے۔ ع

بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

ٹیکسلا سے کچھ پہلے، جنرل نکلسن کی لاٹ کے پاس، مغلوں کے زمانے کی سڑک کا ایک ٹکڑا اب تک بچا ہوا ہے۔ اس پر نظر جا پڑی تو موٹر رکوا کر اس سڑک کی پیمائش کو چل پڑے۔ سڑک تو خیر ڈیڑھ دو فرلانگ جا کر تاریخ میں غائب ہو جاتی ہے، لیکن آپ تاریخ کی جس لہر پہ سوار تھے، اگر میں اور سلطان رشک ہاتھ جوڑ کر ان کا راستہ نہ روک لیتے تو شاید روات کے قلعے میں جا نکلتے۔ خدا کا شکر کہ ٹیکسلا کے کھنڈرات آپ کے چھانے پھٹکے ہوئے تھے، مگر ہماری بد قسمتی کہ حسن ابدال میں آپ پہلی مرتبہ قدم رنجہ فرما رہے تھے اور یہ وہ خطہ ہے کہ اس کے چشموں اور شادابی کے باعث اس کو ممتاز انگریز شاعر ورڈز ورتھ کا "دیوانِ مصور" سمجھنا چاہیے کئی آثارِ قدیمہ بھی ان مرغزاروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں لالہ رخ کا مقبرہ بالخصوص اس وجہ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں لالہ رخ کی قبر سرے سے موجود ہی نہیں ہے خالد صاحب نے ایک ایک چشمے کا گیت سنا، ہر پرانی عمارت کو گلے لگا کر ملے اور راستے میں جتنی بھی نئی اور پرانی مسجدیں آئیں، ان کے اندر جا کر نمازیوں کی ویلفیئر کے انتظامات کا جائزہ لیا، مگر اس کے معنی تھے سات آٹھ میل کی پیدل گردش اور جب وہ آثارِ قدیمہ کی طرف جاتے ہیں، تو چل کر نہیں جاتے، دوڑ کر جاتے ہیں۔ انہیں شاید اس بات کا دھڑکا رہتا ہے کہ ان کے پہنچنے تک آثارِ قدیمہ کہیں بالکل ہی نہ مرجھا جائیں

ہمارا اگلا پڑاؤ اٹک کے قلعے پر تھا۔ ہم خیال کر رہے تھے کہ مغلوں کی سڑک اور لالہ رخ وغیرہ نے مل ملا کر ان کو خستہ کر دیا ہوگا، مگر اس بوڑھے کو دیکھ کر آپ دوبارہ جوان ہو گئے۔ چنانچہ جوانوں کی طرح کلکاریاں بھرتے، فصیلِ قلعہ پر جہاں تک ہاتھ پہنچتا تھا، ایک ایک اینٹ پر دستِ شفقت پھیرتے، تاریخ کے ساتھ سرگوشیاں کرتے، دریائے سندھ میں اتر جانا چاہتے تھے، مگر اس مہم میں ہم ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ ان کی شاعری سے بھی تین چار مشخص نسبتیں رکھتا ہے، مثلاً دونوں بہت گہرے ہیں، دونوں کے کنارے بلند ہیں، دونوں بلند آہنگ، آگے جا کر دریا کا پاٹ بھی ان کے

شاعری کی طرح چوڑا ہو جاتا ہے۔

خوشحال خان خٹک کے مزار پر حاضر ہوئے تو آپ قلبی کیفیت کے ایک ایسے گہرے اور طویل غوطے میں غائب ہوگئے کہ ہم تو ان کی بازیابی کی طرف سے ناامید ہو چلے تھے۔ ہم نے تو صرف فاتحہ پڑھی تھی، آپ خوشحال بابا سے گویا ملاقات کر کے آئے تھے۔ سچ ہے ؎

کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

مزار پہ حاضری کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، مگر خالد صاحب بجد وضع دار انسان ہیں، کہنے لگے:

کرنل فصیح احمد اور بیگم رضیہ فصیح احمد (اردو کی ممتاز ناول نگار) آج کل رسالپور میں ہوتے ہیں۔ جی نہیں مانتا کہ اتنے قریب آ کر ان سے ملے بغیر لوٹ جائیں۔"

سو اکوڑہ خٹک سے رسالپور پہنچے، مگر اتنے میں پشاور بقدر تیس میل ہم سے قریب آگیا۔ اب وہ احمد فراز، محسن احسان، تاج سعید، فارغ بخاری اور خاطر غزنوی کا تذکرہ کچھ اس پیرائے میں کرنے لگے کہ اگر ہم رسالپور سے راولپنڈی واپس چلے گئے تو یہ لوگ کیا کہیں گے، لیکن میں نے اور سلطان رشک نے ان کی ایک نہ چلنے دی، لہٰذا ناچار ان کو راولپنڈی کی طرف چلنا پڑا۔ اور جب ہم راولپنڈی پہنچے تو رات خاصی بھیگ چکی تھی اور خود راولپنڈی بارش میں بھیگ رہا تھا۔ میں تو اس رات ایسا لوٹ کر سویا کہ اگلے روز دفتر میں بھی دیدہ و دل ہی کھول کر بیٹھا رہا۔ البتہ جب سہ پہر کو ان سے ملاقات ہوئی تو ایک معرکہ آرا تازہ نظم ان سے سننے کو مل گئی اور جب وہ نظم سنا رہے تھے تو علاقائی زبان کی یہ کہاوت میرے ذہن میں کسمسا رہی تھی:

"گوہر مرنے کے بعد کھال اور عقاب شہرت چھوڑ جاتا ہے۔"

اور عقاب میرے سامنے بیٹھا رومال سے اپنی چونچ، یعنی ناک رگڑ رہا تھا۔

عارف عبد المتین

عبدالعزیز خالد کی غزل گوئی

عبدالعزیز خالد اپنے آپ کو بنیادی طور پر نظم گو خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب کبھی غزل گوئی کی طرف مائل ہوتے ہیں تو خود اپنے آپ پر تعجب کرنے لگتے ہیں اور اس عالمِ استعجاب کا اظہار یوں کرتے ہیں:

انقلابات ہیں زمانے کے
خالدِ نظم گو، غزل خواں ہے!

حالانکہ میرا پختہ یقین ہے کہ عبدالعزیز خالد اصلاً ایک غزل گو ہیں اور اسی سبب سے اُن کی بہترین نظموں میں سے بیشتر غزل یا قصیدہ (جس میں سے خود غزل کا ظہور ہوا ہے) کی ہیئت کی علمبردار ہیں۔ ان نظموں میں لہجے کی غنائیت، بات کرنے کا ایمائی اور رمزیہ انداز اور فکر و ادراک کے بجائے جذبہ و احساس کی سطح سے ابلاغ کا مستحکم میلان اِس امر کا آئینہ دار ہے کہ ان کی تخلیق غزل کی اساسی خصوصیات کی مرہونِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان کی غزل گوئی پر اظہارِ خیال کی آرزو کی ہے۔ اس آرزو کی تکمیل شاید عبدالعزیز خالد اور ان کی شاعری کی بہتر تفہیم میں اعانت کا موجب بن سکے۔ عبدالعزیز خالد کی غزل، فن اور شخصیت کا ایک دلآویز نقطۂ اتصال پیش کرتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے ہاں فن کا فروغ اور شخصیت کا ارتقا ایک دوسرے کی باہنوں میں باہنیں ڈال کر چلتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے اس خیال کی عملی تفسیر ارزانی کرتا ہے کہ:

شعر و افسانہ کے پردے میں خم و پیچ کے ساتھ
لکھیں اربابِ قلم اپنی سوانح عمری

ہم ان کے غزلیہ اشعار کے ذریعہ ان کے کردار کے خدوخال اور ان کی ذات کی ایک ایک پرت سے کماحقہٗ آگاہ ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل روایتی غزل کی طرح ہمیں مختلف بلکہ متضاد سیرتوں کے افکار و جذبات کی عکاس بن کر بیک وقت کفر و ایمان، قنوطیت و رجائیت، رندی و پرہیزگاری، ہوس و عشق، بداخلاقی و خوش اطواری، بے جہتی و خودداری کی آماجگاہ دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس میں ایک ایسی ہم آہنگیٔ فکر و جذبہ اور یگانگتِ احساس و نگاہ پائی جاتی ہے جو صرف اُس ہستی کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہے جس نے اپنے آپکو اوصافِ حمیدہ کا آئینہ دار بنانے کے لئے نظریاتی اور عملی ہر دو سطح پر شدید ریاض کیا ہو کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ ؎

فیضِ فیاض ہے بقدرِ ریاض شرحِ صدر ابتدائے عرفاں ہے

یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی غزلیات کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہر ذوق اور ہر مزاج کے قاری کے خیالات و جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہیں بلکہ ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ مختلف المزاج ناظرین کو ایک خاص ارفع کرداری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی

ہیں، ان کے مزاج کی تربیت کرتی ہیں اور انہیں اعلیٰ انسانی اقدار سے روشناس ہی نہیں کرواتیں بلکہ ان کے لئے ایک ایسا بے پناہ لگاؤ پیدا کرتی ہیں جو انہیں معاشرتی سطح پر ان کی ترویج و اشاعت کے لئے اس حد تک مستعد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے رگ و پے میں ایک مجاہد کے خون کی روانی کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ درخشاں کارنامہ صرف وہی شاعر سرانجام دے سکتا ہے جو سخن کو "کارِ بے کاراں" نہیں بلکہ "ذکر و عبادت" کا درجہ عطا کرتا ہے۔

عبدالعزیز خالد کی غزلیات کے مطالعہ کے دوران میں جو چیز قاری کو سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ اس کا حسیاتی پہلو ہے۔ ان کے کلام میں محسوسات کی ایک بوقلموں دنیا آباد ہے۔ اس عالم کی تخلیق میں انہوں نے اپنی پانچوں حسوں کو بروئے کار لانے کی سعی کی ہے اور اس سعیٔ جمیل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اشعار کے توسط سے قدم قدم پر اپنے قارئین کو حواسِ خمسہ کو متحرک و برانگیختہ کرتے ہیں اور وہ ان کے سحر حلال میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں۔ بصارت اور سماعت کی حسّوں سے وہ بالخصوص استفادہ کرتے ہیں حس بصارت کی تحریک کی چند مسحور کن مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

کالی ساری میں لپک پنڈے کی　　جیسے گھنگھور گھٹا میں بجلی!

مدھ بھری نیند سے ماتی آنکھیں　　جسم — پَو پھوٹ رہی ہو جیسے

عارض و لب ہوئے بوسوں سے کبود　　کوئی پوچھے تو وہ کیا عذر کرے

انار سینے پہ ہیں اور خال چہرے پر　　لباسِ تنگ سے اُبھرے تناسبِ اعضاً

سینے میں جزر و مدّ سمندر کا　　سحرِ فرعون تیری آنکھوں میں!

روشنی پھوٹے ساق و ساعد سے　　شعلے شاخِ چنار سے لپکیں!

جھینپتی ہے آپ اپنا اُبھرا سینہ دیکھ کر　　تن کی عریانی نمایاں ہے لباسِ چُست سے!

سنگِ مرمر کی طرح جلد بدن کی بے داغ　　نقرئی طشت پہ سُورج کی شعاعیں رقصاں

اب حسِ سماعت کی برانگیختگی کی چند دلآویز مثالیں ملاحظہ کیجئے:

گھنیرے کنج دھڑکتے دلوں کے راز سُنیں　　سکوتِ شب میں ہے آوازِ پا، لبِ گویا

یوں بلبلیں شاخوں پہ چہکتی ہیں کہ جیسے　　پازیب پہن کر بنتِ سرمست غزل خواں!

دل آشفتہ، سودا بر بلط، نگہ چشم خماریں، مضراب!

آپ نے ان مثالوں سے محسوس کیا ہوگا کہ غالب کی تراکیب مستعار لیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عبدالعزیز خالد "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" تعمیر کرنے پر انتہائی قدرت رکھتے ہیں اور فن کی معراج کا حصول بالعموم اسی نوع کی قدرت کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔ اب لامسہ کے تحرک کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

شراب نو کی طرح تند و تیز و کیف آگیں
کبھی نہ بھولیں محبت کے اولیں بوسے!

کبھی کبھی عبدالعزیز خالد دو حسوں کو بڑی چابکدستی سے بیک وقت متحرک کرنے کا سامان بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ غور فرمائیے انھوں نے ذیل کے شعروں میں لامسہ اور سامعہ کو آن واحد میں کیونکر بیدار کیا ہے:

آگ بوسوں میں، راگ لفظوں میں
تجھ میں آئی کہاں سے یہ قدرت!

حسن آواز میں، سخن گو آنچ
پیار کے لمس کا بدن پیاسا!

دو شعلے ہمکنار تھے، بجتا تھا جلترنگ
کل رات جاگتے رہے ہم دونوں رات بھر

ان مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ عبدالعزیز خالد جسمانی لذت کے دلدادہ ہیں۔ ان کی پیش کش کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ حضرات جو عبدالعزیز خالد کی شاعری کو زاہد خشک کی روکھی پھیکی باتیں قرار دینے کی سعی فرماتے رہتے ہیں، ان کے سامنے ان کے تخیل کی شادابی اور طراوت کا عملی اور ناقابل تردید ثبوت پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا جائے کہ یہ شادابی اور طراوت کسی ہوس کار کی تردامنی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی بلکہ اسے فنی سطح پر جسم سے لطف اندوز ہونے کی ارفع کاوش کا مظہر آبدار قرار دیا جا سکتا ہے جہاں جسم مقدس بن کر روح کی طہارت کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ جسم کے متعلق عبدالعزیز خالد کے اس پاکیزہ رویہ کا اظہار خود ان کے اپنے متعدد اشعار سے ہوتا ہے جنہیں میں اپنے دعوے کے لئے بیّن ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً ملاحظہ فرمایئے:

اسے چوما کتاب کی مانند
پیار میں احترام شامل تھا

حسن کو یوں جو نگہ آتش پرستوں کی طرح
آگ کو کرتے ہیں سجدہ اُسکے عاشق دُور سے

حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جسم و روح کے سلسلہ میں بڑا متوازن طرز عمل اختیار کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ طرز عمل اس ضابطۂ حیات کی دین ہے، جو روح اور اس کے مسائل کو فوقیت دینے کے باوجود جسم کو تیاگ دینے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے مطالبات کی تکمیل کو لازمی قرار دیتا ہے تاکہ انسانی معاشرہ افراط و تفریط کا شکار ہو کر نہ تو "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا رویہ اپنا لے اور نہ رہبانیت کے در وا کرے۔ اس ضابطۂ حیات کے عظیم پیش کار نے خود اپنی زندگی میں اس پر نہایت کامیابی سے عمل پیرا ہو کر پوری انسانیت کے سامنے آج سے چودہ سو سال پیشتر ایک لائق تقلید نمونہ مہیا کر دیا تھا۔ عبدالعزیز خالد نے روح کے تفوق پر اپنے ایمان اور لذتیت سے اپنی بیزاری کا اظہار اپنے ایک شعر میں بڑے واشگاف طریقے سے کیا ہے ؎

بن ترجمان تو بنی آدم کی روح کا
لذت کا جو شکار ہو بے کار وہ ہنر

اُن کی پوری شاعری کو بالعموم اور جسم سے متعلق شاعری کو بالخصوص اس شعر کی روشنی میں سمجھنا اور پرکھنا ضروری ہے ورنہ کئی طرح کے مغالطوں کا امکان ہے جس کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ عبدالعزیز خالد پر نہیں، ان کے قاری یا ناقد پر عائد ہوگی۔

عبدالعزیز خالد کی غزل کا ایک بڑا امتیازی وصف اس کی بے پناہ غنائیت ہے۔ اس وصف کی توضیح کے لئے کسی خاص شعر کو پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ میرے خیال میں ان کے تقریباً سبھی اشعار اس خوبی کے حامل ہیں۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ قدم قدم پر حرف و صوت کا جادو جگا رہے ہوں، اور سامع طلسمِ آہنگ میں کھویا ہوا ایسے عالم میں پہنچ گیا ہے جہاں عبدالعزیز خالد کرشن کے روپ میں بالسری بجا رہے ہیں اور گوپیاں اُن کی لَے پر بے سُدھ ناچتی چلی جا رہی ہیں اور کائنات گویا سحرِ نغمہ سے مسخر ہو چکی ہے۔ عبدالعزیز خالد کو اپنی اس غیر معمولی قوت کا شعور ہے اور ذیل کے اشعار اس سلسلہ میں ان کی خود آگہی کے آئینہ دار ہیں:

میں ہوں متھرا کا مدھوکر، من ہر　　　گو پیو نام مرا گردھاری

گگن سے چاند اٹھے، دیکھنے کو رات ڈھلے　　　کدم کے پیڑ تلے، بالسری بجائے کون

یوں بالسری کی لَے پہ تھرکتی ہیں گوپیاں　　　جس طرح ناگ جھومیں سپیرے کی بین پر!

آپ نے مذکورہ بالا جملہ اشعار کے مطالعہ سے اندازہ کیا ہوگا کہ عبدالعزیز خالد اپنے جذبات و افکار کی ترسیل کے لئے عام طور پر اس قدر شستہ، لطیف اور جمیل طریق کار کو اپناتے ہیں کہ ہمیں ایک مہذب اور شائستہ انسان کی آسودگی بخش سرگوشی کا احساس ہوتا ہے۔ کسی بلند آہنگ خطیب یا ناصح کی گفتارِ ناگوار کا ادراک نہیں ہوتا۔ وہ بالعموم واشگاف انداز میں گفتگو نہیں کرتے بلکہ رمز و کنایہ کا سہارا لے کر لب کشا ہوتے ہیں ؎

کہیں بدنام نہ ہو یارِ عزیز اس لئے
شاعر ابہام و کنایہ میں کہے بات اپنی!

البتہ بعض مقامات پر وہ قصداً اس ڈھکے چھپے اسلوب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، اپنے خیالات کو کھل کر پیش کرنے لگ جاتے ہیں اور اپنے اظہار کو مطلوبہ حُسن کارانہ اوٹ سے مستغنی قرار دے دیتے ہیں۔ ایسے مقامات پر مجھے ہمیشہ گمان گزرتا ہے کہ عبدالعزیز خالد اپنے قاری کے ہاتھ میں اپنی شخصیت کے طلسم کدے کی کلید تھمانا چاہتے ہیں تاکہ وہ اسے کھولنے اور اس کا مشاہدہ کرنے میں آسانی محسوس کرے۔ ظاہر ہے کہ قاری کو سہولت مہیا کرنے کا یہ مقصد فن کی حدود سے ماورائی ہے۔ لہٰذا اس کی تکمیل کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو شعر وضع ہوتے ہیں وہ جمالیاتی معیاروں سے چنداں بے نیاز نظر آتے ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بت شکن ہوں میں، بت فروش نہیں　　　مجھے حکمِ شکستِ زنداں ہے

جو زباں پر ہے، وہی دل میں ہے　　　ہمیں آتی نہیں ظاہرداری!

یہ اتہام لگایا گیا براہِ حسد　　　وگرنہ خالدِ خود دار میں غرور کہاں

رُوح ہے آزاد میری جسم گو پابند ہے　　نام ہے خالد مرا، بندہ ہوں اپنے نام کا

ظاہر ہے کہ یہ شعر عبدالعزیز خالد کے بُت شکن، راست گفتار، خود دار، آزادہ رد ہونے کا احساس تو بخوبی کرداتے ہیں، اگر فنی نقطۂ نظر سے انہیں اپنے خالق کے نمائندہ اشعار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی نمائندگی کا حق صرف ایسے ہی اشعار کو حاصل ہے جن کے چند نمونے، مشتے از خروارے کے طور پر اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔

ان کے نمائندہ اشعار پر نگاہِ نکرہ ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ ان سے کلام خالد کی ایک اور خصوصیت مترشح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کے مفہوم پر ایک مہین چلمن تو ضرور آویزاں ہے مگر کوئی دبیز پردہ موجود نہیں یعنی وہ اشکال، ابہام یا ژولیدگی کا حامل نہیں ہے۔ اُن کی منظومات پر الفاظ و معانی کی گراں باری کا اعتراض تو وارد کیا گیا ہے اور ہر چند کہ یہ اعتراض وہاں بھی بالعموم ان کے فکر کی تہہ داری اور علم کی گھمبیرتا کو نظر انداز کر کے کیا جاتا ہے اور میں اسے چنداں قابلِ قبول نہیں سمجھتا۔ تاہم ان کی غزل نگاری تو سرے سے اس اعتراض سے محفوظ و مامون ہے اور اس کی بڑی وجہ وہی ہے جس کی طرف میں مضمون کی ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں یعنی غزل سے عبدالعزیز خالد کے مزاج کی ایسی مناسبت کاملہ جو ان کے کلام کے بے ساختہ پن اور سلاست کی درخشاں امین ہے اور جس کے فیضان سے اُن کا دامن ایسے سدا بہار پھولوں سے مہک رہا ہے جن کی بظاہر مدہوش کن خوشبو حقیقتاً خود آگہی کے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بالکل یکہ و تنہا محسوس کرتے ہیں۔

یہ احساسِ تنہائی اُن کے کلام کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے ان کے اکیلے پن کی آنچ ہمارے دل و دماغ کو متواتر گداز کرتی چلی جاتی ہے مگر واضح رہے کہ یہ احساسِ تنہائی بڑا تعمیری ہے۔ اس نے انہیں ایسے اندوہ کا شکار نہیں کیا جو انسان کو بندِ تیسچ قنوطی یا سنگی بنا دیتا ہے بلکہ اس کے برعکس اس نے اسے ایسا استقلالِ طبع عطا کیا ہے کہ جو دیکھے وہی کہے ؎

مضبوط پہاڑ سے زیادہ،　　وہ ایک چٹان کی طرح تھا

اس صورتِ حال کا ذمہ دار اُن کا وہ تاریخی شعور ہے جو انہیں دنیا کی عظیم شخصیتوں کے ارتقا کے مطالعہ سے حاصل ہوا ہے اور جس کے تحت وہ جانتے ہیں کہ:

ہر صاحبِ عزم ہے جہاں میں　　ناشاد، بلند بال تنہا!

ان کی یہ تنہائی اس چراغ کی مانند ہے جو خود جلتا ہے مگر دوسروں کو نور بخشتا ہے۔ نور جسے عرفانِ ذات کی ایک علامت قرار دیا جا سکتا ہے، عرفانِ ذات جو معرفتِ الٰہی کا پیش خیمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

خود شناسی،　　خدا شناسی ہے

کنجِ عزلت ہے،　　منزلِ عرفاں!

تو ہمیں ان کی روشِ خلوت پسندی ایک تارک الدنیا کی اس تاریک گوشہ گیری سے کتنی مختلف نظر آتی ہے، جو بنی آدم کے لئے ایسی افادیت کی حامل نہیں جس کا اظہار عبدالعزیز خالد کے مندرجہ ذیل شعر میں ہوا ؎

جلتا ہوں مگر اُجالتا ہوں　　گویا ہوں چراغ کا فلیتہ

یہی وجہ ہے کہ جب وہ تنہائی کے اس درخشاں اوج پر ایستادہ ہو کر پکار اُٹھتے ہیں کہ:

آج جو ابلہ سمجھ کر مجھے ٹھکراتی ہے　　کل یہ دنیا مرے دروازے پہ دستک دیگی

تو ہم ان کے اس بلند بانگ دعوے کی تائید پر بسر و چشم آمادہ ہو جاتے ہیں!

عبدالصمد صارم

خالد کی شاعری کی سب سے بڑی کمزوری

کلامِ خدا کے سوا کسی کا کلام عیوب سے پاک نہیں ہو سکتا، اگر خالد کے کلام میں بھی کچھ کوتاہیاں ہیں تو ان سے اس کے کمالِ فن میں کوئی فرق نہیں پڑتا، خالد بلاشبہ ایک باکمال شاعر ہے، مگر کیا کیا جائے، اک نہ اک عیب حسینوں میں ہوا کرتا ہے۔

چاند کا چہرہ بھی داغوں سے خالی نہیں ہے۔

خالد کی شاعری کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کا کلام عام فہم نہیں ہے، عوام تو کیا متوسط صاحبِ علم بھی نہیں سمجھ سکتا، متوسط تو کیا خواص کو بھی اس کے کلام کے بیشتر حصے کے سمجھنے میں دشواری، لغت گیری اور غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔

میں خالد کا ایک مجموعہ کلام پڑھتا چلا گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پہلے انسان مجھ جیسا عربی داں ہو لے، تب اس کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، ہماری طرح طرح عربی کو اوڑھنا، بچھونا بناتے، عرق ریزی سے عربی ادب کی تحصیل کرے، نئے اور پرانے ادب عربی سے آشنا ہو، تب خالد کے کلام کو ہاتھ لگائے، مگر چند اوراق الٹنے کے پیچھے ایسا محسوس ہوا کہ خالد کو پڑھنے کے لئے اعلیٰ درجے کا عربی داں ہونا کافی نہیں ہے، اسے عربی پڑھنے کے بعد ہندی اور سنسکرت بھی پڑھنی پڑے گی، اور ان میں بھی کمال پیدا کرنا پڑے گا۔

پھر آگے بڑھا تو معلوم ہوا یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، یہاں صرف عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت سے کام نہیں بنے گا، فرانسیسی، انگریزی، عبرانی سریانی اور نہ جانے کتنی زبانوں کی اور ضرورت پڑے گی۔

اور آگے بڑھا تو پتہ چلا زبانوں کا علم ہی کافی نہ ہوگا، خالد کے قاری کو علامہ ہونا چاہیئے۔ اسے تاریخ اسلام، حدیث، فقہ، تفسیر، تصوف، نئے اور پرانے علوم اور تلمیحات کا ماہر بھی ہونا چاہیئے۔

خالد کا کلام پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن شعر ہے اگرچہ صاحبِ کلام بتاکید کہتا ہے کہ میرا کلام شعر نہیں ہے جو اسی طرح اگرچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، ہم نے اپنے رسول کو شعر نہیں سکھایا نہ یہ اس کی شان کے لائق ہے، مگر خالد کا اصرار ہے کہ حدیث بھی شعر ہے۔

اگر خالد کچھ اور طویل عرصہ تک زندہ رہے تو میرے خیال میں ساری حدیثیں نہیں تو پورے قرآن کو ضرور شعر کے قالب میں ڈھال دیں گے وہ اس طرح بے تکلف حدیث و قرآن کو پیوند کرتے چلے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ حدیث و آیت اسی مصرعہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ خالد کے کلام کو سمجھنے کے لئے نہ صرف عربی داں ہونا ضروری ہے بلکہ عالمِ قرآن و حدیث و تفسیر وغیرہ ہونا بھی ضروری ہے بلکہ کچھ اور بھی۔

خالد ایسے بھاری بھرکم الفاظ بھی لاتے ہیں، جنہیں اردو کے دامن میں پیوند کرنے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، اور لغت گردانی کی ضرورت پڑتی ہے" مگر وہ معذور ہیں، فرماتے ہیں:-

آہ الفاظ کا سیلاب ٹھہرتا ہی نہیں روزِ اول ہی سے محسوس کیا تھا میں نے

کہ محرک ہے کوئی ارفع و اعلیٰ جذبہ کوئی آدرش کوئی شوخ سہانا سپنا

ان جگر تاب مساعی جمیلہ کا شباب!

تنقید اور نقاد اچھے خاصے کلام کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ خالد نے نہ صرف ایک نیا طرز شاعری ایجاد کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے لئے ایک مسلک شعری اختیار کیا ہے، جس سے پوری طرح مطمئن ہیں تو بھلا کیا اختیار ہے کہ اپنے اسالیب و قوانین پر ان کے کلام کو پرکھیں، فرماتے ہیں

تجب تک کرتے رہیں مدح اسالیب قدیم　　　وائے بر شیوۂ فرسودۂ ارباب زمن

ذوقِ تخلیق سے کرلیں نئی دنیا آباد　　　شوقِ تجدید سے صحرا کو گلستاں کر دیں

انہوں نے صفت کو ایک مصرعہ میں تو موصوف کو دوسرے میں اور حرف جار کو بطرز عربی دوسرے مصرعہ میں پھینک دیا ہے تو یہ ان کا اپنا طرز ہے، اسے غلطی کیسے کہا جا سکتا ہے وہ چاہے "جہاں بادشاہ" کہہ دیں یا کچھ اور انہیں اختیار ہے۔

خالد میر و مرزا، غالب و ذوق، داغ و امیر، حالی و اقبال، حسن و محسن، نظیر و اکبر، جوش و جگر، حفیظ اور فیض ان سب کا مجموعہ ہے اور ان سب کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے، ان میں سے بعض شعراء ابن الکلام ہیں، بعض ابوالکلام مگر خالد ملک الکلام ہے، انہوں نے اپنے بارے میں سچ کہا ہے ؎

خالد ملک الکلام خالد　　　مشہور انام نام اس کا

خالد کے جذبات دھرسات کہہ رہے ہیں ؎

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل　　　کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

خالد نے بجا کہا ہے ؎

ہے سرور شراب عاریتی　　　لیکن اشعارِ خالد آبِ حیات

بے شک خالد کا کلام ایک قوم کے لیے آبِ حیات ہے، اور وہ مردہ دلوں کو گرما سکتا ہے۔

اسی قسم کی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

شاعری جزویست از پیغمبری

ابنِ انشا

عبدالعزیز خالد جالندھر کے ضلع میں ہمارے گاؤں ایک دوسرے سے چند کوس کے فاصلے پر تھے۔ لیکن ہماری طبائع اور افتادِ طبع میں قطبین کا فرق ہے۔ وہ آسان نہیں لکھ سکتے، میں مشکل نہیں لکھ سکتا۔ میری تو خیر مجبوری ہے۔ مشکل لکھنے کے لئے اتنا علم و فضل اور ذخیرہ الفاظ کہاں سے لاؤں۔ خالد ہاں خالد کی بھی مجبوری ہے۔ ایک روز میں نے کرید کر پوچھا "تم کو عربیت کی چاٹ کہاں سے لگی"۔ بولے۔ "مجھے عربی وربی نہیں آتی"۔ میں نے کہا "سُنا ہے علامہ عبدالعزیز میمن تک تمہاری عربی دانی کو سراہتے ہیں"۔ فرمایا "یہ سچ ہے لیکن ان کی ذرہ نوازی ہے۔ بس اپنے شوق سے کچھ پڑھی ہے ورنہ کالج میں میرا مضمون فارسی تھا"۔ میں نے دریافت کیا کہ "ابتدائی درجوں میں ضرور تحصیل کی ہوگی"۔ کہنے لگے "ہاں مڈل میں بس اتنا تھا کہ سبعہ معلقہ اور دیوان متنبی پڑھ لیتا تھا"۔ میں نے مزید جستجو کی "بغیر معنوں اور حاشیے کے؟" بولے "اس میں کیا مشکل ہے"۔ میں چپ رہا تو اصرار فرمایا "ہاں ہاں بتاؤ۔ اس میں کیا مشکل ہے"۔ یہ الفاظ "اس میں کیا مشکل ہے" ان کا تکیہ کلام بن گئے ہیں۔ ایک روز ان کی ایک نظم میں ایک مصرع آیا۔

تو وہ غبرائے غاسق کو کبِ دُرّی بنے

میں نے تامل کیا تو فرمایا۔ اس میں کونسا لفظ مشکل ہے۔ انہوں نے غبرا اور غاسق کے کچھ معنی بتلائے تھے "جو میں اب بھول گیا ہوں۔ لوگوں نے ان کے اس رجحانِ طبع کے متعلق عجیب عجیب قصے مشہور کر رکھے ہیں۔ اوروں کی سہی نہیں میں خود فخریہ کہا کرتا تھا کہ عالمِ عرب میں فقط دو شخصیتیں ہیں جن کو اُردو سے والہانہ عشق ہے۔ ایک عزام بے دوسرے عبدالعزیز خالد۔ عزام بے تو بیچارے مر گئے (میری اس فقرہ بازی کی وجہ سے نہیں بلکہ طبعی موت) عبدالعزیز خالد بفضلہ حیات اور آٹھوں گانٹھ تندرست ہیں۔ فارسی کا حال یہ بتایا کہ "پرائمری پاس کی تو مقاماتِ حریری کا مطالعہ مرغوب رہا"۔ میں نے کہا "پھر ٹھیک ہے۔ جس شخص کا ابتدائی عمر میں مقاماتِ حریری اور سبعہ معلقہ سے واسطہ پڑے اس سے یہ امید کرنا کہ بڑا ہو کر ہم عامیوں کی سطح پر آ کر گفتگو کرے گا، عبث ہے"۔

اقبالؔ نے شروع شروع میں اُردو میں کوہ ہمالہ، پہاڑ اور گلہری قسم کی نظمیں لکھتے تھے۔ جب پختہ عمر کو پہنچے تو فارسی پر آ گئے لیکن ہمارے خالد صاحب نے آغاز فارسی شاعری سے کیا۔ پھر انگریزی شاعری پر آ گئے۔ جن دنوں میٹرک کے امتحان میں بیٹھے ہیں، اقبال کے سارے کلام کو انگریزی کا جامہ پہنا چکے تھے۔ عربی میں کچھ لکھا ضرور ہو گا۔ سبعہ معلقہ کا جواب وغیرہ، لیکن از راہِ انکسار بتاتے نہیں۔ یہی خاکساری وہ قدیم ادق نزادہ معدوم زبانوں کے باب میں بھی برتتے ہیں ورنہ کوئی مان سکتا ہے کہ ان کو فنیقی، آشوری اور سریانی وغیرہ نہ آتی ہوں گی۔ حال ہی میں ان کا ٹیگور کی منظومات کا ترجمہ "گلِ نغمہ" شائع ہوا ہے۔ اب تک "گیتا نجلی" کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان میں سب سے اچھا ہے اور اہلِ نظر اس کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں خالد صاحب نے ٹیگور سے بھی عربی بلوا ہی دی۔

لیکن ایک بات ماننی پڑے گی۔ اگر کوئی شخص دشمنی یا استہزا کے طور پر نہیں بلکہ خلوص سے کوئی بات کرے تو مان لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مجھ ایسے کج مج کی درخواستوں پر بھی کان دھرتے ہیں۔ اس وقت تو نہیں لیکن دوسرے روز فون کر کے کہتے ہیں کہ "میاں تم نے کل شام جو یہ کہا تھا میں نے غور کیا تم ٹھیک کہہ رہے تھے"۔ اب تو ان پر لغت کا رنگ ہلکا ہو گیا ہے۔ پہلی شائع شدہ تصنیف "زرداغِ دل" میں نغز گوئی ان کی کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ فقط ہست اور بود

کی جگہ تھے اور بھاتے نھے۔ پھر اس میں انہوں نے تسکین اوسط نامی ایک صفت برتی تھی جس کو جاننے اور قدر کرنے والا ہمارے ہاں رفیق خاور کے علاوہ کوئی نہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے خیالِ خاطر احباب سے تسکین اوسط کا بکھیڑا اٹھا دیا لیکن نہ ماننے والے پھر بھی نہ مانے۔ میں نے بھی کہا۔ "بھائی جی ۔ پنجابی میں کہا کرتے ہیں۔ اے فلانی۔ تونے خصم کیا بُرا کیا۔ کرکے چھوڑ دیا۔ اور بُرا کیا۔" اب بھی ان کے ہاں ایسی بحریں مل جاتی ہیں جن کی خلیل بن احمد بصری علم اپنے بکری والے اخفش کو ہوا بھی نہ لگی تھی لیکن کم۔ اردو زبان ان کا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکتی۔

بظاہر دیکھا جائے تو وہ کسی طرح بقراط یا ماہر آثار قدیمہ نہیں لگتے۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے سُرخ و سفید ہیں۔ پہلوان ہوتے ہوتے رہ گئے بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ رہ نہیں گئے۔ فقط پہلوانی کا اکھاڑہ بدلا ہے۔ ادب کے میدان میں کسرت کرتے ہیں۔ مگدر ہلاتے ہیں۔ خیر میاں آزاد کہنے والوں کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔ یہ سبھی حاسدانِ بد ہیں ہیں۔ سالہا سال سے فکر شعر سے فارغ ہیں۔ فقط خلافت پر گزارہ ہے۔ رسالوں والوں کے پُر زور اصرار پر کوئی انڈا دیتے بھی ہیں تو گندہ نکل جاتا ہے۔

خالد صاحب نے پان سگریٹ کسی قسم کا شغل نہیں پالا۔ ڈرائنگ روم ان کا کسی طرف سے کباڑی کی دکان نہیں معلوم ہوتا۔ دفرق معلوم کرنا ہو تو خاکسار کے دردولت پر تشریف لایئے) کرسی نشین ضرور ہیں۔ لیکن اس میں تجتر باریا کا دخل نہیں۔ پڑھنے لکھنے کے لئے دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ اندر قفل بھی چڑھا لیتے ہیں۔ مجھ سے گیارہ سو صفحے کی ایک ویدک لٹریچر کی تاریخ لے گئے تھے۔ تیسرے روز واپس کر دی۔ فرمایا کل دوپہر ختم کر لی تھی لیکن کل ادھر آنا نہ ہو سکا۔ لکھنے کی رفتار بھی یہی ہے۔

شاعر عبدالعزیز خالد مجھے کچھ جالندھری ہونے کی وجہ سے عزیز نہیں۔ کیونکہ سُنا ہے کراچی میں اتنے جالندھر والے ہیں کہ انہوں نے مسلمانان جالندھر کے نام سے ایک انجمن بھی بنا رکھی ہے جس کی مُردے کھینچنے کی اپنی گاڑیاں ہیں۔ میری ملاقات ان سے پاکستان بننے کے بہت دن بعد کراچی میں ہوئی۔ مجھے وہ اس لئے عزیز ہیں کہ ان سے جدید شاعری کی آبرو قائم ہے۔ اور ہم عصروں کے بارے میں میرا احساس اشتراک وہ ہے جو حالیؔ نے ایک مصرعے میں بیان کیا ہے ؎

میں لکھوں یا کوئی اور لکھے سب گیت مرے

ہماری جدید شاعری تن آسانی اور ابتذال کا شکار ہے۔ ہر موزوں گو بالعموم غزل کا رُخ کرتا ہے کہ اس میں محنت کم پڑتی ہے اور ہر شعر پر الگ الگ داد مل سکتی ہے۔ کون مضمون کا تار باندھے جس کے شکست ہونے کا کھٹکا بھی لگا رہتا ہے۔ اب رہے غصیلے نوجوان۔ سو آپ کے سامنے ہیں۔ آپ لیے تپتے بکتے پھر رہے گے یا لمبوتری ٹوپی میں گھنگرو ٹانک کر چھنک چھنک کرتے چلیں گے تو لامحالہ راہگیر خصوصاً بچے کچے ٹھٹک کر ایک بار تو ضرور دیکھیں گے۔ اردو شاعری کبھی کی بالغ ہو چکی لیکن ابھی تک بہتوں کو خبر نہیں ملی۔ آزاد شاعری بھی بالآخر غزل کی طرح روایت بن گئی اور لوگ اوب گئے۔ تب اکے پتہ چلا کہ شاعری وہ ہے جس میں بناوٹ نہ ہو۔ دل کو کھینچتی ہو اور کس بل رکھتی ہو۔ آزاد اور پابند ہونے سے اس کی تاثیر پر فرق نہیں پڑتا۔

خالدؔ کا مطالعہ قدیم اور جدید ادب کا اتنا وسیع ہے کہ کم لوگوں کا رہا ہوگا لیکن وہ اسٹوڈیو کے سیٹ کے سے نظر فریب محل بنانے کی بجائے اپنی گڑھی کی بنیادوں کو پکا اور گہرا کرتے رہے۔ چائے خانوں اور ستائش باہمی کے حلقوں سے کنارہ کیا اور دل بد نیا دوبیں نہ آنے دیا۔ ان کے ہاں عربی شاعروں کی طنازی اور صلابت بھی ہے اور یونانیوں کا آئیڈیلزم بھی۔ ڈرامائیت ان کے کلام کا خاص پہلو ہے۔ جو نظم باقاعدہ ڈرامہ نہیں وہ بھی خود کلامی یا تنہا کلامی ضرور ہے۔ اقبال سے خالد نے لفظیات نہیں بلکہ دروں نگری اور دردمندی کا لہجہ لیا۔ انتاد اور خاکساری کے بجائے ان کے ہاں تخلیق کار کی انانیت اور قدر ناشناسی کا گلہ بھی شامل رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات پھیل رہے ہیں۔ اب تو کہیں کہیں ہندی کا رنگ بھی چوکھا ہوتا ہے۔

رفیق خاور

برگِ بہار

عجم "عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوزِ دروں ۔ کم از کم چھ زبانوں اُردو، انگریزی، سنسکرت، ہندی، عربی اور فارسی ۔ کا ادب و شعر ان میں رچا ہوا ہے۔"

یہ ہے جو شاہد احمد دہلوی نے کہا ۔ عین انجیل کا انداز، شاعر کے اساطیری ذوق کی علامت ۔ اور یہ بالکل درست ہے ۔ غالب کی طرح، جس سے اس کا نابغہ بہت ملتا جلتا ہے، جواں سال، جواں فکر عبدالعزیز خالد بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہو گا کہ ــ نہادِ من عجمی و طریق من عربی است ۔ اگرچہ یہ مناسبت استعارۃً ہے ۔ کیونکہ بست جالندھر اور جھنگ سیال دونوں سے وابستہ یہ جامع کمالات ہندی نژاد، عجم و عرب کا متوالا ہوتے ہوئے یونان و یہود، مشرق و مغرب، قدیم و جدید کا دلدادہ بھی ہے ۔ ہر سو خرام، شش جہت، مجمع البحرین بلکہ مجمع البحار۔ ایک مردِ آفاقی ۔

ٹی ایس ایلیٹ نے جدید شاعروں کے لئے ایک نصاب مقرر کیا ہے ۔ آخر وہ مدرس ٹھہرا ۔ اس نے اپنے نصاب میں ہومر، دانتے، شیکسپیئر، اپنشدھ، اناجیل، گولڈن باؤ اور بے شمار دوسرے علمی و ادبی مظاہر شامل کئے ہیں ۔ چنانچہ اس کا شاہکار "ویسٹ لینڈ" زبانوں اور حوالوں کا ایک محیر العقول مرقع ہے ۔ یہ نصاب اس لئے نہیں کہ انسان بڑا بھاری گنوان پنڈت بن جائے بلکہ اس لئے ہے کہ بیسویں صدی کے شاعر کا شعور و آگہی اس ہی کے مطابق ہو ۔

اگر ہمارے یہاں کوئی ایسا شاعر ہے جس نے پورے ذوق و شوق، شد و مد، ساز و سامان اور اہتمام کے ساتھ شاعری کی طرف رجوع کیا ہو تو وہ خالد ہے ۔

ماہ نخشب کی طرح جو کرمکِ شب تاب ہیں
ہیں وہ بے تہہ فیض پرورد سپہر دوں نواز
ایک میں ہوں شعر و نغمہ کی مے سرجوش سے
کلبۂ احزاں کی خلوت میں رہینِ سوز و ساز
یہ مرا سامانِ ذوق!
یہ مرا طغیانِ شوق!

خبر نہیں یہاں فیض میں ایہام ہے یا نہیں ۔ اگر ہے تو اس کی حیثیت ایک مدرسہ و مشرب کی علامت ہے ۔ اس کے برعکس یہ سرجوشی، یہ طغیان اس سرمست شاعر کا طرۂ امتیاز ہے ۔ وہ ایک سچے عاشق کی طرح جو فنا فی العشق ہے ۔ ایک اور صرف ایک محبوب کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا ۔ یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید ۔ اس دھن کے سوا اسے اور کوئی دُھن نہیں ۔ اس لئے وہ کہتا ہے

ور برملا کہتا ہے ۔

زندگی ان کے لئے

شاہد و شہد و شراب و نقرہ و کمخواب ہے

اک خمستانِ بادہ ، اک تاتارِ مشکِ ناب ہے

زندگی میرے لئے

اک نگارستانِ نغمہ ، اک خیالستانِ حسن

ذوقِ پروازِ خیال و شوقہ پیچ و تاب ہے

غالب سے بھی زیادہ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ سے بے نیاز وہ لفظاً و معناً تن من دھن سے شاعری پر قربان ہے ۔
خوش اور فخر کناں کہ ــــ حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ــــ اور یہ حاصل صرف چھ زبانوں اور ان کے ادب ہی تک محدود نہیں بلکہ اس
میں شاعر کا ذاتی تجربہ، اس کے وسیع مطالعے، ہر در، ہر دور، ہر دیار کی باتیں بھی شامل ہیں ۔ خاقانی کا خماہن گوں ۔ دوائے آتشیں ۔ آخشیجان ۔
آبائے علوی اور مناسکِ حج کی تفصیلات ، اور غالب کا کاغذی پیرہن ۔ کیموس ۔ تیرہ نہیں ۔ شب دیج ۔ ہیلاج ۔ خرمہرہ سے
آراستہ گائے وغیرہ یاد کیجئے ۔ جن کا مشرب بھی یہی سامان وطغیانِ شوق اور ایلیٹ کی ہمہ دانی کا مشرب تھا اور وہ اپنے وسیع
ظرف اور پسِ منظر سے فی الحقیقت شاعری کو ایسی تہہ دار چیز بنانا چاہتے تھے جس کا دامن بہت وسیع ہو اور جس کے لیے غیر معمولی
جوہرِ درکار ہوں ۔ انہی کے ہم کیش نظامی نے "سخن گفتن و بکرِ جاں سفتن است" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا ۔
ہر غالب اور اقبال کو اپنی روشنیٔ طبع کے باعث دوسروں سے نبرد آزما ہو کر طویل کشمکش کے بعد ہی کامیابی میسر آتی ہے ۔
عبدالعزیز خالد کو اپنے انقلاب آفریں منصب کا شدید احساس ہے ۔ اسے یقین ہے کہ قدرت نے اسے غیر معمولی صلاحیتیں
عطا کی ہیں ۔ اسے عرفانِ شعر اور فیضان کا درجہ حاصل ہے ۔ وہ ہل من مبارز کہتا ہوا میدان میں آتا ہے ۔ اسے اپنے آپ پر اعتماد ہے اس
لئے اسے غیروں کی تضحیک اور ہنگامہ آفرینی کی کوئی پرواہ نہیں ("میری متاعِ حقیر مایۂ تضحیکِ عام") گو اسے یہ یقین ہے کہ اس کی متاعِ حقیر
فی الحقیقت متاعِ ارجمند ہے ۔ اسے ضد ہے کہ وہ بالآخر دوسروں سے اپنا لوہا منوا کر چھوڑے گا ۔ اسی لئے وہ بے انتہا استقلال اور خود اعتمادی کے
ساتھ ایک تخلیق کے بعد دوسری تخلیق کو منظرِ عام پر لائے جاتا ہے کبھی دو تا کبھی سہ تا عنوانات کے ساتھ ۔ زرداغِ دل ۔ دکانِ شیشہ گر ۔ زنجیرِ رمِ آہو ۔
سرودِ رفتہ ۔ برگِ خزاں ۔ گلِ نغمہ ۔ گنجِ رنج شائگاں ۔ ورقِ ناخواندہ ۔ ماتمِ یک شہرِ آرزو میں عنوان چہار تا ہے
ملٹن کو اپنے الہامی فیضان کا شدید احساس تھا ۔ جسے (HIGH SERIOUS NESS) کہا جاتا ہے ۔ یہ محض تاثر ہی نہیں بلکہ مبعوث ہونے
سے مشابہ پیغمبرانہ احساس ہے ۔ یہ احساس کہ شاعری اس کا فرضِ منصبی ہے ۔ براؤننگ کی طرح اس کی نجاتِ روحانی کا کفیل ۔ ودیعتِ فن اس پر آیۂ
الٰہی کی طرح نازل ہوئی ہے ۔ ہر صریرِ خامہ پہ نوائے سروش کا یقین پیدا کرتی ہوئی ۔ امہاتِ فن کی خاص الخاص کرامت ۔ اس لئے وہ ایک والہانہ مجذوبیت
کے ساتھ شاعری کرتا ہے ۔ محض شاعری کی داد نہیں دیتا ہے
بلاشبہ اردو کے اور کسی قدیم و جدید شاعر میں یہ احساس اس قدر شدید نہیں اور نہ کسی نے بار بار اس کا راگ الاپا ہے ۔ یہ احساس اس کے
یہاں جریرہ رگِ گل بھی ہے اور جدیدہ رگِ سنگ بھی ۔ اسی لئے اس کی غنائیہ نظموں کے مجموعہ "زنجیرِ رمِ آہو" میں الاپ سے ٹیپ تک یہ تان رہ رہ
کر گونجتی ہے ۔ تاثیر کے ایک یدِ بیضا کے مقابلے میں یہاں کتنے ہی یدِ بیضا ہیں ۔ اس لئے کہ زندہ دل اور زندہ رو فنکار ہونے اور اپنے زندہ منصب کا
احساس شاعر کے دل و دماغ پہ نشۂ تیز بن کر چھایا ہوا ہے ۔ فیضان کے عمومی تذکرہ میں خصوصی تذکرہ کا باعث :۔

لختِ دل روز و شب نازشِ عمرِ رواں — خالدِ آشفتہ کا، نادرہ فن شاہکار!

وہی غالب کی روش۔ — زعرفی و طالب یہ غالب رسید

خالد بازیافت کا شاعر ہے۔ یہ بنائے جاوداں کا احساس انگریزی شعرا ملٹن یا ورڈزورتھ ہی کی دین نہیں۔ اس میں فردوسی کی بنائے چنار کی صدائے بازگشت بھی صاف گوش زد ہوتی ہے "پھرتا ہوں میں بے کلاہ" - تاج بقائے دوام! "سیریلزم" کے نظریئے کے مطابق نوعِ انسان کے تمام حادثے، دنیائے آب و گل کی تمام نیرنگیاں اس میں ہمہ وقت برقرار اور جیتی جاگتی ہیں، اس طرح خالد کی شاعری رفتہ و حاضر کا زندہ و گویا مرقع ہے۔ جنت نگاہ اور فردوس گوش۔ دونوں اعتبار سے ایک سمعی بصری مظاہرہ۔

شعلہ زن ہے رگِ الفاظ میں خونابِ جگر — تجربہ گاہِ حوادث میں پلا ہے مرا فن — (ذکر و فکر)

آیۂ توفیق ہے وجدان کیا عرفان کیا! — یمنِ عشقِ لاابالی ہے دلِ خونیں نوا! — (خاکسترِ پروانہ)

اشعار کی بضاعت لایا ہے کوئی خالد — آؤ کریں مشخص ہم اس کی قدر و قیمت — (غبارِ خاطر۔ آخری نظم)

میں اپنے طالعِ میموں پہ کیوں نہ ناز کروں — ملی ہے ملکِ سخن کی پیمبری مجھ کو — (اختر شناس)

میں اس لفظ "پیمبری" کا منتظر ہی تھا۔ چنانچہ یہ خالد کے کلام میں آخرکار وارد ہو ہی گیا ہے۔

بیشک شاعر نے حبس التہاب و اضطراب کا ذکر کیا ہے، وہ رمِ آہو کو زنجیر کرتا ہے اور رگِ گل کو حریر بھی بناتا ہے۔ مگر کبھی زنجیر دار و گیر کی شدت کے علاوہ بھی بن سکتی ہے اور حدید بھی۔ فن کے منصب کی شرافت مسلم مگر اندیشہ ہی ہے کہ یہ سنگِ گراں نہ بن جائے۔ ملٹن، ورڈزورتھ اور ان کے اردو ہم پیشہ و ہم مشرب اس احتمال کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکے۔ خالد میں احساس کی شدت اس حد سے زیادہ دور نہیں اور جو تقاضہ مایۂ جاں ہو وہ تجرید کا روپ بھی دھار سکتی ہے۔ پیغمبر بہرحال پیغمبر ہے خواہ وہ اعلان کرے یا نہ کرے اور فن کار کی فنی صلاحیت ہی کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ زر داغِ دل۔ زنجیرِ رمِ آہو۔ ماتم یک شہرِ آرزو میں اپچ تو ضرور ہے مگر لوچ، گھلاوٹ؟ ممکن ہے ان کے بارے میں خود شاعر کو بھی شک ہو۔ اس لئے کہ اپچ ایک حد سے گزر جائے تو وہ گنج رنجِ رائیگاں بن جاتی ہے۔ ایک غیر عادی چیز جسے عام ذہن قبول نہ کرے تو عجب نہیں اور شاعر کو بھی اس کی شکایت بن نہیں پڑتی۔ یہ ایک طرح کی موشگافی ہے جس کی خاصیت بوالعجبی ہے اور جس سے بیگانگی احساس پیدا ہوتا ہے، اس لئے شکسپیئر نے ایک جگہ اس قسم کی انتشار کو ظریفانہ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔

مگر ذوق و شوق اپنے ساتھ اپچ کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لاتا ہے۔ گوناگوں ساز و سامان۔ اسی سے خالد کی اہمیت ابھرتی ہے۔ وہ مجدد کے لئے تازہ جنوں لاتا ہے، اس کی مثال ایک دریا کی سی ہے:

جس طرح کوئی عظیم الشان دریا تندہ رود — گھومتا پھرتا پھراتا وادی و کہسار میں
سیم و زر، لعل و گہر کا ایک انبارِ گراں — جمع کر کے پھینک دیتا ہے بہ صد عجز و نیاز
صورتِ نذرانہ بحرِ بے کراں کے پاؤں میں

اپنی محبوب اردو کے پاؤں میں رول دیتا ہے۔ اس کی "پہلی محبت" فارسی تھی جس نے اس کے دل میں عشق کی شعلہ بر انداز آگ روشن کی۔ "عشق" "بے تابانہ عشق"۔ اسی لئے فارسی اس کے دل و دماغ، اس کی تمام شخصیت پر چھائی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ یہ اس کے افکار پر ہی نہیں قوائے فکر پر بھی سایہ انداز ہے۔ اس کے رگ و پے میں دخیل ہے اور ظاہر ہے کہ جب من تو شدم تو من شدی کی کیفیت پیدا ہو جائے تو کیا ہوگا۔ خالد کا ذوق فارسی زبان کے ساتھ اس کے لوازمات، ادب، اسالیب، تصورات پر بھی حاوی ہے اور ان کے بعض اجزا کو اپنائے بغیر نہیں رہ سکا۔ بعض صورتوں میں فارسی زبان و ادب نے اس کی طبیعت پر غلبہ کیا ہے اور بعض میں اس نے ان پر ذہنی عمل کیا ہے اور اس طرح جو جادو فارسی جگا یا سلا

سکتی ہے وہ اس نے جگائے بھی ہیں اور سلائے بھی ہیں۔
فارسی کے بعد عربی اسی والہانہ شغف اور اسی " دل کو وقف رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کردیں " کی سرمستی کے ساتھ۔ پھر سنسکرت اور
ہندی۔ انگریزی اور اردو کی حیثیت اور ہے۔ انگریزی دور جدید میں تعلیم کی قدر مشترک ہے یہ ہر ذی علم شخص کی تعلیم و تربیت کا سنگ بنیاد
رہی ہے۔ مغربی زبانوں کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت سے شناسائی کا ذریعہ اور جدید ادب، جدید ذوق، جدید
تصورات کا سرچشمہ۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید ادب بڑی حد تک مغربی چیز ہی ہے جس سے دوسری چیزوں سے رنگ آمیزی کی جا سکتی ہے اور
اب تک یہی ہوتا رہا ہے۔ یہ رنگ آمیزی جدید وضع کے ریختہ سے کی جاتی ہے جسے ہم اردو کہتے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کی عمومی زبان کی حیثیت
سے کلی یا بین الملی، ذیل آفاقی زبان۔ سنسکرت زبان و ادب ہمارے لئے ایک لحاظ سے آفاقی اور دوسرے لحاظ سے ذیل آفاقی ہیں۔ ہندی،
اتھوا ہندوستانی، ذیل آفاقی ہوتے ہوئے اردو سے قرب کے باعث اور بھی خصوصیت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ سب زبانیں اور ان کا ادب
خالد کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں اس لئے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں ان تمام آفاقی اور ذیل آفاقی زبانوں اور ان کے ادبیات کا سنگم ہیں۔
اس میں ان سب کے افق ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو جاتے ہیں اور باہم مل کر ایک مدغم کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

ہمارا دور درحقیقت مشرق و مغرب کے ادغام کا دور ہے اور کسی بھی جدید شخصیت کی اہمیت اسی سے متعین ہو سکتی ہے کہ اس نے اس عمل میں کیا
حصہ لیا اور اس تشکیل نو میں کیا اضافہ کیا۔ خالد کی شاعری فی نفسہٖ کچھ بھی ہو وہ متعدد عالمی افقوں کا سنگم اور ادغام کے عمل میں ممد و معاون ہونے
کی وجہ سے ضرور اہم ہے۔ دوسرے روشن نقطوں کی طرح اس میں بھی مشرقی و مغربی علوم و افکار کی شعاعیں جمع ہوتی ہیں۔ قبل ازیں اتنے افق
اتنی وسعت اور شدت کے ساتھ آمیز نہیں ہوئے۔ اس کے پیش رووں میں بعض زبانیں، ان کا ادب، بعض نظریے اور بعض تصورات
ہی شامل ہو سکے ہیں۔ خالد میں افق ہی افق سمٹ سمٹ کر ابھرتے، نکلتے اور پھیلتے ہیں۔ یہ بات ہمیں پھر ان اجزائے ترکیبی کی طرف
لے آتی ہے جن کا اوپر فرداً فرداً ذکر کیا گیا ہے، تاکہ ان اثرات کا جائزہ لیا جائے جن کے وہ مستلزم ہیں۔

ذوق و شوق اپنی منزل آپ نہیں بلکہ اس ساز و سامان کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جو شعر و ادب کے لئے درکار ہوتا ہے۔ خالد
ان روشن دماغ لوگوں میں پیش پیش ہے جو مغربی ادب و فکر میں گہرے ڈوبتے اور ان کا بھرپور اثر لے کر آتے ہیں۔ خصوصاً انگریزی شاعر، ادیب
اور مفکر اس کے لئے اتنے ہی زندہ و فعال ہیں جتنے مشرقی۔ اب مغربی روایت درحقیقت ہماری ہی روایت کے بمنزلہ ہے اور مغرب کا جزو کل
ہماری دنیا کا ایک اہم عنصر۔ بنابریں جدید شاعری نے جو وضع اختیار کی تھی اور اس کا سلسلہ جہاں تک پہنچا تھا خالد نے اس کو اپنایا اور کچھ انگریزی
شاعری کے مطالعہ اور کچھ اپنے شعور و ذوق کی کارفرمائی سے اس میں نئے خد و خال، نئے بال و پر پیدا کئے۔ اس کی دو نمایاں صورتیں تھیں شیکسپیئر
کی وضع کے منظوم ڈرامے اور انگریزی کی رومانوی شاعری، خالد دونوں کا بے حد مشتاق ہے اور ان کو اردو میں جلوہ گر کرنے کا خواہاں۔ ستر دلبراں
کو حدیث دیگراں میں بیان کرنا اس کی افتاد طبع کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے وہ ڈراموں میں تمام تر اور غنائیہ نظموں میں زیادہ یہی بالواسطہ
طریقہ اختیار کرتا ہے۔ تخلیقی عمل ہمیشہ ذاتی، بلاواسطہ تاثرات ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی تخلیقات سے اثر پذیری کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔
اخذ و استفادہ اسی طرح رونما ہوتے ہیں اور اس حقیقت کو آشکار کرتے ہیں جو سرقہ یا اکتساب کی تہہ میں کام کرتی ہے۔ جس تک تاثر و
فیضان کے روایتی نظریوں کے باعث ہماری نظر نہیں جاتی ہے۔ صاحب فن وہبی ملکہ یا حاسۂ باطنی سے دوسرے فن کاروں کا قائم مقام بن
جاتا ہے اور ان کے فن عمل کا رخ اور تیور بھانپ کر ایک مشابہ و متوازی تخلیقی عمل سے اپنے یہاں لے آتا ہے، اس طرح اس کی تخلیق بھی گویا
طبع زاد ہی ہوتی ہے اور اس کی ذاتی تخلیق نہ کہ دوسروں کا چربہ یا دریوزہ گری۔ اس کے ادب پارے اظہار و بیان اور روح مضمون کے اعتبار
سے اخذ و استفادہ کے باوجود جدت و ندرت کی شان سے نمودار ہوتے ہیں۔

خالدؔ نے اسے "باز آفرینی" کہا ہے، جس کے معنی ہیں، از سر نو تخلیق۔ محض صدائے بازگشت نہیں۔ لہٰذا شاعر نے اخذ و استفادہ کے ساتھ حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ایک امتیازی شان پیدا کی ہے اور اس کی متعدد پیشکشیں دوسروں کی ہوتی ہوئی اس کی اپنی بھی ہیں۔

اس ضمن میں زیادہ تر زور منظوم ڈراموں پر رہا ہے جیسے وہ اُردو میں ڈراموں کے فقدان کے خلا کو مکمل طور پر پورا کر دینا چاہتا ہو۔ اس سے پہلے جو منظوم ڈرامے لکھے گئے وہ سب مختصر پیمانے پر تھے؛ اور ان سے اس صنف کا نقش اردو میں قائم نہیں ہو سکا تھا۔ خالدؔ کے ذوق و شوق نے کم از کم یہ بات ضرور پیدا کر دی ہے۔

منظوم ڈراموں کے ساتھ مناسب بحروں کا مسئلہ بھی ہے جو خاصا دشوار ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بالاکثر منظوم ڈرامے اس شعور کے ساتھ لکھے بھی گئے ہیں یا نہیں کہ اس صنف کا مخصوص وضع کا مکالمہ کس بحر یا بحروں سے بخوبی ادا ہو سکتا ہے اور اب تو فری ورس، اسپیکنگ ورس اور جستہ آہنگ سے بات بہت دور جا پڑی ہے۔ خالدؔ نے زیادہ تر بحر مضارع و رمل مثمن و مسدس مزاحف ہی برتی ہے۔ ان بحروں کی بنیادی مشکل ان کی واضح جھنکار اور جامد وضع ہے۔ تاوقتیکہ شاعر کی جولانیٔ طبع پورے زور پر نہ ہو اور از خود رنگینی بیان میں بے ساختہ سیال بہاؤ نہ پیدا کر دے، یہی اندیشہ ہے کہ ٹھوس وزن اس کی لوچ لچک پر غالب نہ آ جائے۔ ہمارے اکثر شاعر جنہوں نے یہ بحریں اختیار کی ہیں یا انہوں نے پابند نظم میں مکالمے دوڑائے ہیں، اس بنیادی مشکل کو حل نہیں کر سکے۔ مثلاً جعفر طاہر کا زورِ بیان مسلّم، مگر اس کے پابند نظم میں مکالمے آغا حشر کی مقفٰی نثر کا جواب ہیں۔ ان سے مکالمہ کو زندگی کی اصلیت اور بے ساختہ گفتگو سے قریب رکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب مصرعوں کے دوران مناسب ٹھہراؤ اور بیان و مضمون کے مصرع بہ مصرع ڈھلک جانے سے آہنگ میں تنوع اور یہ احساس پیدا ہو کہ واقعی زندگی میں گفتگو یا بیان کا سلسلہ جاری ہے۔ مثلاً

نہیں سردی نہیں، چلتی ہے سمومِ سوزاں
گرمی لگتی ہے، ہوا بند ہے، دم گھٹتا ہے
چھینٹے پانی کے مرے ہاتھ پہ دو
برف دو مجھ کو چبانے کے لئے
میری پوشاک کو ڈھیلا کر دو
کھول دو بند قبا کے مرے فی الفور شتاب

شاعر کو یکسانیت کے توڑنے کا احساس ہے اور وہ اس کے لئے کئی ترکیبیں اختیار کرتا ہے۔ مثلاً بعض جگہ طویل و مختصر مصرعے، مصرعے کے وزن میں قدرے تصرف ("بوجتا ہیں ترے جسم کی شیدائی ہوں") وہ اصول جسے شاعر تسکینِ اوسط قرار دیتا ہے۔ کرداروں کی تقریر کے مطابق مصرع کی کئی بیڑیوں میں تقسیم، طبیعت کی جولانی اور متلون بہاؤ کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے ایک مخلوط ہیئت وضع کی ہے جس میں حسب منشا قافیہ سے گریز بھی کیا جا سکتا ہے اور پے در پے قافیوں کا اہتمام بھی ممکن ہے، جس سے زورِ کلام اور سیلان میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور کبھی یہ دونوں پا بہ زنجیر بھی ہو جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ڈرامہ "آشوربنی پال" میں یہ سیال پن زیادہ ہے اور شیکسپیرین ڈرامہ کا جو تصور شاعر کے ذہن پر حاوی ہے اس کو خاصا اُجاگر کرتا ہے۔

شاعر نے جن ڈراموں پر اپنے ذہن سے کیمیائی عمل کیا ہے وہ زیادہ تر انگریزی ہیں، گو ان کے موضوعات مغربی بھی ہیں اور مشرقی بھی۔ یہی کیفیت غنائیہ شاعری کی بھی ہے۔ اس طرح یہ دائرہ انگریزی کی تمثیلی و غنائیہ شاعری کی حد سے نکل کر عالمی شہ کاروں پر حاوی ہو جاتا ہے: جیسا کہ سیفو کی منظومات کے تراجم "سرودِ رفتہ" اور ٹیگور کی گیت انجلی کے ترجمہ "گل نغمہ" سے ظاہر ہے۔ چونکہ ان سب کا ماخذ انگریزی

کے منظوم ڈرامے، رومانوی شاعری اور غنائیہ منظومات ہیں، اس لئے خالد کی شعری کاوشوں کی حقیقی بنیاد یہی ہیں اور نتیجتہً وہ ان کی قوتوں اور کمزوریوں کا وارث بھی ہے۔ علیٰ ہذا اس کے شعری و فنی تصورات کا سرچشمہ بھی انگریزی ہی ہے۔ اس کی معلومات جو اس نے "سرود رفتہ"، "غزل الغزلات"، "گل نغمہ" میں پیش کی ہیں، انگریزی ہی سے ماخوذ ہیں۔ اگر ان تمام امور کی بنا پر شاعر کو ایک ذہنی اسفنج، مقناطیس یا کاہ ربا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ایک سفیر معنوی جو دنیا بھر کا سامانِ غنیمت کھینچ کھینچ کر اپنے دامن میں لے آتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے وطن میں بھی۔ اس لئے کہ۔ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست۔ "زنجیرِ رم آہو میں" "طیور آوارہ" کے زیرِ عنوان ادب پارے خیابانِ مغرب کی گل چینی کے آئینہ دار ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ خوشہ چینی اس کی طبع زاد نظموں میں کس حد تک ہے۔ اپنا مسلک اس نے خود ہی واضح کر دیا ہے:

تمتع زہر گوشۂ یافتم   زہر خرمنے خوشۂ یافتم

اگرچہ وہ محض خوشہ چین نہیں بلکہ ان خوشوں میں اپنے ذہنِ رسا سے رنگ رس بھی بھرتا اور ان میں گل ہائے رنگ رنگ شامل کر کے بہارِ تازہ پیدا کرتا ہے۔ مغربی شاعری کے اعلیٰ نمونوں کو شمعِ راہ بنا کر وہ اپنے ہی تصور کی جوت جگاتا اور اپنی طبع زاد تخلیقات سے اردو شاعری کو چار چاند لگاتا ہے چنانچہ اس کی غنائیہ منظومات میں بھی ہئیت و مواد کی چیدہ چیدہ ندرت کوشیاں جھلکتی ہیں۔

ان توضیحات کا مدعا یہ ہے کہ جدید شاعری کو ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ کرنے کی خاطر شاعر کے لئے انگریزی شاعری ایک مہتم بالشان توشہ خانہ ہے اور ہیئت و مواد کی جو جو تازہ تر صورتیں اُردو شاعری کو بیش از بیش وسعت اور طرح نو عطا کرنے کے لئے ہاتھ آسکتی تھیں اس نے وہ فراہم کی ہیں۔ ان کا سلسلہ زیادہ تر انگریزی رومانوی شاعری تک محدود ہے۔ جدید ترین انگریزی شاعری اس حد سے فی الحال خارج ہے۔ جس سے بعض اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں؟ کیونکہ اس طرح "سرود رفتہ" ہی اجاگر ہو سکتا ہے اور فروغِ حافر کی بجائے جلوۂ دوش ہی زیادہ پیش نظر رہتا ہے۔ خالد کا شعور بدستور انیسویں صدی کا رومانوی شعور ہے۔ اقبال اور اس کے مابعد شاعروں سے ممیز کیا وہ اس حلقے سے گزر کر ہاپکنس، ٹی، ایس، ایلیٹ، ڈائی لان تھامس اور فرانسیسی علامت نگاروں جیسے "جدیدین" کی طرف رجوع کرے گا اور اس سوال کے جواب پر بہت کچھ موقوف ہے۔

شاعر کے ذوق و شوق نے مغربی ادبیات کی حد تک جو ساز و سامان فراہم کیا اس کی کیفیت یہ تھی۔ فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی اور خود اردو نے جو کچھ دیا وہ اس پر مستزاد ہے۔ ایک حاشیہ آرائی۔ چونکہ وسیلۂ اظہار اردو تھا، اس لئے زبان و بیان کے وسائل خانہ سازہی رہے۔ ان میں ذخیرۂ الفاظ کی اہمیت ظاہر ہے، کیونکہ شاعری کا جادو الفاظ ہی جگاتے ہیں۔ شاعر کی ایک بڑی مہم ایسے الفاظ کی تلاش ہے جو اس کے مقاصد کو پورا کر سکیں۔ خالد نے جس زور شور سے اس مہم کا اہتمام کیا ہے وہ اس کی بلند حوصلگی کے شایانِ شان ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اور دیگر اعتبارات سے بھی، الف لیلیٰ کے عظیم الشان رخ کا تصور کیجئے۔ قوی بال و پر، صبار فتار، علوی فضاؤں میں اپنے پرِ سطوت شاہانہ پھیلائے، آفاق کی پہنائیوں میں قاف تا قاف، پست و بلند، سنگلاخ کوہستانوں لق و دق صحراؤں، بسیط وادیوں، وسیع و عریض میدانوں، انبوہ در انبوہ جنگلوں اور بیکراں سمندروں کی پہنائیوں پر گرم پرواز، اور جب وہ کسی البرز یا الوند کی چوٹی پر جا بیٹھتا ہے تو کسی سندباد کی حکمتِ عملی سے بیش بہا لعل و جواہر، الماس و یاقوت، نیلم و زمرد اور زر و سیم کے تودے کے تودے فراہم ہوتے ہیں، ایسے کہ ہر گہر پارہ "خاتم بانوئے قیصر کا نگیں بن گئے" رہے۔ یہی فال و فر اور شان و شکوہ اس کے منیل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ الفاظ کے انمول ہیرے موتیوں اور "تودہ ہائے عنبرائے سیم و زر" کا متلاشی بھی ہے اور پجاری بھی۔ تفحص الفاظ اس کے لئے باعثِ زحمت نہیں۔ اس کی براقیٔ طبع اور فطری ذکاوت خود اس کی کفیل ہے۔ اور الفاظ کے ساتھ ہی وہ شہ پارے بھی ہیں

جن سے قدیم و جدید ادبیات کا دامن لبریز ہے۔ اگر خالد کسی عنصری، کسی خاقانی، کسی نظامی یا وصاف، قائم مقام ابوالفضل علامی کا معاصر ہوتا تو وہ بعینہٖ عنصری، خاقانی، نظامی، وصافِ حضرت، قائم مقام اور ابوالفضل علامی ہوتا۔ اس لئے کہ ہمارے ملک الشعراؤں اور دفتر آراؤں نے جو عالمانہ مغلق الفاظ، تراکیب، پیرائے، صنائع، بدائع اختیار یا ایجاد کئے تھے، وہ ان سے سبقاً سبقاً گذرا ہے۔ ان کے سارے گُر اسے ازبر ہیں اور ان کے گن اوگن دونوں اس کے ہیں۔ اس لئے وہ انہیں بھر سے اپنے کلام میں لا سکتا ہے۔ از طاق بادہ گیرم و در ساغر انگنم۔ اور اس بادہ کا کیف جیسے تو یں ہوگا ویسے ہی کہیں بھی ہوگا۔ پوری پوری باز آفرینی سے شاعران کو قلم کی طرح تختۂ الٹ کر ایک دم سامنے لا سکتا ہے وہ پوری کی پوری تہبت جو گزر چکی ہے۔ لہٰذا اس کے شعری کیف کا کافی حصہ بادۂ دوشینہ کا کیف ہے یا خمار، اور جیسے ہم اس کے دھارے پر آگے بڑھتے ہیں، ویسے ہی پیچھے بھی ہٹ جاتے ہیں۔ پرانی شاعری کا سیلِ بے زنہار یوں جدید شاعری میں امڈ آنے سے فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی۔ اس لئے کہ یہ ندرتِ پارینہ ہے۔ ندرت بجا، تاہم ساتھ ہی اخلاقِ جلالی، درۂ نادرہ اور تاریخ جہاں کشائے نادری کے بادۂ دیرینہ کی سرجوشی بھی ہے۔

عجم سے عرب چلے جائیں تو آب و ہوا گرم سیر ہونے کے باوجود تاثیر میں یکساں رہتی ہے۔ کیونکہ عربی میں عربیت مطلق الحکم ہے، فارسی پر اپنی تجریدی وضع اور دینی فوقیت سے حاوی۔ مگر شاعر قرآن مجید اور عربی شعرا، خصوصاً شعرائے جاہلیہ سے نئی نئی چمن بندیوں کا سراغ لگاتا ہے۔ وہ عرب کی زندگی، اس کی ثقافت، اس کی ساری دھرتی اور بادیہ کی ریگِ رواں کو موکشاں اپنے کلام میں لے آتا ہے۔ اور ہم جدید شعری نصاب کے واضع ایلیٹ کی دلق مرقع "ویسٹ لینڈ" میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ خالد نے ایک نئے انداز سے دوسرے شاعروں کا گھر بے چراغ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس طرح کہ الہ دین کے جادوئی چراغ سے سارا محل اٹھا لایا جائے۔

کیا عربی، فارسی کے علمی ادبی دھارے سنسکرت و ہندی سے مل سکتے ہیں! بادی النظر میں یہ دو انتہاؤں کا ملاپ ہے۔ سوال محض زبانوں کا نہیں بلکہ اس فاصلہ ذوق، اس فاصلۂ مزاج کا ہے جو ان کے درمیان حائل ہے۔ وہ خلیج جسے کوئی بہت بڑا مہندس ہی پاٹ سکتا ہے۔ مگر کسی البیرونی سے یہ کارنامہ بعید نہیں۔ اور ہمارے عبدالعزیز خالد، ہمارے جعفر طاہر اس کے عملی ثبوت ہیں کہ مشرقین کے ڈانڈے کس طرح مغربین سے ملائے جا سکتے ہیں۔ خاقانی اور قاآنی کے ذخیرۂ الفاظ کا بحرِ بیکراں دیکھ کر ہر اثر جو کوزہ و سبیل سے تعجب ہوتا ہے کہ زبانوں کے یہ دھنی، یہ شبدوں کے ساہوکار، یہ لغت کے قارون کیسے پیدا ہوئے؟ مذکورہ دونوں شاعر اس کا برجستہ جواب ہیں۔ جن کی لغت دانی پر عرصۂ آفاق تنگ ہے۔

عربی، فارسی اور دیسی زبانوں کا میل اتر پورب کا میل ہے۔ ایک پرکار دوسری سادہ، بلکہ سیدھی سادی۔ ایک علم، فلسفہ، حکمتِ دین کی دھنی دوسری دھرتی کے رنگ میں رچی بسی، ہلکی پھلکی مدھر، کام کرت، روپ جوبن کی کومل، سندر شوبھا کے گن گاتی۔ اردو کی حد تک دونوں کے طور تیور جدا جدا، دیسی زبانیں اپنی، پیار محبت کے رس بھاؤ اور روپ جوبن کے سبھاؤ پر اتراتی۔ تو فارسی عربی کو اپنی لطیف و شیریں وضع پر ناز۔ ایک کومل تو دوسری ٹھوس، بھاری بھرکم۔ اس لئے ایک سے دوسری کی طرف گریز کے معنی ہیں ذوق و مزاج کو یکدم بدل دینا۔ زاہد کا چولا اتار کر رند بن جانا۔ ڈاکٹر جیکل بھی اور ہائیڈ بھی۔ ایسی باتیں جن کا جوڑ ہی نہیں۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ کوئی شخص یونانی بھی ہو عبرانی بھی، ہر دو متناقض باتوں کا جامع۔ وہ بے حد ٹھوس، سنجیدہ، خشک یہاں تک کہ بلید بھی رہے اور اس میں پرلے درجے کا لوچ لچک، اچپلتا اور پل پل بدلتی ہوئی جتر کاری اور نرت بھی ہو۔ خالد بے حد وضعدار سہی مگر جب وہ کھل کھیلنے پر آتا ہے تو وہ رند بن کر مادھو کو بھی مات کر دیتا ہے۔ اس کی شخصیت سارے بندھن توڑ کر، سارے نقاب اتار کر، بے حجابانہ فرائیڈین نمود کی حد تک سامنے آجاتی ہے اور ہم تعجب کرتے ہیں کہ خلوت و جلوت میں یہ تضاد، آں کارِ دیگر می کنند۔ یعنی کیا یہ وہی خالد ہے؟ عابدِ شب زندہ دار جس کے

سلیم الفطرت ضبط و پابندی وضع ہیں کسی خلشِ نہہاں، کسی تلملجان کا شائبہ تک نہیں۔ اس کی فطرت کی یہ دوئی اچنبھے سے خالی نہیں۔ یعنی اپنا رقیب آپ! اپنے آپ سے برسرِ پیکار!! اس کے ترکش میں دو تیر، ایک سطبر (موٹا۔ کند۔ بھدّا) اور دوسرے کی انی تیز، تیکھی، نوکیلی۔ جب بھی اسے موقع ملتا ہے بلکہ وہ ایسے مواقع تلاش کرتا ہے جن میں اس کے من کا کام دیو اپنا من چلا پن دکھا سکے۔ تو وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ جی کھول کر رنگ رلیاں کرنا، پھاگ کھیلنا، دھومیں مچاتا اور سوانگ رچاتا ہے۔ اس کا جی نہیں چاہتا کہ اس رس بیلا کے رنگین کھیل کو چھوڑے وہ اس حدیثِ دلنشیں کو زیادہ سے زیادہ طول دیتا ہے۔ لائے خوار جو تلچھٹ تک بھی نہ چھوڑے اور جب ایک ہی سانس میں تمام ابلاؤں، دوشیزاؤں، گوریوں، سانولیوں، سلونیوں، کامنیوں، گج گامنیوں، چھیل چھبیلیوں، سلومیوں، بلیتساؤں، عشتاروں اور پدمنیوں کے نام نہ لے لے۔ جعفرؔ طاہر کا چتر رقیب۔ اس کا ذوق مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس ذوقِ فراواں کی عذرخواہی نہ ممکن ہے نہ ضروری۔

اگر خود نگہداری کے باوجود اقبالؔ کو فردوس میں حوریں مجبورِ نوا کر سکتی ہیں تو ایک زندہ اقبال کو جو ذوقِ حیات سے سرشار ہے زندہ و گویا حوریں مجبورِ نوا کیوں نہ کریں؛ "عمر بھر کی بے لبی کا انتقام"! یہ شاعر کی رواتی روح جس کا والٹر پیٹر نے اس تفصیل سے نقشہ پیش کیا ہے، کا ازلی و ابدی تقاضا ہے اور خالدؔ اس سے بدرجۂ اتم بہرہ ور۔

جو خراب ذوقِ گلچینی اتنی دور دور اور پاس پاس زبانوں کا رنگ رس اڑائے وہ اپنی زبان اردو کے روپ سروپ اور کافر ماجرائیوں یعنی گنجینۂ معنی والفاظ سے کیسے بے خبر رہ سکتا ہے۔ اس نے اس سرمایہ سے بھی بہت کچھ لیا ہے اور بہت کچھ بڑھا چڑھا کر واپس بھی دیا ہے۔

یہ تھا وہ سامان جو خالدؔ نے اِس کنارے، اُس کنارے گوشے گوشے سے فراہم کیا اور اُردو کی آب و تاب بڑھائی۔ کیسے؟ اس کا جواب اس کی شاعری کے بسیط جائزے ہی سے دیا جا سکتا ہے۔

دیکھی سنی باتیں، مشاہدہ کی باتیں، تجربہ کی باتیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ مطالعہ کے علاوہ ہیں۔ مگر آرائشِ محبوب کے جذبۂ بے اختیار کے لئے یہ سب بجا اور بکار آمد ہیں۔ شاعر نے اپنی بساط بھر ان سے بھی کام لیا ہے۔

ممکن ہے تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں ۔ وہ دوسروں کی نظر ہیں خزاں کا موسم ہو۔ مگر اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ہم جس کو خزاں سمجھتے ہیں وہ بہار ہو۔ ہمارے یہاں دیکھنے والوں نے زرد داغِ دل سے برگِ خزاں تک خزاں ہی خزاں دیکھی ہے۔ مگر ہمارے دیس سے پرے، بھارت میں۔ ہشیار رندوں کی نظر کچھ اور کہتی ہے ۔ وہ اس برگِ خزاں کو برگِ بہار ہی سمجھتے ہیں۔ اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی! ٭

———×———

محمد عبداللہ قریشی

خالد اپنے اشعار کے آئینے میں

عبدالعزیز خالد سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بڑے نیک، مخلص اور ہمدرد انسان ہیں۔ مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے۔ ان کے دل میں محبت، آنکھوں میں مروت، ہاتھوں میں سخاوت، برتاؤ میں شرافت، قول میں صداقت اور مزاج میں انکسار و استغنا، غرض وہ تمام خوبیاں پورے جلال و جمال کے ساتھ موجود ہیں جن سے گوشت اور پوست کا مجموعہ شریف انسان کہلاتا ہے۔ ان کی ذہانت، فطانت اور علم و فضل میں بھی کوئی کلام نہیں مگر ان میں شاعروں والی کوئی بات میں نے نہیں دیکھی۔ نہ وہ اپنے جسم و لباس سے بے پرواہ ہیں نہ گھر والوں سے، نہ وہ تنگ دست و قلاش ہیں نہ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں دوستوں سے خوش گپیوں میں بے کار وقت ضائع کرتے ہیں۔ وہ ایک معزز شہری اور مقتدر عہدیدار ہیں جو اپنے فرائض منصبی نہایت ذمہ داری سے ادا کرتے ہیں۔ ان میں غرور اور تکبر کا شائبہ تک نہیں۔ اگر کوئی انھیں ایسا کہتا ہے تو حسد سے کہتا ہے:

یہ اتہام لگایا گیا براہ حسد — وگرنہ خالد خوددار میں غرور کہاں؛ (کف دریا ص ۱۰۱)

ان کی شرافت سے فائدہ اٹھا کر ان کے ہمزاد نے انہی کے نام سے چند کتابیں چھاپ لی ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

فارقلیط	منحمنا	سرودِ رفتہ	غزل الغزلات	دکانِ شیشہ گر
برگِ خزاں	ورقِ ناخواندہ	سلومی	گل نغمہ	لحنِ حریر
زنجیرِ رمِ آہو	زرِ داغِ دل	کلکِ موج	ماتمِ یک شہرِ آرزو	دشتِ شام
کفِ دریا				

ان کتابوں کا خالق بے حد خود ستا اور تعلّی باز ہے۔ بہت بلند بانگ دعوے کرتا ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے۔

"میں خالد آخر الزماں ہوں" (دشت شام ص ۲۲)

اور یہ بھی کہ:

خالد، ملک الکلام خالد۔ مشہورِ انام، نام اس کا (کفِ دریا ص ۸۱)

اس کا دعوےٰ ہے کہ میں فقط شاعر ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں:

ہم ذریعہ نہیں ہیں مقصد ہیں — ہم نہیں دولت و حکومت کے
آلۂ کار، ہم سخن ور ہیں — تاجدار معانی و الفاظ
ترجمان خدائے اکبر ہیں (کف دریا ص ۹)

وہ کہتا ہے کہ اگرچہ شاعری جی کا جنجال بن کر میری صحت تباہ کر رہی ہے پھر بھی میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں شاعری ترک نہیں کر سکتا۔

ترک ممکن ہے، ترک عشق بھی — شاعری لیکن ہے میری زندگی

تندرستی نہ ہوتا عمر نصیب   شعر کی جس کو لگے بیماری

(کفِ دریا ص ۴۸)

وہ اپنی ذات کے عرفان اور کائنات کے اسرار و رموز جاننے کا مدعی بھی ہے۔

شاعر نہیں جو مستِ مے ذات نہیں   نقادِ روایات و درایات نہیں

رکھتا ہوں معانی سے سروکار فقط   ہیں قشر پرست اصطلاحات نہیں

(لحن حریر ص ۸)

خلوتی پردۂ اسرار کا ہوں   میں نہیں مردِ مقالات و خطاب

بے پیئے مست ہوں میں شاعر ہوں   آبِ حیواں کو سمجھتا ہوں سراب

(کفِ دریا ص ۱۰-۱۱)

سمجھتا ہوں اشاروں کی زباں کو   مجھے معلوم ہے کیف و کم کُن

تبسم رُخ پہ لیکن حزن دل میں   ہے درکارِ سخن ضبط و توازن

مجھے بخشا ہے قسامِ ازل نے   نوا سنجی کا سودا، شعر کی دُھن

حقیقت کے الجھتے تار دے کر   کہا: جان سے خوابوں کی قبا بُن

کبھی ٹانک آسماں پر چاند تارے   کبھی مٹی سے دُرِّ شاہگاں چُن

زمیں گویا عروسِ آسماں ہے   ذرا آپس میں ان کی گفتگو سُن

نہیں حد کوئی ادراک و ہنر کی

و فوقَ کُلِّ ذی علمٍ علیم

(دشتِ شام ص ۲۳-۲۴)

عشق و جنوں نے اس کے تنِ بدن میں آگ لگا رکھی ہے:

ہر چند نہفتنی ہیں اسرارِ دروں   جو دل پہ گزرتی ہے اسے کہتا ہوں

چہرے سے متانت مترشح، لیکن   باطن میں ہے آتش کدۂ عشق و جنوں

(لحن حریر ص ۹۱)

وہ حسن و نغمہ کو شراب اور شعر کو مناجات کا نام دے کر بدنامی کے ڈر سے اشاروں کنایوں میں بات کرتا ہے:

حسن و نغمہ مری مے، شعر مناجات مری   مجھے قرآن سناتی ہے نسیمِ سحری

کہیں بدنام نہ ہو یارِ عزیز، اس ڈر سے   شاعر ابہام و اشارہ میں کہے بات اپنی

(کفِ دریا ص ۲۵۲)

احساس کا مغنّی، الفاظ کا مصوّر   خالد ہے حسن کاری میں بے مثال و یکتا

(کفِ دریا ص ۸۶)

اس کو اپنے ذہنِ رسا پر بڑا ناز ہے، گویا عالی دماغی کا تاج اسی کے سر ہے:

ذہنِ رسا سے مضمون اُگتے ہیں گلبن آسا
خوشبوئے فکرِ عالی سے خامہ ہے معطر

(از نخچیرِ رم آہو ص ۴۴)

ہم اپنے ذہن کو اِک سلطنت سمجھتے ہیں
دل و دماغ ہیں سرچشمہ شعر و حکمت کا

غلامِ فن ہیں پرستارِ اقتدار نہیں
رفیقِ راہ تھا خلوص و استغنا

حسب نسب ہے ہمارا ادب، ادب منصب
ادب نے ہم کو زمانے سے بے نیاز کیا

ہے ہم کو خرقہ پشمیں ہی اطلس و اکسوں
ہمیں خبر ہے کہ الکا سب حبیب اللہ

نہ برگِ راہ میسر نہ توشۂ منزل
مہم حرف کو ہم سر کریں تن تنہا

ہمارے خون ہی سے رنگ دام لیتے ہیں
شفق، شہاب، دھنک، گگن، چمن، صبا

مزاجِ شعر ازل سے ہے دیو مالائی
سمندِ فکر کو افسانہ تازیانہ ہوا

حریمِ فن میں لقائے دوام کی پریاں
طلازمانہ دہیں دست بستہ استادہ

(دشت شام ص ۸۵ - ۹۰)

جذبات کی اسی ہیجان نے اسے کتابیں لکھنے پر مجبور کیا ہے :

عزمِ تخلیق تڑپتا ہے رگ و ریشہ میں
میری تحریر مرا گوشت ہے مرا شعلہ

(دشت شام ص ۱۴۸)

میں نے یہ تخلیقات پڑھی ہیں۔ کچھ رغبت و شوق سے اور کچھ بے دلی سے، بعض اچھی لگیں، پسند آئیں، بعض نے بے مزہ کیا، بھاری پتھر سمجھ کر چوم کے چھوڑ دیں۔ یہ اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ایک شخص اتنے اصنافِ ادب پر حاوی کیسے ہو گیا۔ انجیل کے پرانے عہد نامے سے لے کر نئے عہد نامے کی حکایات و روایات تک، یونانی دیو مالا سے لے کر ٹیگور کی گیتا نجلی تک؛ حضرت سلیمان ؑ کے نغمہ نغمات سے لے کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و نعت تک سب میں جودتِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ منظوم ڈرامے اور غنائیے بھی لکھے ہیں، نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں اور قصیدہ اور رباعیات بھی۔ اچھی بھلی صاف ستھری اردو زبان بھی استعمال کی ہے اور جناتی زبان بھی۔ عربی، فارسی، ہندی اور دیگر کئی زبانوں کے لغات اور محاورات کے خزانے جھولیاں بھر بھر کر بے دریغ اس طرح لگائے ہیں کہ سمیٹے مشکل ہو گئے ہیں۔ ان کا اتنا انبار لگ گیا ہے کہ شعر کی لطافت الفاظ کے بوجھ تلے دب گئی ہے، زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھا جائے تو :

شعرِ خالد کو لوگ کہتے ہیں
ہے تو ہیرا یہ ناتراشیدہ

(دشت شام)

خالد خود بھی اپنی اس خامی سے آگاہ ہیں:

گو میں ظاہر، باطن، اول، آخر
شاعر ہوں سب اصنافِ سخن پر قادر

ہے بغزِ اشعار کا مضمون مگر
مصداق، دُمَاشُو بقولِ شاعر

(الخ...)

وہ ایک طرف تو اپنے عجز کا اعتراف کر کے چپکے چپکے خدا سے نگاہِ کرم کی التجا کرتا ہے۔

تیری مشیت سے ہو ہم نفسِ آفتاب — شمع تنگ تاب ہے میری تمنائے خام
ایک نیستاں ہوں میں، گرمیٔ نے کو عطا — حدّتِ مہرِ مبیں، خنکیٔ ماہِ تمام
منزلِ فن دور ہے، عظمتِ فن دور تر — آہوئے دشتِ ہنر ہوتا ہے مشکل سے رام
مسندِ عظمت پہ ہیں خونِ جگر کے نشان — شہرتِ جاوید ہے ثمرۂ سوزِ دوام
درگہِ امید میں، میں ہوں غریب و فقیر — میری متاعِ حقیر مایۂ تضحیکِ عام
جس نے لگا رکھی ہے میرے رگ و پے میں آگ — ہوگا وہ سوزِ دروں جانے کب آسودہ کام
گرچہ ہے قبلہ نما پھر بھی ہے کفر آشنا — یہ دلِ بے مدعا بندۂ دینار و درام

خالقِ شام و پگاہ ایک کرم کی نگاہ
پھرتا ہوں میں لیے کلاہ تاج بقائے دوام

(زنجیر رم آہو ص ۱۳ - ۱۵)

مگر وہ دوسری طرف اعتراض کرنے والوں ہی پر جوابی حملہ کر دیتا ہے کہ حضور! یہ تو فرمایئے کہ اگر میرا ہیرا آبدار نہیں تو جوہر[ی] کی آنکھیں خیرہ کیوں ہو رہی ہیں:

یہ بات حسن شناسانِ شعر سے پوچھو — کہ راز کیا ہے فروغِ کلامِ خالد کا
ملے نہ یونہی مصنف کو عظمت و شہرت — کہ عود آگ میں جل کر ہی جاں فزا ہوا

(دشتِ شام ص ۹۰)

نا تراشیدہ بھی ہوں ابلہ بھی ہوں — ہوں مگر مست شرابِ کبریا

(کفِ دریا ص ۱۹۵)

ہر غوغِ نغمہ کو خالد کہتے ہیں لوگ خبطی — لیکن برا نہ مانو معذور ہیں یہ ناداں

(زنجیر رم آہو ص ۱۶۱)

شعر ہے جنوں کا جذبۂ خلاقی — ہے عشقِ حقیقی و خرد الحاقی
پڑھ گفتۂ خالد کو بہ امعانِ نظر — فیضان ہے یہ، نہیں نری مشاقی

(لحنِ صریر ص ۱۶۰)

اسی زعم میں ساری دنیا کو للکارتا ہے کہ آج نہ سہی کل میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ گے:

آج جو ابلہ سمجھ کر مجھے ٹھکراتی ہے — کل یہ دنیا مرے دروازے پہ دستک دے گی۔

(کفِ دریا ص ۲۵۶)

اب یہ دنیا والوں کا کام ہے کہ اصلی خالد اور شعر نواز خالد کو پہچانیں، کھرا کھوٹا الگ کر دکھائیں اور اپنے ذوق اور وجدان کی بدولت اس کے فن کا تجزیہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیں۔

اشعار کی بضاعت لایا ہے کوئی خالد — آؤ کریں مشخص ہم اس کی قدر و قیمت

(زنجیر رم آہو ص ۱۶۹)

انور رومانی

خالد کی انفرادی خصوصیات

میں اور خالد ہم علاقہ، ہم برادری، ہم طبقہ، ہم مکتب اور بہت حد تک ہم خیال اور ہم اقدار ہیں۔ حتیٰ کہ عقدۂ لسانی اور خوف تقریر میں بھی مشترک ہیں۔ وہ بھی اسی متوسط طبقے کی "فردوس گمشدہ" کا فرزند ارجمند ہے۔ محنتی، جفاکش، سربلند، خوددار، خلوت پسند، خودنگر اور آزاد منش! وہ آج ہمارے اس علاقے کے خدامست کسان کی طرح علم و ادب کی نہایت سنگلاخ زمینوں میں اپنے تجربات کے ہل چلاکر سونے اور چاندی کی نادیدہ فصلیں اُگا رہا ہے۔

ایک دن میں اسلامیہ ہائی اسکول ننگل انبیا کے لائبریری روم میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا وہاں آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا اس کا چہرہ سنجیدگی، وقار اور معصومیت کا مرقع تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن، لازوال مسکراہٹ ثبت تھی جو اس کی آنکھوں میں بھی حلول کئے ہوئے تھی بلکہ اس کے پورے چہرے پر پرتوفگن تھی۔ بالکل ایسی مطمئن، لازوال مسکراہٹ جو شہرۂ آفاق اطالوی مصور لیونارڈو ڈاونسی (۱۴۵۲ - ۱۵۱۹ء) کے شاہکار "مونالزا" میں مجسّم ہے! میں نے اس کو ایک نظر دیکھا اور پھر اپنے لکھنے میں محو ہوگیا! تھوڑے عرصے بعد وہ لڑکا جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا! دوسرے دن وہ بھولا بھالا لڑکا پھر آیا اور بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔ "آپ کون ہیں اور کیسے آئے ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "میں عبدالعزیز ہوں اور یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ کیسے پڑھتے اور لکھتے ہیں؟" یہ تھی میری اس وقت کے عبدالعزیز اور آج کے شاعرِ اعظم عبدالعزیز خالد سے پہلی ملاقات اور پہلی گفتگو۔!!

اب تک اس کی جو خصوصیات مجھ پر واضح اور منکشف ہوئی ہیں وہ بالترتیب مندرجۂ ذیل ہیں۔

اوّلاً: خالد ایک وسیع و دقیق علم و فضل کا مالک ہے۔ ہمارے موجودہ ادبا و شعراء میں وہ علم و فضل کے لحاظ سے ممتاز ترین ہے۔ وہ نہ صرف کم و بیش آٹھ قدیم و جدید زبانوں کو جانتا ہے۔ بلکہ ان کا قدیم و جدید ادب بھی اس کے تصرف میں ہے اور ابھی اس کا ذوق زباندانی و مطالعہ جاری و ساری ہے۔ ہمارے ادبا و شعراء اکثر و بیشتر نیم خواندہ ہیں اسی لئے ان میں فکری یکسانیت پائی جاتی ہے اور وہ اپنے ملک و قوم کے لئے کوئی نئی راہ فکر تجویز کرنے سے قاصر ہیں خالد نے اپنے ہوش و حواس ذہن و قلب اور نظر و فکر کے دروازے مقفل نہیں کئے ہیں بلکہ کھلے رکھے ہیں تاکہ جدید و قدیم عالمی ادب کی دلآویز خوشبوئیں اور آوازیں اس کے مشام جاں کو تر و تازہ رکھیں اور اس کی تخلیق کے سوتے ان مختلف النوع معاونین کی شرکت سے مسلسل بڑھتے اور پھیلتے رہیں۔!

ڈاکٹر ہردیال کی طرح قدیم ترین عالمی ادب سے لے کر جدید ترین عالمی ادب پر مسلسل اور گہری نظر رکھنے والا صاحب علم و فضل یقیناً اپنی زبان و اندازِ بیان میں کم علم ادبا و شعرا سے مختلف بھی ہوگا اور مشکل بھی اور عام قاری تو ایک طرف، خود کہنہ مشق ادیب و شاعر

اور نقاد و محقق بھی بعض اوقات اس کی ذخاری کے سامنے عاجز ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن جو قاری خواہ وہ عام قاری ہو یا بذات خود بحر علم و فن کا شناور، کچھ محنت اور دقتِ نظر سے کام لے تو وہ محسوس کرے گا کہ خالد کا مطالعہ اسے لمحہ بہ لمحہ، لو ما فیہو ما بلند کر رہا ہے

ثانیاً: خالد کسی بھی نعرے یا نظریئے کا پابند نہیں ہے۔ اور اسی لئے وہ کسی حزب او بیہ سے منسلک نہیں ہے۔ اس کی حیثیت آزادانہ ہے۔ اور وہ قطبی ستارے کی مانند ہے جو ستاروں میں سے ہوتے ہوتے اپنی جداگانہ تنویر اور سمت نمائی کی وجہ سے ان سے ممیز و ممتاز ہے! جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ اس نے اپنے ذہن و قلب کے دروازے دریچے کھڑکیاں اور روشن دان سب کھلے رکھے ہیں تاکہ نئے نئے احساسات واردات، تجربات، تخیلات اور نظریات کی روح پرور ہوائیں اور بلا روک ٹوک ان میں حلول کر سکیں اور پھر اس کی فطرتِ سلیم کے چشمہ کوثر میں نہا دھو کر حلیہ ہائے الفاظ و معانی پہن سکیں۔ اس لئے اس کی تخلیقات میں نئے نئے احساسات، واردات اور نظریات و تخیلات کا بے پناہ لاؤ لشکر ہے۔ ۱۹۳۶ء کے اردو ادب کے اسکول نے ہمارے ادب اور ہماری ادبی تخلیق کو جو ایک ہی نظریہ کے طلسم میں جکڑ دیا تھا۔ خالد نے اسے توڑ کر ہمارے لئے تخلیق کے تمام راستے کھول دیئے ہیں اس کا یہ اقدام اردو ادب پر ایک احسانِ عظیم ہے اور ایک عجیب مجاہدانہ و غازیانہ شان لئے ہوئے ہے۔

ثالثاً: خالد متنوع افکار و خیالات کو شرفِ باریابی بخشنے اور لبساا اوقات ان کی بازآفرینی کے باوجود قطعی طور پر مسلمان ہے، اسلام کی صداقت اور حقانیت پر مکمل یقین رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ اسلام موجودہ ازموں کی طرح زندگی کا جزوی نظریہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور ایک جامع نظریہ کون و مکان ہے۔ فارقلیط اور منحمنا میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے اس کی جو گہری عقیدت و محبت ظاہر ہوتی ہے وہ اس کا بین ثبوت ہے۔

شاعرِ فردا

کہانی نظم میں ہو یا نثر میں اس کو گا کر سنایا جاتے یا رقص کے طور پر پیش کیا جائے وہ لفظوں میں ڈھلے یا حرکتوں کے ناطے بیان کی جائے، بیتی باتوں اور یادوں گزرے دکھوں اور سکھوں کا کہنا کہانی ہے۔ کہانی کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ نئی ہو کیونکہ نئے واقعات تو دنیا میں روز نہیں ہوتے قصے کو بس قصہ ہونا چاہیے جو گلیوں اور بازاروں میں گا کر بھیک مانگنے والے بھی کہیں اور چوپال میں سردیوں کی لمبی سیاہ راتوں میں الاؤ کے سامنے بیٹھ کر سنانے والے کی داستان سننے والوں کو مبہوت کر سکے۔ قصے صدیوں سے کسی نہ کسی رنگ میں یہاں وہاں سنائے جاتے رہے ہیں، لکھے جاتے رہے ہیں اور عبدالعزیز خالد نے انہیں کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔ یونانی دیو مالا اور اس کی تمثیلیں، بائبل جو کسی فسانے سے زیادہ پرکشش ہے، تمثیلیں جن کے ذریعے زندگی اور موت کی تشریح کی گئی ہے اور ان کے درمیان کا وقفہ جس کو حیات کہتے ہیں جو کچھ اس میں ہوا ہو سکتا ہے یا ہو چکا تھا سب مافوق الفطرت ہونے کے باوجود صدیوں کے فاصلے سے ہم کو حیران کر سکتا ہے۔ کہنے والا فطرت کا رمز شناس ہے۔ کتھک جو بھاؤ، تال اور راگ کے سامنے ساز جاتا ہے اور بیک وقت رقاص اور موسیقار ہے وہ اپنی واردات قلب کو ان کے پردے میں یوں چھپاتا ہے کہ سننے والا اور دیکھنے والا اسے اپنی ہی آپ بیتی سمجھنے لگتا ہے اور اس لئے ساری آپ بیتیاں جگ بیتیاں اور جگ بیتیاں آپ بیتیاں بن جاتی ہیں۔ پرجوش سنجیدہ، زبردست اور خوبصورت کالی داس کی شکنتلا، جائسی کی پدماوت، الاول کی پدماوتی، وارث شاہ کی ہیر، اور خالد کی سلومی۔ لگتا ہے تاریخ کے چکروں میں گھومتی دھرتی کے سو روپ ہیں جو انسان کے جذبات کو سارے دائروں کو گھماتے ہیں۔ مسرت خوشی، رنج، غصہ، سنجیدگی سب کچھ ہے۔ ان میں یہ کہانیاں اگر آپ مان لیں تو میں کہوں گی کہ راماشن اور مہابھارت کی سی ہمہ گیری سے حیران کرتی ہیں۔ کالی داس کی سیاہ آنکھوں والی مالوہ کی کنواریوں سے لے کر جوان سال زخم خوردہ اور بے رحم سلومی تک ایک ان دیکھا رشتہ ہے۔

کتھک کا انداز بیان ان داستانوں کا حسن ہے۔ لفظ اس کی کہانیوں میں شعلوں کی طرح لرزاں اور رقصاں ہیں۔ جھاگ اڑاتی موجوں کی طرح خیال ایک کے بعد ایک آتے ہیں اور شاعر کو اپنا ساحل جان کر اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ وہ ایک قہرمان کمانڈر کی طرح ان کو قابو میں رکھتا اور مرضی سے انہیں آگے بڑھاتا اور پیچھے ہٹاتا ہے۔ لفظ غلام ہیں اور اس کے تابع فرمان۔ وہ ایک عجیب شانِ بے نیازی سے انہیں اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ کئی ایک زبانوں کے لفظ اور خیال پرے باندھے ہاتھ جوڑے اس کی قادر الکلامی پہ گواہی دیتے ہیں۔ شاعر کی بے نیازی اور اس کا احساسِ امارت ہی اسے عام لوگوں سے اونچا اور عام قاری کی پہنچ سے دور رکھتا ہے۔ جیسے ایوان در ایوان فاصلے اس کے اور لوگوں کے درمیان ہوں اور بلاغ کے لئے جہانگیر کی انصاف کی زنجیر تک نہ ہو۔ رسائی کے سارے راستے بند ہوں، سمجھ لیجئے وہ ایک مجسمہ ساز ہے جس نے اپنے مجسموں کو لفظوں کے خس و خاشاک میں چھپا رکھا ہے۔ اس کی سلطنت کی وسعت اسکی سرحدوں کی حفاظت کے درمیان حائل ہے۔ بیشک بہت ساری زبانوں کا علم اس کے مطالب میں زیادہ گہرائی اور اس کی کہانیوں میں آفاق گیری کی صفت پیدا کرتا ہے۔ وسیع جذبے اگر عمیق نہ ہوں ترنم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ ان میں اپنے سامنے کی ہر شے کو بہالے جانے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے

میگھنا کی سوئی ہوئی لہریں سمندر سے آتی ہوئی طوفانی پُرشور خوفناک جھاگوں سے بھری ہوئی دیوار کی طرح کی اُٹھتی ہوئی موجوں کے سامنے فنا ہو جاتی ہیں۔ یہ شاعری پُرشکوہ ہے اور ایک بڑے ایوان کا تصویر خانہ بھی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ خالد کس طرح مصوّر کی سی صحت اور چابکدستی کے ساتھ رنگوں کے اس میلے کو روشنی کی ان لہروں کی ذرا ذرا سی تفصیل سے سجا سکے۔

اُن کے ہاں مدھ ماتی آنکھوں والی ہندوستانی کنواریوں سے لیکر عکاظ کے میلے میں جھم جھماتی برجستہ سخن شناس دوشیزائیں تک ہیں۔ گہرے نیلے لباس میں لپٹی افسوس زدہ اور قسمت پر راضی ہیلن سے کر شاہ بانو تک ہے۔ یہ اپنے سے آشنا اور نغمے کی صدا کو چھوتے ہوئے سراپے تصویر کشی اور سنگ تراشی کے نادر نمونے ہیں اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو ہماری سمجھ میں نہ آ سکے۔

مگر یہ سنگ تراش جب ثنائے محمد عربی پہ اتر آتا ہے تو لگتا ہے ترساں لرزاں دربار رسالت میں حاضر ہے اور عشق محمد کے شعلے اس کی جان کو گھلائے دیتے ہیں۔ یہ جائے ادب ہے اور یہیں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں وہاں وہ نادر تخلیط اور منجمائے کر باریابی چاہتا ہے۔

میں خالد سے درخواست کروں گی کہ وہ وقت کے تقاضے کو سمجھیں اور اپنے سارے علم اور جذبے کو بروئے کار لائیں۔ ہمیں اُن سے امید رکھنی چاہیے کہ اب پاکستان کی دیومالا انکی منتظر ہے۔ ہمارے سارے المیے، ساری شکستیں اور سارے ماتم "یک شہر آرزو کے نہیں دنیائے آرزو کے ہیں" اُن گیتوں میں ڈھلیں گے وہ گیت جو عربی فارسی یونانی عبرانی لاطینی اور سندی کا عالم ہوتے نہ بھی ہماری سمجھ میں آ سکیں گے کیونکہ وہ خالص احساس اور جذبے سے وجود میں آئیں گے۔ ہمیں اب مزید مجسموں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو انتشار کے بعد اُن گیتوں کو سُننے کی خواہش ہے جو درد ملت سے اقبال کو بے تاب کر دیتے تھے۔ خالد بیشک مصحفی کی طرح دیوان مرتب نہ کریں مگر بقول شورش کاشمیری اُن میں سالار کارواں بننے کی ساری صلاحیتیں ہیں اور پھر اُن کے سمند شوق کو تازیانوں کی بھی ضرورت نہیں وقت کا سیل اُن کی طبیعت کے سیل کو تھام لے گا کہ کمال نے نوازی آخر کس دن کے لئے انہیں بخشا گیا تھا۔ شاعری کا تو جزو پیغمبری ہے وہ منوہر گردھر بنے دیس دیس کی گوپیوں کے ساتھ بہت گھومے اب انہیں نہایت سنجیدگی سے غور کرنا اور راستے کو بدلنا ہے۔ پاکستان کی اس قوم کو اگر وہ احساس زباں دے سکیں تو بہت ہوگا۔ جب یہ احساس ہو جائیگا تو شاید کوئی دن ایسا بھی آئے کہ اس زباں کی تلاش ہم کر سکیں۔ ہمارے بچے خالد کو صرف سلومی کا خالق ہی نہ سمجھیں۔ سلومی زندگی کے جنگل میں ایک پگڈنڈی تو ضرور ہے شاہراہ نہیں۔ کہانی کہنے والے کو یہ خیال بھی ہونا چاہیے کہ قصہ خواب اور اسکندر و جم کا وقت بیت گیا ہے۔ ہمارے ایوانوں میں صف ماتم بچھی ہے۔ یہ سداسکھ کی سرحدیں جیسے طلوع ہوئی خلقت کی زندگی سے تہی جلتے بناہ ہو اس سیاہ رات کو گزارنے کے لئے ہمیں آتش نوا مغنی کی ضرورت ہے۔ شعلہ بیاں شاعر کی خواہش ہے جس کی صدا ہمارے لئے جلوہ سحر بن جائے۔ خالد صاحب کیا آپ سالار کارواں بن کر یہ پرچم نہیں تھامیں گے؟

سلیم بے تاب

کلامِ خالدؔ — بصارت اور بصیرت کا سنگھم

عبدالعزیز خالدؔ کی غزل کا مطالعہ کرتے وقت قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے شاعر کا کلام پڑھ رہا ہے جو قدم قدم پر بصیرت کے موتی بکھیرتا چلا جاتا ہے اور جب قاری کا دامنِ استفادہ لبریز ہو جاتا ہے تو پھر شاعر اس کو کچھ وقت کے لئے بصیرت سے اٹھا کر بصارت کی جلوہ گاہ پر لے جاتا ہے جہاں ع کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجاست!

خالدؔ کی غزل، مجھے ایک عارف کا کلام محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نگاہ اتنی عمق شناس دوربین اور فراز پسند ہے کہ وہ اس ابعاد ثلاثہ کا کوئی گوشہ ان دیکھا یا ان چھوا نہیں چھوڑتی۔ اس نگاہ تیز میں، چیزوں کی تہ تک اتر جانے کی اتنی صلاحیت ہے کہ اس سے نگاہِ شاعر کی بجائے نگاہِ فلسفی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نظر کی چند فتوحات دیکھیے:

خوبی کا سفیر ہے خرابی، ہے رات سحر کا پیش خیمہ
مٹتی ہے کثافتِ عناصر مٹی کا مکاں ہو جب شکستہ

جسم کی جان مطمئن دل ہے جانتے ہیں پیمبر و شاعر
چُپ رہوں تو دماغ جلتا ہے ہونٹ کھولوں تو سب اثر زائل!
جل اپنی آگ میں ہمیشہ ققنس کی طرح ہے فن کی فطرت
صناعی سے مفر نہیں ہے بن ترشے نگوں کی کیا ہو قیمت

ہے راہنما جبلت اُن کی بے حس نہیں موسمی پرندے
کھونا بھی ہے اک طرح سے پانا جو ہارے ما آل کار جیتے

کہیں چھپتی ہے آنکھ چاہت کی ہم نے در در کی خاک چھانی ہے!
سدا آباد بھی برباد بھی ہے یہ دل خانہ بدوشوں کی ہے بستی!

میگھنا کی سوئی ہوئی لہریں، سمندر سے آتی ہوئی طوفانی پُرشور خوفناک جھاگوں سے بھری ہوئی دیوار کی طرح کی اُٹھتی ہوئی موجوں کے سامنے فنا ہو جاتی ہیں۔ یہ شاعری پُرشکوہ ہے اور ایک بڑے ایوان کا تصویر خانہ بھی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ خالد کس طرح مصوّر کی سی محنت اور چابکدستی کے ساتھ رنگوں سے اس میلے کو روشنی کی ان لہروں کی ذرا ذرا سی تفصیل سے سجا سکے۔

اُبھرے ہاں مدھ ماتی آنکھوں والی ہندوستانی کنواریوں سے لیکر عکاظ کے میلے میں جھم جھماتی برجستہ سخن شناس دوشیزائیں تک ہیں، گہرے نیلے لبادے میں لپٹی افسوس زدہ اور قسمت پہ راضی ہیلن سے لے کر شاہ بانو تک ہے۔ یہ اپنے سے آشنا اور نغمے کی صدوں کو چھوتے ہوئے سراپے تصویر کشی اور سنگ تراشی کے نادر نمونے ہیں اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو ہماری سمجھ میں آ سکے۔

مگر یہ سنگ تراش جب ثنائے محمد عربی پہ اتر آتا ہے تو لگتا ہے ترساں لرزاں دربار رسالت میں حاضر ہے اور عشق محمدؐ کے شعلے اس کی جان کو گھلائے دیتے ہیں۔ یہ جائے ادب ہے اور ہیں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں وہاں وہ نادر تخیلات اور مخانے کر باریابی چاہتا ہے۔

میں خالد سے درخواست کروں گی کہ وہ وقت کے تقاضے کو سمجھیں اور اپنے سارے علم اور جذبے کو بروئے کار لائیں۔ ہمیں اُن سے امید رکھنی چاہیے کہ اب پاکستان کی دیومالا اُنکی منتظر ہے۔ ہمارے سارے المیے، ساری شکستیں اور سارے ماتم "یک شہر آرزو کے نہیں دنیائے آرزو" کے ہیں اُن گیتوں میں ڈھلیں گے وہ گیت جو عربی فارسی یونانی عبرانی لاطینی اور ہندی کا عالم ہوتے ہوئے بنا بھی ہماری سمجھ میں آسکیں گے کیونکہ وہ خالص احساس اور جذبے سے وجود میں آئیں گے۔ ہمیں اب مزید مجسموں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو انتشار کے بعد اُن گیتوں کو سُننے کی خواہش ہے جو درد ملت سے اقبال کو بے تاب کر دیتے تھے۔ خالد بیشک مصحفی کی طرح دیوان مرتب نہ کریں مگر بقول شورش کاشمیری اُن میں سالار کارواں بننے کی ساری صلاحیتیں ہیں اور پھر اُن کے سمند شوق کو تازیانوں کی بھی ضرورت نہیں وقت کا سیل اُن کی طبیعت کے سیل کو تھام لے گا کہ کمال نے نوازی آخر کس دن کے لئے انہیں بخشا گیا تھا، شاعری کا تو جزو پیغمبری ہے وہ منوہر گردھر بنے دیس دیس کی گوپیوں کے ساتھ بہت گھومے اب انہیں نہایت سنجیدگی سے غور کرنا اور اپنے کو بدلنا ہے۔ پاکستان کی اس قوم کو اگر وہ احساس زبان دے سکیں تو بہت ہوگا۔ جب یہ احساس ہو جائیگا تو شاید کوئی دن ایسا بھی آئے کہ اس زبان کی تلاش ہم کر سکیں۔ ہمارے بچے خالد کو صرف سلومی کا خالق ہی نہ سمجھیں۔ سلومی زندگی کے جنگل میں ایک پگڈنڈی تو ضرور ہے شاہراہ نہیں۔ کہانی کہنے والے کو یہ خیال بھی ہونا چاہیے کہ تعبیر خواب اور اسکندر و جم کا وقت بیت گیا ہے۔ ہمارے ایوانوں میں صف ماتم بچھی ہے۔ یہ سدا سکڑتی سرحدیں جیسے سکڑتی ہوئی خلقت کی زندگی سے تہی جلتے پناہ ہوا اس سیاہ رات کو گذارنے کے لئے ہمیں آتش نوا مغنّی کی ضرورت ہے۔ شعلہ بیاں شاعر کی خواہش ہے جس کی صدا ہمارے لئے جلوہ سحر بن جاتے۔ خالد صاحب کیا آپ سالار کارواں بن کر یہ پرچم نہیں تھامیں گے؟

سلیم بے تاب

کلامِ خالدؔ ــــ بصارت اور بصیرت کا سنگھم

عبدالعزیز خالدؔ کی غزل کا مطالعہ کرتے وقت قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے شاعر کا کلام پڑھ رہا ہے جو قدم قدم پر بصیرت کے موتی بکھیرتا چلا جاتا ہے اور جب قاری کا دامنِ استفادہ لبریز ہو جاتا ہے تو پھر شاعر اس کو کچھ وقت کے لئے بصیرت سے اٹھا کر بصارت کی جلوہ گاہ پر لے جاتا ہے جہاں ؎ کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجاست!

خالدؔ کی غزل، مجھے ایک عارف کا کلام محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نگاہ اتنی عمق شناس دوربین اور فراز پسند ہے کہ وہ اس ابعادِ ثلاثہ کا کوئی کونہ اَن دیکھا یا اَن چھوا نہیں چھوڑتی۔ اس نگاہِ تیز بیں، چیزوں کی تہ تک اُتر جانے کی اتنی صلاحیت ہے کہ اس سے نگاہِ شاعر کی بجائے نگاہِ فلسفی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نظر کی چند فتوحات دیکھئے:

خوبی کا سفیر ہے خرابی، ہے رات سحر کا پیش خیمہ
مٹی ہے کثافتِ عناصر مٹی کا مکاں ہو جب شکستہ

جسم کی جان مطمئن دل ہے جانتے ہیں پیمبر و شاعر
چُپ رہوں تو دماغ جلتا ہے ہونٹ کھولوں تو سب اثر زائل!
جل اپنی آگ میں ہمیشہ ققنس کی طرح ہے فن کی فطرت
صنّاعی سے مفر نہیں ہے بن ترشے نگوں کی کیا ہو قیمت

ہے راہنما جبلّت اُن کی بے حس نہیں موسمی پرندے
کھونا بھی ہے اک طرح سے پانا ہو بارے تاسل کار جیسے

کہیں چھُپتی ہے آنکھ چاہت کی ہم نے دردر کی خاک چھانی ہے!
سدا آباد بھی برباد بھی ہے یہ دل خانہ بددوشوں کی ہے بستی!

"آ۔ذں کی سیر کرنا لیکن اُن کے جادو کا قائل نہ ہونا" ــــ یہ طرزِ فکر اور اس کی تبلیغ صرف ایک فلسفی اور سائنسی ذہن ہی سے ممکن نہیں خالد کا یہ طرزِ فکر جو مندرجہ بالا اشعار میں بڑی وضاحت اور خوبصورتی سے منعکس ہوا ہے۔ ان کے ان تجربات و احساسات کا پروردہ ہے جو اپنی وسعت میں بے کراں اور معیار کے اعتبار سے انتہائی Maximum ہیں۔ خالد کی یہ شاعری اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ انتہائی Maximum شاعرانہ سوچ مآل کار فلسفیانہ اور سائنسی فکر کا نہ صرف ہم پلہ بن جاتی ہے بلکہ اپنے تجسس اور فتوحات کے اعتبار سے بسا اوقات اس سے کہیں آگے بھی بڑھ جاتی ہے۔

خالد کی بصیرتوں سے لبریز یہ شاعری، ان کے بے کراں مطالعہ کی بھی غماز ہے۔ انہوں نے دنیا بھر کے ادبیات عالیہ کا مطالعہ کر رکھا ہے اور اس مطالعہ کی خوشبو ان کے کلام میں ہر جگہ اپنی رعنائی اور روشنی کا احساس دلاتی ہے۔ اس وسیع و عریض مطالعہ نے جہاں خالد کے شاعرانہ فکر و احساس کو مستند بلوغت سے مستفید کیا ہے، وہاں ان کے اندازِ بیان کو بھی بے مثال تنوع اور لاجواب پُرکاری کا حامل بنا دیا ہے۔ اس نابغہ فکر اور پختہ اور شستہ اُسلوبِ بیان نے ان کے بیشتر اشعار کو ضرب الامثال کے رُتبۂ بلند پر فائز کر دیا ہے۔ ایسے چند اشعار سُنیئے:

وہ لوطؑ کی بیوی ہو یا کہ نوحؑ کا بیٹا ہر شخص ادا کرتا ہے کفارۂ عصیاں!

یہ کارخانہ دہر کا قائم ہے عدل و رحم پر دیتے ہیں سب کو تول کر روزینۂ سود و زیاں

موقع شناسی اس کا مذہب، ماسوا سے کیا غرض کمبخت ابن الوقت، ہوتا ہے مگر رطب اللساں!

مٹی سے محبت کبھی اُگتے نہیں دیکھی سب نیک و بد دہر ہے اعمال کا ثمرہ!

سچ جھوٹ کی صورتیں ہیں یکساں ہر شے کو منافقانہ پرکھو!

وہ بے پروا ہے شاہانِ جہاں سے جسے مل جائے دل کی بادشاہی!

نکلتے ہیں مگر ہونٹوں سے نغمے گلہ مندی نہیں کیشِ محبت
مدام آوارگی، صحرا نوردی ملی عاشق کو مجنوں کی خلافت!

مرد عورت کا کھلونا اور وہ شیطان کا کاکلیں زنجیرِ پا بھی ہیں، گلے کا ہار بھی!

شے کوئی ملتی نہیں ہے تحفۃً یا تو بن جبقدار، یا سائل نہ ہو!

ہے دانا آدمی ہی زور آور　　بھروسہ، جہل کا مکڑی کا جالا!

خالد کے ان اشعار کی "زور آوری" سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک "مردِ دانا" کی تخلیقات ہیں — یعنی ایک ایسے باشعور شاعر کے فکر و نظر کا اعجاز ہیں جو زندگی کے متنوع تجربات، بے کراں مشاہدات اور لامتناہی مطالعات کا مالک ہے اور وہ فن کے ایک ایسے مقامِ ارفع پر کھڑا ہے جہاں اسے فن کے اعتبار سے امام اور فکر و نظر کے لحاظ سے عارف کہا جا سکتا ہے!

اب تک میں نے عبدالعزیز خالد کی شاعری کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے اس کا غالب تاثر یہی مرتب ہوتا ہے کہ وہ اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے ایک سائنس دان اور فلسفی کے زیادہ قریب ہے۔ یہ تاثر اپنی جگہ درست سہی لیکن میں اسے حشو زوائد کرنے کی سفارش کروں گا کیونکہ اس تاثر کو Absolute یا Total Immersion ان لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ خالد میں شاعرانہ جینئیس (Poetic Genius .) کا فقدان ہے حالانکہ یہ بالکل غلط نتیجہ ہوگا کیونکہ خالد مستند بصیرت کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند بصارت کا بھی مالک ہے اور یہ اسی صحت مند بصارت کا نتیجہ ہے کہ خالد کی شاعری بصیرت و دانش کے سچے موتیوں کے پہلو بہ پہلو جنس و جمالیات کے رنگا رنگ پھولوں کو بھی اپنے دامن میں سجائے ہوئے ہے۔

مجھے خالد کی شاعری کے مطالعہ سے یہ خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ جنس اور جمالیات کے ضمن میں بالکل فطری اور صحت مند نظریات کا حامل ہے۔ اس کے یہاں جنس کہیں بھی Complex نہیں بننے پاتی بلکہ فطری پن اور صحت مندی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ جمالیات کے میدان میں بھی خالد بڑا مشاق نظر آتا ہے۔ نسوانی جسم کی رعنائیوں کی جو تصویریں خالد کی شاعری پیش کرتی ہے ان میں بڑا رس اور تاثیر ہے اور یہاں خالد کی خالص شاعرانہ حسیات کو اپنے شباب پر دیکھا جا سکتا ہے ؎

جھلمل جھلمل بدن کا سونا　　لہرائیں لٹیں کمر سے نیچے
اے چاند اگر تو اس کو دیکھے　　کوٹھے پہ کبھی اکیلے سوتے
تیرے چہرے کا رنگ فق ہو　　تو اپنی سب آن بان بھولے!

ٹھوکر سے زخمی ہو مبادا وہ کلائی چاندسی
مہندی لگے ہاتھوں میں نازک، کانچ کی ہیں چوڑیاں

وہ دلربائی کا مرقع ہے، اسے کیا نام دیں
تصویر اس کی ہے کوئی نقشِ حسیں دیکھو جہاں

دنبالہ دار قدرتی کاجل بھرا ہوا　　غش سوئی ہوئی آنکھ یہ چشمِ غزال ہے
سر پہ دو شالہ قرمزی بر میں لباسِ سرخ　　وارفتگی کا رنگ ہے، بدمست چال ہے

ملبوسِ سیہ میں حسنِ نسوانی　　جیسے شبِ دیجور میں ماہِ روشن!
حاصل ہوئی غیب سے جو چاہی بات　　جو بن میں ہے اٹھتی ہوئی کونپل کی پھبن

جسم ہے پیمانۂ صہبا کہ تاکستاں کی بیل
جادوئے بابل ہے آنکھوں میں کہ سحرِ سامری

چاکِ جامہ سے نمایاں سینہ ہائے سیمگوں
مست و شہوت ناک اندامِ ملیح و مرمری

وُہ مجھے چومتی ہے یوں جیسے
پھُول کو اوس، چاند کو دریا!

جامہ اندامِ نو بہار پہ تنگ
شوق کھُل کھیلنے پہ آمادہ

دل کو تلوؤں سے ملتی چلتی ہے
مزے بوسوں کے لب میں پوشیدہ

پاؤں مکھن سے اس کے ڈھلتے ہیں
اُس پری وش کا نام ہے عذرا

حُسن و جمال کے موضوع پر مبنی اشعار میں جو کیفیات بیان کی گئی ہیں وہ بالکل فطرتی اور صحت مند ہیں۔ شاعر نے حسن و جمال کو خواہ مخواہ intellectualize یا Phenomenalize کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر جنس اور جمال کو مثبت اور صحت مند قدریں سمجھتا ہے جیسا کہ وہ ہیں اور ان کو بلا وجہ مجرد طور پر Perversion یا گناہ کے خانے میں نہیں ڈالتا جاتا۔ خالد کا ایک شعر ہے ؎

ابنِ آدم کا خواب ہے عورت
عشق کرتا ہے کارِ مشاطہ!

جس شاعر کے نزدیک عورت ابن آدم کا خواب ہو وہ بھلا جنس و جمال کو غیر مشروط طور پر Negate کیوں کرنے لگا بلکہ اس کا نظریہ ہمیشہ یہی رہے گا ؎

ذوقِ رطلِ گراں بجا لیکن،
جو بڑھے اعتدال سے کافر!

اور پھر جس شاعر نے یہ بھی کہا ہو کہ ؎

یہ ہے طولِ و عرضِ "لا رہبانیت"
زندگی کے حُسن کا منکر نہ ہو!

وہ شاعر بھلا خود کیونکر "زندگی کے حسن" کا منکر ہو سکتا ہے —— یہی وجہ ہے کہ خالدؔ کے کلام میں جنس و جمالیات کی جو گلکاریاں سجی ہوئی ہیں ان میں ایسی ایسی حسین و جمیل تصویریں آویزاں ہیں کہ جن کی "زیارت" سے صاحبِ دل اور اہلِ نظر کی روح سرشار ہو جاتی ہے —— اور حسن کا یہی "فیضان" ہے جسے دنیا بھر کے عظیم شاعروں نے ہمیشہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ عبدالعزیز خالدؔ بھی اُن کی ہم نوائی کرتے ہوئے یوں لب کشا ہوتے ہیں:

اے حسینو! گلعذارو! مہوشو!
ہم دعا گو ہیں تمہارے، خوش رہو!!

بصیرت اور بصارت کی شاعری کا خالق —— عبدالعزیز خالدؔ اتنا طویل و عریض فن کار ہے کہ اس کے شاعرانہ پھیلاؤ اور فنی عظمت کا بھرپور جائزہ لینے کے لئے ایک کثیر الاطراف مطالعے کی ضرورت ہے اور میرا زیرِ نظر مضمون تو کلامِ خالدؔ کے صرف دو پہلوؤں کا ایک سرسری جائزہ ہے اور بس! ٭

اُردو شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو میرؔ، نظیرؔ، انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور خالدؔ کا نام ایسے عظیم المرتبت شعرا میں آتا ہے جنہوں نے بلحاظ ذخیرۂ الفاظ اردو زبان کو متمول بنایا ہے۔ پیرایہ اظہار کے نو بہ نو پیراہن تراشے ہیں، لسانی وسعت، ہمہ گیری اور ذخیرۂ الفاظ کے صرف کے لحاظ سے یہ شعرا دوسرے تمام غزل گو شعرا سے مختلف ہیں، جس کی بدیہی وجہ یہ ہے کہ سفینۂ غزل کا بادبان نہایت محدود مجموعۂ الفاظ سے ترکیب پایا ہے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سمونا ہی کمالِ فن سمجھا جاتا ہے۔ اطناب پر ایجاز کو فوقیت دی جاتی ہے لہٰذا وہ وسعت بیان جو ان شعرا کے یہاں نظر آتی ہے کسی غزل گو کو نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح ہر بڑے شاعر کا ایک مزاج ہوتا ہے، اسی طرح لفظ کے استعمال کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے، اس کا مخصوص دلکش اور اسلوب بھی ہوتا ہے، اگر یہ خصوصیتیں نہ ہوں تو وہ بڑا شاعر نہ ہوگا، بڑے شاعر کی اولین پہچان ہی اس کی لسانی خصوصیتیں ہوتی ہیں اور پھر معانی اور حیات و کائنات پہ اس کی گرفت اور تصرفات۔

میرؔ بہت بڑا غزل گو ہے، لیکن میری نظر میں وہ جتنا کشیدہ قامت غزل گو ہے، اس سے کسی طرح وہ کم نظم نگار نہیں، وہ اپنی مثنویوں شکار ناموں، ہجویات، ساقی ناموں، واسوختوں اور رباعیات میں بھی سرو قامت ہے، اس طرح وہ بڑے وسیع بادبان کا مالک ہے۔ اور اہلِ نظر بادبان دیکھ کر ہی سفینے کی وسعت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ میرؔ کا سفینۂ بحرِ بیکراں پر سایہ فگن نظر آتا ہے، بایں ہمہ اس کا ذخیرۂ الفاظ اس قدر وسیع نہیں جتنا اکبر آبادی کا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے ایوانِ شعر کے لئے الفاظ جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ کھڑا ہو کر چنتا ہے اور نظیرؔ شمالی و مشرقی ہندوستان کے شہر و قصبات سے۔

"جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ ہر طبقے کے لوگوں کی بولی سنائی دیتی ہے، میرؔ کے ذخیرہ الفاظ کا ماخذ یہی لوگ ہیں۔ اور یہ لوگ ایک خاص معاشرے کے پروردہ ہیں، برصغیر کا مسلم معاشرہ میرؔ اسی معاشرے کے پروردہ ہیں اور بالتخصیص طبقہ وہ اپنا رشتہ اسی سے استوار کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی غزلوں میں "نور کی سیاہی" بھی ظلمت میں نور کا ڈھتی نظر آتی ہیں اور ان کا دلکش اس قدر محدود نہیں جو بعد کے شعرا کا طرۂ امتیاز بنا اور نہ ان کی زبان اتنی غیر فطری ہے۔ جتنی بعد کے غزل گوؤں کی بن گئی۔ میرؔ کی غزلوں میں عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، پوربی، برج بھاشا اور متعدد زبانوں کے لغات نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنی جملہ لسانی خصوصیتوں کے لحاظ سے ان کی زبان مقامی حیثیت کی حامل ہے۔ اور ان کا ذخیرۂ الفاظ دہلی کے متوسط طبقے کی زبان پر مشتمل ہے۔

میرؔ کے برعکس نظیرؔ نے الفاظ کا ذخیرہ نہ صرف آگرے کی گلیوں اور تاج محل کے سائے میں کھڑے ہو کر چنا ہے بلکہ مشرقی و شمالی ہندوستان کی ہرزہ گردی نے اس کے دامنِ طلب میں نگر نگر کی بھاشاؤں کا رنگ و آہنگ ڈال دیا ہے۔ وہ مسجدوں، مندروں، خانقاہوں جوگی استھانوں، میلے ٹھیلوں، قصبات و دیہات میں گھومتا پھرتا رہا ہے، وہ میرؔ کی طرح اپنی زبان خراب ہونے کے ڈر سے کانوں

میں رہتی اور ہونٹوں پر تالا ڈالے سفر نہیں کرتا رہا ہے، بلکہ بھانت بھانت کی بولی ٹھولی سنی ہے، ہر طرح کے لوگوں سے ملا ہے، ہر عمر کے لوگوں کو نظر میں رکھا اور اُن کے جذبات و حسیات کا مشاہدہ کرتا رہا ہے، پھر اُس کے پیشِ نظر برِ صغیر کا مسلم معاشرہ نہ تھا، وہ کثیر الثقافتی معاشرے سے ربط و ضبط رکھتا تھا اور اُس نے اُن تمام کے دُکھ سُکھ کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے، یوں اُس کا ذخیرۂ الفاظ بے انتہا وسیع اور اُس کا ڈکشن نہایت متنوع ہے۔ وہ آزاد فضا کا شاعر تھا، اُس نے جہاں غزل کی شائستہ، رائج الوقت اور فصیح زبان میں اپنی قدرت کا ملہ دکھائی ہے، وہاں اُس نے عامیانہ زبان (SUB - STANDARD SPEECH) بھی لکھی ہے اُس نے اپنے عہد کے فصحا کی تنقید کو نظر انداز کرتے ہوئے زبان کے معاملے میں کسی قسم کا چھوت چھات کی پرواہ نہ کی اور یوں اپنے عہد کی جیتی جاگتی زندگی کو سمونے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

نظیر سے پہلے الفاظ کا ایسا جمگھٹا نہ کسی نے لگایا تھا، نہ اُن کے بعد اُس کے ہمہ گیر تجربے سے کسی نے فائدہ اٹھایا بلکہ زبان کی وسعت اور پیرایۂ اظہار کی بو قلمونی کو غزل کی شائستگی پہ قربان کر دیا گیا اور اس میں اس قدر غلو کیا گیا کہ اسی فیصد لغات غریب و ناموس ہو گئے، زبان پھیلنے اور ترقی کرنے کے بجائے سکڑ کر رہ گئی۔ لسانی نقطۂ نظر سے یہ رجحان کل بھی غلط تھا اور آج بھی ہے۔

نظیر کے بعد ذخیرۂ الفاظ کے 'خرچنے' کے لحاظ سے مرثیہ گو شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر کا سرمایۂ الفاظ ہی نہیں ڈکشن اور پیرایہ بیان میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔

انیس و دبیر مرثیہ نگار تھے، لیکن شاعرانہ عظمت کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے بھی ان کے مراثی، سلام، رباعیات، نوحے اور منقبتیں لسانیات کے طالب علم کی توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ ڈکشن کے بارے میں اُن کا رویہ انتخابی (SELECTIVE) ہے، اس رویے کی اعلیٰ مثالیں انیس کے کلام میں زیادہ نظر آتی ہیں، جو بہترین مواد کے لئے بہترین الفاظ کے انتخاب کا ایسا سلیقہ رکھتے ہیں، جس کی مثال ادب میں مشکل سے ملے گی۔ ان کے مراثی میں ایک جانب موضوعات کی حد بندی، اُن کی فکر کو مقید کرتی ہے تو دوسری جانب موضوعات کی متانت انہیں الفاظ کے انتخاب میں شائستگی اظہار کے معیار سے ایک قدم دور ہٹنے نہیں دیتی۔ وہ جس منبر پہ بیٹھ کر زورِ بیان کا کمال دکھاتے ہیں، جس مجلس کے سامعین سے داد وصول کرتے ہیں اور انہیں نالہ و بکار پہ مائل کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ منبر اور وہ مجلس اُن سے پیرایۂ اظہار کی متانت کی طالب ہے اور الفاظ و تراکیب کی موزونیت کی متقاضی۔ نتیجتاً ان کا شاعرانہ کمال اور جوشِ بیان انہیں اگر ایک جانب قطرے کو سمندر سے ملانے اور ذرے کو صحرا کی وسعت بخشنے پہ آمادہ کرتا ہے تو دوسری جانب سو رنگوں میں بات کرنے کی صلاحیت ایک مضمون پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس ایک مضمون کو اُن کی شاعرانہ شخصیت ہر بار نئے رنگ کا نکھار بخشتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انیس کا فنِ الفاظ کے صرفے میں بھی توازن و تناسب کا فن ہے۔ ان کے یہاں مفرد فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کا استعمال بھی ملتا ہے اور روز مرہ اور محاورے کا بھی، لیکن ہر چیز کا ایک جگہ ہے۔ جہاں بچوں اور عورتوں کی زبان میں جذبات نگاری کی گئی ہے، وہاں روز مرہ اور محاورہ سے کام لیا ہے، جہاں شکوہِ الفاظ کی ضرورت ہے وہاں فارسی الفاظ و تراکیب کا بر محل استعمال ہے۔ رزم کا بیان ہے تو جوشیلے الفاظ، شہادت کا مضمون ہے تو رقت انگیز احساس پیش کرتے ہوئے سادہ اور مفرد الفاظ کا باکمال صرفہ۔ فارسی تراکیب میں تو ثقالت سے دور، ہندی الفاظ ہیں تو فصاحت کے قریب۔

وسیع ذخیرۂ الفاظ برتنے، الفاظ و تراکیب کو ادبی حسن بخشنے اور روز مرہ کو ایک ایسی جہت دینے کے باوجود جسے معیاری ٹکسالی نمونہ کہیں، اُن کے یہاں موضوعات کی حد بندی اور ایک خاص تہذیب کے لب و لہجے نے جہاں اُن کے کانونیس کو محدود

وسعت عطا کردی ہے، وہاں اُن کی زبان و الفاظ کی دنیا کو بھی شرفا و سنجیدہ طبقے کے روزمرہ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ اُن کا ذخیرۂ الفاظ نظیر اکبر آبادی کی طرح زندگی پر محیط نہ ہو سکا۔

انیس کے بعد اردو زبان میں ایک نئی وسعت پیدا ہوئی، اقبال ایسا مفکر شاعر پیدا ہوا۔ انگریزی اور مغربی ادب کے مطالعے، بدلے ہوئے سماجی حالات، قومی آزادی کی تحریک نے ذہنوں کو فکر و خیال کے نئے سانچے عطا کئے، اردو شاعری کے موضوعات، اصناف سخن اور ڈکشن تینوں اس ہمہ جہتی انقلاب سے متاثر ہوئے، پہلے غزل سب سے مقبول صنف سخن تھی، اب جدید نظم نے ان کی جگہ لے لی، پرانی غزل نے بھی اپنے رموز و علائم بدلے۔ پہلے شاعر اور قارئین کے درمیان رابطے کا ذریعہ مشاعرے تھے، اب اخبارات و رسائل بھی اس ربط کا ایک قوی اور سہل ترین وسیلہ بن گئے۔ پہلے رسمی اور روایتی موضوعات ہی شاعری کی طبع آزمائی کا میدان تھے۔ اب قومی و ملی احساسات نے شعر کو نئی زندگی کا نقیب، وطن دوستی کا ترجمان اور احیاء تہذیب کا پیغامبر بنا دیا ہے۔

ظاہر ہے ادب میں اس انقلاب نے شاعری کی مروجہ ڈکشن کو بہت کچھ بدل ڈالا۔ ڈکشن کی اس تبدیلی کے آثار سب سے پہلے جدید نظم کے بانی حالی اور آزاد کی شاعری میں نظر آتے ہیں، لیکن اس انقلاب کی تکمیل ہمیں اقبال کی شاعری میں نظر آتی ہے، جو اپنے پیشرووں کے مقابلے میں ایک طرف مغربی ادب و فلسفہ سے زیادہ آگاہ تھا دوسری جانب اس عہد کی دنیا کے سیاسی حالات اور برصغیر میں آزادی کی تحریک کی تیز تر جد و جہد نے اس کی فکر کو ایک خاص انداز سے متاثر کیا تھا۔ اقبال بنیادی طور پر اسلامی نشاۂ ثانیہ کا شاعر ہے۔ اُس نے اردو شاعری کے فکر سے تقریباً تہی دامن مزاج کو ایک حکیمانہ لب و لہجہ اور ایک پُر وقار آواز عطا کی جو اپنے دامن میں معرّد الفاظ و تراکیب کی ایک نئی دنیا لئے ہوئے تھی۔ جدید خیالات و تصورات، فکر و فلسفہ کے انتخاب موضوعات اور "پان اسلام ازم" کے عقیدے نے اس کے لب و لہجہ اور ڈکشن دونوں کو کلاسیکل اردو کے روزمرہ اور بحیثیت انداز بیان کے مقابلے میں فارسی کے قریب تر کر دیا۔ یہاں تک کہ دورِ آخر میں اردو کے بجائے وہ فارسی کی زبان میں شاعری کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے ڈکشن کو ایجاز و اختصار کی رعایت سے فارسی تراکیب کے خلاقانہ استعمال سے مالا مال کر دیا۔

اس دور کی شاعری کا لسانی مطالعہ کرنے والے کے لئے ایک بات اور قابل لحاظ یہ ہے کہ اس عہد میں وسیع ذخیرۂ الفاظ کے استعمال کے لحاظ سے مولانا ظفر علی خان کی شاعری بھی قابل توجہ ہے لیکن یہ شاعری ایک نئے انداز کی شاعری تھی، جس میں ادبیت کی جھلک کے بجائے صحافتی رواں دواں اندازِ بیان اور لب و لہجہ کی متانت اور فکر کے عمق کی جگہ جذباتی وفور یا طنز و مزاح سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجتاً ایک نئی شاعرانہ جہت دکھانے کے باوجود الفاظ و تراکیب کا وہ تخلیقی صرفہ جو ہمیں اقبال کی شاعری میں نظر آتا ہے مولانا کے ہاں نہیں، اگرچہ وہ ٹھیٹ اردو الفاظ کے استعمال میں اہلِ زبان جیسی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔

معرّد الفاظ اور تراکیب کے علاوہ اقبال کا ڈکشن اردو شعراء سے اس لحاظ سے بھی بدلا ہوا نظر آتا ہے کہ اُن کے ہاں رموز و علائم، تلمیحات، اِسم معرفہ کی ایک نئی دنیا آباد ہے۔

عہد جدید میں ذخیرۂ الفاظ و تراکیب کے لحاظ سے جوش کا ایک خاص مقام ہے، ساتھ ہی اسالیب بیان کی رنگا رنگی بھی اُسے اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اب تک کی شاعری میں برتے گئے بیشتر اُن الفاظ کو صرفے میں لے آتا ہے جو کسی خاص اسلوب بیان کے تحت شاعری میں در آئے ہیں۔ مناظر فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے وہ انیس کی آواز سے آواز ملا کر اُسی ڈکشن کو استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، آدمی نامہ اور اسی قبیل کی دوسری نظموں میں وہ نظیر اکبر آبادی کے

رنگ میں شعر کہتا ہوا نظیر کے دلکشن کو صرف میں لے آتا ہے، پھر اُردو کے اِن کلاسیکل اسالیب کے ساتھ ہی ساتھ چونکہ وہ ذہنِ جدید کا مالک ہے اور وطن دوستی اور مسلکِ انسانیت کا ترجمان ہے، اس لئے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ہزاروں اُن مفرد الفاظ کو نظم کی لڑی میں پرو دیتا ہے جو برصغیر کے نئے ذہن اور جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں، اپنے مزاج کے اعتبار سے چونکہ وہ فکر کے بجائے جذبے کا شاعر ہے لہذا رزمیہ اندازِ بیاں کی حرارت لئے ہوئے اس کے الفاظ اس جدوجہد آزادی کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس سے اس عہد کا برصغیر گذر رہا تھا۔

اقبال اور جوش دونوں کی شاعری میں زبان میں ایک قدر مشترک فارسی تراکیب کا استعمال ہے۔ لیکن اقبال فارسی تراکیب کا سہارا فکر جدید کی ترجمانی اور اپنے مسلکِ خیال کو ایجاز و اختصار سے نظم کرنے کے لئے لیتا ہے اور جوش شاعرانہ صنعت گری اور جوشِ بیاں کے لئے۔ جوش کی فارسی تراکیب میں ندرت ہے لیکن یہ ندرت زبان پر اس کی حاکمانہ گرفت اور بحیثیت شاعر اس کی قادر الکلامی کا برملا اظہار ہے۔ اور اسی قادر الکلامی کے نتیجے میں مفرد الفاظ اور تراشِ تراکیب کے لحاظ سے وہ اب تک کے تمام اردو شاعروں میں کم و بیش سب سے ممتاز نظر آتا ہے۔

جوش کے بعد خالد کا نام آتا ہے ؎

گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی

لیکن یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ خالد کا ذخیرۂ الفاظ جوش سے کہیں زیادہ متنوع و وسیع ہے۔ پھر یہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ جوش جو کچھ اردو شاعری کو دے سکتا تھا دے چکا ہے، اور خالد ابھی اٹھان پر ہے۔ خالد کی شاعری اُردو کے تشکیلی عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اردو کی جدید تشکیل کا علمبردار ہے۔ اس نے اُردو زبان اور لغات کے قدیم نگینوں کے امکانات اور ابلاغِ خیال کے لئے قوت و توانائی کو بھی آزمایا ہے اور عربو ایرانی لسانی خطے کے لغات سے بھی اُردو شاعری کو متمول کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو کی فطری تشکیلِ نو برصغیر کی تقسیم کے بعد تاریخی مقدرات کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اردو کی یہ فطری تشکیل ہندوستان اور پاکستان میں الگ الگ خطوط و جہات میں ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں اردو کو عام فہم، سہل اور صاف و شستہ بنانے کے فطری اور لاشعوری دونوں طرح کی کوششیں ہو رہی ہیں تاکہ وہ عوامی زبان بن سکے، اور اس سلسلے میں غلو یا احتیاط کا یہ عالم ہے کہ ایسے عربی، فارسی اور ترکی لغات بھی ترک کرنے کی روش پیدا ہو چکی ہے جو صدیوں سے اردو زبان میں رچ بس چکے ہوں۔ ادھر پاکستان میں اس کے برعکس ردعمل ہوا۔ اردو نہ صرف فارسی کے قریب ہوتی چلی گئی بلکہ پاکستان کی علاقائی زبانوں براہوئی، بلوچی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، سندھی، کشمیری وغیرہ کے الفاظ نہ صرف صحافت میں در آئے بلکہ شعر و ادب میں بھی ان زبانوں کے الفاظ، تلمیحات، تشبیہات، استعارات، شعری تمثال (Imagery) اور پیرایۂ اظہار آنے لگے[۱]۔ خالد نے اس صحت مند ماحول کو اپنی خلاقانہ صلاحیتوں سے بڑی تقویت دی، اس کی شاعرانہ بافتوں میں ان زبانوں کے لغات بھی ہیں اور علاقائی ثقافتوں کی فضا، تلمیحات، تشبیہ و استعارے اور شیوہ بیانی بھی۔ مثلاً

کتنے پنوں ہوئے شکارِ فریب
مر گئیں کتنی سسّیاں تھل میں

---

[۱] "اردو کی جدید تشکیل" از کامل القادری مطبوعہ "خاور" کوئٹہ اپریل ۱۹۶۹ء نیز مقالہ مطبوعہ "امروز" لاہور کراچی ۱۹۵۷ء (متعدد اقساط)

سامنے آتے مجھے آتی ہے لاج — بیلو چھتے میں دو پڑ چھٹ گیا
آج بھی ہر سوہنی کے آگے بہتا ہے چناب — اے غریقِ لجۂ الفت ذرا دل کو سنبھال

ہیر کو زہرِ ہلاہل بن گیا آبِ حیات — لوحِ تربت پر لگی مہرِ بقائے جاوداں
زندۂ جاوید ہیں عاشق شہیدِ دل کی طرح — سوہنی کو دے نویدِ زندگی موجِ مجناں
دشمن بیگانہ و یار یگانہ ایک ہیں — گنج لالہ میں ہوئے مصلوب مرزا صاحباں
عورتوں کا مکر ہے اللہ اکبر کیا عظیم! — آپے لاواں یاریاں تے دھاوی آپے وینداں

یوں ہی خالد صاحب نے پاکستان کی علاقائی زبانوں کے پیرایۂ بیان اور ثقافتی فضا، علائم و رموز، تلمیحات و استعارے سے اردو کو متمول بنایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ علاقائی اجنبیت کو دور کرتے ہوئے قومی یک جہتی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ اردو جو پاکستان کے کسی علاقے کی زبان نہیں سمجھی جاتی تھی، خالد کی خلاقانہ کاوش پیہم کے صدقے ہر علاقے کی دھڑکن بن گئی۔ اور کچھ ایسے شاعر پیدا ہوئے جو محض علاقائی رنگ کی وجہ سے پہچانے اور بزمِ شعراء میں محترم گردانے جاتے ہیں۔ لیکن خالد کی نوائے سروش کا یہ محض ایک آہنگ ہے۔ اس نے نہ صرف علاقائی زبانوں کا دودھ پیا اور رس چوسا ہے بلکہ سریانی، عربی، فارسی، ترکی، یونانی، انگریزی ادبیات کا بھی ذائقہ چکھا ہے۔ اور اردو زبان کی جدید تشکیل میں ان زبانوں اور ان کے ادبیات سے بھی استفادہ کیا ہے۔

زبان ایک عمرانی ضرورت کی ایجاد ہے، الفاظ عمرانی خصوصیتوں کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے نتائج کے تعین اور ابلاغ و ترسیل بھی عمرانی پس منظر و پیش منظر کے محتاج ہوتے ہیں، اگر درمیان سے یہ رشتہ کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ نثر اور نو کا ذخیرۂ الفاظ محدود تر ہو چکا ہے اور ان کی نظریں اپنی وسیع و عریض مملکت کا احاطہ نہیں کر پاتیں جس کے وہ بجا طور پر وارث ہیں، خالد اپنی تہذیبی وراثت کی آگہی رکھتا ہے، اور اسے بازیاب کرنے میں ہمہ تن محو ہے، وہ ملتِ ابراہیمی کی جملہ علمی و فکری اور تہذیبی فتوحات کو اپنا سرمایہ سمجھتا ہے اور اسے بے تکلف تصرف میں لاتا ہے۔ لہٰذا ادبیاتِ اسرائیلیہ، ادبیاتِ عربی، اساطیر، صحائفِ آسمانی، کلامِ حکیم، فارسی ادبیات سے اخذ و استفادہ ہی نہیں کرتا بلکہ تہذیبی فضا کے اعادہ و تجسیم کی بھی کوشش کرتا ہے۔ یوں اس کے ذخیرۂ الفاظ میں سمندر کی سی وسعت اور اس کے شعری فرہنگ میں قوس و قزح کی رنگت پیدا ہو گئی ہے۔

خالد کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اردو شعراء کے برعکس اس کے یہاں زبان کے بطن سے خیال پیدا ہوتا ہے وہ لفظ کی اہمیت کا قائل ہے اور خیال پر اس کے اثرات اور ناگزیر تصرفات کا رمز آشنا، لہٰذا معرفتِ لفظ کو بڑی اہمیت دیتا ہے ؎

تجلۂ الفاظ میں شاہدِ معنی مقیم
غالیہ مو، شعلہ رو، عربدہ جو بیقرار

اور "لفظ" ہی نہیں، وہ اس کی صوتی اثرات کا بھی مزاج داں ہے، اور اپنے تمثیلوں میں اس نے صوتی اثرات سے فائدہ بھی اٹھایا ہے، لہٰذا اس کا یہ دعویٰ حق بجانب بھی ہے کہ ؎

یوں معانی حروف سے ٹپکیں
جیسے چشمے چٹان سے پھوٹیں

خالد کا مطمحِ نظر ملتِ ابراہیمی کی تہذیب کا احیا ہے اور اردو کی جدید لسانی تشکیل میں اس کے تجربات قدرے مختلف انداز

میں جیمس جوائس، ازراپونڈ، اور ایلیٹ سے ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان کے لسانی ڈھانچے، فرہنگ، انداز بیان کو مختلف و متعدد دوسری زبانوں اور تہذیبی عناصر سے تال میل کیا ہے اور عربو ایرانین اور ہندی لسانی و تہذیبی علاقوں اور اُن کے ادبیات سے اُردو کو متمول کرنے کی کوشش کی ہے۔ خالد کے یہاں ایک مانوس قسم کی اجنبی فضا پائی جاتی ہے جو جاذب ملاحی ہے اور تحیر افزا بھی لیکن ازراپونڈ کی بیشتر شاعری کی طرح ناقابل فہم نہیں اور اس کے کینٹوز تو محض معمے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ازراپونڈ کی برعکس خالد احساس کا مغنی اور الفاظ کا مصور نظر آتا ہے۔

خالد کے ذخیرۂ الفاظ میں وسعت کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اُس کی شاعری کا کینوس (CANVAS) وسیع ہے۔ اس نے ہیئت کا متنوع تجربہ کیا ہے، اور اپنے احساسات، افکار اور مطالعے کو نو بہ نو اصناف میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے محض ایک رخ کو پیش نہیں کرتی بلکہ جیتی جاگتی زندگی کی ہر ادا کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی شاعری پوری معاشرتی و فکری زندگی کے آہنگ کو پیش کرتا ہے، لہٰذا اس کا ذخیرۂ الفاظ اسی تناسب سے وسیع اور متنوع ہے اور خالد کے شعری فرہنگ (ڈکشن) کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے اجزائے ترکیبی میں مندرجہ ذیل لسانی خصوصیتیں نظر آتی ہیں۔

۱۔ طبقاتی زبان (CLASS DIALECT) کا استعمال
۲۔ کردار کی مخصوص زبان (IDIOLECTS) کا استعمال
۳۔ عامیانہ زبان (SUB STANDARD SPECH) کا استعمال
۴۔ موضوع کی مناسبت سے ہم آہنگ و ہم رشتہ زبان کا استعمال
۵۔ اسم معرفہ اور تلمیحات کی کثرت
۶۔ علاقائی زبانوں کی فرہنگ، تلمیحات اور دیگر شیوہ ہائے بیان سے استفادہ
۷۔ عربی، فارسی، سریانی، یونانی، سنسکرت (ہندی زبانیں) انگریزی، چینی، ترکی اور دیگر زبانوں کی فرہنگ اور شیوہ ہائے بیان سے استفادہ
۸۔ یونانی، ہندی، لاطینی اور دیگر صنمیات سے استفادہ اور ان کے کرداروں کو بطور تلمیحات استعمال کرنے کا رجحان۔

خالد کے ذخیرہ الفاظ کی وسعت اور رنگا رنگی اُردو کے کسی شاعر کو اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ نظیر، میر، انیس اقبال، جوش کے ذخیرہ الفاظ پر نظر کیجیے، وہ ایک تہذیبی وحدت سے الفاظ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں خیال کو زبان پر فوقیت ہے، وہ مانوس لسانی فضا سے زیادہ دور نہیں جاتے بلکہ اسی حلقے میں جست و خیز کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن خالد نے تہذیبوں کے خیام اکھاڑ کر ایک وسیع و کشادہ خیمہ لگایا ہے وہ وحدت انسانی کا زمزمہ خواں ہے وہ جانتا ہے کہ تمام اسمار آدم اللہ تعالیٰ نے سکھا دیئے تھے اور ان سب کو وہ اپنی وراثت سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ خالد کے اغلاق کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ اعتراف کرتے ہیں:

"خالد کی یہ "زبان بیگانہ" کئی عناصر پر مشتمل ہے، اوّل تو اس کی لفظیات میں اساطیر قدیم کی تلمیحات ہیں، یہ تلمیحات عام جانی پہچانی بھی ہیں اور وہ بھی جن کا عام قاری کو زیادہ علم نہیں، لیکن دوسری قسم کی تلمیحات کم مانوس ہونے کے باوجود کچھ ایسی ہیں، جن کی تاریخی یا واقعاتی نوعیت جانے بغیر بھی یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق تاریخ یا قصص ہائے قدیم میں سے کسی اہم قصے یا واقعے سے ہے۔

یونانیات اور اسرائیلیات یا عجمیات کی یہ تلمیحات بیگانگی کے باوجود قربت کا احساس دلاتی ہیں"

خالد بڑے پنیڈے کا شاعر ہے، اس کی شاعرانہ کاوشوں کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر جہت کا کچھ اپنا تقاضہ بھی ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مثلاً سرود رفتہ، غزل الغزلات، گل نغمہ، سلومی، پرواز عقاب، ماتم یک شہر آرزو اور اس کی اکثر تخلیقیں ترجمہ یا اخذ و استفادہ ہیں۔ خالد نے ترجمہ کرتے ہوئے نہ صرف معانی بلکہ فضا اور اسلوب کے ساتھ ساتھ شاعرانہ محاسن اور شیوہ ہائے بیان کو بھی اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمام تصنیفات جن کا خالد نے ترجمہ کیا ہے وہ مختلف عہد سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنے عہد کی منہ بولتی تصویریں ہیں، مثلاً غزل الغزلات سے شبانی معاشرہ کی معصومیت جھلکتی ہے، پرواز عقاب سے عہد حاضر کی انقلابی روح اور جہد آزادی کی تڑپ ہویدا ہوتی ہے۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں کچھ دیر کے لئے اپنے عہد کی حکایتیں بھول جانی پڑتیں اور اگر ہم نہ بھول سکیں تو خود خالد ہمیں ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے، کہ ہم زماں و مکاں کی آزادی و فراغت محسوس کرنے لگتے ہیں

"نشید الانشاد" کا نثری ترجمہ بھی راقم السطور کے پیش نظر ہے اور خالد کا منظوم ترجمہ "غزل الغزلات" بھی، اس کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف مطالب کو صاف و شستہ زبان میں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ بلکہ اس طلسماتی فضا، زمین کی خوشبو، تہذیبی آہنگ اور دل گرفتگی کو بھی منتقل کر دیتا ہے۔ لہٰذا غزل الغزلات پڑھتے ہوئے نہ صرف آنکھوں کے سامنے عنبر فام حسینہ، دیودار و شاہ بلوط، حضرت سلیمان کا جلوس اور شان و شوکت کا مرقع آتا ہے بلکہ ناک میں عود و مُر کی خوشبو اور کان میں عنبر فام حسینہ کی دل گرفتہ آواز بھی گونج پیدا کرنے لگتی ہے۔ پھر شیوہ ہائے بیان اور تشبیہات ملاحظہ کیجیے۔

ہے وہ میرا عاشق (اقبال مند)
اس قدر سرخ و سفید
دس ہزار افراد میں ہے سربلند
اس کا سر گویا زرِ کامل عیار
گھنگھریالے بال اس کے کوّے سے کالے سیاہ
اس کی آنکھیں دو کبوتر، بیٹھے ہوں باتمکنت
جو لب دریا نہا کر دودھ میں
دانت گویا دودھ سے دھوئے ہوئے۔
تابناکی میں نگینوں کی طرح
باسمیں رخسار پھولوں کے چمن
کیاریاں بلسان کی ابھری ہوئی
سوسن اس کے لب تراوش جن سے مُرِ ناب کی
ہاتھ اس کے ہیں زبرجد سے منقش طوق زر
پیٹ اس کا کام ہاتھی دانت کا
جس پہ ہوں نیلم کے پھول

لہ قلم کے سفر میں نہیں ہم رکاب   کرلے دل شتاب کہ پینڈا بڑا ہے

اس کی ٹانگیں گنڈلی پایوں پہ مرمر کے ستون
دید میں لبنان ہے خوبی میں سرو سربلند

اُردو شاعری نے اس رنگ و روپ کا محبوب کب دیکھا تھا! نہ صرف اردو کا سرمایہ الفاظ بلکہ پیرایہ بیان میں بھی ایک نئی جہت پیدا ہوتی ہے، یہ تشبیہ و استعارے کتنے انوکھے اور تر و تازہ ہیں۔ گلستان کے عود و عنبر کی خوشبو اور شبانی معاشرے کی معصومیت لفظ لفظ سے پھوٹی پڑ رہی ہے۔ ندرت تشبیہ دیکھیے ؎

۱۔ خوشۂ انگور تیری چھاتیاں
۲۔ تیری دونوں چھاتیاں دو بچے توأم غزال
۳۔ تیری دونوں چھاتیاں توام ہیں دو آہو برے
۴۔ میں ہوں اک دیوار، برج (انور) ہیں پستاں مرے
۵۔ دستۂ مُر ہے مرا محبوب میرے واسطے
۶۔ تیری آنکھیں فاختائیں در تۂ دام نقاب

ان دلکش تشبیہوں کے ساتھ ساتھ غزل الغزلات میں گنڈلی، باڑھ اور کڑاڑوں ایسے ٹھیٹ ہندی الفاظ بھی آتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد پہلی مرتبہ اردو شاعری میں "کڑاڑوں" کا استعمال خالد نے کیا ہے اور غالباً "باڑھ" اور "گنڈلی" کا اس سے قبل شعر میں استعمال نہیں ہوا اس کی بدیہی وجہ یہ ہے کہ خالد الفاظ کے استعمال میں چھوت چھات کا قطعاً پابند نہیں، مزمور میر مغنی میں وہ ہندی مفرد الفاظ بڑے سلیقے سے استعمال کرتا چلا گیا ہے، چند مثالیں دیکھیے ؎

۱۔ برابر لگے ہیں عدو گوہ میں
۲۔ گھروں میں اندھیرے میں ماریں وہ سیندھ
۳۔ نکموں کو آتی ہے جھونجل بہت
۴۔ جو دیکھو عمل تو نکھتر نکھد
۵۔ دفینوں کو رکھتے ہیں وہ سینت کر
۶۔ ہوس ملک گیری کی ذرے بھر چکیں

ٹھیٹ ہندی مفردات یوں ہی مزے سے وہ باندھتا ہے، اور شاید صاحب وضع اصطلاحات کی تقلید میں "خرچ" سے "خرچنا" بھی وضع کر لیا ہے ؎

بڑے خرچنے سے یہ دولت ہے وہ

"غزل الغزلات" کی خوبیوں سے قطع نظر جب وہ یونانی شاعرہ سیفو کی شاعری کو اردو کے قالب میں منتقل کرتا ہے تو الفاظ کے حسن و تناسب سے طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور یونانی فضا اور ثقافت کی تصویریں ابھارتا ہے ؎

اس خوش نصیب کو میں سمجھتی ہوں دیوتا | جو باریاب ہو کے حریم وصال میں
نقش و نگار ناز کو جی بھر کے دیکھتا | لبہائے دلنواز کے سنتا ہے زمزمے
لہجے کی مرکیوں میں گھلاوٹ وہ شہد کی | آنکھوں میں ناچتی ہے ہنسی جو دبی دبی

اس نامراد دل میں لگاتی ہے آگ سی ۔۔۔ پل بھر جو تیرے روئے نگاریں کو دیکھ لوں

سینے میں ولولے بھڑک اٹھتے ہیں گونہ گوں ۔۔۔ آواز گھٹ سی جاتی ہے عراب نطق میں

کس منہ سے ماجرائے دل مبتلا کہوں ۔۔۔ کیا طاقت سخن کسی گم کردہ ہوش کو

آنکھوں کے آگے دھندلے سے سائے آئیں جائیں ۔۔۔ کانوں میں گونجے سرمئی لہروں کی سائیں سائیں

اسی حال میں خیال لگے تن بدن کا ہو ۔۔۔ پنڈا تمام سوز دروں سے عرق عرق

دکھتا ہے جوڑ جوڑ، جگر شق ہے چہرہ فق ۔۔۔ برگ گیا وزرد و خزاں دیدہ کی طرح

پژمردہ ہے مزاج طبیعت ملی دلی ۔۔۔ دل میں بھی ہے رشک و رقابت کی کھلبلی

تپتا ہے جسم شعلہ جوالہ کی طرح ۔۔۔ بڑھتی ہے اور حبس و حرارت سے بے کلی

لے نو بہارِ ناز، لب ہے تو سدا سہاگ ۔۔۔ اس مست کو تو لغزش مستانہ لے چلی

شاعرانہ محاسن سے قطع نظر خالص لسانی نقطہ نظر سے بھی یہ ترجمہ نہایت درقیع ہے، لہجے کی سرکیاں، شہد کی گھلاوٹ، دبی دبی ہنسی، آواز کا گھٹنا، دھندلے سائے کا آنا جانا، سرمئی لہروں کے سائیں سائیں کا بیہم کانوں میں گونجنا، ملی دلی طبیعت ـــــ امیجری اور پیرایہ اظہار کے محاسن سے قطع نظر یہ زبان اُردو کو کب نصیب ہوئی تھی! خالد نے مندرجہ بالا کتابوں کا ترجمہ کر کے نہ صرف اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے بلکہ اردو کی لسانی صلاحیتوں اور امکانات کو بھی وسیع تر کر دیا ہے۔ اسی طرح اُن کی تمثیل کی جانب نظر کی جائے تو یہاں بھا یہ فرق و امتیاز کرنے کی ضرورت ہے کہ خود شاعر کا اسلوب سخن کیا ہے اور وہ کرداروں کے منہ میں کیسی زبان رکھ رہا ہے۔ پھر یہ بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ دکانِ شیشہ گر، برگِ خزاں، ورق ناخواندہ، سلومی، طبع زاد ڈرامے نہیں، عہد نامہ قدیم عہد نامہ جدید اور اساطیر سے ماخوذ و مستفاد ہیں اور خالد صاحب نے ان ڈراموں میں بھی نہ صرف کہانی کی حد تک اصل روایت سے قریب تر رہنے کی کوشش کی ہے بلکہ تہذیبی فضا اور عہد کی جملہ خصوصیتوں کو برقرار رکھا ہے۔

خالد کے کردار نگاری کی نمایاں خصوصیت اس کی طبقاتی زبان ہے۔ کنیز، غلام، سپاہی، عام شہری، خدمت گار ہر ایک کی زبان اُس کی طبقاتی خصوصیت و حیثیت کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح اشرافیہ، بادشاہ، وزیر، شہزادے، شہزادیاں، بنی آدم، حوّا، اقلیما، یہودا، شیطان کی زبانیں مختلف ہیں، سلومی میں حضرت یحییٰ کی آواز اتنی منفرد ہے کہ ہر جگہ پہچانی جاتی ہے۔ لسانی اصطلاح میں کردار کی مخصوص زبان ([illegible]) سے یہی مراد ہے۔ زبان پر ایسی دسترس انیس کے یہاں کس قدر نظر آتی ہے، وہ بھی احساس و جذبات کی ترجمانی کی حد تک لیکن خالد کے یہاں اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے پھر یہ انواع و اقسام کے اسالیب کلام ڈرامائی موقعے سے یوں ہم آہنگ و ہم رشتہ ہو جاتے ہیں کہ لطف سخن دوبالا ہو جاتا ہے، مختلف طبقے کے کرداروں کا تنوع اُن کی زبانوں کے تنوع سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

آوازِ یوحنا ـــ : اپنی قدرت سے ملتمس ہوا ے ارضِ صیہون!

ہو گیا شاہِ دو عالم کا ظہور

آ گیا ابنِ بشر

بختِ خفتہ ہوا بیدار نصیبہ چمکا!

قصر دریا میں نہاں جا کے ہوئے ہیں فغفور

شیر سے ڈر کے گدھے جیسے بدک جاتے ہیں
سیرزمیں چھوڑ کے دریا کی چٹانوں کو چلیں
تیاگ کر بسترِ تر، جنگلی پتوں میں چھپیں

سلومی : کون تھا جس نے پکارا تھا ابھی؟

پہلا سپاہی : شہزادی یہ تو پیغمبر ہے

سلومی : آہ پیغمبر، اسی سے ہے ہراساں ترارق؟

دوسرا : ہم کو اس بارے میں کچھ علم نہیں شہزادی
ہم تو یہ جانتے ہیں، ہے یہ نبی یوحنا

شامی : کیا محافے کے لیے حکم کروں شہزادی
کنجِ گلشن میں سماں رات کا ہے قابلِ دید

سلومی : میری ماں کے متعلق وہ عجب وعظ وعید
کرتا رہتا ہے، سنا تم نے بھی

دوسرا سپاہی : ہم کلام اس کا سمجھتے ہی نہیں شہزادی

سلومی : ہاں اسی کے متعلق وہ یہ سب کہتا ہے۔

ایک غلام اندر داخل ہوتا ہے۔

غلام : بادشہ آپ سے شہزادیٔ والا رتبہ
ملتمس ہے کہ ضیافت کدے کو لوٹ چلیں

سلومی : اب تو ہرگز نہ وہاں جاؤں گی

شامی : شاہزادی ہے یہ اس بندۂ گستاخ کی عرض
نہ گئیں آپ تو آفت نہ کوئی نازل ہو

سلومی : یہ نبی کوئی مسن شخص ہے کیا؟

شامی : آپ کا جانا ہی بہتر ہے، اجازت دیجے
لبِ تالارِ حضور آپ کو پہنچا آؤں

سلومی : یہ نبی مردِ معمّر ہے کوئی؟

پہلا سپاہی : نہیں شہزادی جواں ہے بالکل

دوسرا سپاہی : کہہ نہیں سکتے یقیں سے کچھ بھی
بعض کہتے ہیں کہ وہ ہے ایلیاس

سلومی : کون ایلیاس؟ کہو تفصیلاً؟

دوسرا سپاہی : اگلے وقتوں میں پیمبر تھا کوئی شہزادی

غلام : جاسکے تیز البرق سے کیا عرض کروں عالی جاہ ؟

آوازِ یوحنا : نہ منا ارضِ فلسطین تو خوشیاں نہ منا
جس نے مارا تھا تجھے اس کا عصا ٹوٹ گیا
باسلیق ایک جنم لے گا گردم افعی سے
ذریت اسکی پرندوں کو نگل جائے گی
آتشی سانپ کی مانند ہوا میں اُڑتی
ہوگی بے رحم شترِ مُرغ بیابانی سی
عیش مسکینوں کے پہلو عطا کریں گے اس وقت
اور محتاجوں کو آرام میسر ہوگا ۔

یوحنا اپنے طرزِ خطابت سے ہی پہچانا جاتا ہے ، اور یہ IDIOLECT کی عمدہ مثال ہے ، پھر سپاہی مختصراً جواب دیتا ہے ، لیکن سپاہیانہ قطعیت اور پاس ادب کو ملحوظ رکھتا ہے ، اور غلام اپنی حیثیت کے مطابق " شہزادئ والا رتبہ " اور " عالی جاہ " کہتا ہے ، دوسرے آزاد شہریوں کی طرح محض شہزادہ " کہہ کر مخاطب کرنے کی جسارت نہیں کرتا ۔ زبان سے کردار ں کی طبقاتی سطحیں نمایاں ہوجاتی ہیں ، فصاحت کا تقتضی ہے کہ مخاطب کی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے خطاب کیا جائے ۔ اشور بنی پال سے اس کا سپہ سالار مخاطب ہوتا ہے ؎

آسماں تخت و اسد بخت وفلک بار گیا
کہکشاں سیر و پرن حیدد ثریا جایا

بار گیا اور جایا کی ضخامت سے اشور بنی پال کی عظمت وجلالت کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے ۔ یہی کیفیتیں دوسری تمثیلوں میں نظر آتی ہیں ۔ یعنی ڈرامائی وقوعے کے مطابق پیرایۂ بیان ، طبقہ وحیثیت کے لحاظ سے زبان کا استعمال ، سلاست ، صوتیاتی آہنگ اور فن پر خالد کی گرفت تحیر انگیز سماں پیدا کر دیتی ہے ۔

اب ہم خالد کی تخلیقات فارقلیط ، منحنی ، لحن خزیں ، مزمورِ میرمغنی ، کلک موج ، کفِ دریا ، دشتِ شام ، زنجیر رم آہو میں اس کے اسالیب کا مطالعہ کریں گے ۔ اپنی تخلیقات میں خالد ترجموں اور تمثیلوں کی طرح گوناگوں پابندیوں میں جکڑا ہوا نہیں ہوتا وہ اپنی ذات اور اپنی شخصیت کا بے تکلف اظہار کر سکتا ہے ، لیکن چونکہ اس کے سفینۂ سخن کا قوس قزحی بادبان اُفق تا افق پھیلا ہوا ہے اور وہ اقصائے عالم کے جملہ علمی و ادبی سرمائے کو اپنی متاع جُزدہ سمجھتا ہے ، لہٰذا اپنی تخلیقات میں بھی وہ کسی ایک اسلوب کا پابند نہیں ، افسوی فرہنگ کے لحاظ اس کے یہاں مندرجہ ذیل اسالیب تواتر سے آتے ہیں ۔

۱۔ صاف وشستہ اردو ، عام فہم ، سہل مثلاً

اس انتظار میں
کہ خواب میں
تم آؤ گی
میں ساری رات جاگتا رہا

۲۔ عام فہم ہندی آمیزہ اسلوب مثلاً

شام وسحر کا پگھلتا سونا
میٹھا گرم گھنیرا جادو
عشق انگیز، شلنگ آہو
جوت جگاتی چشم پُرفن
یہ جانی پہچانی خوشبو
کھیت کنوارے، فصل سہاگن

۳۔ فارسی اسلوب، جو بلحاظ ضخامت اقبال کے عمومی اسلوب سے قریب تر ہے، مثلاً ؎

روح سرود وسخن خواب وخیال وفغاں
سینۂ صدچاک سے فیض کے سوتے رواں

جوہر تخلیق ہے، بادۂ میناگداز!
ہر نظر اِک ابتلاء، ہر نفس اک امتحاں

اک ازلی التہاب، اک ابدی اضطراب
مبداء فیاض سے قسمتِ آزادگاں

سختیٔ دشت ودیار، صدق طلب کا عیار
راہ تمنا میں ہے ہر قدم اک ہفت خواں

سینۂ بیتاب میں ولولوں کا اہتزاز
ولولے جن کا غبار گردِ رہ کہکشاں

اسی اسلوب کا ایک روپ یہ بھی ہے ؎

ہے تیری ذات سزاوار ہر ثنا یارب
کیا ذلیل کو تونے جلیل کا محرم

چراغ قافلۂ درد ہے، دل پُردرد
صدف ہے سینے کا گنجینہ دار گوہر غم

ہجوم شوق ہے شاعر ہے اور تنہائی
جگر فگار، نفس سوختہ، مژہ پُرنم

تو کارساز وکریم ومسبب الاسباب
کرے جو ایک نگاہِ کرم تو جانِ کرم

فقیر عشقم ومستغنیٔ سروساماں
دلیست سوختہ از عشق مصطفیٰ دارم

اور پھر اسی اسلوب کا ایک اور روپ یہ بھی ہے:

سمجھتا ہوں اشاروں کی زباں کو — مجھے معلوم ہے کیف و کم گُن
تبسم رخ پہ لیکن حزن دل میں — ہے دہ کارِ سخن ضبط و توازن
مجھے بخشا ہے قسّامِ ازل نے — نوا سنجی کا سودا شعر کی دھن

حقیقت کے چمکتے تار دے کر — کہا جا ان سے خوابوں کی قبا بُن
کبھی ٹانک آسماں پر چاند تارے — کبھی مٹی سے کر شایگاں چمن
زمیں گویا عروسِ آسماں ہے — ذرا آ لیس میں ان کی گفتگو سُن
نہیں حد کوئی ادراک و عمل کی — وفوق کل ذی علمٍ علیم

خالد کی تمام تصانیف کا بہ امعانِ نظر مطالعہ کیجیے۔ اُن کی خلاقانہ صلاحیتوں کا اظہار مندرجہ بالا اسالیب ہی میں کم و بیش ہوا ہے اور یہ تمام اسالیب اردو کی کلاسیکل شاعری سے ہم رشتہ ہیں۔ ان میں پیچیدگی، اغلاق اور اجنبیت قطعی نہیں، لیکن بعض صفِ اوّل کے نقاد بھی خالد صاحب کے اسلوب پہ گفتگو کرتے ہوئے دھوکہ کھا گئے ہیں، اُن کی تلمیح اور تضمین نگاری کو اُن کا خاص اسلوب قرار دیا ہے، حالانکہ ان کا مطالعہ فنی مظاہرے کے ضمن میں ہونا چاہئیے تھا، مثلاً مزمورِ مغنی ۱۳۶۰ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں التزاماً ہر دوسرا مصرعہ عربی کا ہے، لیکن اس میں سے تیس چالیس اشعار ایسے نکل آئیں گے جو اُردو میں کہے گئے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو زیادہ بہتر تھا، پھر فنی لحاظ سے اعلانِ نون اور نونِ غنہ کے قوافی کا ایک نظم میں اجتماع محلِ نظر ہے۔ لسانی لحاظ سے مزمورِ مغنی پہ نظر کی جائے تو اس کا اسلوب ہندی آمیز مفرد الفاظ یا فارسی آمیز الفاظ پہ مشتمل ہے مثلاً

۱۔ فروغِ تجلّی ہے خیرہ نگہ
۲۔ نہیں ہے تمہیں فکرِ سود و زیاں
۳۔ ہے دل کا زیاں غیبتِ دیگراں
۴۔ اسیرِ حجاباتِ تارِ نگاہ!
۵۔ خدا اپنے بندوں پہ ہے مہرباں
۶۔ نگارانِ گلچہر و شمشاد قد
۷۔ بلوریں تن و قاقمیں پیرہن
۸۔ تکلف نہیں شیوہ اہلِ دل
۹۔ نہ برقِ تجلّی نہ ضربِ کلیم
۱۰۔ مرے دل کے آئینے میں عکس ریز

دوسرا مصرعہ تو خیر عربی ہے، ان مصرعوں پہ نظر کیجیے، تمام شعری فرہنگ فارسی آمیز ہے۔ اب ہندی مفردات کا استعمال دیکھیے ؎

۱۔ جہالت چھپر کھٹ پہ سرمست ناز
۲۔ مُرن شنکر، آنہ دل، دنی، دو غلے

۳۔ نہ جوہر نہ جوہر کا پارکھ کوئی

۴۔ برستی ہیں تقریریں مینہ کی طرح

۵۔ اڑائیں الّلوں تلّلوں میں غال

۶۔ اک اندھیر نگری ہے روئے زمیں

۷۔ جوانی کا رس جتن کہاں ؟ ضعف سے ،

گویا اس طویل نظم میں بھی محض دو اسلوب ہیں۔ ہندی آمیز اردو اور فارسی آمیز اردو ۔ اور جہاں تک عربی بحر کے کا تعلق ہے ، اہل نظر جانتے ہیں اور خود خالد صاحب نے اشارہ بھی کر دیا ہے ؎

پئے معنیٰ لغزد لفظِ بدیع
کرے دل کو خوں شاعرِ ذو فنون

بھیانک جہنم کا دانتے کہاں
کہاں خُلدِ فن خالد ذو فنون

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ تلمیح یا تضمین نگاری ایک فنی مظاہرہ ہے ، اسے شاعر کا خصوصی اسلوب قرار دینا مناسب نہیں ہے ، اسی طرح "لا فارتلیط" اور "منحنا" میں خالد نے ہندی ، برج بھاشا اور خالص سنسکرت شعری فرہنگ میں زورِ بیاں دکھانے کے لئے شعر کہے ہیں اسے بھی خالد کا منفرد اسلوب قرار دینا مناسب نہیں ہے ، مثلاً

ہے بزمِ راز میں رندوں کے لب پہ ہُو ہُو ہُو
ہے چشمِ مردمِ آگاہ میں وہ پرشوتم
پُرتی سرگ مہا حد سے جس کو یاد کرے
ہے خلق و خُلق و شمائل میں وہ گروِ زم
وہی قرارِ دل ہفت دُخترِ خضرا
گواہ اس کی ہے پرتم کہ ہے وہی پرتم
مرورِ وقت سے اُپ نام ہی بنے شبھ نام
الگ نہ ہو سکے اسم صفت سے اسم علم
شمار کرنے چلیں اس کی خوبیوں کا اگر
تو ساتھ چھوڑ دیں تھک تھک کے نیل سنکھ پدم

یا پھر یہ روپ ملاحظہ فرمائیے ؎

یہی للن ، یہی یوگیشور ، یہی کاہن	سدا تما اپراجیت انویم ادر درحم
وشالتا میں یہ ترمی یہ رس بیہ کو ملتا	یہی ہے منو نتا ، اشکتی کا تکملہ سیتم

یہ زورِ بیان، یہ تبحر، یہ روانی اقلیم سخن خالد کے یہاں عام طور پر پائی جاتی ہے، وہ الفاظ کا بادشاہ، معانی کا شہنشاہ، ترجمان ماضی وحال ہے۔ بہ ایں ہمہ کسی شاعر کا اسلوب اس کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔

اب خالد کسی زبان میں گفتگو کرے، اظہار مطلب کے لئے کسی قسم کا ذخیرۂ الفاظ استعمال کرے، اس کی شخصیت کی انفرادیت کا اظہار ہو کر رہتا ہے، پھر نفسیاتی توضیحات کی روشنی میں کسی شاعر کا ڈکشن بھی اختفائے ذات کرتا ہے، لہٰذا ہمیں خالد کے انفرادی اسلوب کا تعین کرتے ہوئے کثرت میں وحدت (UNITY IN DIVERSITY) کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں اس کے تلمیحی اسلوب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہ زلفِ پریشاں یہ خم کاکل پیچاں
یاد آئیں قریطس کی مجھے بھول بھلیاں

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا کوئی غافل
دیمیتر بھی پریشاں ہے اڈونس بھی پریشاں

یوں سینکڑوں تلمیحات محض اسم معرفہ کی صورت میں آتے ہیں۔ جن میں اساطیر، عہد نامۂ قدیم اور عہد نامہ جدید کے قصص کے کردار بھی شامل ہیں، بعد کے افسانہ وافسوں بھی جغرافیائی مقامات اور تاریخی شخصیتیں بھی، معروف کتابوں کے نام اور اُن کے کردار بھی تلمیح کے اس اچھوتے انداز سے خالد صاحب کو خاص مناسبت ہے اور اسلوب کی بُنت میں اس تلمیحی رنگ کو امتیاز حاصل ہے۔ پھر خالد نے ان تلمیحات کو بار بار اور سوز ونگ سے باندھ کر ہمیں اس سے مانوس کر دیا ہے۔

خلاصہ بیان یہ ہے کہ اُردو کی جدید تشکیل میں خالد کی خلاقانہ مساعی کا بیش بہا حصہ ہے۔ اس نے ندما کے شعری فرہنگ (ڈکشن) اسالیب اور پیرایہ بیان (امیجری)، اکسپریشن، تشبیہ واستعارے، کنائے، محکات وغیرہ) کو بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے اور علاقائی اور کلاسیکل زبانوں اور ادبیات، اساطیر، صحائف آسمانی، قرآن حکیم سے بھی اخذ و استفادہ کیا ہے۔

خالد حروف والفاظ کے تخلیقی استعمال میں مہارت تامہ رکھتا ہے، اس نے ہندی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو بڑے سلیقے سے باندھا ہے نیز خود بھی نو بہ نو ترکیبیں وضع کی ہیں۔ زبان وبیان پر قدرت کاملہ اور مختلف زبانوں کی لغات پہ عبور رکھنے کے باوجود وہ لفظ کے استعمال کے معاملے میں چھوت چھات کا قطعاً پابند نہیں۔ وہ اظہار مطالب کے لئے کوئی بھی لفظ چن لینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا، لہٰذا اس کے کلام میں ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو عموماً شاعری کی اصطلاح میں "غریب" سمجھے جاتے ہیں وہ مبتذل وعامیانہ لفظ کو بھی رفعت بخشتا ہے۔

خالد زندگی کے کسی ایک رُخ کی مصوری وترجمانی نہیں کرتا بلکہ بھرپور زندگی کی ہر ادا، ہر کیفیت، ہر جہت اس کا موضوع سخن ہے، لہٰذا ہیئت اور مواد دونوں لحاظ سے اس کی شاعری پرُ وقعت، متنوع اور پہلی مرتبہ اردو شاعری میں زندگی کی ترجمانی یوں ہوئی ہے۔

خالد کے پیش نظر ملتِ ابراہیمی کی تہذیب کا احیاء ہے۔ لہٰذا وہ کثیر اللسانی ثقافتوں کو ایک کر کے تنظیم وحدت بنانے کا خواہش مند ہے۔ اس تجربے کے نتائج سے قطع نظر یہی فائدہ اردو کے متمول کی صورت میں رونما ہو چکا ہے۔
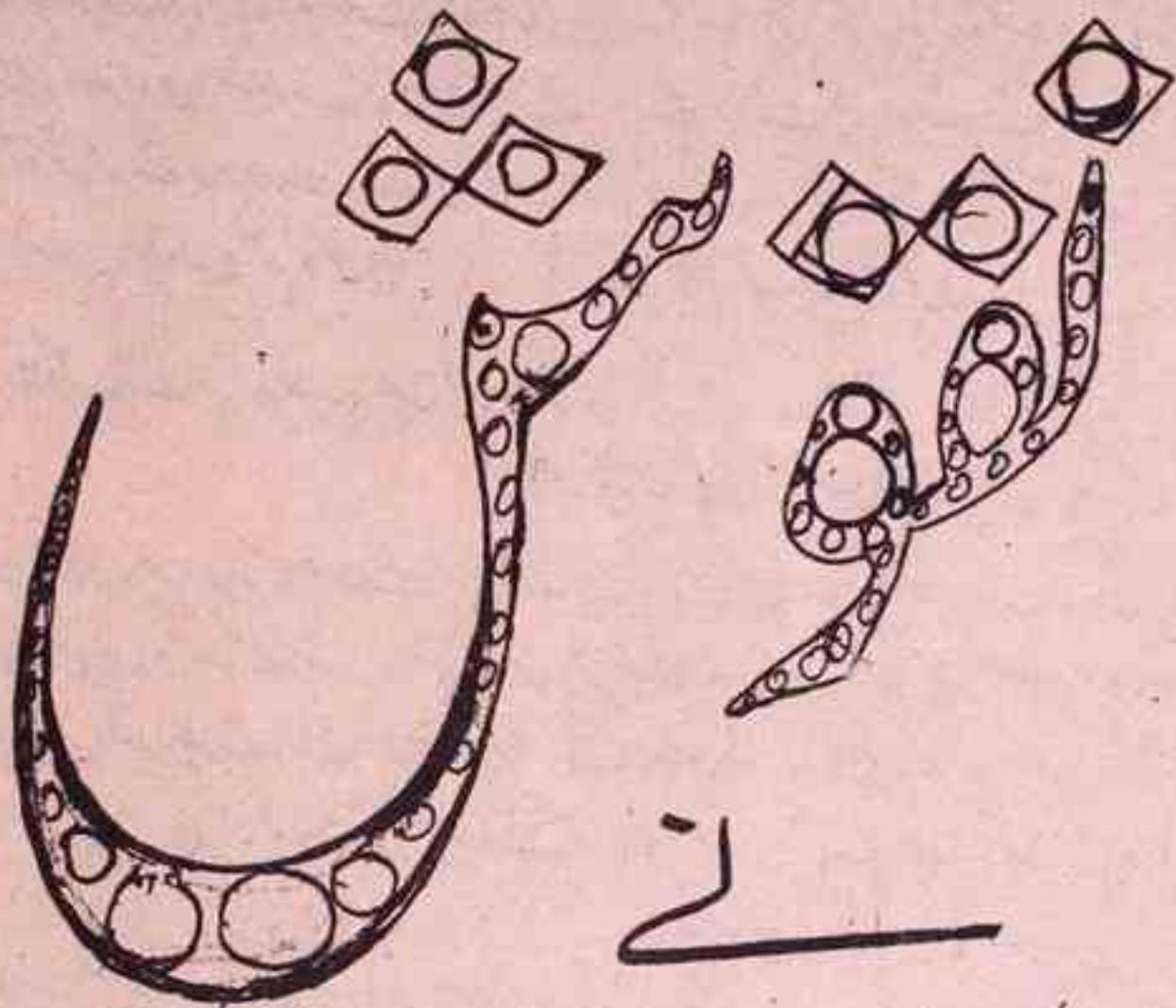
عبدالعزیز خالد ایک نیا آہنگ

عبدالعزیز خالد کی شاعری کا سورج اس وقت اُفق ادب پر اُبھرا جب سید ضیاء جالندھری زمستان کے گیت گا رہے تھے، منیر نیازی بھوتوں اور چڑیلوں کے وجود کا احساس دلا رہے تھے اُن کے دوست تجمل حسین جنت گم گشتہ کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اور ناصر کاظمی اُداس لمحوں کو اپنے لہو میں اُتار رہے تھے۔

یہ ایک عہد کے محبوب رجحانات تھے۔ مگر اس کے برعکس عبدالعزیز خالد تمثیلی اور نوزنیہ نظموں کے ذریعے نہ صرف ہیئت کے تجربے کر رہے تھے بلکہ موضوعات کے انبار لگا کر اساطیر، اسلاف اور تاریخ کو کھنگال رہے تھے۔ اس طرح انہوں نے یونانی، رومی، مصری، بابلی، ہندی، پاکستانی اساطیر اور قرآنی روایات کو نئے نئے تجربات کی روشنی سے منور کیا ہے۔ چنانچہ زمستان، آسیب، اُداسی اور احیائی میلانات کے عہد میں خالد خاموش سمندر اور چپ چاپ دھماکے کی حیثیت میں زندہ ہے جس کی بنا پر اُن کی شاعری، ادب و تاریخ اور تہذیبی سطح پر موجود رہی۔ اور آج وہ بہت سے ذہنوں کو تجربے، آہنگ اور علم کی روشنی بخش رہے ہیں۔

شعر و ادب میں اُن کے وسیع تجربے نے ایک عام قاری کو تقویت بخشی ہے۔ جس سے نہ صرف نقادوں نے اُن کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے بلکہ ایک عام قاری بھی اجتماعی لاشعور کی گھٹن میں رہ کر اجتماعیت کے امکان اور روحانی سکون کو محسوس کر رہا ہے۔ چنانچہ اُن کا شمار ایک عظیم منظوم ڈرامہ نگار کی حیثیت میں ہونے لگا ہے۔ البتہ ہمارے "مشہور نقاد" اُن کے بارے میں کھل کر بات کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ شاید وہ ابھی تک اُن کی شاعری کے بارے میں متذبذب ہیں یا جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کوئی نقاد یہ کہتا ہے کہ خالد کی شاعری مبہم ہے مگر وہ انسان بہت اچھے ہیں۔ کوئی نقاد انہیں طنزیہ، المیہ اور مترجم کی حیثیت دینے پر تُلا ہوا ہے اور کسی واضح جہت کی نشان دہی سے کترا رہا ہے۔ لہٰذا اب صرف قاری ان کی شاعری کی واضح جہت کے بارے میں کوئی فیصلہ دے سکتا ہے (میرے نزدیک قاری ہی بہترین منصف ہو سکتا ہے۔ اس لئے قاری کی رائے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس لحاظ سے میری حیثیت بھی ایک قاری سے زیادہ نہیں) چنانچہ میں خالد کی شاعری کو روحانی سکون کی شاعری قرار دے سکتا ہوں۔

مجھے یوں تو اُن کے ہیئتی تجربوں نے بہت متاثر کیا ہے۔ اسی لئے مجھے اُن کے موضوعات، ہیئت اور ان تھک محنت نے گرویدہ کیا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک عبدالعزیز خالد کی شخصیت ہم تہہ جہت رہی ہے اور ایک ایسی شخصیت جس کے نزدیک افراتفری کوئی معنی نہیں رکھتی اور نہ ہی جس نے محنت سے جی چُرا کر شعر کہے ہیں۔ تاہم اُن کا روحانی سکون آج کے عہد کی شے دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی آج کا نقاد اُنہیں موجودہ خود ساختہ خانوں میں جگہ دے سکے گا۔ بہرکیف ہیجانی کیفیات میں روحانی سکون کی تلاش تاریخی، سیاسی اور ادبی اعتبار سے بھی اس لئے اہم ہے کہ اس کے ڈانڈے ہمارے صوفیا کے علاوہ جدید شاعری کے بے ہنگم شعور تک پھیلے ہوتے ہیں۔

جدید شاعری اور بے ہنگم شعور ایک ایسا مسئلہ ہے جو قاری کو ہمیشہ ستاتا رہا ہے۔ اس لئے میں ایک قاری کی حیثیت سے روحانی سکون کا متلاشی

ہو کر بے ہنگم شعور کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں۔ یہ تو خیر ذاتی معاملہ رہا ہے لیکن عبدالعزیز خالد کا روحانی سکون آج کے عہد میں کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج کے نقاد اور آئندہ کے قاری دونوں کو ستائے گا۔

روحانی سکون عموماً ایسے انسان کا آدرش رہا ہے جسے مادی زندگی کی فراوانی میں یہ کیفیت میسر نہ رہی ہو یا ایسے انسان کی زندگی جو روزِ ازل ہی سے روحانی رہی ہو اس لحاظ سے عبدالعزیز خالد دونوں صورتوں میں روحانی سکون کے متلاشی رہے ہیں۔ اُن کی زندگی بے حد پاکیزہ اور خوبصورت رہی ہے اس لئے بالیدگی اُن کے ہاں روزِ ازل سے موجود ہے۔ لہٰذا اُن کے روحانی سکون کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد روحانی سکون کے ذریعے بیسویں صدی کے اُس انسان کو باور کرانا چاہتے ہیں جو خلا کی وسعتوں کا مالک ہے اور مادی زندگی کا مبلغ اور مفسر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عامیانہ قسم کے شک کا شکار بھی ہے اس لئے ایسے خلائی انسان کے لئے باطنی تعلق کی بے حد ضرورت ہے جس کے باعث اُس کا انسانی رشتہ باقی رہتا ہے۔ چنانچہ خلائی انسان کے لئے جس کے جسم کا ڈھانچہ روحانی قوت سے خالی ہے۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری ایک بنیادی تنازعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی حیثیت مذہبی ہے لیکن تاثر کے اعتبار سے آفاقی ہے۔ ایسی صورت میں عبدالعزیز خالد کی شاعری خالص پاکستانی شاعری ہے جسے متمیز کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں مگر خلائی انسان کے بے روح جسم کے لئے خالد شاعری کیوں فرما رہے ہیں۔ کیا انہوں نے کوئی مشن اپنے ذمے لیا ہے کیا وہ سیفو، ٹیگور اور بوچی منز کی شاعری کے آزاد مترجم کی حیثیت سے نیز منظوم تمثیل نگار کی حیثیت سے کون سا فریضہ ادا کر رہے ہیں کیا سیفو اور بوچی منز کی شاعری روحانی غذا کا کام دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مکالمے میں واقعیت اور روزمرہ کا انداز پیدا کرنے کے لئے تمثیل نگاری کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کو روحانی تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ خالد تساہل پسندی کے خلاف عملی جہاد کر رہے ہیں وہ فن کو سہل بنا کر اُس سے مقصدی کام لینا چاہتے ہیں۔ اُن کا یہ عمل اُن کے روحانی تجربے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے قاری کو اپنے تجربے میں براہِ راست شامل کرنے کے خواہاں ہیں۔

وہ اپنے قاری کو قرآنی زبان کے ساتھ شناسائی پیدا کرانے کا مشن لے کر آگے بڑھ رہے ہیں وہ شاید روح اور جسم کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے لئے اپنے قاری کو رسولِ اکرمؐ کی ہمہ گیر شخصیت، رحم دلی، ترحم اور جہاد سے شناسا کرنے کے لئے اپنی طویل منظومات میں قرآنی آیات، الفاظ اور اصطلاحوں کو بے ساختہ استعمال کرتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں وہ روحانی خلا پورا کرنے کے لئے یہ بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ انسان اپنی ذات کے لئے پیغمبرؐ کی رہبری کا واسطہ تو دیتا ہے لیکن اُس کا اپنا عمل اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ خالد فن اور اخلاقیات کو صنعتی اور تہذیبی عہد میں یکجا کر کے روح اور جسم میں اکائی تلاش کر رہے ہیں۔ روح اور جسم کی تلاش میں نکلنا اتنا آسان نہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے خالد نے فن پر توجہ دی ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں ایک تجربہ کیا ہے۔ وہ اپنی نظم "طوفانِ نوح" کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں منظوم تمثیل نگاری ابھی اپنی کوئی روایت قائم نہیں کر سکی۔ اس لئے بہت کم لوگ اس بات کا احساس کر سکتے ہیں کہ مکالمے میں واقعیت اور روزمرہ کا انداز پیدا کرنے، کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کی ہو بہو عکاسی، واقعات کے مد و جزر کو فطری پیرایہ میں ظاہر کرنے اور ڈرامائی فضا کی تعمیر و تاسیس میں عروض کے بجدار و مریز کس حد تک سدِّ راہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دو چار متفرق کوششیں جو اس صنف میں ہمارے سامنے آتی ہیں، ان میں تنوع اور تاثر کے لئے شاعر کو مجبوراً ایک سے زائد بحروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ذہنی تساہل اور تعصب سے بچ کر مروجہ اوزان و بحور کا نئے سرے سے مطالعہ کیا جائے اور ان میں پوشیدہ امکانات کا غائر نظر سے جائزہ لے کر ان میں ایسی ترمیم و تنسیخ کی جائے جن سے یہ بدلے اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکیں۔"

عبدالعزیز خالد کی یہ تحریر اُن کی شاعرانہ جنگ و دو کا ایک منشور بھی ہے اور اُن کے تجربات کا اعلامیہ بھی تاہم وہ کسی نظریے، کسی پارٹی یا کسی ہیئت سے جڑے نہیں۔ بلکہ انہوں نے ہر قسم کے اسلوب سے گذر کر اپنا ایک نیا آہنگ پیدا کیا ہے جو اُنکی پہچان بھی ہے اور آواز بھی۔ انہوں نے بیانیہ شاعری کو از سرِ نو فروغ دیا، ہٹ دھرمی اور تساہل کے خلاف جہاد کیا اور جولانیٔ فکر کو آزاد کر دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اقبالؔ، ظفر علی خاں، جوش، شورش

اور مختار صدیقی کا بہت حد تک ساتھ دیا ہے اور داستان گوئی کو اہم بنا کر جولانی فکر کو قرآنی آہنگ کا پابند کر کے انہوں نے اپنے اسلوب کو ایک وجود بخش دیا ہے۔ چنانچہ یہ اسلوب عبدالعزیز خالد کے اس نئی شکل میں موجود ہے۔

عبدالعزیز ہر تخلیقی انداز کو اسی اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے اسلوب کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بعض اوقات کھردرا ہو جاتا ہے۔ جس سے نفیس ذوق کو دھچکا لگتا ہے۔ مگر جس فن میں کوئی آلائش نہ ہو، جس فن کے شناور کی مسافت طویل ہو تو وہ دریا کے چکنے پتھروں کا سہارا نہیں لیتا۔ چنانچہ عبدالعزیز خالد نے کھردرے پتھروں کا سہارا لے کر فن کی شاعری میں اسلوب کا دریا عبور کیا ہے جو عصر حاضر کے استفسار سے الگ ہے۔ چنانچہ عبدالعزیز خالد نے ازمنہ وسطیٰ کی کائنات کو آج کے خلائی عہد میں پیش کر کے روحانی معنویت کا ایک تجربہ کیا ہے۔ جس میں خدا، انسان، کائنات کی ایک تکون موجود ہے، جس کے ہر زاویے میں بولتی صدائیں اور ایک محشرستاں ہے۔

مبارک اکمل گیلانی

قلبِ تپیدہ کی ایک مثال

"عشق بازی" کا شغل خواہ وہ حقیقی ہو یا مجازی، سوز و تب و تاب اول، سوز و تب و تاب آخر سے عبارت ہے، یہ کاروبار زیاں ہے، محبوب کے حصول کے لئے زندگی کی بازی لگا دینے کا سودا، عشق محبوب کی طلب اور عاشق کے جنونِ طلب کی اس کیفیت کا نام ہے، جہاں عاشق کی کائنات میں سوائے محبوب کے دوسری ساری حقیقتیں باطل ہو جاتی ہیں۔ حسنِ طلب کے اسی جذبے نے مشرقی شعر و ادب خصوصاً فارسی اور اردو شاعری میں غزل کے پیکر کے توسط سے انسان کے اس ناقابلِ تسکین تشنگی کے احساس کو جو وہ محبوب سے مہجوری کی کیفیت میں محسوس کرتا ہے، جو زبان دی ہے وہ انسانی جذبات کی تجسیم کے سلسلے میں ایک نادر مثال ہے، اقبال نے عشق کو "اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور" کہکر جس حقیقت کی نشاندہی کی ہے وہی دراصل عین گنجِ حیات ہے، زندگی سے اگر عشق کی بخشی ہوئی اضطرابِ مسلسل کی دولت چھین لی جائے تو بس سرد مٹی کا ایک ڈھیر باقی رہ جاتا ہے جسے آپ انسان کہنے کی ضد کریں تو ایک الگ بات ہے، ورنہ دیو جانس کلبی تو مٹی کے ان ڈھیروں میں انسان کو تلاش کرنے، دن میں بھی چراغِ فروزاں لے کر نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس اضطرابِ مہجوری اور اس خلش نے کیا کیا روپ اختیار کئے ہیں وہ انسان کی تاریخِ حیات کے مختلف شعبوں اور گوشوں میں بکھرے پڑے ہیں، جس طرح زندگی کا کوئی ایک رُخ متعین نہیں اسی طرح اس دردِ مہجوری کی داستان کا کوئی ایک رنگ، ایک روپ متعین نہیں۔

—— عشق کا بخشا ہوا یہ دردِ مہجوری جو بھی صورت اختیار کرے، تصورِ محبوب کو تصورِ کائنات پر حاوی کر دینا بلکہ تصورِ حیات کو تصورِ محبوب میں گم کر دینا ہی عشق کی منزلِ اوّل ہے اور "کہ جس پہ نگاہ تجھ کو دیکھا" کے اس عالم کی ایک نہایت پُر اثر تصویر، جس سے عشق کے اس دردِ مہجوری کی پیدا کردہ ناقابلِ تسکین تشنگی کا حاصل مجسم دکھائی دیتا ہے، غالب نے یوں کھینچی ہے ؎

ره روِ تفتہ در رفتہ بہ آیم غالب ؎ تو شتہ بر لبِ جو ماندہ نشان است مرا

اجمالاً کہی جائے تو یہ داستان عبدالعزیز خالد کی داستان ہے!

—— مُنحمنّا اور فارقلیط کا یہ حامد و مداح خالد اردو نظم کی تاریخ میں اپنی دیگر خصوصیات و محاسن سخنوری کے علاوہ جس امتیازی خصوصیات کی بنا پر یادگار رہے گا وہ اس کی "نعت گوئی" کا انداز ہے۔ مدحتِ پیمبر کا مضمون نہ نیا ہے، نہ نادر، مگر حسنِ طلب اور عشقِ مہجوری کے بخشے ہوئے اضطراب کا ایک سیلِ بے پناہ ہے جس نے خالد کی قادر الکلامی اور علمیت کے بل پر اظہار کے سینکڑوں پیکر تراشے ہیں اور بیان کی ہزاروں راہیں تلاش کی ہیں۔ اردو کے تمام بڑے نظم گو شعرا اور متقدمین سے لے کر متاخرین بلکہ دورِ جدید تک کے تقریباً ہر بڑے غزل گو شاعر نے بھی جوشِ عقیدت کے اظہار کے لئے ہو یا حصولِ برکت کے لئے اس نازشِ کائنات و فخرِ موجودات کی مدحت سرائی کی ہے۔ نظم گو شعرا میں ظفر علی خان اور اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی نعتیں خصوصاً بہت پُر اثر اور سوز و گداز سے مملو ہیں، تاہم یہ بات

قابلِ ملاحظہ ہے کہ سوائے محسن کاکوروی کے اردو شعر کی پوری تاریخ میں کوئی نمایاں نام ایسا نہیں جس نے نعت گوئی کو ایک الگ اور مستقل صنفِ سخن کی حیثیت سے موضوعِ سخن بنایا ہو۔ خالد کا نام اس ضمن میں دوسرا ہے اور نعت گوئی کی تاریخ لکھنے والا مورخ محسن کاکوروی کے بعد جس واحد ممتاز شاعر کا ذکر کرے گا وہ عبدالعزیز خالد ہے۔

یہاں تک کی بحث سے یہ غلط مبحث ذکر لیا جائے کہ خالد نے نعت گوئی کی اُسی روایت کو آگے بڑھایا ہے جو محسن نے چھوڑی تھی۔ محسن کی نعت گوئی، اُن کی قادر الکلامی، تشبیہات و استعارات کے حسن کارانہ استعمال اور جدتِ بیان کے باعث ممتاز ہے۔ مگر اُن کی قادر الکلامی اور شاعرانہ حسنِ بیان کے پردے اُٹھا کر دیکھا جائے تو شاعری کے علاوہ جو چیز ملے گی وہ مذہبی عقیدت ہے جو فخرِ کائنات صلعم کی ذاتِ اقدس سے ایک راست العقیدہ اور مخلص مسلمان کو ہو سکتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ میں محسن کی نعت کے حوالوں سے اس کی تشریح کروں، نہ ان دو شعرا کے رنگِ سخن کا تقابل مقصود ہے، تاہم چند اشعار کے حوالے سے اندازہ ہو جائے گا کہ محسن کی نعت ان کی قدرتِ شاعرانہ اور عقیدت کے امتزاج سے وجود پذیر ہوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض اوقات اُن کی نعت میں خصوصاً نعتیہ قصائد میں آرائشِ کلام کی شعوری کوشش اور تشبیہات و استعارات میں تکلف کا احساس ہوتا ہے۔ نعتیہ قصیدہ کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

گلِ خوش رنگ، رسولِ مدنی و عربی — زیبِ دامانِ ادب طرۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر — نہ کوئی اس کا مماثل، نہ مقابل نہ بدل
مہرِ توحید کی ضو، اوجِ شرف کا مہ نو — شمعِ ایجاد کی لو، بزمِ رسالت کا کنول
ہفت اقلیم ولایت میں شہ عالی جاہ — چار اطراف ہدایت میں نبیٔ مرسل

خصوصیت محسن سے ہی مخصوص نہیں، نعت گوئی کے پورے دفتر میں شعرا کے ہاں مذہبی عقیدت، لسانی طاقت اور شاعرانہ مہارت کے رنگ سے نکھرتی ہے۔ لیکن صرف لسانی طاقت اور شاعرانہ قادر الکلامی سے تعریف میں مبالغے کا رنگ پیدا کرنا تو مدح گوئی کا روائتی انداز ہے جو شعرا بادشاہوں کی مدح کے لئے بھی اختیار کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ روائتی نعت گوئی کے سلسلے میں کچھ اور شعرا کے مختصر حوالے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گے۔

جناب ظفر علی خان کی مشہور نعت کا رنگ دیکھئے۔ تاریخ کے سیاق و سباق میں جذباتی آہنگ پیدا کیا گیا ہے اور زورِ کلام کا انحصار نکتہ آفرینی پر ہے:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں — اک روز جھلکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں
جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا اور نکتہ وروں سے کھُل نہ سکا — وہ راز اک کملی والے نے سمجھا دیا چند اشاروں میں

حالی کی نعت گوئی کا اندازہ ان کی زیرِ لب فریاد کے رجحان اور دلِ دردمند کے سوز و گداز کے چھینٹے پا کر رقت انگیز ہو جاتا ہے مگر اس کا مقصدِ اصلی حرفِ عشقِ حبیبؐ نہیں، حبِّ قوم و وطن ہے، حالانکہ مسدس میں نعت کے جو بند ہیں وہ درد آفرینی اور سوز و گداز میں اپنی مثال آپ ہیں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا!
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا!

یہاں تک کہ غالب جیسے شاعر کی نعت میں بھی عقیدت کے جوش کا اظہار صرف ذہنی پرواز اور تخیل کی اڑان کا مظہر ہے، وہ بھی روائتی انداز سے آگے نہیں بڑھ پاتے اور یہ کہہ کر نعت گوئی کا بھاری جوکھم کر ہٹ جاتے ہیں:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم — کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

حفیظ جالندھری نے بھی شاہنامہ میں سرورِ کونین صلعم کو شاندار خراجِ عقیدت و احترام پیش کیا ہے بلکہ ان کے مشہور سلام کا یہ شعر مداحتِ عقیدت ایک ایسا قدم ہے جو روایت سے آگے ہے:

تراً در ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو　　تمنّا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

مگر دوسرے اشعار کا رنگ وہی روایتی مدحت سرائی کا ہے۔ حُسنِ طبیعت اور حُسنِ کلام کا امتزاج مگر شاعری اور عقیدت سے مُرتّب

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی　　سلام اے فخرِ موجودات و فخرِ نوعِ انسانی

سلام اے ظلِّ رحمانی سلام اے نورِ یزدانی　　ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی

اقبالؔ کے ہاں پہلی بار نعت و عقیدتِ رسولؐ کے مضامین کے صرف ذہن و فکر کے حلقے سے نکل کر دل کی دُنیا میں آباد ہونے کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری زندگی میں عشق کی اہمیت پر جو نقطۂ نظر رکھتی ہے وہ اس مقالے کے موضوع سے خارج ہے۔ تاہم شعرِ اقبال کا مقصد ایک قوم کی نشاۃِ ثانیہ ہے اور عشقِ رسول کا مقام اس نشاۃِ ثانیہ کی منزلِ اول ہے، مگر اقبال نے نعت کو ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت سے نہیں برتا، حالانکہ فارسی شعر اور نظمِ اُردو ہر دو جگہ اقبالؔ کے ہاں نعت کے مضامین ملتے ہیں:

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی　　جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

اے زمیں از بارگاہت ارجمند　　آسماں از بوسۂ بامت بلند

از تو بالا پایۂ ایں کائنات　　فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

اقبالؔ کے ہاں بھی نعت کے اشعار فلسفیانہ آہنگ کے حامل ہیں، جو اقبال کا مخصوص رنگ ہے، یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ خالدؔ کی نعت کے آہنگِ الفاظ اور شکوہِ بیان میں اقبال کے اشعارِ نعت کے لہجے کا پرتو ملتا ہے

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تُو　　نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بُو

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب　　گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حُباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ　　ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود　　فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے　　عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

مگر خالدؔ کی نعت گوئی جس واحد اور نمایاں خوبی سے ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ خالدؔ نے اردو شعرا کی نعت گوئی کی روایتی عقیدت کو گرمیٔ عشق اور جذبے کی تپش دیکر محبت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس نے نعت کو ذہن سے نکال کر دل کی دُنیا سے روشناس کیا ہے۔ خالدؔ کے ہاں نعت 'عقل غیاب و جستجو' کے مقام سے 'عشق حضور و اضطراب' کی منزل تک کا سفر مکمل کر لیتی ہے۔ یہی اضطرابِ عشق خالدؔ کی نعت کا امتیازی وصف ہے 'محسنؔ' کاکوروی اور دیگر شعرا کے ہاں حضور صلعم مرجعِ عقیدت ہیں مگر خالدؔ نے انہیں محبوب بنا دیا ہے، ایک ایسا محبوب جس کی محبت شاعر کی زندگی کے ہر جذبے، ہر پہلو، ہر شعبے، ہر دھڑکن اور ہر لمحے کو حاوی ہے۔ عقیدت کے محبت سے بدل جانے میں جذبات کے تکلف میں دردِ عشق کی لذت اور کسک پیدا ہو گئی ہے خالدؔ کی نعت کے اشعار اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

سرکارِ دو عالمؐ سے محبت کا یہ اظہار خالدؔ کے ہاں دو طرح سے ہوا ہے۔ اوّل اندازِ بیان میں اور دوسرے موضوعِ سخن میں۔ اندازِ بیان میں خالدؔ نے نعت کو جس لطیف و دل آویز مگر دور رس تبدیلی سے روشناس کیا ہے، وہ صرف عشق کی دین ہے۔ اس نے اب تک کے نعت گوئی

کے دفتر میں شعرا کے ہاں مستعمل "محبوب کبریا" کے لئے صیغہ واحد غائب کو صیغہ واحد متکلم سے بدل کر نعت کا رنگ ہی بدل دیا ہے۔ "وہ" میں جو ماورائیت یا "ثنویت" کا احساس ہے "تو" میں قرب اور اپنائیت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یُوں کہیے کہ اقبال کی اصطلاح میں "وہ" عقل عیاب و جستجو کی منزل تھی جسے "تو" نے "عشق حضور و اضطراب" بنا دیا ہے۔ حالی نے مسدس میں نعت کے جو چند بند دیئے ہیں اور جن کا ایک حوالہ گزر چکا ہے۔ اُن کے درد اور اثر آفرینی سے کسے انکار ہو سکتا ہے مگر ان بندوں کے اشعار بھی "وہ" کی کیفیت کے حامل ہیں۔ خالد کے ہاں فارقلیط کی تقریباً پوری کتاب اول نعت ہی کے اشعار ہیں اور سب میں طرزِ تخاطب "واحد متکلم" سے ہے۔ "وہ" انداز جو کسی حجاب، کسی آڑ اور کسی پردے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کتاب اول کا پہلا شعر ہے اور کتاب کا بھی پہلا شعر ہے

میں فرشِ زمیں ہُوں تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا بہماں تو موجِ ہوا ہے

یہیں سے خالد کی نعت کے موضوع کی جداگانہ حیثیت متعین ہوتی ہے۔ اس کے ہاں محبوب کبریا، شاعر کا بھی محبوب ہے، جس کے لئے خود خالق یہ کہے کہ اگر اس کی تخلیق نہ ہوتی تو کائنات نہ بن پاتی، وہ شاعر کی رگوں میں رواں زندگی کا خون ہے۔ اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے، اور اس کے نفس کی گرمی ہے۔ خالد صرف واحد غائب کی حیثیت سے، ایک تماشائی کی طرح اس کے اوصاف بیان کرنے کا روادار نہیں، اس لئے کہ وہ تو خود خالد کی زندگی ہے۔ سانسوں کے بہماں کو موجِ ہوا کے مطالعہ کے لئے خارج میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی باعث ہے کہ اس کی نعت کے اکثر اشعار میں محبوب اور چاہنے والے کا یہی بامعنی اور لازوال رشتہ بار بار سامنے آتا ہے۔ کس کس رنگ اور کس کس روپ میں سامنے آتا ہے، یہ سارے رنگ اور یہ سارے روپ "محبت" کے بُوقلموں جذبات کے آئینہ دار ہیں:

میں لوہا تو پارس، میں کنکر تو ہیرا
میں مٹی کی گُڑیا، تو ابرو ہوا ہے

رہوں رات دن میں ترے سنگ سیّاں!
مری روشنی ہے تو بیرا دیا ہے

تو دریا میں ماہی، تو منزل میں راہی
میں ادنیٰ کنیز اور تو بادشا ہے

خریدی ہے دل بیچ کر جان میں نے
یہ سودا مگر پھر بھی سستا پڑا ہے

اردو غزل میں تصوف کے حوالے سے مہجوریِ عشق کے اضطراب کو ظاہر کرنے کے لئے ایک شعر ہے

حضورِ وصل کی لذّت ازل سے ہے مجھ کو
خیال کیجئے کب سے امیدوار ہُوں میں

یہاں شاعر کا خطاب محبوبِ ازلی، خالقِ حیات سے ہے۔ خالد کا محبوب کون ہے، اس شعر میں دیکھیے:

محبت کا روزہ کب افطار ہو گا
جدائی کا دن چودہ سو سال کا ہے!

خالد کی نعت کا کلیدی جذبہ یہی محبت کا جذبہ ہے اور یہی وہ پہلُو ہے جس نے اُس کی نعت کو نیا آہنگ دیا ہے، سرد و سوز دیا ہے، تب و تاب دی ہے، درد و اثر دیا ہے اور یوں اسے مقام امتیاز دیا ہے۔ یہ حرفِ محبت، فارقلیط کے ورق ورق پر بکھرا پڑا ہے:

وہ بُجھتا ہے شعلوں پہ خبّابِ دلبر
ہر اک سانس میں آہِ صلِّ علیٰ ہے

اذیت میں ملتی ہے عاشق کو لذّت
یہ تقفس سے ہے، مر مر کے زندہ ہُوا ہے

محبت کی قیمت ہے اندوہ و کُلفت
جو خوش باش ہے، عاشقِ بے وفا ہے

زہے جذبۂ جوششِ سر فروشی
کہ خود کٹ کے سر دار سے جھُولتا ہے

خرامندہ مقتل کو سرمست فردہ
ترے عاشقوں کو انو ہی نشہ ہے

خالد، محبتِ رسول صلعم میں باقی نعت گویوں سے اس لئے بھی آگے ہے کہ اُس نے اپنا نقدِ حیات دیگر محبت حاصل کی ہے، وہ تو

بقول غالب 'طبعِ خریدار' کا 'عیار' دیکھ کر خود بھی 'متاعِ حیات' کے ساتھ حسنِ طلب کے ہاتھ بک گیا ہے۔ وہ 'عاشق' سے زیادہ 'مملوک' ہے جس سے محبت کرتا ہے اس کا 'غلام' بھی ہے۔ عشق تو نام ہی غیر مشروط غلامی کا ہے، ایک مشہور فارسی شعر ہے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست — می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

محبت 'میں مملوک' ہونے کی منزل 'نفیِ ذات' کی منزل ہے۔ زخود رفتگی کا مقام۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اویس قرنی "محبوب" سے سینکڑوں میل دور بیٹھ کر بھی دندانِ مبارک کے شہید ہونے کا صدمہ برداشت نہیں کر پاتے۔ خالدؔ کی نعت گوئی اُس کے قلبِ تپیدہ کی بیخودی 'ذاتِ محبوب' میں گم شدگی کی کیفیت ہے۔ 'فارقلیط' کے آخری حصے کے اشعار ہیں:

میں عالم نہ فاضل نہ مفتی نہ قاضی	سمجھتی ہے دُنیا سند یافتہ ہے!
خطابت نہ حکمت نہ صورت نہ سیرت	ادیا لطفِ نفسی مرے پاس کیا ہے؟
ہے فی کُلِّ وادٍ یہیموُن میں سے	یہ مٹی کا مادھو، جہالت زدہ ہے
یہ آلودۂ معصیت، مست طامع	مئے ماعرفنا کا کیف آشنا ہے
کہاں نعت و نامِ رسُولِ تہامی	کہاں وہ زبان جو کہ لکنت زدہ ہے
پیمبر کہے اِنّی لَسْتُ بشاعر	کہ یہ مرتبہ میرے "مملوک" کا ہے
وہ 'مملوک' جس کو میں کہتا ہوں خالدؔ	جو جاہل ہے، بے باک ہے، باولا ہے

— عاشق سے زیادہ مملوک ہونے کا یہی احساس ہے جس نے خالدؔ کے عشق کو سرگشتگی، بے باکی اور بے خودی کی کیفیت عطا کی ہے۔ اسی لذتِ بے خودی نے اُسے 'محبوب' کا ذکر بار بار کرنے اور ہر بار نئے انداز میں اس کا نام لینے کا انداز اُسے بخشا ہے، اس لئے کہ بقول شاعر ؎

نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا — بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

یہی نام تو عشق کا خلاصہ نام ہے۔ 'فارقلیط' کے صفحات اس کیفیت کے گواہ ہیں کہ اُس کا مقصود صرف وہ حلاوت آفریں بلکہ حیات آفریں نام لینا ہے جو اس کا مقصودِ حیات اور حرزِ جاں ہے۔ مگر جس بھی انداز میں اس کے دل مضطرب اور احساسِ مہجوری نے ذکرِ محبوب کیا ہے، وہ بغیر دانستہ ہے۔ صرف محاسنِ اسوۂ عظیم یا حقائقِ تواریخی و سوانحی بیان کرنا اس کا مقصود نہیں۔ محبوب کے حسنِ ہزار شیوہ کا بیان اس کے مدِنظر ہے، زیادہ صحیح الفاظ میں وہ ایسا پیاسا ہے جس نے شدتِ تشنگی سے مجبور ہو کر خود کو پانی میں ڈبو دیا ہے اور اس کی نعت کے اشعار 'تو تشنہ برلبِ جُو ماندہ' ہیں۔

— محبت کے اسی درد اور عشق کے اس بیان کی فارقلیط میں کئی منزلیں ہیں، منزلِ اول تو حُسنِ محبوب کا بیان ہے جو حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں کے حسین امتزاج سے مرتب ہوا ہے۔ حسن کی کیفیت بھرپور نہ ہو اور بقول اقبال کے اگر نگہ میں وہ شوخی نہ ہو جو ایک نگاہ میں دل کا فیصلہ کر دے تو اُسے دلبری کون کہے گا۔ خالدؔ نے محبوبِ کبریا کا جو دل کش سراپا کھینچا ہے، وہی اس کی محبت کی کیفیت و کمیت کا خاطر خواہ اظہار ہے۔ فارقلیط کی کتابِ اول کے پہلے تین اجزا سراپا کو محیط ہیں اور اپنی مثال آپ ہیں۔ حُسنِ محبوب کی مرقع نگاری میں اس کے ذہن و قلم کی جولانیاں قابلِ دید ہیں:

دمِ گفتگو مُنہ سے کرنوں کی بارش	دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے
تبسم سے تیرا جو پوچھا تو بولیں	سمجھ لو کہ مشرق سے دن چڑھ رہا ہے
ترا چہرہ مصحف کا قرطاس و رقعہ	تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے

ہے چشمِ حیا دسنگہ نجم ثاقب — رُخِ دل رُبا صبح کا کوکبہ ہے

کنارِ شفق میں لڑی موتیوں کی — گُلِ نو دمیدہ لبوں پر فدا ہے

زہے اعتدالِ بیاضی و ملاحت — تجھے دلبری کا خزینہ ملا ہے

مُحن کے اس بیان نے اور عشق کے درد مجبوری کے اس اظہار نے اول تو نعت گوئی کے روائتی انداز سے انحراف کا راستہ نکالا اور دوسرے مُحن کی توصیف اور مدح کے لئے نعت میں قصیدے کا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ خالد کی نعت گوئی میں نہ تو قصیدے کی روائتی مجبوریاں نہ روائتی ترتیب و ہیئت مگر شوکتِ الفاظ اور انتخابِ مضامین کے ساتھ ساتھ لہجے کی بلند آہنگی اور نعت کی ندرت و جدت نے، محبت کے درد کی موثر ترجمانی کم ہے۔ یہ بات بھی کم حیرت انگیز نہیں کہ خالد کے متعلق اس رائے کے باوجود کہ وہ مشکل گو ہیں اور اشعارِ نعت میں بالالتزام تلاشِ الفاظ کے احساس کے باوجود اُس کی نعت میں آورد کا تاثر بہت کم ملتا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو اقبال کی فارسی گوئی یا فارسی الفاظ تراکیب سے رغبت کے باوجود اُن کے کلام میں اثر آفرینی کی تہ میں ملتی ہے، دراصل جذبے کے خلوص اور شدتِ احساس نے تلاشِ الفاظ اور نامانوس تراکیب کو بھی دل میں ترازو ہو جانے کا اثر عطا کر دیا ہے:

تجلّی سے چہرہ ترا ارغوانی — تو خورشید روز و مہ چار دہ ہے

ٹپکتا ہے روغن تری رہگذر سے — ترا نقشِ پا، گنجِ گلشن کدہ ہے

دیا نافۂ مُشک نافِ زمیں کو — تری گردِ رہ، عنبر و توتیا ہے

حکیم و کریم و رشید و مسدّد — تو سیاحِ دشتِ وراء الوراء ہے

شہِ عرش فرسا د مفتاحِ رحمت — تو انجم مُطاف و فلک مرتبہ ہے

اس ضمن میں منحمنا کے یہ اشعار بھی آہنگِ قصیدہ اور تلاشِ الفاظ کے ساتھ ساتھ بیاں اور لہجے کی بلند آہنگی کی عمدہ مثال ہیں، مگر دل میں کھُب جانے کی کیفیت کے حامل، اور یہ کیفیت بات کے دل سے نکلنے کی دین ہے۔ یہ اشعار جوشِ اظہار، روانیٔ بیان، بے ساختگی اور وفورِ احساس کے سیلاب میں الفاظ کی نامانوس صورتوں کو بھی اپنے ساتھ بہالے جاتے ہیں:

مُطاعِ ادم و انجم، منارِ لوح و قلم — محمدؐ، اُمّی محبوبِ کبریا، اعلم

محمدؐ، انجمنِ کُن فکاں کا صدر نشیں — محمدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم

وہ عبدہٗ وہ رسولہٗ وہ اسمہٗ احمدؐ — کتاب و حکم و نبوت کا خاتم و خاتم

حمود و حامد و احمدؐ، محمدؐ و محمود — کریم و مبیرِ کرام و مکرم و اکرم

'فارقلیط' کے ہی مطالعہ کے دوران خالد کے قلبِ تپیدہ کی ایک اور جھلک بھی اس رائے کی تصدیق کرتی ہے کہ خالد نے نعت کو فن سے زیادہ عشق اور مدحتِ پیمبرؐ کو عقیدت سے زیادہ 'محبت' کا رنگ دیا ہے۔ 'فارقلیط' کی کتاب اول میں ہی شعر ۱۶۰ سے شعر ۲۲۵ تک کے ۶۵ اشعار میں خالد نے محبتِ رسولؐ کا اظہار ہندی شاعری کے روائتی اندازِ شعر، استعاروں، کنایوں اور تلمیحات کے حوالے سے کیا ہے، نعت گوئی کا یہ رنگ خالد کا اپنا ہی رنگ ہے، ممکن ہے نعتِ رسول سے عموماً اور ذاتِ مقدس و اقدسِ رسولؐ سے خصوصاً جو جذباتِ ادب و احترام وابستہ ہیں، ان کی روشنی میں نعت کے اس حصّے کے بعض اشعار کو پڑھتے ہوئے ذرا سا دھچکا لگے مگر جہاں محبت کا قدم درمیاں ہو اور جہاں محبوب ربّ المشرقین والمغربین کو شاعر اپنا محبوب بلکہ ماہی کہکر خطاب کرے وہاں حجاباتِ من و تو ایسے اُٹھ جاتے ہیں کہ بعض اوقات سوئے ادب بھی عین تقاضائے ادب بن جاتا ہے۔ کتنے ہی منصور حلّاج عشق کی اس منزل کی علامت ہیں۔ جہاں ذاتِ محبوب میں گم ہو کر ہی

ذات کی منزل آجاتی ہے اور عشق تعینات سے ماورا چلا جاتا ہے خالدؔ نے نعت کے ضمن میں ان اشعار میں دل کی جس تڑپ اور عشق کی لیس بے چینی کا اظہار کیا ہے اور خطاب دندا کی جو صورتیں وضع کی ہیں وہ اہلِ دل سے انصاف طلب ہیں۔ جہاں صورت حال یہ ہو کہ ؎

تو ماہی ہے اے کملی والے کہ ماحی — دلِ خالدؔ آموختہ بھولتا ہے

جہاں عشق کی تڑپ اور مجبوری کا اضطراب آموختہ ادب بھلا دے۔ یا تعینات و تعلقاتِ دُنیا کی منزل سے آگے لے جائے وہیں اس طرح کی شاعری وجود پذیر ہوتی ہے۔ یہی عشق کا وہ مقام ہے اور جذب و جنوں کی وہ منزل ہے جہاں عشق بے اختیار ہو کر کہتا ہے۔

ع نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

خالدؔ کی نعت کا یہ رنگ بھی دیکھئے:

کہوں کس سے دُکھ دیر ہے۔ چین ویری	تمہارے محبت میں دل ہر گیا ہے
میں شبدوں کی پیاسی، میں چرنوں کی داسی	تری جستجو مجھ کو صبح دما ہے
نشیلے کنول نین کجرارے تیرے	چھپا کر نظر، دل تجھے دیکھتا ہے
میں جوگن، برہ گن میں کملی کمینی	تو سرتاج میرا، مرا دیوتا ہے
میں تسدن پریتم کے درشن کو ترسوں	مری ہر سحر شام گاہِ عزا ہے

جہاں عشق اظہار کی اتنی بھرپور قوت کے باوجود اور بیان کی اس ہمہ گیر شدت کے باوصف یہ کہہ اُٹھے ؎

سراپا ستودہ، سراپا محمدؐ — کسے اس کی توصیف کا حوصلہ ہے

جہاں نطق کو اپنی تمام تر جالاکی و مشاقی کے باوجود احساس عجز ہو جائے، وہی مقام، مقامِ عشقِ محمدؐ ہے۔ اور خالدؔ نعت گوئی کے ضمن میں عشق کے اُسی مقام پر فائز ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں دل میں موجزن درد کی لہریں، اظہار کی وسعتِ استعداد سے باہر ہو جاتی ہیں، اسلئے کہ عشق کی آگ کی جلن صرف سمجھی جاسکتی ہے، سمجھائی نہیں جاسکتی۔

اور یہی سینے میں بھڑکنے والی مجبوریٔ عشق کی آگ خالدؔ کی نعت کو سمجھنے کی کلید ہے۔ اس لئے کہ خود خالدؔ کے الفاظ ہیں۔

؎ سلگتی ہے دل میں برہ کی جوالا
ترے بن یہ جیون، اگن ہے اپنا ہے

—o—

آصف ثاقب

خالد کی رباعی گوئی

عبدالعزیز خالد اردو شاعری کا تیشہ گر بھی ہے اور کیمیا گر بھی۔ تیشہ گر یوں کہ اس نے الفاظ و معانی کے جواہر ریزوں میں تصورات کے ایسے عکس دکھائے ہیں کہ مکمل شبیہ کے حصول کے لئے لمحہ در لمحہ کڑیاں ملانی پڑتی ہیں۔ کیمیا گر یوں کہ اس نے عقل و عشق کے باہمی "کیمیائی" عمل سے خیالات و جذبات کے ایسے "مرکب" پیدا کئے ہیں کہ ان کے مطالب کو گرفت میں لینے کی خاطر ماضی، حال اور مستقبل کے دریچوں میں جھانکنا پڑتا ہے۔ مانا، اس کے مافی الضمیر تک رسائی دشوار، تراکیب و الفاظ سے آشنائی ہفت خواں مگر اس کی شعری کیفیات سے انکار ممکن نہیں۔ ایک زمانے میں اقبال کی منظومات میں شعریت سے انکار پر کئی نقادوں نے اپنی تنقید کی بنیادیں کھڑی کی تھیں، اب ایک دو کو چھوڑ کر سبھی اقبال کی شعری اقدار کے رطب اللسان نظر آتے۔ عبدالعزیز خالد کو بھی اسی قسم کے نقادوں سے واسطہ پڑا ہے ایک روز یہ شور و شغب بھی ختم ہوگا اور خالد کی شاعری میں نزاکتِ احساس کی لہروں کا اثبات تنقید میں رتبۂ اعتراف ہوگا۔ اندازِ تکلم، تنوعِ خیالات، انفرادیت ادا اور ندرتِ اظہار ہی تو وہ ابعاد ہیں جن پر شاعری کی فضیلت و معیار کے ستون بلند ہوتے ہیں، خالد کے ہاں ان خوبصورتیوں کی کمی نہیں، ریل پیل ہے۔ جانے، آئندہ نسلیں اردو شاعری کی تاریخ میں "مقامِ خالد" سے متعلق کیا حکم لگائیں۔ آج اس امر کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ خالد تمام اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی واحد آواز ہے۔ سودا، نظیر، انیس، غالب، محسن کاکوروی، اقبال جوش، مصطفےٰ زیدی اور جعفر طاہر سے مناسبتیں رکھتے ہوئے بھی خالد ان سے الگ ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ خالد کی شاعری کی آب و ہوا رنگ و فضا، طرز و ادا بالکل مختلف ہے۔ اس کی شعریت واضح اور منفرد رجحان کی آئینہ دار ہے۔ خلاصہ یہ کہ خالد اپنی ذات میں ایک بھرپور دبستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذرا سنیئے تو یہ لب و لہجہ، فکر و خیال، بحر کی لے سے برتاؤ اور کہاں! ؎

زمیں گویا عروسِ آسماں ہے ۔۔۔ ذرا آپس میں ان کی گفتگو سن

خالد نے اینٹ کہیں روڑہ کہیں سے لے کر کنبہ جوڑنے کی نہیں کی۔ بلکہ اس نے شاعری کو ایک خوشگوار وحدتِ مقصدیت سے مزین کیا ہے۔ ایسی مقصدیت، جس میں فکر و عمل کی رغبت دلائی گئی ہو۔ اعلیٰ و ارفع اقدار کے تذکروں سے شخصیت کو سنوارنے نکھارنے کی ترغیب ہو۔ یہ سب کچھ ہوتے سوتے بھی صرف ایک کسر باقی ہے، ایک لمحہ سے سر سے گزرتا رہتا ہے۔ وہ ہے ازخود رفتگی۔ جس سے خالد دوچار ہونے کو ہے۔ یہی وہ لہر ہے جو سر سے گزری تو میر، میر بنا، غالب غالب، اقبال اقبال (آج کے دور میں احمد ندیم قاسمی کے سر سے بھی یہ طوفانِ رنگ و بو گزر چکنے کو ہے) غرض خالد تک پہنچنے میں اگر کوئی مشکل ہے تو وہ ہے اس کا بارعب تبحرِ علمی۔ جو اشعار میں پوری وجاہت کے ساتھ منعکس ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں شاعر کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ یہ اصل میں اس کی افتادِ طبع کی جولانی ہے۔ فن کی ایسی جہات کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے استعداد پیدا کرنا پڑتا ہے۔ کسی جواہر ریزے کو حرزِ جاں بنانے کے سلسلے میں کاوش کے دردِ سر سے گزرنا بری بات نہیں۔ خالد کی مشکل گوئی کا ذکر چھڑا تو یہاں یہ کہنا بعید از مضمون نہ ہوگا کہ شاعری میں ابلاغ کے جس رجحان کی داغ بیل خالد نے ڈالی ہے افسانے میں قرۃ العین حیدر اس کی نمائندہ ہے۔ یعنی خالد شاعری کا قرۃ العین حیدر ہے یا پھر قرۃ العین حیدر افسانے کی عبدالعزیز خالد ہے۔ دونوں کے سفرِ اظہار میں اتنے نشیب و فراز

میں دونوں کی رفتار میں اتنی لپک جھپک ہے کہ قاری بیچارہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے اور ہم کابی کے شرف سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ دونوں کے ہاں تبحر علمی کے علاوہ ایک اور یکسانی ہے، ڈرامائی تاثر!

خالد نے شاعری کو اور قرۃ العین حیدر نے افسانے کو اس دل خوش کن تاثر سے روشناس کرایا ہے۔ یہی وہ تاثر ہے جس کے بل بوتے پر دوسری بڑی زبانوں کے ادب دنیا بھر کے ادب پرستوں کے ذوق کی آبیاری کرتے ہیں خیر یہ تو تھا جملہ معترضہ، عبدالعزیز خالد علمی اور لسانی استعداد کی بدولت گوناگوں و بوقلموں موضوعات کے کمال پر قادر ہے۔ اتساع طبع اور وسیع النظری کے وسیلے سے ان کو ایسے اظہارات بخشتا ہے کہ حسنِ ابلاغ "انگشت بدنداں" ہے۔ علمیت نے چونکہ اس کے ہاں موضوعات و مضامین کے انبار لگا دیئے ہیں، چنانچہ ان کو شعریت کے قالب میں ڈھالنے میں اس نے نت نئے تجربے کئے ہیں۔ بدیں وجہ اس کی شاعری میں تخلیقات کی ایک سے ایک نئی ہیئت ملتی ہے۔ جہاں اس نے کبھی منظومات اور کبھی غزلیات کو گفتگو کا بہانہ بنایا ہے وہاں اس نے مظاہر رمزیت و ایمائیت رباعی کو بھی وسیلۂ فن کے طور پر برتا ہے۔ رباعی کی بحریں بحرِ ہزج سے فرع ہیں۔ ہزج، نغمگی کو کہتے ہیں۔ رباعی کی بحر یا نغمگی اور حسنِ لے کے اعتبار سے اظہار کی جلترنگ تو ہیں مگر ان میں فلسفیانہ مضامین کو شعریت کا لبادہ دے کر سمیٹنا بھی عظمتِ فن ہے۔ یہ عظمتِ فن خالد کا طرۂ امتیاز ہے۔ خالد نے بھی فن رباعی گوئی میں اپنی قادر الکلامی کے کمالات دکھائے ہیں۔ اس نے رباعیات میں سیاست، انسانیت، اخلاق، مذہب، محبت، اور تہذیب کے معیارات کے "نظم طلب" مضامین کمال چابکدستی سے سمیٹے ہیں۔ رباعی کا کینوس اگرچہ ایسے مضامین کے لئے بقول کسے موزوں ہے مگر اس میں ان مضمونوں کی وسعت کو اس طرح سمیٹنا کہ اس صنفِ سخن کی تنگ دامانی کا احساس تک نہ ہو، کسی کسی کا حصہ ہے دیکھئے تو خالد اس میدان میں کتنا کامیاب ہے۔ اس نے رباعیات میں محسوسات و افکار کے کیا کیا کارخانے دکھائے ہیں۔ مثلاً قدرے آسان رباعیات کا انتخاب کیا ہے۔

زہراب کو انگبیں بنا لیتا ہے
الحاد کو جز و دیں بنا لیتا ہے
ہے انفس و آفاق میں جو شے بھی اُسے
شاعر ملکِ یمیں بنا لیتا ہے

(مضمون کی اس اپچ کے لحاظ سے خالد اقبال سے آگے نظر آتا ہے)

٭

ارباب بصائر سے یہ پوشیدہ نہیں
میراث ہے بندگانِ صالح کی زمیں
جو خادم انساں ہے اسی کو ہے بقا
چاہے کلمہ گو ہو وہ چاہے لا دیں

٭

ملتے ہیں اگر لوگ تو مطلب کے لئے
گر جان چھڑکتے ہیں تو منصب کیلئے
اب ہم بھی نہ کھائیں گے حسینوں کے فریب
پانی بھرے کون چاہِ غبغب کیلئے

٭

ہے درد ہی سرچشمۂ احساس و خیال
بے درد کو حاصل نہ ہو عرفانِ جمال!
فیضان کی جاری رہے بارش جب تک
دل درد کی دولت سے ہے مالا مال

٭

دیں اہلِ وطن کو درسِ حب الوطنی
در پردہ وطن کی جو کریں بیخ کنی
اخوانِ صفا کے معتسب اہلِ ریا
یہ پستی بہ بلندی امنشا و غنی

بے علم کی دولت ہے تجارت مطلوب لکھتے ہیں کتاب کی بجائے مکتوب
قرآن کو بیچتے ہیں اہلِ قرآں کرتے ہیں مسیحا کو مسیحی مصلوب

٭

خالد لب گویا ہے نہ گوشِ شنوا بے نور ہوتی روشنیٔ شہرِ نوا
انبوہِ خلائق میں ہے گم سم شاعر دل خستہ جگر سوختہ تنہا تنہا

٭

جینے کی اگر ہوس ہے تو مرنا سیکھ گر جینے کا شوق ہے تو مرنا سیکھ
زندانِ کدورت نہ بنا سینے کو تقصیر سے اغماضِ نظر کرنا سیکھ

٭

ہم رشتِ قلم کو بانگِ نے کہتے ہیں خوں نابۂ دل کو موجِ مے کہتے ہیں
لاشے کو مجسم و مصور کر کے ہم صورت گر نہیں کو ہے کہتے ہیں

دیکھا! خالد کی مقصدیت کس نوع سے جاری و ساری ہے۔ یہ تو رہا نفسِ مضمون کے رخ سے خالد کی رباعی گوئی کی ہمہ رنگی کا جائزہ۔ اب آیئے عروض کی روشنی میں اس صنف میں اس کی موزونیت فن کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل صنفِ سخن ہے۔ اردو میں چوبیس بحریں مروج ہیں۔ اس کی بحروں کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام مثمن الارکان ہوتی ہیں۔ اردو میں بارہ شجرہ اخرب سے صدر و ابتدا کا رکن مفعول بارہ شجرہ اخرم ہے، صدر و ابتدا کا رکن مفعولن مستعمل ہیں۔ دونوں جگہ عروض و ضرب میں ارکان فع، فاع، فعل، فعول آتے ہیں۔ حشو کے ارکان مختلف النوع ہیں۔ مثلاً مفعول، مفعولن، مفاعلن، فاعلن، مفاعیلن، فعاعیل میں سے کوئی دو۔ مگر اس انتخاب میں ہر بحر میں ارکان کی ترتیب کا معین اصول پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ یوں کہ پہلے رکن کے آخر میں اگر وتد ہے تو دوسرے رکن کے شروع میں بھی وتد ہی ہوگا اگر سبب ہے تو دوسرے رکن کے آغاز میں سبب کا عمل ہوگا۔ چونکہ یہ اصول رباعی کی تمام بحروں کا خاص وصف ہے اس لئے تمام بحریں باہمی طور پر موزونیت کی حامل ہیں۔ یعنی اگر چاروں مصرعے رباعی کی الگ الگ بحروں میں ہوں تو جب بھی آپس میں موزوں ہونگے۔ ایک رباعی میں کم از کم دو بحروں کا اجتماع مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس التزام کو معراجِ فن گردانا جاتا ہے۔ خالد اس فن سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کے باوصف اس نے اس التزام کو بہ دل و جان ملحوظ رکھا ہے۔ جب خالد کی علمیت کے چرچے ہوں تو مختلف علوم کے ذیل میں علم عروض کا ذکر بھی یقیناً آئے گا۔ عربی فارسی اور اردو شاعری کو موزوں صوت و صدا فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تاثر اور تاثیر پیدا کرنے میں اس فن کا بڑا ہاتھ ہے۔ خالد کی چند رباعیات اس نہج میں دیکھئے۔ پس منظر میں رباعی کے فن کے لوازم ہوں۔ مصرعوں کے سامنے ان کی بحروں کے ارکان بھی لکھتے ہیں۔

ہم رشتِ قلم کو بانگِ نے کہتے ہیں مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع
خوں نابۂ دل کو موجِ مے کہتے ہیں مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع

لاشے کو مجسم و مصور کر کے مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع
ہم صورت گر "نہیں" کو ہے کہتے ہیں مفعولن، فاعلن، مفاعیلن، فع

پہلے تین مصرعے شجرۂ اخرب کی ایک بحر میں ہیں اور آخری شجرۂ اخرم کی بحر میں ہے۔ دو بحروں کا التزام موجود ہے۔

آذر سے بجا ہیم ہے محو ستیز　　مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعول
فرہاد کو ناکام بناتے پرویز　　مفعول، مفاعیل، مفاعیلن، فاع
ہر دور کا ہے سامری و گوسالہ　　مفعول، مفاعیل، مفاعیلن، فع
ہر دور میں ہے فتنۂ کجدار و مریز　　مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعول

اخرب کی تین بحریں جمع ہیں۔ درمیان کی بحروں کے عروض و ضرب کے ارکان میں فرق ہے۔ (اس قسم کا فرق رباعی کی بحروں سے باہر بھی پایا جاتا ہے)

مامور من اللہ بنے پھر آمر　　مفعول، مفاعیل، مفاعیلن، فع
ادراک مقامات بشر سے قاصر　　مفعول، مفاعیل، مفاعیلن، فع
افکار و خیالات کا گھونٹے وہ گلا　　مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعل
سچ کا کرے قتل عام مثل نادر　　مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع

تین بحریں۔ تیسرے مصرعے میں فن کی پرکاری ہے جس کا ورود شعوری بھی ہوتا ہے اور لاشعوری بھی۔ "گھونٹے وہ گلا" میں "گھونٹے" کی "ے" کو اگر حرکت خفیف بنا کر دبا دیا جائے تو بھی "وہ" پورا ادا ہو گا۔ اس صورت میں "مفاعیل" کی بجا "مفاعلن" نکلتا ہے اور بحر بدل جاتی ہے۔ یعنی مفعول، مفاعیل، مفاعلن، فعل ــــ ایک مصرعے میں دو بحروں کا علاقہ پیدا کرنا پرکاری ہے خالد کے یہاں یہ پرکاری دیکھنے میں آتی ہے۔

ارباب بصائر سے یہ پوشیدہ نہیں　　مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعل
میراث ہے بندگانِ صالح کی زمیں　　مفعول، مفاعلن، مفاعیل، فعل
جو خادم انساں ہے اسی کو ہے بقا　　مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعل
چاہے کلمہ گو ہو وہ چاہے لا دیں　　مفعول، مفاعیل، مفاعیلن، فع

بظاہر تین بحریں ہیں مگر دوسرے شعر کے مصرعوں میں حرکتوں کے اتار چڑھاؤ میں کمی بیشی سے ان پہ اور بحروں کا اطلاق بھی ممکن ہے مثلاً پہلے مصرعے کی اخرب شجرے کی بحر کی بجا اخرم کی بحر سے بھی تطبیق ہو سکتی ہے۔ وہ بحر ہے مفعولن، فاعلن، مفاعیل، فعل۔ رباعی کی بحروں کے ارکان کے درمیان ایک مخصوص عمل "تسکین اوسط" بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جب دو متصل رکنوں کے تین حرف ایک ساتھ متحرک ہوں تو درمیان والے کو ساکن کر دیا جاتا ہے۔ یہاں یہی عمل ہوا ہے۔ مفعول، مفاعیل میں ل ہم اف متحرک ہیں، م کو ساکن کر دیا گیا اور اسے پہلے رکن کے آخر میں لگا دیا گیا پھر بنا مفعولم، فاعلن۔ مفعولم کو مفعولن سے بدل لیا۔ اس طرح شجرہ اخرب کی بحر اخرم میں منتقل ہو گئی۔ اس صورت میں "انساں" کا الف صرف زبر کی حرکت میں ڈھل گیا ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی دو بحروں میں وقوع پذیر ہے لیکن یہ تسکین اوسط کے رشتے سے نہیں بلکہ حرکات کی نوعیت بدل جانے سے ہے۔ دوسرے رکن مفاعیل کی جگہ مفاعلن کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ مگر اس حالت میں اگر گو، میں "گو" کی "و" دب کی حرف پیش کی حرکت دے گی۔ بنا بریں بحر بھی بدل جائے گی۔ تقطیع سے احتراز کیا ہے بصورت دیگر صحبت طویل کا کون متحمل ہو گا۔

ابداع معانی ہے نہ حسنِ اسلوب　　مفعول، مفاعیل، مفاعیلن، فاع
کرلی ہوس زر نے فطانت مسلوب　　مفعول، مفاعیل، مفاعیلن، فاع
آزادیٔ افکار کا خورشید ہوا　　مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعل

مغرب سے طلوع ہو کے مشرق میں غروب — مفعول، مفاعلن، مفاعیل، فعول

تین بحروں کا اجتماع ہوا ہے۔ پہلے مصرع میں ایک ساتھ دو بحروں کا امکان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ دوسرا رکن فعاعلن بھی ہوسکتا ہے مگر اس کے لئے "معانی" کی "ی" زیر کی حرکت بن کر معرضِ تخفیف میں آ سکے گی۔

المختصر عبدالعزیز خالد نہ صرف عالم بلکہ فنکار بھی ہے۔ وہ علمیت کو شعریت کی تابانیاں دے کر "حیرانیوں" کے سامان مہیا کرتا ہے۔ شاعری کو جو مخصوص مزاج اقبال نے دیا تھا اسے اپنی طبیعت اور فطرت کے مطابق الگ انداز میں چمکانے میں خالد کا اسم ہے۔ اس مزاج کا خاصہ عشقِ رسول، عظمتِ اسلام اور رفعتِ انسان ہیں۔ خالد شعری رویے میں اقبال سے مختلف ہے۔ اسی لئے اس کی تخلیقات کا ہیئت منفرد ہے اور اشعار کی قطع الگ ہے۔ یہ وضع قطع رباعیات میں بھی نمایاں ہے۔ مگر جہاں فن کی عظمتوں کا ہجوم ہو وہاں اکا دکا محلِ نظر معاملات میں بھی مل جاتے ہیں اور قادر الکلام رباعی گو شاعروں کی طرح خالد بھی کہیں کہیں بحروں کے قرینوں اور اصولوں سے عدمِ مطابقت کر گیا ہے۔ ڈھونڈنے سے مثالیں مل جائیں گی۔ اس کی مشہور رباعی ہے۔

شاعر طبعاً دروں نگہ ہوتا ہے	مفعولن، فاعلن، مفاعیلن، فع
از سر تا پا قلب و نظر ہوتا ہے	؟ ؟ ؟
رہتا ہے وہ اپنے آپ میں گم لیکن	مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع
اخبارِ جہاں سے باخبر ہوتا ہے	مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع

مضمون اور لب و لہجے کے اعتبار سے یہ رباعی بہت بلند ہے مگر دوسرا مصرعہ بحر سے عاری ہے۔ اخرب کی کسی بحر میں تو یہ مصرع چلتا ہی نہیں۔ اخرم میں "از سر تا" مفعولن کے وزن میں ہے، قلب کا لام متحرک نہیں۔ اس فاعلن کا مقام نہیں نکلتا۔ ہاں اگر "لام" متحرک ہو تو پھر فاعلن وارد ہو سکتا ہے اور بحر کی صورت نکل آتی ہے۔ اور بھی مثالیں موجود ہیں اسی قبیل سے۔ عین ممکن ہے کوئی عروضی ایسے مصرعوں کی قابلِ قبول توجیہہ کر سکے۔ مگر اس کے ظاہری اسباب دکھائی نہیں دیتے۔ اتنی بہت مثالیں تو اور رباعی گو شعراء کے پاس بھی مل سکتی ہیں۔

آخر پر یہ کہنا ہے کہ خالد نے چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر رباعی گوئی کا حق ادا کیا ہے۔ اس نے اگر اسی شد و مد سے اس فن کی طرف توجہ دی تو ممکن ہے رباعی پھر در خورِ اعتنا سمجھی جائے اور جدید شعراء بھی اسے "وسیلۂ ظفر" سمجھیں۔ امکانات روشن ہیں کہ عبدالعزیز خالد کی مقبولیت روز افزوں ترقی کرے گی۔ یہ خود ساختہ مفروضوں، سوالوں اور اعتراضوں کا شکار نہیں ہو سکی۔ کیونکہ اسے سفارشات کی بیساکھیوں کی مدد سے چل کر چلنے کی حاجت نہیں۔

اس مصرع کا وزن	مفعولن مفعول مفاعیلن فع ہے
صدر و ابتدا اخرب	حشو اول مکفوف مجبوب — حشو دوم مکفوف
عروض و ضرب	مجبوب - مجبوب

جامی ؎ گاہے بخشد لعلِ تو مرہم ما را
؎ بوسہ جو گیسو کا وہ جانی مانگے

— ادارہ

دنیا کے تمام علوم و فنون میں شاعری سے زیادہ ہمہ گیر اور ہمہ رس نہ کوئی علم ہے نہ فن۔ یہ زندگی اور کائنات کے تمام مظاہر و محاسن کا احاطہ کرتی ہے۔ فنون سے قطع نظر دنیا کے تمام علوم اپنے اپنے وسیع دوائر میں محدود ہیں، لیکن شاعری محیطِ کل ہے اور انفس و آفاق کی تمام وسعتوں کو اپنے اندر جذب کر چکی ہے۔ شاعری کی وسعتوں کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب شاعر اسے کسی فرد کی تعریف کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے، تو اس طرح آغاز کرتا ہے ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام　　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

کبھی کبھی وہ برگزیدہ شخصیت کی ستائش کے لئے اس قسم کی تمہید پسند کرتا ہے۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم　　　دُرد یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق　　　بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

"بیکسی ہائے تمنا" اور "بیدلی ہائے تماشا" کا شکوہ سنج، لافِ دانش اور نفعِ عبادت پر تبصرہ کرنے کے بعد اپنے ممدوح سے اس طرح عرضِ مدعا کرتا ہے ؎

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد　　　کہ بجز تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شاعری کی وسعتوں اور پہنائیوں کا اندازہ لگانا تساہل پسند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں شعر و ادب کا مذاق رکھنے والوں کو ادب نواز کہا جاتا ہے۔ یقین کیجئے کہ شعر و ادب کی اس سے زیادہ تذلیل تصوّر میں بھی نہیں آسکتی۔ دنیا کے مہذّب ملکوں میں ایسے اشخاص جنہیں شعر و ادب سے تعلق نہ ہو، غیر مہذّب اور غیر متمدّن سمجھے جاتے ہیں، گویا لوگ اپنے کو غیر مہذب لوگوں سے متمائز و ممتاز کرنے کے لئے شعر و ادب سے تعلق پیدا کرتے ہیں، لیکن ہمارے یہاں شعر و ادب سے اس قسم کا لگاؤ یا علاقہ پیدا کرنے والوں کو شعر و ادب کا پروردگار نیز شاعر اور ادیبوں کا ماوٰی و ملجا قرار دیا جاتا ہے ؏

تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو

جناب عبدالعزیز خالد کے شعری کمالات پر تبصرے کے سلسلہ میں اس طویل تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی شاعری بجائے خود بلحاظِ اعتبارِ مواد و موضوعات دنیا کے ماضی و حال نیز (میرے نزدیک) مستقبل کو بھی اپنے جلو میں لئے ہوئے نظر آتی ہے۔ شاعری کو صرف روایتی تغزل تک محدود رکھنے اور سمجھنے والے، جن کے نزدیک شاعری مقتل، کوچۂ قاتل، رقیب و آغوشِ رقیب، ساقی، جلوہ، کلیم و طور، قطرہ و دریا، ذرّہ و صحرا، زلف، گیسو، گیسوئے پیچاں، زلفِ چلیپا، شبِ وصل، شبِ فراق، یگانہ و بیگانہ، جنون و خرد، دشت پیمائی، طوفان، کشتی، ساحل، بہار و خزاں، بلبل و صیاد، خار و گل کے تذکروں تک محدود ہے، وہ جب بزمِ شاعری میں آفاقِ قدیم و جدید کے بہت سے حوادث، سوانح، صدہا تاریخی اور ما فوق التاریخ شخصیتوں کا جلوہ بے محابا دیکھیں گے، تو کیا سوچیں گے، کیا سمجھیں گے اور کیا کہیں گے،

اب سوال یہ ہے کہ اگر لوگوں کے سوچنے سمجھنے اور کہنے کے خطرات کو سامنے رکھا جائے تو دنیا کی ترقی رک جائے گی، اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر سرزنشِ خلق اور فسادِ خلق کے ہنگاموں کو سامنے رکھا جاتا، تو آج دنیا میں نہ فلسفہ ہوتا، نہ سائنس، نیز تعمیرِ حیات و کائنات کی تمام انسانی صلاحیتیں مفلوج و منجمد ہو کر رہ جاتیں۔

خالد کی شاعری ایک ایسے مصوّر کا نگار خانہ ہے، جس نے تمام دنیا کو دیکھا، پرکھا اور سمجھا ہے اور اس کے بعد تمام الوانِ معلومہ اور ان کے امتزاج سے جس منظر کو چاہا پیکرِ تصویر میں ڈھال دیا ہے۔ یہ نگار خانہ اُس دیہاتی "چترکار" کے نگار خانے سے یقیناً مختلف ہونا چاہیئے، جس کے یہاں پنگھٹ، چوپال اور چوپاؤں کی تصاویر کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

دراصل خالد کی شاعری کو سمجھنے سے پہلے اُن کی افتادِ مزاج اور وسعتِ علم کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کے یہاں جمالیاتی اور کائناتی فکر کا ایک نظام موجود ہے، جس کے مدارج بھی واضح ہیں، ان کے ذوق و فکر کی بلندی انہیں تنگنائے غزل میں بھی اندازِ گل افشانیٔ گفتار دکھانے پر قادر بنا دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے بیان کے لئے وسعتیں بھی موجود ہیں۔ بڑے شاعر کی فکر فرسودہ اور پامال موضوعات میں بھی ندرت یا ندرت کے پہلو پیدا کر لیتی ہے۔ عشق اور متعلقاتِ عشق کے بارے میں کس شاعر نے خامہ فرسائی نہیں کی، لیکن میرؔ کی تفلسف پسندی نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ؎

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ — مذہبِ عشق اختیار کیا!

خالد نے بھی تخلیقِ کائنات اور جلال و جمال کے تمام مظاہر کے متعلق یہی اندازِ فکر و نظر اختیار کیا، اور انہوں نے عہدِ عتیق کی شخصیتوں اور اصنامیاتِ عالم کے کرداروں پر شاعرانہ اور حکیمانہ انداز میں نظر ڈالی، اور اس سلسلے میں اُن کا یہی مسلک واضح اور نمایاں نظر آتا ہے، اور جگرؔ کے اس نظریۂ حسن کے قائل نظر آتے ہیں ؎

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے — اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

ان کے ہاں حسن و عشق محبتِ قدیم و جدید سے بے نیاز ہیں، وہ سیفو اور دلائیلہ کا بھی ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ بُعدِ زمانی کا احساس تک نہیں ہوتا، اور وہ ایک پُراسرار ماضیٔ بعید کے بجائے حال کی ہستیاں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ خالد کی تمثیلی تمثیلات اور طویل نظموں سے قطع نظر پہلے ہمیں اُن کے تغزل و تفلسف کا جائزہ لینا چاہیئے، ان کی غزل بقولِ خود ایک عالم پیش کرتی ہے ؎

مقصدیت بغیرِ مقصد کے — فن کے پردے میں ایک عالم ہے

جذبات کے اتار چڑھاؤ بھی دیکھئے:

دیکھ جذبات کا اُتار چڑھاؤ — ہونٹ خنداں ہیں آنکھ پُرنم ہے
حسن کھلتا ہے سوگواری میں — کتنا دلکش لباسِ ماتم ہے

عرفیؔ نے ذاتی محاسبے یا محاسبۂ ذات کے لئے ایک نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے ؎

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا — یکدم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

اسی مضمون کو خالد نے کس سادگی سے پیش کیا ہے ؎

لے عدو بن کے جائزہ اپنا — طبعِ دشمن عیار محکم ہے!

خالد کے یہاں توارد خیال و افکار کی مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن وہ ان افکار کو اپنی غزلوں اور نظموں میں نہایت احسن طریقے سے پیش کر دیتے ہیں، مثال کے طور پر ایک ہندی کا گیت ملاحظہ ہو ؎

اچھے سے ہوئے بڑو اور بڑے بھلے سے ہوئے — دیپک سے کاجل پڑے اور کنول کیچ سے ہوئے

خالدؔ نے اسی مضمون کو اس طرح باندھا ہے ؎

دیپک سے کاجل ہوتا ہے پیدا — دیکھو کنول کی کیچڑ سے ملت

اس غزل کا ایک اچھا شعر ملاحظہ ہو ؎

سعی و عمل ہے رُوحِ توکل — بے چارگی ہے ضدِ قناعت!

تاہم ضد کو مشدّد دیکھ کر اور "سعی و عمل" کو واحد پڑھ کر کوفت ہوتی ہے ؎

چپ چاپ آؤ اک دن اچانک — دیکھا جو چاہو عاشق کی حالت

"دیکھا جو چاہو" متروک اور مستحسن الترک ہے، خالدؔ ایسے شاعر کو متروک زبان اختیار نہ کرنی چاہیئے، اسی طرح یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

عذّال میں ہے کنکاش دنجوا — کرتے ہیں مسکوٹ اہلِ سیاست

اس قسم کے اشعار کی "کلکِ موج" میں بھرمار ہے، جن کی شرح خود خالدؔ صاحب بھی لکھنے بیٹھ جائیں تو شاید کبھی تکمیل پذیر نہ ہو سکے۔ یہ صورتِ حال محض پرگوئی اور تمام معلوم شدہ الفاظ کے استعمال کو ضروری قرار دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ خود کو نہ تو غزل کے اسلوب و ہیئت کا پابند بنانا چاہتے ہیں اور نہ موضوعات کا۔ وہ شاعروں کی اس روایتی محبوبہ کے قائل نہیں ہیں، جو صرف گلنار، گل عذار وغیرہ ہوتی ہے، بلکہ انہیں سانولی رنگت بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے ؎

سلونا پن ملیحانِ عرب کا — وہی سونلائی سونلائی سی رنگت

خالدؔ کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عشق ہے۔ جب ان کا یہ تعشق پیرہنِ شعر قبول کر لیتا ہے، تو ان کی نعتیہ شاعری مؤثر اپنی بلندی، گہرائی، دلپذیری اور وسعت و بلاغت کے اعتبار سے اقبالؔ کی نعتیہ شاعری سے قریب نظر آتی ہے۔ اقبالؔ کی طرح خالدؔ بھی عام نعت گو شاعر نہیں ہیں "کلکِ موج" سے ایک طویل نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ تعبیرِ خوابِ خداوندِ خالق — وہ نقشِ ہیولائے ارض و سما ہے
اُٹھے جاتے ہیں پردے ایک ایک کے — یہ طوبیٰ ہے وہ سدرۃ المنتہیٰ ہے
طفیلی ہیں تیرے یہ آفاق و انفس — انہیں تیری خاطر ہی پیدا کیا ہے
ترا حسن آئینۂ اسمِ اعظم — تو اخبارِ کونین کا مبتدا ہے
کوئی ملّتِ کفر سے جا کے کہدے — کبھی اس سے شعلۂ گُل بُجھا ہے
یہ لبیک لبیک کی صوتِ دلکش — نشیدِ رُما ہے کہ بانگِ درا ہے

خالدؔ اور اقبالؔ کا موازنہ اگرچہ بعض لوگوں کو پسند نہ آئے گا، اور اس میں شک نہیں کہ خالدؔ کے یہاں اقبالؔ کے اس ایقان و قطعیت کا انداز موجود نہیں ہے ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است!

لیکن اس کے باوصف ان کی طویل ترین نعت "فارقلیط" حسن و تخیل اور اسلوب و ابداع کا معجزہ ہے۔ یہ نعت چار حصوں پر مشتمل ہے، اور مجموعی ہیئت کے لحاظ سے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ "فارقلیط" دنیا کی وہ طویل ترین نظم ہے، جو بقیدِ ردیف و قافیہ تحریر کی گئی ہے، اور اس اعتبار سے خالدؔ کو وحیدِ عصر اور یکتائے روزگار شاعر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ۱۲

شخصیت پرست دنیا میں اگر کسی عظیم و مبلط شخصیت سے ان کا مقابلہ اور موازنہ پسند نہ کیا جاسکتا ہو، تو بھی ان کی شاعرانہ عظمت و انفرادیت کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ادب میں کسی شاعر کی انفرادیت کئی بڑے شاعروں کی مابہ الاشتراک عظمت سے کم درجے کی چیز نہیں ہوتی۔ "فارقلیط" کے پہلے حصے سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

میں فرشِ زمیں ہوں، تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں، تو موجِ ہوا ہے

شہنشاہِ لولاک و مولائے سدرہ
تو میرے تخیل سے بھی ماورا ہے

تری ذات فخرِ بنی نوعِ انسان!
تو صلّی علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے

دمِ گفتگو منہ سے کرنوں کی بارش
دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے

ترا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ
تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے!

کنارِ شفق میں لڑی موتیوں کی
گلِ نو دمیدہ لبوں پر فدا ہے

بوئے مشکِ اذفر بسی ہے بدن میں
ترا پیرہن قطعہ گلزار کا ہے

شہابی بدن زیبِ تن سرخ جوڑا
کنول آبِ شفاف پر تیرتا ہے

یں ہوتا تو وہ پاؤں دھو دھو کے پیتا
وہ مشروبِ رحمت ہے آبِ بقا ہے

نہیں نرم تر تیرے ہاتھوں سے ریشم
انس کہہ رہا ہے جو لمس آشنا ہے

کبھی مشک و عود اس طرح کا نہ سونگھا
پسینہ ہے تیرا کہ عطرِ حنا ہے

تو محمود و حامد تو مصدوق و صادق
تو فخرِ انام و حبیبِ خدا ہے

سحر کی طرح صادق الوعد ہے تو
جو ذمہ لیا اُس کو پورا گیا ہے

خالدؔ کی شاعری میں الفاظ کی غرابت اور نامانوسیت سخت تکلیف دہ ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ خود اپنے وسیع علم اور مطالعے کی وجہ سے، ان الفاظ اور تراکیب سے بے حد مانوس ہیں۔ طویل استعاری اور تمثیلی منظومات میں اِس قسم کے (DICTION) یا ذخیرۂ الفاظ کا استعمال ضروری بلکہ بعض صورتوں میں ناگزیر سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ہلکے پھلکے تغزل اور مدحِ رسولؐ کے معاملے میں اتنے گرانبار الفاظ کا استعمال نہ ہونا چاہیئے۔ اس دقت پسندی کا سبب بھی خالدؔ کا وسیع علم اور ان کا بہت سی دقیع زبانوں کے ادب کا مطالعہ ہے۔

دراصل خالدؔ کی طبیعت کو تغزل سے مناسبت ضرور ہے، لیکن وہ غزل کی روایات کی اس حد تک پابندی گوارا نہیں کرتے کہ کسی قافیے کے نظر انداز کر دینے کو بدعتِ سیئہ سمجھتے ہوں۔ ان کا فن طویل تمثیلی منظومات میں نکھرتا ہے، اور وہ اپنے پسندیدہ کرداروں اور ان کے ماحول کو سامنے رکھ کر شاعری کا تمام زور صرف کر دیتے ہیں۔

خالدؔ ایک پُرگو اور کثیر الموضوعات شاعر ہیں۔ ان کی طویل ترتیلی تمثیلات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی اُن غزلوں پر ایک نظر ڈال لی جائے، جو انہوں نے غزل کی روایتی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی ہیں۔ ایسی غزلیں "زنجیرِ رم آہو" میں موجود ہیں، جن میں سے جستہ جستہ اشعار انتخاب کیے جاتے ہیں:

نشاطِ نغمہ بھی ہے مستیٔ خمار بھی ہے
خزاں کا دور بھی ہے موسمِ بہار بھی ہے

اک اضطراب اک احساس تشنہ کامی کا
ترے حضور میں ہیجان بھی قرار بھی ہے

خالدؔ غزل کے ایجاز و انتشار کے بھی قائل ہیں، لیکن شیوۂ ایجاز و انتشار کو وہ اپنے محبوب کی چشمِ فسانہ گو سے متعلق کر دیتے ہیں

ستم ہے صنعتِ چشمِ فسانہ گو جس میں — غزل کا شیوۂ ایجاز و اختصار بھی ہے

نغمہ پیرائی کا فلسفہ دیکھئے ؎

ایک پردہ ہے خود فریبی کا — یہ مرا ذوقِ نغمہ پیرائی !!!

اسی غزل کا ایک اور اچھا شعر ملاحظہ ہو ؎

پھر ترے آستاں پہ لے آئی — کھینچ کر لذتِ جبیں سائی

خالد کی نظر ضرورت سے زیادہ متمدن اور تکلیف وہ حد تک پُر تکلیف "شہرِ نگاراں" ہی کی دلدادہ و پرستار نہیں ہے بلکہ وہ حُسنِ صحرا کی دلنوازیوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں ؎

آفتِ عقل و ہوش ہے خالدؔ — اُس پری رُو کا حُسنِ صحرائی

ایک شعر دوسری غزل کا ملاحظہ ہو ؎

بُوئے نسیم سے کبھی بادِ شمال سے — کسبِ نشاط کرتا ہوں تیرے جمال سے

فکرِ مآل سے بے نیازی کے سلسلے میں اکثر شعرائے گُل اور خندۂ گُل پر تبصرے کئے ہیں مثلاً:

تجھے ہم دوپہر کی دھوپ میں اے پھول دیکھیں گے — ابھی شبنم کے روتے پر ہنسی معلوم ہوتی ہے

واقف نہیں مآلِ گُل سے میاں لیکن — پھوٹی جو کرن تو مسکرانا ہی پڑا (جوشؔ)

کہا میں نے گُل کو ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا (میرؔ)

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت (حالیؔ)

خالدؔ نے فکرِ مآل سے اپنے محبوب کی بے نیازی کا ذکر کیا ہے، لیکن کتنے بلیغ انداز سے، ملاحظہ ہو ؎

اُس حُسنِ بے نیاز کی شادابیاں نہ پوچھ — گویا کہ بے نیاز ہے فکرِ مآل سے

خالدؔ کو ترکیبیں تراشنے میں بھی یدِ طولیٰ حاصل ہے:

واماندگیٔ دشتِ تحیر ہے اور ہمیں — یہ مختصر حیات مگر مختصر نہیں

حُسن ملائک فریب عشق جنوں دستگاہ — ارضِ عجم میں لٹی سطوتِ کردِ بیاں

وہ نفسِ کیمیا آج زمانے میں ہے — یا لبِ شیوہ بیاں یا کفِ گوہر فشاں

خانہ خرابی کرے ذوقِ نظر کا فساد — اک نگہِ نیم رس سو جگر آشوب بیاں

بہ دلِ آذر نفس، جس کو نشیمن قفس — خونِ رگِ صاعقات، خار و خسِ آشیاں

دشتِ تحیر، جنوں دستگاہ، نفسِ کیمیا، نیم رس، آذر نفس، خالدؔ کی طبع زاد ترکیب ہیں۔ اس غزل کا ایک شعر تو ناقابلِ فراموش ہے ؎

عرضِ تمنا نہیں ایک نظر سے فزوں — حرفِ تمنا مگر سلسلۂ بے کراں

خالدؔ اگر صرف غزل کے شاعر ہوتے، تو ان کا سرمایۂ شعری چند سو غزلوں سے زائد نہیں ہو سکتا تھا، لیکن وہ شاعرِ ہمہ اصناف ہیں۔ [انہوں] نے عالمی کلاسیکی ادب اور کلاسیکی اصنافیات کو جامۂ شعری پہنا کر اُردو کی وسعتوں میں انتہائی قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

"گیتان جلی" رابندر ناتھ ٹیگور کی وہ مشہورِ آفاق تصنیف ہے کہ جس کا ترجمہ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اُردو زبان

بیں اسے سب سے پہلے علامہ نیاز فتح پوری نے منتقل کیا تھا۔ اس کے بعد شاید کسی مزید ترجمے کی ضرورت باقی نہ تھی، لیکن خالد نے بھی اسے ایک نئے حسن اور زاویۂ حسن سے اردو میں منتقل کیا ہے، اور اس طرح مزید ترجمے کی ضرورت کا جواز بھی کسی حد تک پیدا ہو گیا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں خالد کی جملہ تصانیف پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ زرد داغِ دل، گلِ نغمہ، ماتمِ یک شہرِ آرزو، سرودِ رفتہ، سلومی، غزل الغزلات، نخچیرِ رمِ آہو، دکانِ شیشہ گر، برگِ خزاں، ورقِ ناخواندہ، کلکِ موج اور فارقلیط ان کے معروف و مقبول شعری مجموعے ہیں۔ اس مزاج، استعداد اور قدرت کے شاعر کے متعلق ایک مکمل کتاب کی فوری ضرورت ہے۔ تشہیر و نشاعب نیز تقابل و مطابقت کے اس دور میں ایسے اہلِ قلم خال خال ہوں گے، جو اس مقصد کے لئے اپنے وقت اور قلم کو مخصوص کر سکیں۔ میں ذاتی طور پر ان ناشرین سے جنہوں نے خالد کی کتابیں حسنِ طباعت کے مثالی معیار کے مطابق شائع کی ہیں، یہ التماس کرتا ہوں کہ وہ خالد کی زندگی اور شاعری پر اردو اور انگریزی میں کتابیں شائع کریں۔ خیر یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی، اب "گلِ نغمہ" (گیتان جلی) کے چند حصے ملاحظہ ہوں:

بہار آفرینا ترے فیض نے — کہ ہے گلشن آرائے کون و مکاں
عطا کر کے معمورۂ آرزو — دلِ مختصر کو کیا بے کراں
مرے اس سبوئے سفالینہ کو — تہی کر کے بھرتا ہے تو بار بار
نئی زندگی کی مئے سرخ سے — ہے پت جھڑ کے پردے میں گویا بہار
میں اک عودِ نالندہ ہوں اور تو — مغنی کہ آتش نوا جس کا نام
مدام اک نیا زمزمہ چھیڑتا — خیابان و وادی میں محوِ خرام
ترے لمسِ زندہ کی تاثیر سے — مرا دل ہے سرمستِ راز و نیاز
دریغا کہ لفظوں میں ڈھلتا نہیں — مری روح کا سرمدی سوز و ساز

بجھ نہ جائے ہوائے صرصر سے — یہ مہکتا گہر یہ خرمنِ زر
ہو نہ جائے بکھر کے مرجھا کر — جزوِ گرد و غبارِ خاکستر

نا سرائندہ اب تک ہیں وہ زمزمے — جن کو گانے کی خاطر میں آیا یہاں
دن مرے کٹ گئے جوڑتے کھولتے — اپنے سازوں کے تاروں کو واحسرتا
ٹھیک کہیں جس کو آیا نہیں وہ سمے — اور الفاظ بھی ٹھیک بیٹھے نہیں
ہے اگر دل میں کچھ تو غمِ آرزو — ہونٹ کھولے نہیں ہیں کلی نے ابھی
صرف بھرتی ہے موجِ صبا سسکیاں — میں نے آواز اُس کی سنی اور نہ تا
صورتِ دل رُبا کا نظارا کیا — صرف آہٹ سنی تخلیں پاؤں کی
گھر کے آگے سے جاتی ہوئی راہ میں — صبح سے شام تک میں بنتا رہا
اس کے شایانِ شاں بیٹھنے کی جگہ — لیکن اب تک ہے بے نور میرا دیا
ان سے کیسے کہوں میرے گھر آیئے — بے تکلف قدم رنجہ فرمایئے
کٹ رہی ہے اسی آس میں زندگی — رام جانے کب آئے ملن کی گھڑی

اکبر کاظمی

فارقلیط سے پروازِ عقاب تک

عبدالعزیز خالد نے اپنی اردو شاعری میں عربی فارسی ہندی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اگرچہ اس انداز سے استعمال کئے ہیں کہ اردو پڑھا ہوا شخص ان اشعار کو پڑھتے وقت عربی نہ جاننے کے باوجود ان الفاظ کے مطالب و معانی تک پہنچ پاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خالد نے جہاں جہاں جس لفظ کو بھی استعمال کیا خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہے اس کو اردو الفاظ میں اس انداز سے شامل کیا ہے کہ اسی قبیلے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میں ایک سوال کرتا ہوں کہ کیا ہر شاعر ان پڑھ لوگوں کے لئے شاعری کرتا ہے۔ کیا شعر کو سمجھنے کے لئے کسی بھی قاری کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں۔ کیا شعر و ادب سے لگاؤ رکھنے والے شخص کے لئے ضروری نہیں کہ وہ جس زبان کی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو اُس زبان کا جاننے والا بھی ہو۔ اگر ایک شخص انگریزی نہیں جانتا تو اس کو کسی ایسے شاعر کی شاعری کے بارے میں جس نے انگریزی زبان میں شاعری کی ہو یہ کہتے ہوئے شرم آنی چاہیئے کہ اس کی شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی۔ عبدالعزیز خالد نے ایشیا کے مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عرب اور ایران اور دیگر ایسے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی شاعری کی ہے جو اسلامی تہذیب و ارتقا اور اپنی زوال کی داستان سُن کر سنبھلنے کی امنگ اپنے سینوں میں رکھتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد نے پاکستانی مسلمانوں کو بالخصوص اس بات پر اُکسایا ہے یا اُکسانے کی کوشش کی ہے کہ ہر مسلمان کو قرآن کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے اُس نے عرب کے مسلمانوں کو یہ دعوت دی ہے کہ وہ جہاں چند الفاظ عربی کے پڑھ کر سر دھنیں وہاں ہماری اُردو زبان کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس نے ایران کے لئے بھی یہ اہتمام کیا ہے کہ چند الفاظ فارسی کے پڑھ کر اردو کی طرف بھی مائل ہوں یہی نہیں بلکہ ہندی الفاظ کی آمیزش سے اس نے ہندوستان کے ہندوؤں کو بھی اسلامی داستان سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے کہ سارا ہندوستان اردو کو بہر حال سمجھتا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی شاعر جب شعر کہتا ہے تو وہ جن جن زبانوں کا ماہر ہوتا ہے انہیں زبانوں میں شعر کہتا ہے اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے شعر کہتا ہے اور دنیا کا ہر قاری اپنی جانی پہچانی زبان میں لکھے ہوئے شعر پڑھتا ہے اور اشعار میں اگر کچھ مشکل الفاظ آئیں تو انہیں سمجھنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ مجھے آج تک کسی عام پڑھے لکھے آدمی نے یہ نہیں کہا کہ خالد کی شاعری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہنے والے جتنے بھی ہیں وہ سب شاعر ہیں۔ جیسے خالد نے کسی آفاقی زبان میں شاعری کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تو پھر شاعر لوگ خالد کے بارے میں ایسا رویہ کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس کی تہ میں کوئی بات تو ہے اس کو تلاش کرنا ہر اس شخص کا اخلاقی فرض ہے جو فن اور فن کار کے معاملہ میں مخلص ہے۔ اس کے علاوہ میں خالد کے مخالفوں کو یہ بات بھی عرض کردینا چاہتا ہوں کہ کسی بھی اچھے شاعر کی آواز کو لاکھوں کوششوں کے باوجود دبایا نہیں جا سکتا۔ آپ اس کی ذات کے گرد لاکھ حصار بنائیے زمانہ اسے خو[illegible] توڑ دے گا اور شاعر کا فن ابھر کر زمانے کے سامنے آجائے گا۔ دور جانے کی بات نہیں غالب ہی کو لیں اس پر اس وقت کے درباری شاعروں اور متشاعروں نے کیا کیا تہمتیں نہیں لگائی تھیں۔ یہاں تک کہ مشکل گو کے علاوہ اسے مہمل گو بھی قرار دیا گیا۔ لیکن آج زمانہ دیکھ رہا ہے کہ غالب کیا تھا اور کیا ہے۔ غالب کو مشکل گو اور مہمل گو کہنے والوں کی روحیں خود آج نادم

ہوں گی۔ آج کا زمانہ غالب کے مخالفوں کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کرتا۔ اب میں کچھ ایسے شعروں کی مثالیں پیش کروں گا جن میں خالد نے مختلف زبانوں کے الفاظ اس قرینے سے استعمال کئے ہیں کہ معانی نہ جاننے کے باوجود ان الفاظ کے معانی سمجھ میں آتے ہیں بلکہ پڑھ کر ذہن و دل میں سُرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

الانسان بتری امنا سرہٗ — یہ ثابت ہے خلقت عیالِ خدا ہے
ہے دیکھا سُنا لا یدوم خلیل — زمانے میں تنہا خدا کو بقا ہے

زمیں ہے تمہارے لئے خوانِ یغما — تہِ عرش جو کچھ ہے تم کو ہبہ ہے
یکیدون کیداً و کیدم اکیدُ — خدا ان سے کمزور و کم حوصلہ ہے؟
و اُملی لھم ان کیدی متینٌ — خبردار میرا عصا بے صدا ہے

غرضیکہ اس قسم کے بے شمار اشعار ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار میں نے مثال کے طور پر اس لئے پیش کئے ہیں کہ آپ ان کو پڑھ کر ایمان داری سے غور فرما دیں۔ تھوڑا سا ہی اگر آپ سوچ بچار سے کام لیں تو آپ دیکھیں گے کہ عربی کے الفاظ اردو کے الفاظ کے ساتھ اس سلیقے سے رکھے گئے ہیں کہ عربی نہ سمجھنے والا بھی ان کے مطالب و معانی کو پا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی خدمت میں ایسے شعر پیش کرتا ہوں کہ ایک ایک شعر میں تاریخ کا ایک ایک باب بند کر دیا گیا ہے۔ اب اگر کسی نے تاریخ کا الٹ کر نہیں دیکھا تو یہ خالد کا قصور نہیں۔ شعر ملاحظہ فرما دیں ؎

جو مدِّ مقابل ہے فرعونِ سرکش — ڈرے ربِّ موسیٰ سے جو آسیہ ہے
صنم گاہِ نمرود سے نکلی رعفہ — مگر نوح کی ہم سفر واعلہ ہے
کوئی فاعلہ مریم مجسّمہ لائی — کوئی دخترِ امصیا یکلیا ہے
ہوئی اپنے چہرواہے کو تنیٰ پہ عاشق — جو مہ رُو کتاں پوش لقی بے ردا ہے

اب نظم کے اسی باب سے آپ کی خدمت میں وہ شعر پیش کرتا ہوں جو پڑھتے پڑھتے دل میں اُتر جاتے ہیں، جن کی سادگی اور پُرکاری پر رشک آتا ہے۔ حیران ہوں کہ خالد کو مہمل گو کہنے والے اگر ان شعروں کو پڑھ چکے ہیں تو اپنے ضمیر کو کیوں نہیں ٹٹولتے ــــــ؟

یہ مانع ہے بارِ دِگر دیکھنے سے — نگاہوں پہ پلکوں کا پردہ پڑا ہے
کرو حسن سے والہانہ محبت — محبت دلِ ناتواں کی غذا ہے
دلوں میں نہاں ہیں محبت کی راہیں — روش لاابالی ہے بے قاعدہ ہے
حفاظت کرو شرمگاہ و زباں کی — کہ حفظ و حیا شعبہ ایماں کا ہے

مندرجہ ذیل شعر کو دیکھئے اس میں "پرنار" کا اس خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے کہ جس شخص نے زندگی میں اس لفظ کو کبھی نہ پڑھا ہو وہ بھی فوراً اس کے معانی نکال لے گا بلکہ خود بخود اس کے ذہن میں آ جائیں گے۔

کرو عہد آنکھوں سے مضبوط کر کے — کہ پرنار کو گھورنا ناروا ہے

فارقلیط کو مسلسل پڑھتے جایئے اس قسم کے اشعار آپ کو بہت ملیں گے جن پر تھوڑا سا غور کریں تو نہ صرف یہ کہ اشعار کے معانی سمجھ میں آ جائیں گے بلکہ فارقلیط کے مطالعہ کے لئے ساتھ ساتھ ہی ذہن کے دریچوں کو کھولتے جائیں گے۔ فارقلیط سے

ہے اس مقصد سے اختلاف رکھنے والے زیادہ پریشان نظر آتے تھے اور ہر جگہ یہ پراپوگنڈا کیا جارہا تھا کہ خالد کی شاعری بالکل بے کار ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں نظام تعلیم اس قسم کا ہے کہ اس کے اثرات سے قوم میں ایسے لوگ ہی پیدا ہوں گے جو نہ صرف بد افکار و بدکردار ہوں گے بلکہ منافق بھی ہوں گے۔ دنیا میں کسی بھی سوسائٹی کو جتنا نقصان منافق سے پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے اور کسی سے بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ اس ملک میں منافقوں کی تعداد بہت زیادہ اور پھر سب سے زیادہ بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ زیادہ تعداد میں اہل قلم میں ہیں جو ریڈیو پاکستان پر نعتیہ مشاعرہ میں اس لئے شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہاں روپے ملیں گے اور وہاں شامل ہو کر نعتِ رسول مقبولؐ پیش کریں لیکن ادبی انجمنوں میں بیٹھ کر نہ صرف یہ کہ اسلام کو اور اہلِ اسلام کو بلکہ رسولِ اکرمؐ کی توہین کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ یہ سب وہی اہل قلم تھے جنہوں نے عبدالعزیز خالد کے خلاف اتنا شور بلند کیا کہ نئی نسل نے خالد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا یہ سارا پراپوگنڈا صرف اس لئے کیا گیا کہ خالد سے ان کو فکری اختلاف تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اسی عبدالعزیز خالد نے ہوچی منہ کی پروازِ عقاب کے نام سے پیش کیا تو سب نے شور مچا دیا کہ خالد نے بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔

عبدالعزیز خالد نے ایسا کر کے یہ عقلمندی تو ضرور کی ہے کہ کچھ نوجوانوں کو اُکسایا ہے کہ وہ اسی بہانے پروازِ عقاب کے علاوہ بھی خالد کی شاعری پڑھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن میرے خیال میں عبدالعزیز خالد کو نوجوان طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے یہ ذریعے اپنا کر ایک بہت بڑی قربانی بھی دینا پڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہوچی منہ بہت بڑا لیڈر سہی بہت بڑا انسان دوست سہی بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں اس کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں تھیں جنہیں میں ایک مسلمان کی حیثیت سے سراہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ وہ واقعی بہت بڑا آدمی تھا لیکن وہ بہت بڑا شاعر نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہوچی منہ ایک خوددار اور باعظمت قوم کا فرد تھا۔ وہ خوش نصیب تھا کہ اس کی قوم نے اس کو یہ احترام بخشا کہ آج پاکستان میں عبدالعزیز خالد جیسے بلند مقام اسلامی فکر کے شاعر نے بھی اس کی شاعری کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیا۔

عبدالعزیز خالد کی شاعری نہ مٹنے والی شاعری ہے ؎

یہ شب دیر شب ہے کہ آہوئے مشکیں؟	دما دم پیا پے اُڑا جا رہا ہے
چمکتا ہے سورج چمکتی ہے قمری	سخن دھوپ ہے نور ہے زمزمہ ہے
سخن در رہے لفظ کی جستجو میں	کہ لفظوں میں حسن معانی چھپا ہے
قلم کے سفر میں نہیں ہمرکابی	کہ اے دل شتابی گجر بج رہا ہے
دل اک رندِ کافر ہے اشعار مومن	نہاں و عیاں میں عجب تفرقہ ہے

اور آخر میں یہ شعر سُنئے جس میں عبدالعزیز خالد صاحب نے اپنی زبان کے لکنت زدہ ہونے کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ بڑی بڑی طاقت ور زبانوں والے بھی پڑھ کر رشک کریں گے ؎

کہاں نعت و نامِ رسولِ تہامی
کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

خواجہ اعجاز احمد بٹ

خالد کی مختصر ترین نظمیں

نظم اور غزل کے مخالفین آپس میں یا تو مخالفت کا جذبہ مفقود پا کر آپس میں سمجھوتہ کر بیٹھتے ہیں، یا نظم کو آزاد نظم اور آزاد نظم سے مختصر نظم اور اب مختصر ترین نظم دیکھ کر اب مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ جس طرح افسانے کے افسانچے کی نئی حیثیت کو تسلیم کرنے میں نقادوں کو ابھی تک پس و پیش ہے، اسی طرح مختصر ترین آزاد نظموں کے وجود کو تسلیم کرنے میں ابھی کافی وقت لگے گا۔

میراجی، ن۔ م راشد اور فیض کے بعد جو آزاد نظم لکھنے والوں کی کھیپ قابل توجہ ٹھہری ہے، ان میں وزیر آغا، عارف عبدالمتین، عبدالعزیز خالد، منیر نیازی، عرش صدیقی، اعجاز فاروقی، حفیظ صدیقی، عظیم قریشی، کرشن موہن، انور محمود خالد، سلیم بیتاب اور زاہدہ صدیقی کے نام خاص طور سے لائق ذکر ہیں۔ اسی ضمن میں ریاض حسین چودھری اور ناصر زیدی کے نام بھی لئے جاسکتے ہیں۔ ان تمام شعراء نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں موجودہ مسائل، ذات کے کرب اور ذات کے حوالے سے کائناتی کرب اور ذاتی تجربات کو نظم کا روپ دینے کی کوشش کی ہے، مگر عبدالعزیز خالد کے اسلوب میں سادگی کا اظہار ناقابل بیان حد تک رشک آمیز ہے۔

یوں تو آج کے اکثر شعراء نے اظہار میں سادگی کو بنیاد بنا کر زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظم کا روپ دیا ہے مگر مختصر ترین نظموں میں عظیم قریشی اردو نظم کے افسانچہ نگار اس لئے ہیں کہ وہ عموماً تین چار سطروں میں زندگی کی محرومیوں کو سمو دیتے ہیں۔

خاکِ مرقد

لاش سے بولی

بیجان آنسو مجھ کو دے دو (ہمدردی)

سلیم بیتاب اور زاہدہ صدیقی کی نظموں میں انسان کی ازلی محرومی اور موجودہ بے کسی کا نوحہ بیان کیا گیا ہے:

ہم مسلسل

خزاں کے ہر ایک تند جھونکے کو

بھیگی ہوئی آنکھ سے دیکھتے ہیں

مگر

کچھ بھی کہتے نہیں

(محرومی — زاہدہ صدیقی)

عجیب لمحوں کا سلسلہ ہے

ازل سے تا ابد رواں ہے

ہر ایک گھڑی جس کی خوں نشاں ہے

(سلیم بیتاب)

ریاض حسین چودھری سامراجی ناخداؤں سے اس لئے نالاں ہیں کہ وہ ایشیا کا استحصال کر رہے ہیں :

ایشیا — ایک آتش نشاں

اپنے کالے مقاصد کی خاطر جسے وقت کے آمروں نے

بٹھا دیا ہے بارود کے ڈھیر پر

اور بارود کی کھاد سے میں کبھی ایک گندم کا خوشہ بھی حاصل نہیں کر سکوں گا

(ایشیا کا لہو)

اس پس منظر اور پیش منظر میں جب عبدالعزیز خالد کی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا تو یہ رائے دینا یقیناً متنازعہ فیہ اور ناقابل حد تک ادبی جھوٹ کہلائے گی کہ یہ نظمیں مختصر ترین نظمیں ہیں کیونکہ ہمارے عہد کے عظیم شاعر عبدالعزیز خالد پر گوئی اور طویل ترین نظمیں کہنے کی وجہ سے مشہور ہیں لہٰذا عبدالعزیز خالد اور مختصر ترین نظمیں دو متضاد حقیقتیں نظر آئیں گی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں آج تک عبدالعزیز خالد کی شاعری سے محض ان کی نظموں کی طوالت کی وجہ سے خوفزدہ رہا، مگر ان کی مختصر ترین نظمیں اس موجودہ دور کے شعراء سے ہم آہنگ کر کے انہیں ان سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

خالد کی ان نظموں میں فطرت سے محبت کی عکاسی، فطرت کی برتری، عشق، اسلامی تاریخ، تہذیب، رومان اور سب سے بڑھ کر سادگی ہے جو شاید خالد کی دوسری نظموں میں نقادوں کی نظر میں ناپید ہے۔

علامہ اقبال نے جس روایت کو آگے بڑھانے کی سعی کی تھی اس میں فطرت سے محبت اور اسکی برتری مسلم کرنا بھی ایک مشق تھا۔ ورڈز ورتھ اور بائرن اور دیگر رومانی شعراء کی طرح فطرت سے محبت اردو شعراء کا مقبول موضوع رہا ہے۔ فطرت اور قدرت سے محبت دراصل خالقِ کائنات سے محبت اور اس کی مخلوق سے الفت کا اظہار ہے۔ مگر خالد کی فطرت سے محبت محض شاعرانہ ہیولائیں یا چکورہ کا چاند سے پیار اور چکور کا احساسِ محرومی نہیں۔ بلکہ خالد کی قدرت سے محبت سائنسی بنیادوں پر استوار ہے اور سائنسی طریقے سے فلسفۂ زندگی کا بیان۔ یا منطقی لحاظ سے ایک حقیقت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے خالد نے تجزیاتی طریقے کو بھی اپنایا ہے :

زمیں مینہ کو پیتی ہے غٹ غٹ

زمیں کی نمی کو درخت

سمندر ہوا کو، سمندر کو سورج

اسے چاند

آخر

پئے کیوں نہ شاعر لعابِ لبِ مشکبو

دراصل شاعر نے فطرت کو پس منظر میں رکھ کر یوں تو "لعاب لب مشکبو" پینے کے جواز کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی مگر یہ دراصل فطرت سے محبت کا اظہار ہے۔ اس نوع کی ایک اور نظم ہے :

ابرِ باراں کو پپیہا ترسے

عاشقِ نورِ سحر ہے سرخاب

چاند کے جلوے کا دیوانہ چکور

اک دوجے کے لئے ہم بیتاب

چکور کا چاند سے پیار کو حسن سے موازنہ کر کے شاعر نے عشق کے لازوال جذبے کو نئے لہجے اور نئے آہنگ سے پیش کیا ہے۔

خالد کی ان نظموں میں رومانیت رچی بسی ہے۔ رفیق، اختر الایمان اور راشد کی طرح ان نظموں میں اس محبوبہ کا تصور نہیں ابھرتا جس سے شاعر کے نظریات کی تشہیر زیادہ اور محبوبہ کا سراپا اور جذبات کم معلوم ہوتے ہیں۔ خالد کی ان نظموں میں عشق کے ان جذبات کا اظہار ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے سلگتے ہیں اور جن میں شاعر سلگ سلگ کر تڑپتا ہے اور پھر تڑپ تڑپ کر سلگتا ہے مگر اظہار کی اس میں سکت نہیں۔ اگرچہ تصورات اور خیالات میں محبوبہ سے تو مل سکتا ہے، مگر حقیقت میں وہ اختر شیرانی کی سلمیٰ ہے۔ خالد نے ان نظموں میں 'دروازے' کی علامت کو فزیکل معنوں میں بھی استعمال کیا ہے :

شام ہوگی تو میں دروازہ کھلا

چھوڑ کے راہ تکوں گا اس کی

میں نے آدھی رات تک تیرے لئے

اپنا دروازہ کھلا چھوڑا صنم

مگر شاعر کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ دروازہ کھلا رکھنے کے باوجود مہمان کا انتظار فضول ہے، اس لئے وہ یاسیت کا شکار ہے۔ اسے یہ احساس ہے کہ انتظار فضول ہے اسی لئے تو شاعر کہتا ہے :

گھر اکیلا ہے دیا بجھنے کو ہے

جھانکتا ہے ادھ کھلی کھڑکی سے چاند

اور یہ احساس اسلئے بھی شدید ہے کہ شاعر حقیقی دنیا کو شاید زاہدہ صدیقی کی طرح "جاگتی آنکھوں کا خواب" قرار دیتا ہے اور اسے احساس ہے کہ دراصل وہ خوابوں میں ہی حسن کی شہزادی کو مل سکتا ہے :

میرے خوابوں میں ملاقات کا جس

دشمن جاں نے کیا ہے وعدہ

اسی ضمن میں خالد کی ایک خوبصورت مختصر ترین نظم ہے جو اظہار کی سادگی، چھوٹی چھوٹی چار سطروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔ اس نظم میں شاعر کا احساسِ بیچارگی، احساسِ محرومی بھی ہے اور انتظار کی جاں گسل کیفیت بھی جس سے شاعر دوچار ہے :

اس انتظار میں

کہ خواب میں

تم آؤ گی

میں ساری رات جاگتا رہا

ان رومانی نظموں کے علاوہ خالد کی وہ اسلامی نظمیں بھی اہم ہیں، جنہیں پڑھ کر آج کا سیکولر نقاد ناک بھوں ضرور چڑھائے گا کیونکہ ہم پیدا، جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ہر نظریہ پر فلسفیانہ نقطۂ نظر یہاں تک ہندو کا آواگون کا مسئلہ نظموں میں سمو سکتے ہیں اور اسے جدید ترین کا لیبل لگا کر جدید ترین کہلوانے کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ خالد کی شامت اعمال یہ ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی نظموں میں اسلامی افکار، اسلامی تاریخ اور اسلامی ثقافت کا احیاء چاہتا ہے، وہ ثقافت جس کی بنیاد ہماری تہذیب پر ہے۔ خالد نے خالصتاً اسلامی نظمیں لکھنے سے گریز کیا ہے جو نظمیں جن میں کسی واعظ کا سا انداز یا ڈپٹی نذیر احمد کی اخلاقیات کا پرچار ہو، خالد کے ہاں نہیں ملتیں کیونکہ خالد فن اور پراپیگنڈہ کے فرق سے بخوبی آشنا ہے۔ جب فن اور پراپیگنڈہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں تو نہ فن رہتا ہے نہ پراپیگنڈہ۔ اسی لئے تو خالد کی اسلامی نظموں میں یا تو اسلامی تاریخ کے کسی واقعہ کو منظوم کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں محسن بھوپالی کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے آج کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بغیر کسی تبصرے کے منظوم افسانے میں ڈھال لیا ہے۔ خالد نے آج کے واقعات کی بجائے ہماری تاریخ کے چند اوراق کو منظوم کرنے کی کوشش کی ہے:

تعمیر ہو رہا تھا محلِ معاویہ

گزرے جو اس طرف سے ابوذر تو رک گئے

کہنے لگے، کہ ہے اگر اس قصر کی بنا

اللہ کے مال سے تو خیانت ہے برملا

ہے اپنے مال سے تو، اسراف ناروا

خالد کی بعض مختصر ترین نظمیں دو سطروں کی ہیں جن میں بعض طویل ترین نظموں کی سوچ اور مختصر نظموں کے فکر کی بلندی کا احساس ہوتا ہے اور ان نظموں میں شاعر نے شعر اور نظم کے فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ عارف عبدالمتین کی فردیات سے قطعاً مختلف ہیں:

ترک مے ممکن ہے ترکِ عشق بھی

شاعری لیکن ہے میری زندگی

بے نام و نشاں جہاں میں جو شے

مرجھائے گل دل بشر ہے۔

مگر ایک نقص جو ساری نظموں میں کھٹکتا ہے اور جس کا خالد کو احساس نہیں رہا، وہ ان نظموں کے عنوانات ہیں۔ خالد نے اپنی کسی مختصر ترین نظم کا عنوان نہیں رکھا جس سے آج کے اور آنے والے نقادوں کے لئے کافی دقت ہوگی۔

ریاض حسین چودھری

عبدالعزیز خالد اپنے آقا و مولا کی بارگاہ میں

عبدالعزیز خالد کا فن اس ملی شعور کا آئینہ دار ہے اور ان کا ذہنی جھکاؤ اس شعری رویے کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے جس کی چمن بندی مولانا حالی نے اور آبیاری شاعرِ آفاق حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے خونِ جگر سے کی تھی۔ ...... وہی اندازِ فکر ...... وہی اسلوبِ بیان ...... وہی آہِ سحرگاہی ...... وہی دعائے نیم شب ...... وہی فکری زاویے ...... وہی ذہنی بصیرت، وہی نالے، وہی فغاں، وہی سوز، وہی گداز اور وہی حجازی لَے ...... اگرچہ اِن کے فن کے فکری ماخذ عہد نامۂ عتیق سے لے کر عہد نامہ جدید تک پھیلے ہوئے ہیں خالد نے نہ صرف یونانی دیو مالا کی پہنائیوں میں جھانک کر دیکھا بلکہ "سلویٰ" جیسے ڈرامے کا منظوم ترجمہ کر کے آپ نے عہد نامہ جدید کی روح کو بھی اپنے فن میں سمیٹ لیا اور "گُل نغمہ" میں ٹیگور کی گیتانجلی کا تخلیقی روپ پیش کر کے خالد نے فنی بالیدگی اور فکری پختگی کا ثبوت ہی فراہم نہیں کیا بلکہ اپنی تخلیقی قوتوں کا لوہا بھی منوایا ہے ...... انگریزی، ہندی، عبرانی، اُردو، فارسی اور عربی ادب پر آپ کی نظر بہت گہری ہے۔ ان زبانوں کے الفاظ تخلیق کے پیراہنوں میں اس طرح سجتے ہیں کہ سوچ کی سندرتا کا روپ کچھ اور بھی نکھر آتا ہے حال ہی میں آپ نے ہوچی منہ کی نظموں کو اُردو کے قالب میں ڈھال کر مشکل گوئی کے کوچے سے نکلنے کی شعوری کوششیں کی ہیں اور یہ ذہنی، فکری اور ارتقائی سفر کامیابی سے طے کیا ہے۔ قرآن، انجیل، زبور اور دوسرے آسمانی و زمینی صحیفوں کے عمیق مطالعے نے آپ کے فن کو تابندگی بخشی ہے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل اور ترجمہ میں آپ نے بے شمار فکری، تخلیقی اور علمی چراغ روشن کئے ہیں ؎

توفیقِ فکر کو ہم اعزاز جانتے ہیں — غافل یہ داغِ دل ہے گنجینۂ سعادت

"سرودِ رفتہ"، "زنجیرِ رمِ آہو"، "دکانِ شیشہ گر"، "برگِ خزاں"، "گُلِ نغمہ"، "سلویٰ"، "دشتِ شام" اور "کفِ دریا" وغیرہ آپ کی اجتہادی بصیرت اور فکری، علمی، تخلیقی اور تحقیقی سوچوں کے دلآویز مُرقعے ہی سہی، لیکن خالد بنیادی طور اسلامی ذہن کے مالک ہیں۔ اور ان کی سوچ کا مرکز و محور آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے (اور ان کی فکر کا یہی اساسی رویہ بعض نام نہاد روشن خیال جبینوں کو شکن آلود کر دیتا ہے)۔ یہاں مجھے بے ساختہ اور غیر ارادی طور پر محسن کاکوروی کا مشہور نعتیہ قصیدہ "سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل" یاد آ رہا ہے۔ جس طرح محسن کاکوروی مذکورہ قصیدے کے آغاز میں ہند کی غیر اسلامی فضا کا نقشہ کھینچتے ہیں اور اس پس منظر میں جب گریز کا مرحلہ آتا ہے تو آپ کا وجدان نورِ محمدی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح خالد کے فن کا گریز اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب وہ بارگاہِ رسالت مآب میں عشق و محبت کے نغمے بکھیر رہے ہوتے ہیں اور شاعر کے آنسو روضۂ اطہر کی معطر جالیوں پر سجدۂ شوق ادا کر رہے ہوتے ہیں ؎

کہاں ہو سکے تیری مدحت سرائی — ثریا کو دستِ بشر نے چھوا ہے

ثریا کو دستِ بشر کے چھونے کا یہ جمالیاتی احساس خالد کی نعت میں بڑی شدت سے اُبھرتا ہے ؎

قلم بشد ہو کلک و خامہ سے کیسے — بیاں تیرے حُسنِ گلوسوز کا ہے

عبدالعزیز خالد ایک زمانے تک یونانی صنمیات کی بھول بھلیوں میں اور ہندو دیومالا کے اسراروں میں کھوئے رہے۔ آپ نے اس طری ادب کو کھنگال ڈالا اور یونانی شاعرہ سیفو کے نغموں میں گوہرِ مقصود تلاش کرتے رہے لیکن روح کو سکون ملا تو غبارِ رہِ حجاز میں اور دل کو چین نصیب ہوا تو دُرِّ یتیمِ آمنہؓ کے لال، امی لقب آقا و مولا کے دامانِ رحمت میں، بقول اختر شیرانی

نہ جہاں میں راحتِ جاں ملی، نہ متاعِ امن و اماں ملی — جو دوائے دردِ نہاں ملی تو ملی بہشتِ حجاز میں

اگر میں یہ کہوں کہ عشقِ رسولؐ خالد کے فن کی اساس ہے تو اس میں مبالغہ آرائی کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ ان کا قاری میرے اس دعوے کی تصدیق کرے گا کہ خالد کے فن کے تمام راستے مدینہ منورہ کی طرف جاتے ہیں۔ خواہ یہ راستہ یونانی صنمیات کے صنم سے نکلتے ہوں یا ہندو دیومالا کے اسراروں سے ....

شاعر کا دل حُبِّ رسولؐ سے معمور .... اس کی سانسیں شرابِ طہورہ سے سرشار .... اس کی آنکھیں غبارِ رہِ یثرب کی متلاشی .... اس کا وجدان طوافِ کوئے یار میں ہمہ تن مصروف .... اور اس کا قلم اپنے آقاؐ و مولاؐ کی ثنا میں سجدہ ریز .... فارقلیط .... عقیدت و محبت کا زمزمہ اور سرور و مستی کا پیمانہ، ارشاد ہوتا ہے ؎

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے — میں سانسوں کا مہماں تو سوج ہوا ہے

تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں — تو صلِّ علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے

اور جب شاعر کا وجدان نیّرِ اعظم کے نورانی جلووں سے فیض یاب ہوتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے۔

دمِ گفتگو منہ سے کرنوں کی بارش — دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے

ترا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ — تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے

عبدالعزیز خالد کی نعت میں غزل کی رعنائی و دلکشی، قصیدے کی عظمت و جلالت، مثنوی کا تہذیبی رچاؤ اور رباعی کی معنویت کا حُسن اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور حسانؓ بن ثابت سے لے کر اعظم چشتی تک نعتِ رسولِ مقبولؐ جس جاندار اور توانا روایت کی حامل بن چکی ہے اس کی تمام تر جزئیات خالد کی نعت میں موجود ہیں۔

حضور پرنور کا ذکرِ جمیل ہر دور میں ہمارے عربی اور عجمی شعراء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ تقریباً سبھی قابلِ ذکر شعراء اپنے آقاؐ و مولاؐ کی بارگاہ میں عقیدت کے پھول لے کر حاضر ہوتے رہے ہیں۔ حافظ، جامی، سعدی، رومی، عرفی، خسرو، امیر مینائی، غالب، اصغر گونڈوی، بیدل رامپوری، حسرت موہانی، مولانا احمد رضا خاں، محسن کاکوروی، حالی، اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے بعد حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، آغا صادق، عبدالکریم ثمر، امین حزیں، عزیز حاصل پوری، حافظ مظہرالدین، خلیق قریشی، حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی اور عبدالعزیز خالد، حضرت حسانؓ بن ثابت، کعب بن زہیر، اور عبداللہ بن رواحہ کی سنت پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ یہاں میں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مقبولیت کے لحاظ سے اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی اُردو نعت کسی دوسری صنفِ سخن سے پیچھے نہیں۔ اور تو اور غیر مسلم شعرائے اُردو نے بھی سرورِ کائناتؐ کے حضور اپنی عقیدت اور نیاز مندی کا اظہار کر کے نعتِ رسولِ مقبولؐ کی مقبولیت پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے .... لیکن ابھی تک ہمارے تنقید نگاروں نے صحیح معنوں میں اس اہم صنفِ سخن کی پذیرائی نہیں کی اور نعت کو محض ایک مذہبی شے سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے ہیں ....

حقیقت میں نعت کا جمالیاتی پہلو اس قدر دلکش و دلنشیں ہے کہ اسے ایوانِ ادب میں مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہونا چاہیئے لیکن ہمارے نقاد ذہنی اور نظریاتی دھڑے بندیوں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں اور نام نہاد روشن خیالی کے زنداں میں کچھ اس طرح قید ہیں کہ نعتِ رسولؐ سے انہیں حجاب آتا ہے اور اپنے مسلمان ہونے کے اقرار سے گھن ...... یہ سال بھر کی نظم و غزل کا جائزہ تو لیں گے .... اردو شاعری میں جدید رجحانات کی نشان دہی بھی کریں گے .... زمینی رشتوں کا کھوج لگائیں گے .... سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کی توجیہہ کریں گے اور اپنے دھڑے کے چھوٹے موٹے شاعروں کے نام گنوا کر اپنے تئیں نقد و نظر کا حق ادا کر دیں گے لیکن یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس سال کتنے شعراء کو بارگاہِ رسالتمآبؐ میں دل کے آبگینے پیش کرنے کی سعادتِ عظمیٰ نصیب ہوئی ہے .... کیا عبدالعزیز خالد، حافظ مظہر الدین، محشر رسول نگری، عزیز حاصل پوری، حفیظ تائب، عابد نظامی اور دوسرے نعت گو شعراء کی نعتوں کا ادبی اور جمالیاتی پہلو بھی یکسر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ کیا نعتِ رسولِ مقبولؐ دل کی شاعری نہیں ... اور کیا غزل کو ذکرِ جبیں پر فوقیت حاصل ہے؟؟

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں ذکر کر رہا تھا جناب خالد کی نعتیہ شاعری کا .... ان کی نعت تشبیہات کی ندرت اور استعاروں کے حسن سے عبارت ہے۔ فکری تسلسل، فلسفیانہ استدلال اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ آپ کے ہاں سادگی کے سُندر نمونے بھی ملتے ہیں۔

بعض مقامات پر تو میر کی غزل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ امرِ واقعہ بھی یہی ہے کہ خالد نے ظاہری طور پر ہی نہیں باطنی طور پر بھی غزل کے اسلوب کو اپنایا ہے اور وہ اس میں خاصے کامیاب بھی رہے ہیں۔

چلے تُو تو خوشبو چلے آگے آگے — بدستِ صبا، مجمرِ غالیہ ہے

جب تصور میں مضطرب دل کی بے قرار آنکھیں گنبدِ خضرا کا طواف کرتی ہیں تو جذبات الفاظ کے پیراہنوں میں چمن در چمن ڈھلنے لگتے ہیں

ہے روئے مُدوّر، منیر و منوّر — نجومِ درخشاں میں کس کی ضیا ہے

تہذیبی، سماجی، انفرادی، اجتماعی، قومی یا بین الاقوامی سطح پر جب کوئی اہم سیاسی یا تمدنی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کا تخلیقی ردِعمل سب سے پہلے شعر کی زبان میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شاعری محسوسات کے ادراک، جمالیاتی قدروں کے عرفان اور ان کے فنی اظہار کا نام ہے۔ جب شاعر بادِ صبا کی آہٹ اور کلیوں کی مسکراہٹ کا تخلیقی لمس محسوس کر سکتا ہے تو ذات کے اندر اور باہر کا کہرام اس کی سوچوں میں کیا حشر برپا نہ کرتا ہوگا .... عبدالعزیز خالد بھی ایک حساس فن کار کی طرح اپنے عہد کی اذیتوں اور تلخیوں کا نہ صرف شعور رکھتے ہیں بلکہ ان اذیتوں اور تلخیوں کے فنی ردِعمل کو شعر کی روح میں سمونے پر قادر بھی ہیں ...... میں یہاں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ اس کا تعلق نفسِ مضمون سے اتنا گہرا بھی نہیں لیکن ان کی طویل نظم "یا رحمۃ للعٰلمین" کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں جو سقوطِ ڈھاکہ کے فوراً بعد اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ ملتِ پاکستانیہ کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کچھ اس مؤثر پیرائے میں کی گئی تھی کہ دل کے داغوں کا دھواں پلکوں پہ آکر جم گیا اور اشکوں کو بہنے کا یارا بھی نہ رہا ...... شاعر اپنے آقاؐ و مولاؐ کے دربار میں سر جھکائے کھڑا ہے آنکھوں میں اشکِ ندامت، ماتھے پر عرقِ انفعال اور ہونٹوں پر فریاد کہ یا رسول اللہ دیکھئے آپؐ کے غلاموں کی انجمن لٹ گئی ہے۔ یا حبیب اللہ دستگیری فرمایئے کہ آپؐ کے جاں نثاروں کے بازو کٹ گئے ہیں۔

ع بکھری پڑی ہیں آبروئے رفتگاں کی دھجیاں

آبروئے رفتگاں کی دھجیاں دکھانے کے بعد درد و سوز میں ڈوبی ہوئی یہ آواز دوبارہ ابھرتی ہے۔

ع پہنائی شامِ غریباں میں اکیلا ہے حسینؓ

یہ نظم خالد کی نعت کے ایک اچھوتے پہلو کو پیش کرتی ہے۔ اور ان کی نعتیہ شاعری ایک مخصوص اسلوب کی علامت بن کر ایک خاص نقطہ کی طرف آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور آبِ زر میں ڈوبے ہوئے جذبات صفحۂ قرطاس پر بکھر کر محبت اور عقیدت کے مظہر بن جاتے ہیں۔

"فارقلیط" اور منحمنا کی اشاعت سے قبل بھی "کلکِ موج" میں نعتِ سرورِ کونینؐ کے گہرے نقوش ملتے ہیں اور وہ رنگ جو فارقلیط اور منحمنا میں قوسِ قزح کے سات رنگوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ "کلکِ موج" میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

غلامِ محمدؐ کا رتبہ بڑا ہے ہر اورنگ زیب اس کے در کا گدا ہے
یہ گرد و غبارِ گذرگاہِ یثرب یہ کحل جواہر ہے خاکِ شفا ہے
یہاں کا ہر اک ذرہ ہے سنگِ پارس مُہوّس! یہ مٹی نہیں کیمیا ہے

شاعر کا وجدان سرود و مستی کے ہنڈولوں میں جھول رہا ہے۔

سراپا لطافت ہے جسمِ مبارک کہاں سایہ اس کا یہ نُورِ خدا ہے
پسینے کے قطرے ہیں لُولُوئے لالا بدن پر ملوچین کے عطرِ حنا ہے

اور پھر عالمِ وجد میں فرماتے ہیں

فرشتے درِ ناز کے پاسباں ہیں نگہ رو برو، کرسیٔ کبریا ہے
طفیلی ہیں تیرے یہ آفاق و انفس انہیں تیری خاطر ہی پیدا کیا ہے

"لحنِ صریر" کی رباعیات میں بھی حُبِ رسولؐ کی قندیلیں فروزاں ہیں۔ اور "مزمورِ میرِ مغنی" میں بھی نعت کا آہنگ ملتا ہے

محمدؐ ہے احمد ہے حاشر ہے وہ کریں اس کی تعریف اسطیبون

"فارقلیط" میں خالد نے آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ کے ذکرِ پاک سے لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت تک کے اہم واقعات کو دل کے سمندر میں ڈوب کر نظم کیا ہے۔ یوں "فارقلیط" حفیظ کے شاہنامہ اسلام کے بہت قریب آگئی ہے۔ انجیل مقدس میں جس عظیم المرتبت پیغمبر کی آمد کی بشارت دی گئی ہے اسے فارقلیط کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ خالد نے اس غیر مانوس اور اجنبی لفظ کو تقدس کا ایسا رنگ دیا ہے کہ یہ اسم اعظم زبان پر آتے ہی غالب کا یہ شعر ہونٹوں پر رقص کرنے لگتا ہے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیئے

"منحمنا" رسول اکرمؐ کا سراپا --- سیرت و کردار کا تذکرہ --- اور پھر خالد کا اسلوب اور ان کے الفاظ کا شکوہ، قصیدہ بُردہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔

متاعِ آدم و انجم، متاعِ لوح و قلم محمدؐ امّی محبوبِ کبریا صلعم!

محمدؐ انجمن کن فکاں کا صدر نشیں — محمدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم
حمود و حامد و احمد، محمدؐ و محمود! — کریم و میرِ کرام و مکرم و اکرم
جمیل و اجمل و کامل، مکمل و اکمل — ستم زدہ بشریت کا محسنِ اعظم

خالد کی نعت کا یہ پہلو یقیناً قابلِ تقلید ہے اور انہیں عام نعت گوؤں کی صف سے آگے لے جاتا ہے۔ خالد نے ہر جگہ قرآن و حدیث سے استدلال کیا ہے۔ قرآنی تلمیحات کی ندرت قدم قدم پر دامنِ دل کھینچتی ہے۔ الفاظ کی گھلاوٹ، لطافت اور نزاکت نے نعت کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں" اور ہندی زبان کی مٹھاس کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔

ہے جوت جس کی فسوں خیز چاندنی کی طرح — شریر جس کا پوتر اور آتما ہے پرم
شمار کرنے چلیں اس کی خوبیوں کا اگر — تو ساتھ چھوڑ دیں تھک تھک کے نیل سنکھ پدم

جب شاعر کے وجدان نے کالی کملی والے کے جلووں کا نظارہ کر لیا تو سب خدائی ہیچ نظر آنے لگی۔ یونانی دیو مالا کے اسرار دھندلکوں میں چھپنے لگے۔ اصنامیات کے بُت پاش پاش ہوئے۔ دیوی دیوتاؤں کے غاروں کی روشنی مدہم ہوئی اور شاعر جھوم اٹھا۔

جو خاکِ مزارِ مبارک کو سونگھے — وہ پھر عطر و عنبر کہاں سونگھتا ہے۔

خالد کی نعت میں جمود یا انحطاط نام کو نہیں" بلکہ مضامین کا تنوع، تخیل کی بلند پروازی، احساس کی شدت، جذبے کی نزاکت بیان کی سلاست اور اظہار کی بلاغت دل و دماغ کے ساتھ روح کو بھی طہارت اور پاکیزگی کی لذتوں سے آشنا کرتی ہے۔

کرتے ہیں باہم ثنا جس کی ستارے صبح کے — آخرِ شب مجھ کو بھی یا رب جھلک اُس کی دکھا
تیرے پاس آیا ہوں کشکولِ گدا یا نہ لئے — کر فقیرِ راہ کی حاجت روا اے بادشا

ان کی نعت جاذبِ دل و نظر۔۔۔ حُسنِ تراکیب کے زیور سے مزین۔۔۔ مضمون آفرینی کے نگینوں سے مرصع۔۔ لفظی و معنوی خوبیوں کا مُرقع۔ فصاحت، ملاحت اور حلاوت کی زمینوں پہ بکھری ہوئی چاندنی! کیف و مستی کے زمزموں کی فراوانی۔۔۔ عشق و محبت کے سرمائے کی بہتات، حُبِ بلال کی حکایات۔ بیان کی ندرت اور اظہار کی قدرت۔۔۔ خالد کی قادر الکلامی کا ثبوت۔۔

اُسی کو صاحبِ خُلقِ عظیم کہتے ہیں — وہی ہے نوعِ بشر کا معلمِ اعظم
جسے ہر اک نے کہا الامین والصادق — بہ بزم و رزم، عظیم و معظم و اعظم

قرآن و حدیث کے شعری پیکر ملاحظہ فرمایئے۔

ادیب آ کے طرزِ بیاں تجھ سے سیکھیں — سروشِ سخن، شہر یارِ نوا ہے
زمیں کے خزانے تجھے اُس نے سونپے — خدا کے عطیّے کو تو بانٹتا ہے

خالد کو درِ اقدس کی گدائی پر ناز ہے اور سرکارِ مدینہ کے ثنا خوانوں کی صف میں شامل ہونے پر فخر، ان کا تفاخر دیکھئے

ہے اعتبار پہ دار و مدارِ کارِ جہاں — یہی ہے فخرِ غلامانِ مصطفیٰؐ ہیں ہم

اور اس تفاخر کے بعد خالد کے انکسار کے ساتھ میں اپنے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ ؎

کہاں نعت و نامِ رسولِ تہامی — کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

عذرا مسعود

خالد کا فن

آج جب حفیظ صدیقی صاحب کی فرمائش ہی کہ میں "خالد نمبر" کے لئے اپنے مضمون[1] میں کچھ اضافہ کروں تو اس ضمن میں اپنی کم مائیگی کا احساس مجھے پریشان کر رہا تھا۔ لیکن حسنِ اتفاق کہیئے کہ اس عالم میں جب ان کے ایک مجموعۂ کلام "زنجیرِ رمِ آہو" کے ورق پلٹنا شروع کئے تو حسبِ سابق وہ صاحب سوال پھر بصورتِ سوال نظر آئے۔ سوال یہ تھا کہ ؎

صرصرِ وقت سے جب مشعلِ دل بجھ جائے   کیا مرا فن بھی مرے ساتھ ہی کھو جائے گا

مرقدِ خاک میں سو جائے گا،

یا جلا بخشے گا ایام کے ایوانوں کو!

اور یوں ایک بار پھر مجھے اس دشتِ بے کراں میں بکھرے ہوئے نخلستانوں کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑا۔

دراصل خالد صاحب نے ہی مجھے اس راہ پر ڈالا، یہ کہہ کر کہ بی بی! آپ میں بڑی صلاحیت ہے، آپ ضرور لکھا کریں۔ آپ جانیں تعریف و توصیف تو بیشتر طبائع کو بگاڑنے کے کام آتی ہے، جب تک کہ کرنے والا وسیع القلب اور سننے والا عالی ظرف نہ ہو چنانچہ میں نے اُن کی یہ رائے سُن کر پہلے اپنے ظرف کو ٹٹولا اور چھلکنے کا کوئی خطرہ نہ پایا تو صاحب موصوف کو ہی اپنے لئے مقیاس الصلاحیت بنانے کی ٹھانی۔

کسی نے مجھ سے یہ کہا کہ خالد صاحب تو ہر ایک کی تعریف میں یونہی رطب اللسان رہتے ہیں، تم کس چکر میں گرفتار ہو گئیں — میں چند ساعتوں کے لئے الجھی تو ضرور لیکن جب غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ نفسا نفسی کے اس زمانے میں بہت کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو عادتاً نہیں بلکہ دانستہ دل کھول کر بے لوث جذبات کے ساتھ کسی کے خصائل کے معترف بھی ہوں اور اعتراف و اظہار سے گریز بھی نہ کریں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ دوسروں کی وہ خوبیاں جو اُن کی اپنی نظروں سے پوشیدہ ہوں اُنہیں سراہیں بھی اور اجاگر کرنے میں ان کی مدد بھی کریں۔ اس خیال کی روشنی میں میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ خالد صاحب بھی عارضِ ہستی پر ایک ایسا ہی خال ہیں جس سے اعتماد حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ اندیشہ ہائے دور و دراز منفی سے مثبت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اپنی ذات کے آئینے پر شک و شبہات کی پھیلی ہوئی دھند چھٹ جاتی ہے اور وہ صاف و شفاف ہو کر جہاں نما بن جاتا ہے۔

خیر اُن کی رائے اور اپنے ظرف کو پرکھ کر اپنی جستجو کا آغاز کیا۔ ان کا کلام جمع کیا اور اس کے مجموعی مطالعے سے جو تصویر میرے ذہن میں بنی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ خالد صاحب کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور وہ ہے جس میں نوجوان شاعر کے ناپختہ ذہن نے فطرت کے بکھرے ہوئے حسن میں سے اپنی پسند کو تلاش کیا، اور برملا

---

[1] عبدالعزیز خالد کے فن پر ایک نظر — مطبوعہ "تحریریں" جون ۱۹۷۳ء

اُس کا اظہار بھی کیا۔ کچھ مقامات پر اپنی گستاخ نگاہی و بے باک گواہی سے لطافتِ حُسن کو مجروح کرنے میں انفرادیت سمجھی۔ اس دور کی شاعری میں عشق و رومان طرزِ جدید میں ہم آہنگ اور ایک دوسرے میں مدغم ملتے ہیں۔ طبیعت کی اُفتاد بھی بیشتر حُسنِ مرئی کی جانب ہے۔ مثلاً "کفِ دریا" میں ایک شعر ہے ؎

دلِ شاعر طلب کرے ہر رات　　　اجنبی جسم، اجنبی بستر

لیکن جلد ہی آپ اس حقیقت کو محسوس کر لیتے ہیں کہ جن راستوں پر آپ خرد کی پاسبانی میں چلنا چاہتے ہیں، وہاں ؎

منزلِ فن دُور ہے عظمتِ فن دُور تر !　　　آہوئے دشتِ ہنر ہوتا ہے مشکل سے رام

چنانچہ نگراہی کے اس دَور سے نکل کر یہ کہتے ہوئے اس دشتِ بلاخیز میں بڑی جرأت و جذبہ سے قدم رکھتے ہیں کہ ؎

کبھی رُکتے نہیں رہوارِ تمنا کے سوار　　　تم ہو، جولانگہِ آفاق کی پہنائی ہے

اور جب دوسرے دَور میں پہنچتے ہیں تو جلد ہی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاعر کے احساس کی شدت اُسے کسی اور ہی جانب کشاں کشاں لئے جا رہی ہے۔ ایسا جہاں جس کی راہیں نئی اور منزلیں انوکھی ہیں۔ آپ بے قرار ہو کر یہ پوچھتے ہیں ؎

اس عمرِ رائیگاں کا مصرف کوئی بتاؤ　　　آشوبِ آگہی سے چھٹتا ہے کیسے انساں

یہاں ان کا احساس و اعترافِ حسن جسم کی قید سے آزاد ہو کر روحِ حسن کی جانب مائل بہ پرواز ہے۔ اس میں ان جذبوں کو زبان ملتی ہے جن کی لطافت و طہارت مسلّم ہے۔ "زنجیرِ رمِ آہو" میں ہے کہ ؎

جوہرِ تخلیق ہے بادۂ مینا گداز　　　ہر نظر اک ابتلا، ہر نفس اک امتحاں

اور ؎

پائے خضر کے لئے راحتِ منزل نہیں　　　بالِ ھما کیلئے شاخِ نشیمن کہاں

لیکن اب بھی یہ زبان اتنی واضح نہیں جتنی ہونی چاہیئے۔ شاعر کہیں گم اور کچھ کھویا سا ہے۔ کیونکہ وہ اس راز سے آگاہ ہو چکا ہے کہ ؎

سختیٔ دشت و دیار صدقِ طلب کا عیار　　　راہِ تمنا میں ہے ہر قدم اک ہفت خواں

اس لئے لفظوں کے حصار میں رہ کر منزل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ 'راہ و رسمِ منزلہا' یوں بیان کی ہے کہ

مرے سامنے رہگذر اپنے دامن میں جلوے سمیٹے
جنونِ تماشا کو آمادۂ امتحاں کر رہی ہے

اس مقام پر پہنچ کر جب مشکل اور اجنبی الفاظ کے استعمال میں زیادتی ہونے لگتی ہے تو اکثر اوقات خیال و جذبے کے اظہار میں فکر کا عمق ملتا ہے۔ قلم کی روانی البتہ کہیں کہیں رُکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بھی میرے مشاہدہ میں ہے کہ قارئین اس کی زبان اور لب و لہجہ کی علمیت سے مرعوب ہو جاتے ہیں لیکن بین السطور اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، اور یوں دیگر زبانوں کے الفاظ کے گوناگوں استعمال و اظہار سے انہیں یہ شاعری بسا اوقات محض لسانی تجربات کا مرقع لگتی ہے اور ؎

جسے شعور نہ ہو لذّتِ معانی کا　　　ہمیشہ بندشِ الفاظ میں رہے اُلجھا

یہ کسی بے شعور شاعر اور کسی کم فہم قاری دونوں پر ثابت آتا ہے :

خیر، کچھ عرصہ اس دشتِ جنوں میں بادیہ پیمائی کے بعد آخرِکار اندرونی خلش سے بے قرار ہو کر یہ پکارتے ہوئے تیسرے دَور میں پہنچ جاتے ہیں کہ ؎

تم جو چاہو تو تمہارے بھی نقوشِ پا
ظلمتِ دشت میں ہوں رہروِ خستہ کو دلیل

اور قدرے مطمئن ہو کر یہ اقبال کرتے ہیں کہ ؎

یہ محسوس ہوتا ہے گویا حصارِ ہوس سے نکل کر
میں محبوب کی گرم و آسودہ آغوش میں آ گیا ہوں

یہاں شاعر ذہنی پختگی سے مالا مال ہو کر حمدِ الٰہی میں گم اور عشقِ رسول میں گھلنے لگتا ہے۔ قوم و ملت کے غم میں گھلنے، اور وطن کے نام پر مر مٹنے کی تمنا کرنے لگتا ہے ع

اک فردِ منتخب ہے عبدالعزیز خالد ۔۔۔ رہتا ہے اس کے در پے، فکرِ زوالِ امت
فردوسِ گمشدہ کے آثار ڈھونڈتا ہوں ۔۔۔ اے عصمتِ نیاگاں! مشکور ہو یہ محنت!

حسن اشیاء اب بھی بہ صورت مجسم اس کی نظروں میں رہتا ہے لیکن اب اس کا حسنِ نظر انہیں رفعتیں عطا کرتا ہے اور ثریٰ سے تا بہ ثریا، سمک سے تا بہ سماک لئے لئے پھرتا ہے۔ "ذکر و فکر" کے زیرِ عنوان کہتے ہیں ؎

دیدہ و دل کے حجاباتِ کہن چاک ہوئے
رات کی تیرہ فضا اس سے پگھل جائیگی ۔۔۔ نورِ خورشید سے رنگیں ہے سحر کا دامن
جزر و مد بربطِ گیتی کے حزیں نغموں کا ۔۔۔ میرے آئینۂ افکار میں ہے عکس فگن
بزمِ آفاق میں برپا ہوں وہ اقدارِ حیات
پھر سے جو عظمتِ انساں کو نمایاں کر دیں
یادِ ایام کے جادو سے نکل کر خالد
زورِ کردار سے افلاک کو رقصاں کر دیں

اور وہ شاعر جو کبھی یہ کہتا تھا کہ ؎

زندگی میرے لئے
اک نگارستانِ نغمہ، اک خیالستانِ حسن
ذوقِ پروازِ خیال و شوقِ پیچ و تاب ہے

اب اقبال کے مکتبۂ فکر سے منسلق ہو کر یہ کہنے لگا ہے کہ ؎

کشمکشِ ذہن سے فکر کی بالیدگی ۔۔۔ پرورشِ اشک سے تازہ نوائے گلو
اور
نالۂ مرغاں وہ کیا جس میں نہیں سوز و ساز ۔۔۔ گوہرِ غلطاں وہ کیا جس میں نہیں آبرو

اس دور کے متعلق میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ شعری طرب خیزی و فسوں سازی کوئی شیوۂ ساحری ہی نہیں بلکہ ستاروں پہ کمند ڈالنے والے اس جہانیانِ جہاں گرد کا بھی خاصہ ہے، جو ماضی حال مستقبل کے تمام زمانوں میں یکساں گداختگی، گہرائی و گیرائی، فنی و فکری بالیدگی، اور جوش و خروش کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ زادِ راہ کی بھرتی میں نہیں بلکہ اس کی تلاش میں — ایک ایسا ہی سفر عالم سرخوشی و وارفتگی میں انہیں "منحمنا"، "فارقلیط" اور "حمطایا" کی بارگاہِ ناز میں یوں کشاں کشاں لے جاتا ہے کہ یہ وہاں پہنچ کر جبینِ نیاز میں تڑپنے والے سجدوں کی زندہ تفسیر بن جاتے ہیں اور بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں ؎

ہر طرف جلوہ ہے تیرا، ہر طرف تیرا ظہور ۔۔۔ اسمِ اعظم ہے ترا اسم، اے محمد مصطفیٰ

تیرے پاس آیا ہوں کشکولِ گدایانہ لئے
کر فقیرِ راہ کی حاجت روا، اے بادشاہ

بعد مرنے کے مرے، میرا سخن باقی رہے
اے حبیبِ خالق اقرأ باسم ربک

شاعری ہو یا ادب کسی خیال یا جذبے کو لفظوں کے قیمتی لباس میں ملبوس کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اصل شے، قیمت سے کہیں بڑھ کر، اس کا حسن و دلفریبی ہے اور شعر کا حسن اس کے کیف و گداز میں ہے۔ یعنی سماعت کے لئے کیف زا ہو اور قلب و نظر میں گداز پیدا کرے۔ شعر جو ذہن کی رفعتوں سے اترے، اور دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ فہم و ادراک کے لئے بلند نگہی کا پیامبر ہو، اور جس کی پہنائیوں میں ڈوبیں تو روح کے دریچے روشن ہو جائیں۔

بہ مُقتضائے جبلّت میں ہر انسان بہ قدرِ ہمت کسی نہ کسی انداز میں شریک رہتا ہی ہے کیونکہ یہ اس کی تخلیق کا مقصد بھی ہے اور منتہا بھی۔ اس کا ہر قول و فعل گوناگوں تغیرات سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی بھی فنکار اپنی طبع کی خصوصیات سے کہیں جنم لیتا ہے، آنکھیں کھولتا ہے اور قلب و نظر کی حرارت سے گرد و پیش کو روشن کر کے ناگفتنی کو گفتنی کر دکھاتا ہے۔ حالات مساعد ہوں یا مثبت، نامساعد ہوں یا منفی، وہ اپنی سعی کوشش کئے جاتا ہے اور یہی ایک فنکار کا مجاہدہ ہوتا ہے ؏

اے بندۂ تساہل، فن اک مجاہدہ ہے
کر آرزو کے داغوں سے سینے کو گلستاں

اور شعر کی مقصدیت تو اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس میں جذبہ و احساس کی گرمی بھی ہو، عمل کی حرکت بھی اور توانائی کا جوہر بھی — یہی ہماری پرکھ کا معیار ہونا چاہیئے۔ رہی حسن پرستی و رومان پسندی تو وہ کوئی گناہ نہیں۔ البتہ ارفع یہی ہے کہ سنجیدگی اور پاکیزگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو، تاکہ حسن کا تقدس قائم رہے اور خلوصِ نظر بھی مجروح نہ ہونے پائے۔

آدمی کی عظمت اس کے اعمال میں پنہاں ہے اور علم و ادراک بھی کسی کی شخصی میراث نہیں ہوتی۔ رہی شاعری تو بقول خالد صاحب وہ حرفِ بارِ امانت ہے اور کچھ بھی نہیں۔ جادۂ شعر میں کئی ایسے سخت مقام بھی آتے ہیں جب طبیعت ہر اک شے سے متنفر اور بیزار ہوتی ہے اور پھر ایسا لمحہ بھی آتا ہے جب دلِ شاعر میں برپا ہونے والا طوفان یوں نظم و نوا میں ڈھلنے لگتا ہے جیسے کنارِ بحر پہ بکھری ہوئی ریگِ پریشاں کے چند ذرے صدف کے سینے میں اتر کر گوہرِ آبدار کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی یہ دولت تہِ دریا میں چھپے ہوئے دفینوں کی طرح کسی ماہر غوطہ زن کے ہاتھ لگتی ہے۔ خالد صاحب شاعری سے متعلق اپنا نظریہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ؎

ادب و جذبہ کو فرزانے سمجھتے ہیں جنوں
شاعری ملتی ہے آغوشِ قنوط و شک میں

شاعری جذبہ و وجدان ہے فکر و ادراک
دلِ خلاق کو ملتا نہیں مر کے بھی سکوں!

راکھ سے آگ ڈھکی ہو تو وہ کیا آگ نہیں،
شق رہے سینۂ گریبانِ سحر کی صورت
شعر خاموش پر اسرار عمق سے ابھرے
کہ ہے سرچشمۂ تخلیق اک اندھی قوت

اور پھر یہ کہتے ہیں کہ ؎

سامنے دشتِ ابد پھیلا ہے تا حدِ نظر
کون ہے شمعِ صداقت کا جو پروانہ بنے

نارِ غم میں جلے گردِ رہِ جانانہ بنے
دل پہ جو گزرے کہے کافر و دیوانہ بنے

زندگی نذرِ حقیقت کرے، افسانہ بنے!

خود کو قربان کرو عظمتِ فن کی خاطر   ضبط و ایثار ہے فیضانِ سخن کی قیمت

شاعر جو فطرت کا رمز شناس ہوتا ہے، اپنے ان تاثرات کو شعر میں ڈھالتا اور وارداتِ قلب کو بیان کرتا ہے، جو اس کی رُوح کو جھنجھوڑ کر ادراک کو بیدار کرتے ہیں۔ اب اگر وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار سادگی و خلوص سے کرے تو اس میں حسن خوبی تو ضرور پیدا ہوگی، نگاہوں کو خیرہ کرنے والی شان و شکوہ نظر نہیں آئے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پسند اور احتیاج میں کشمکش شروع ہوتی ہے۔ پسند کہتی ہے سادگی و صداقت ہو۔ احتیاج کا تقاضا ہے۔ شان و شکوہ ہو، تاکہ کم فہم بھی ایک بار مسحور و مرعوب ہو جائے پھر شاید اعتراف کرنے کے لئے سمجھنے کی کوشش بھی کر ڈالے۔

خالد صاحب کی فکری شاعری میں جمال پرستی کی جو گھلاوٹ ملتی ہے وہ اگر کہیں کھٹکے تو ہم اسے ایک شاعر کا پیدائشی حق سمجھ کر نظر انداز کر سکتے ہیں کیونکہ میرے اندازے کے مطابق جذباتی طور پر اوّل اوّل آپ جلال سے زیادہ جمال سے متاثر تھے لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی بھی مختلف ادوار میں گوناگوں تجربات و مشاہدات سے گزرتی ہے، جن کے زیر اثر انسان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ اپنے ذہنی جھکاؤ کی مناسبت سے یا تو غور و فکر کا عادی ہو جاتا ہے یا ناپسندیدہ حالات و مناظر سے گریز کرنا سیکھ لیتا ہے اور لاابالی پن سے حسنِ ظاہر کی چاہت میں فرار ڈھونڈتا ہے۔ خالد صاحب غور و فکر کی جانب مائل ہو گئے اور یوں ان کی شاعری میں زُہد و عشق خوب صورت امتزاج کے ساتھ اُبھرنے لگے۔ یہی جذبے کبھی محبوب پر نثار ہونے کی دعوت دیتے ہیں، تو کبھی عشقِ رسولؐ میں ڈھل جاتے ہیں۔ "تذکرۂ شوق" کے زیر عنوان کہتے ہیں ؎

مجھے ازل سے ہوا ودیعت - غمِ محبت، غمِ زمانہ
دماغ کفر آشنا و وجدانِ مومنانہ - حقیقت و شوخیٔ فسانہ -
مجھے تمنائے سروری نے عطا کیا ہے
گدازِ الحانِ ساربانان - مذاقِ طوفِ دیارِ حرماں
ازل سے لکھا تھا کلکِ قدرت نے طبعِ خالد کو عاشقانہ
کہ یوں ہی جذب و گریز کی کشمکش سے ہو عارفِ زمانہ

ایک اور بات جو مجھے محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں شوکتِ الفاظ کے ساتھ ساتھ جذبوں میں صداقت کی سادگی بھی ہے۔ الفاظ عالی شان بھی ہیں اور تخیل بھی مگر اظہار سادہ ہے۔ اسی لئے بسا اوقات کہیں کہیں شعری ترنم کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ غرض — میری آتشِ شوق تو بھڑک ہی رہی تھی اس لئے ورق پلٹتی رہی اور یوں اک جہانِ معنی کے بام و دَر وا ہوتے رہے۔ ہر چند کہ زبان کی بلاغت ذہنی کاوش کی طلب گار ہے۔ تلمیحات و روایات آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح اَن گنت ہیں اور کہیں کہیں رمز و کنایہ اشعار کے لئے ایک ایسے نقاب کا کام دیتے ہیں کہ — صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں — تاہم رفعتِ تخیل و مضمون آفرینی کے علاوہ فکرِ عمیق سے بھرپور ہونے کے باعث بیشتر کلام قاری کو اپنے طور پر متاثر کرتا ہے۔ علم و معانی کی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی تمنا مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔ دیکھیئے اب عالمِ ذوق و طغیانِ شوق کا والہانہ پن کن دھاروں کی سیر کرتا ہے جن میں چٹانوں کا سا ٹھہراؤ بھی ہو اور دریاؤں کا سا بہاؤ بھی۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ اس دریا کو کوزے میں بند کرنا میرے لئے ممکن نہیں، البتہ ہمت نہیں ہاروں گی کیوں کہ بقولِ شاعر ؎

کنارِ بحر پہ غواص رُو بہ قبلہ ہے   کہ بے دعا گہرِ شاہگاں نہیں ملتا

کوئی مقام بھی ناممکن الحصول نہیں   کوئی مقام بھی بے امتحاں نہیں ملتا

ان امتحانوں سے مجھے قدم قدم پر گزرنا پڑ رہا ہے، اور وہ بھی بین الاقوامی سطح پر، کیونکہ ان کی ذات کی وسیع النظری ان کے اشعار میں بھی رچی بسی ہوئی ہے اور یوں ان کی شاعری کی حدیں اگر ایک جانب از بلخ تا بخارا پھیلی ہوئی ہیں تو دوسری جانب انگریزی، عبرانی، یونانی، ہندی، اور سنسکرت وغیرہ کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ جب حالات کی نازکی کا یہ عالم درپیش ہوا تو ذوق و شوق کا وہ بحرِ ذخار جو میرے دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لے رہا تھا، خس و خاشاک کی مانند بہتا نظر آیا۔ تاہم ان کا مشورہ قبول کرتے ہی بنی کہ ؎

طبعِ وقاد کی جودت تو مسلم لیکن   اپنے افکار کو اک نقطے پہ مرکوز کرو

تاکہ پیدا ہو نظر میں تب و تابِ جوہر   قطرۂ آب بنے سوزِ دروں سے گوہر

اور اب میں اسی آب و تاب کے انتظار میں نگاہیں فرشِ راہ کیے ہوں۔

جناب خالد کی مشکل نگاری کے چند معترضین ان سے اسلوبِ بیان و زبان میں تبدیلی کے خواہاں ہیں جو صرف ایک خاص حد تک ہی ممکن ہے کیونکہ میرے خیال میں زندگی جن حقائق سے عبارت اور جن کے علم کا مجموعہ ہے ان میں بنیادی حقیقت بقول مختار مسعود یہ ہے کہ:

"ہر شخص وہی ہوتا ہے جو وہ بنتا ہے اور ہر انسان وہی بن سکتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔"

اس لئے کسی بھی فنکار سے یہ کہنا کہ جو وہ ہے وہ نہ ہو، یعنی بدلنے کی کوشش کرے اور اپنی صفات و خیالات کو آپ کے تجویز کردہ سانچے میں ڈھالنے کی سعی کرے تو یہ امر شاید ناممکن نہ ہو البتہ اس پر ظلم ضرور ہوگا اور پھر میں تو یہ کہتی ہوں کہ اپنی تخلیق پر انسان کو اختیار ہی کب ہے۔ خالقِ حقیقی تو تنہا اسی کی ذات ہے پھر آمد کو آورد میں بدلنے کی خواہش کہاں تک جائز ہے؟

دراصل جہاں تک میرا ذہن رسا ہوتا ہے ہم لوگ کچھ اس قدر سہل انگار واقع ہوئے ہیں کہ خود حظ اٹھانے کے لئے بھی محنت نہیں کرنا چاہتے۔ ہر وہ شے حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خود بہ خود ہماری دسترس میں آجائے اور یہ صریحاً انصاف کے منافی ہے۔ ورنہ ذرا سی توجہ سے ہر شعر دو آتشہ ہو جائے۔ یوں بھی حصولِ علم کے لئے اگر چین کے سفر پر آمادہ ہوا جا سکتا ہے تو کلامِ خالد بہر حال آسان ہے۔

بات نہ تخیل کے ابہام کی ہوتی ہے اور نہ نگارش کے ثقل کی، بلکہ اصل شے شعر کی روح اور شاعری کا نصب العین ہے۔ فہم امروز و فکر فردا ہے۔ افکار کی عظمت اور الفاظ کے معانی ہیں — عقائد کی صحت اور جذبات کی عظمت جس شاعری کا حقیقی جوہر ہوں اس کے اسلوب و اظہارِ بیان کی ندرت صرف انہی کو مایوس کرتی ہے جو محنت سے گریز کر کے تساہل برتتے ہیں۔

ہماری سہل انگاری کا یہی عالم رہا تو ہم کشکولِ گدایانہ اٹھانے کے قابل بھی نہ رہیں گے۔ فقط اک جنبشِ لب سے خوانِ یغما کا حصول اور باغِ عدن کے اشجارِ بار آور سے لذت کام و دہن ہی اگر ہمارا مطمحِ نظر ہے تو پھر جنت سے نکالے ہوئے انسان کو اول اپنے آپ کو جنتی ثابت کرنا ہوگا۔ پھر وہ ان کا حقدار خود بخود ہو جائے گا۔ وہ وقت کب آئے گا۔ کون جانے! البتہ اس لمحے سے قبل کسی کے خونِ جگر سے اپنے چراغ روشن کر کے یہ کہنا کہ روشنی کم ہے، نہ تو مناسب ہے اور نہ جائز!

اس ضمن میں یہ ضرور کہوں گی کہ جس تجرباتی دور سے آج ہم گزر رہے ہیں اس میں لطف انگیز تفریحی شاعری نہیں بلکہ خوابِ غفلت سے بیدار کرنے والے آتش نفس و شعلہ بجاں اشعار چاہئیں۔ جب کسی قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیتیں ماند پڑ جائیں، مایوسیاں و نامرادیاں ڈیرے ڈالنے لگیں تو ایسے شاعروں کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنی پکار سے مردہ دلوں میں زندگی کی حرارت پھونک

دیں ۔ فتح و نصرت کی راہ دکھائیں اور صبح امید کا پیغام دیں ۔ چہار سو چھائی ہوئی تیرگی میں کسی جگمگاتی قندیل کی طرح روشن اور پر نور ستارے کی طرح ضوفشاں ہوں ۔ عظیم بھی ہوں اور محبوب بھی ، رہے خالد صاحب تو میرے خیال میں انہیں عظمت اور محبوبیت دونوں ہی حاصل ہیں :

خوباں شکستہ رنگ خجل ایستادہ اند   در محفلے کہ تو بہ مقابل نشستۂ

کیونکہ مشکل کوشی عظمت عطا کرتی ہے اور بندگی سے بلندی نصیب ہوتی ہے انہوں نے اپنے مزاج و اخلاق کے حسن کی گرمی سے اپنے کلام کا تمام تر ثقل پگھلا رکھا ہے اور ہونے والے اعتراضات کے باوجود ان کی شاعری کا لب و لہجہ اگر منفرد ہے تو اسلوب میں جدت فکر کی جھلک ملتی ہے اور ان کی اس انفرادیت میں جو عظمت ہے اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ "سومی" نظم معرا (بلینک ورس) میں ایک کامیاب کوشش تو ہے اور اس میدان میں غالباً آپ میر کارواں بھی ہیں جب کہ "پرواز عقاب" آزاد آہنگ کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ اسی طرح "گیتانجلی" اور "غزل الغزلات" کی صورت میں دیگر مصنفین اور مختلف زبانوں کے شاہکاروں کو اردو کا پیراہن عطا کر کے نہ صرف شعر و ادب کی دنیا میں قابل قدر اضافہ کیا ہے ، بلکہ فن شعر میں کئی دریچے وا کئے ہیں اور کئی نئی راہیں سجھائی ہیں ۔ آج جب کہ وہ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار و بیقرار ہو کر اُسے ابھارنے کی سعیٔ بلیغ کا پرچم تھام ہی چکے ہیں تو خدا کرے یہ کبھی سرنگوں نہ ہونے پائے ۔ آمین

میرے خیال میں وہ ایک ایسے شعری ادب کے نام لیوا بن چکے ہیں جس میں زندگی اپنی تمام ادبی قدروں سمیت موجود ہے ۔ جذبات و احساسات کے اظہار میں اگر بے باکی و تفکر کا امتزاج ہے تو زبان و بیان میں اجنبی الفاظ کی آمیزش و اختلاط ان کی شاعری کا وصف ہے اور ان کی علمی ذہانت و قادر الکلامی سے ان کا قاری ، اگر چاہے تو بڑی جان دار توانائی حاصل کر سکتا ہے ۔ میں سمجھتی ہوں ان کا یہ ناز و اعتراف ہرگز خود بینی پر مبنی نہیں ہے کہ ؎

خدا کی دین ہے ادراکِ آگہی مجھ کو   ہے سوز و ساز کا سرچشمہ شاعری مجھ کو
میں اپنے طالع میموں پہ کیوں نہ ناز کروں   ملی ہے ملک سخن کی پیمبری مجھ کو

اور یہ بھی ایک درخشاں حقیقت ہے کہ ؎

یہ ظلمتوں کا تجمل شرارہ ریز سہی   سرور نور محبت مٹا نہیں سکتا !
ہوائے یاس کا جھونکا بہت ہی تیز سہی   چراغ جوشش تمنا بجھا نہیں سکتا !

ناامیدی کفر ہے اور میں ایک روشن سحر کی منتظر ہوں ۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ خالد صاحب اپنے کلام کو غیر سنجیدہ اشعار و غیر ضروری اضافوں سے پاک کرنے کے لئے انتخاب میں مصروف ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ بالآخر انہوں نے آب حیات تلاش کر ہی لیا ہے جسے نوش جاں کر کے نہ صرف وہ زندہ رہیں گے بلکہ زندۂ جاوید ہو جائیں گے ۔

یوں بھی جست و بود میں ایک پل کا ہی تو فاصلہ ہے ۔ یہ فاصلہ کبھی کبھار زمانوں پر محیط ہوتا ہے اور کبھی پلک جھپکنے میں طے ہو جاتا ہے ۔ اگر وہ سالار کارواں بن کر راہ روانِ منزل کو صراط مستقیم پہ ڈال سکے ۔ بھٹکنے سے بچا کر فاصلوں کی خبر دے سکے ، فغان نیم شبی و سجدۂ سہو و سحر کے فسوں سے آگاہ کر سکے تو آنے والی نسلیں انہیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی ۔ ایک روز آئیگا جب ان کا شمار بھی اہل احسان

میں ہوگا اور ان کا فن ایام کے [illegible]

اکرام سانبوی

خالدِ سخن ــــ خالد

عبدالعزیز خالد کا نام اُن بڑے شعراء کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جنہوں نے روایت اور انفرادی صلاحیتوں کے خوبصورت امتزاج سے اردو شاعری میں نئے محرکات اور نئے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کی شاعری موضوعیت اور معروضیت کا سنگم ہے۔ خالد کا وجدان اگر روایت کی روشنی سے منور ہے تو ان کا شعور جدیدیت کی کرنوں سے تابندہ ہے اور چونکہ شعر کو بقول ایک معروف نقاد کے شاعر کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس لئے روایت اور جدیدیت کا یہ خوش گوار توازن خالد کی شخصیت کے علاوہ ان کی شاعری کی وسعتوں پر بھی محیط ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں روایت اور جدیدیت کے ڈانڈے آپس میں اس طرح مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا کسی طور ممکن نہیں رہا۔

خالد کی شاعری تنوعِ افکار اور موضوعات کی رنگا رنگی کے اعتبار سے یونانی صنمیات سے لے کر موجودہ دور کی ٹھوس حقیقتوں تک کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا بلند تخیل جو عالمانہ فضاؤں میں محوِ پرواز رہنے کے باوجود زمینی رشتوں سے قطع تعلق نہیں کرتا اور مختلف النوع اشیاء کے مابین رابطوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اپنی نمائش کی خاطر اظہار کے مختلف سانچوں کو اپنے تصرف میں لاتا ہے اور کبھی غزل کے نازک روپ میں ظاہر ہوتا ہے تو کبھی نظم کے دلکش پیرہن میں روئے حسین دکھاتا ہے کبھی نعتِ رسول ؐ کے ملکوتی لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے تو کبھی منظوم ڈراموں یا تمثیلوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ خالد نے جن مختلف اصنافِ سخن میں اپنی بلندیٔ فکری، وسعتِ نظر، علمی تبحر اور جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں ان میں سے ایک صنف منظوم ڈرامہ یا تمثیل کی بھی ہے۔ ان کی بیشتر تمثیلیں اسرائیلی اساطیر اور یونانی صنمیات سے ماخوذ ہیں جو شاعر کے ہاتھوں ایک نئے قالب میں ڈھل کر ایک نیا رنگ اور نیا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔

ادبیاتِ عالم کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ منظوم ڈراموں اور منظوم تمثیلوں پر مشتمل ہے ہومر کی "ایلیڈ" اور "اوڈیسی"۔ "طاسو کی یروشلم آزاد"۔ کالی داس کی "شکنتلا"۔ بھرتری ہری کی "عبرتناک سرگزشت" اور اسپنسر کی "فیری کوئین"۔ اسی طرح سفوکلیز اور ایلکائیس کے منظوم ڈرامے اور شیکسپیر کے المیے (TRAGEDIES) اور طربیے (COMEDIES) اسی نوع کے شعری کارنامے ہیں۔

اردو میں منظوم ڈراموں کی روایت کچھ ایسی قدیم نہیں جو چند منظوم ڈرامے یا ڈرامہ نما چیزیں لکھی گئی ہیں وہ خاص قابلِ ذکر نہیں ہیں ماسوائے آغا حشر کے ڈراموں اور اقبال کی چند ڈرامائی تمثیلوں کے۔ آغا حشر کے ڈراموں میں جو فکری و فنی کمزوریاں ہیں ان سے بحث کرنا تحصیلِ لاحاصل ہوگا۔ کہ وہ اظہر من الشمس ہیں البتہ اقبال کے تمثیلی تجربات نہایت قابلِ قدر ہیں اقبال نے پہاڑ اور گلہری، بچہ اور جگنو، چیونٹی اور عقاب سے لے کر ابلیس و جبرائیل، ابلیس و یزداں اور ابلیس کی مجلس شوریٰ تک بعض بہت مختصر اور بعض کسی قدر طویل ڈرامائی

تمثیلیں لکھی ہیں۔ ان میں سے شمع و شاعر، پیر رومی و مرید ہندی، خضر راہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ اور ابلیس و جبرئیل دنیائے تمثیل میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے
اقبال کی اسی قائم کردہ روایت کو عبدالعزیز خالد نے بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی تمثیلوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زردِ داغِ دل، برگِ خزاں، ورقِ ناخواندہ، دکانِ شیشہ گر اور سلوبی۔ انہوں نے تمثیل نگاری کی مدد سے ہر قسم کے مضامین کو نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے مثلاً عشق و محبت کی واردات، اخلاقی و روحانی مسائل اور فطرتِ انسانی کے اسرار وغیرہ۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر برگِ خزاں کے پہلے ڈرامے کو لیجیے جس کا عنوان ہے "قابیل" اس میں انسانِ اول حضرت آدم، طلوعِ آفتاب کے وقت خالق و مالکِ کائنات کی تعریف و توصیف میں یوں رطب اللسان ہوتے ہیں۔

آدم ۔ ہے بے نیاز علائق وہ ذاتِ بے ہمت — صفات و ذات میں یکسر منزہ و یکتا
تمام حمد و ستائش اسی کو ہے زیبا — وہ جس نے کن سے کیا کائنات کو پیدا
وہ جس نے دے کے مذاقِ تجسسِ اشیاء — کفِ غبار کو سونپی خلافتِ دنیا

بدیعِ ارض و سما لا الٰہ الا اللہ

اسی طرح حوا، ہابیل، اقلیما اور یہودا بھی معبود و مسجودِ حقیقی کے حضور نذرانۂ خلوص و عقیدت پیش کرتے ہیں مگر قابیل لب بستہ کھڑا رہتا ہے اور حضرت آدم کے استفسار پر اپنی ذہنی کجروی کا یوں اظہار کرتا ہے۔

قابیل ۔ الم ہے میرے مقدر میں ابتہاج نہیں — مجھے نیاز فروشی کی احتیاج نہیں
عطا کیا ہے مجھے غم نے ذوقِ استغنا — مرا سکوت ہے اک احتجاج سرتاپا

حضرت آدم اُسے بڑے دلکش پیرائے میں سرزنش کرتے ہیں اور مقامِ بندگی کی "عاجزانہ رفعتوں" سے آگاہ فرماتے ہیں مگر قابیل دنیا کی ہر شے سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس پر حضرت آدم فرماتے ہیں۔

آدم ۔ بذاتِ خود بشریت ہے نعمتِ عظمیٰ — یہ عرصۂ سحر و شام میں مجالِ نفس
یہ بیکرانہ و مستانہ زندگی کے فیوض — کہ جن سے عہدِ الست استوار ہوتا ہے
تری نظر میں سزاوارِ اعتبار نہیں؟ — ہوا نہ ملکِ احساں کبھی مذاقِ سلیم

کہ اہلِ ہوش کو سمع و بصر ہیں عینِ یقیں

اردو شاعری میں نعت کا موضوع اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو شاعری پرانی ہے۔ دکنی دور سے لے کر عہدِ حاضر تک کم و بیش سبھی مسلم اور بہت سے غیر مسلم شعرائے اردو نے کسی نہ کسی رنگ میں سرورِ کائنات (صلعم) کے حضور گلہائے عقیدت و خلوص پیش کیے ہیں اقبال، حالی، امیر مینائی، محسن کاکوروی اور مولانا ظفر علی خان نے تو نعت کو ایک نئی وسعت اور نیا اسلوبِ اظہار عطا کیا۔ خالد نے اس بیش بہا ذخیرہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی نعتوں میں علم و فن کے ساتھ ساتھ خلوص و محبت اور عشق و عقیدت کا جو والہانہ اظہار ملتا ہے وہ درحقیقت ان کی مجموعی شخصیت اور اس میں پنہاں سوز و سازِ حیات کا ایک عکسِ لطیف ہے ان کا ایک ناقابلِ فراموش شاہکار فارقلیط کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ طویل نعتیہ نظم اپنی اٹھان اور جذبے کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اس میں روحانی ترفع اور عشقِ رسولؐ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ فارقلیط پاکیزگیٔ خیالات، صداقتِ جذبات، خلوصِ بیان اور ندرتِ اظہار کے نقطۂ نظر سے خالد کی خلاقانہ صلاحیتوں کا نقطۂ عروج ہے تو غلط نہ ہوگا اس زندہ جاوید تصنیف میں جس نے مصنف کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دیا ہے، خالد نے سرورِ عالم کی ذاتِ قدسی صفات کے ساتھ بے پناہ عقیدت و محبت کے اظہار کے علاوہ حیاتِ طیبہ کے بعض اہم واقعات کو بھی بڑی خوبصورتی

سے بیان کیا ہے۔ "فارقلیط" میں اگرچہ عربی الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ تاہم غرابت اور اجنبیت کا احساس کہیں بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ کسی بھی عظیم شخصیت کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے شاعر کو بڑے بڑے پرشکوہ، رعب دار اور بلند آہنگ الفاظ کا استعمال لامحالہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کے بغیر اس شخصیت کی عظمت کا نقش پوری طرح ابھر نہیں سکتا، لیکن اس کی عظمت و شان کو خراجِ عقیدت ادا کرنے کے بعد شاعر جب اس کے ساتھ اپنے معاملاتِ ہجر و محبت کو بیان کرتا ہے تو اس موقع پر نہایت ہلکے پھلکے، رواں اور سبک الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔ فارقلیط کا مصنف ان دونوں مشکل مراحل سے باحسن و خوبی عہدہ برآ ہوا ہے۔ مثلاً

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے۔ ۔۔۔ میں سانسوں کا مہماں، تو موجِ ہوا ہے
قلم بند ہو کلک و خامہ سے کیسے ۔۔۔ بیاں تیرے حسنِ گلو ساز کا ہے
شہنشاہ لولاک و مولائے سدرہ ۔۔۔ تو میرے تخیل سے بھی ماورا ہے
تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں ۔۔۔ تو محسنِ علی خیرِ خلقِ خدا ہے

وجہِ تخلیقِ کائنات کے حضور خالد کسی دنیاوی جاہ و جلال کے حصول کی تمنا نہیں کرتے بلکہ ایک ایسی خواہش کا اظہار کرتے ہیں جس پر خود خواہش کو بھی ناز ہو اور حور و ملائکہ کو بھی رشک آئے۔

میں ہوتا تو وہ پاؤں دھو دھو کے پیتا - ۔۔۔ وہ مشروبِ رحمت ہے آبِ بقا ہے -
کبھی مشک و عود اس طرح کا نہ سونگھا - ۔۔۔ پسینہ ہے تیرا کہ عطرِ حنا ہے -

اور جب یہ جذبہ بے اختیارِ شوق شاعر کی پوری شخصیت اور اس کے تمام جذبات پر حاوی ہو جاتا ہے اور شاعر تصورِ محبوب کے سمندر میں اپنی ذات کے قطرے کو گم کر دیتا ہے تو فغانِ نیم شبی اور آہِ سحرگاہی کی لذتوں میں ڈوب کر بے اختیار ہو کر کہہ اٹھتا ہے کہ

نشیلے کنول نین کجرالے تیرے - ۔۔۔ چھپا کر نظر دل تجھے دیکھتا ہے
میں جوگن بروگن ہیں کملی کمینی - ۔۔۔ تو سرتاج میرا، مرا دیوتا ہے
رہوں رات دن میں ترے سنگ سیاں - ۔۔۔ مری روشنی ہے تو میرا دیا ہے

مگر جب شاعر اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس کا ساجن سوامی، جس کے نین کجرالے اور پسینہ عطرِ حنا ہے، جو اس کے من کی روشنی ہے اور سارے گن جس پر ختم ہیں، اس سے دور ہے تو برہ کی جوالا اس کے من میں پوری طرح بھڑک اٹھتی ہے اور وہ ہجر و فراق کی بے قراریوں اور اپنے کربِ مسلسل کا اظہار یوں کرتا ہے کہ

بنے ہار پھولوں کے تو کیلے کانٹے ۔۔۔ ترے بن جیر کھٹ مجھے کاٹتا ہے
ستاتی ہے مدماتی بَیرن جوانی ۔۔۔ کوئی کام روپ اس کو کلپا گیا ہے
بجھاتا ہے سیپی کی پیاس ابر نیساں ۔۔۔ تو کس کارن اس من کو ترسا رہا ہے

یہ ہے وہ معجزۂ فن جس کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ قوافی اور بحر کی پابندی کرتے ہوئے ایک ہزار تین سو چوراسی اشعار پر مشتمل نعتیہ قصیدہ لکھنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں تھا جب تک شاعر زبان و بیان اور فکر و فن کے اوجِ کمال پر فائز نہ ہوتا۔

خالد کی دوسری طویل نعتیہ نظم منحمنا ہے جو چار سو چالیس اشعار پر مشتمل ہے اور حسنِ تخیل، شکوہِ الفاظ اور جدید مصطلحات کا نادر شاہکار ہے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

محمدؐ انجمن کن فکاں کا صدر نشیں ۔۔۔ محمدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم

محمود و حامد و احمد محمد و محمود — کریم و میر کرام و مکرم و اکرم
نگار خانۂ کن کی حسیں ترین تصویر — ہے جس پہ ناز کناں خود مصوّر مریم

عبد العزیز خالد کے پختہ کار قلم نے منظوم ترجمے کے میدان میں بھی اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ خالد نے دنیا کے بعض عظیم ادبی شاہکاروں کو اردو کا جامہ اس خوبصورتی سے پہنایا ہے کہ ترجمے طبع زاد تصانیف معلوم ہوتے ہیں۔ منظوم تراجم کی روایت اردو شاعری میں کچھ ایسی پرانی نہیں ہے اگرچہ عربی اور خصوصاً فارسی شاعری نے اردو شاعری پر اپنے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں۔ بقول محمد حسین آزاد " اردو شاعری نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی ہے" چنانچہ ہمارے شعراء ایک طویل عرصے تک جو میر سے لے کر غالب کے زمانے تک پھیلا ہوا ہے جملہ اصناف سخن میں فارسی شعراء کا اندھا دھند تتبع کرتے رہے ان کی تشبیہات، استعارات اور تراکیب تک فارسی زدہ ہیں یہاں تک کہ ان کے اشعار کو پڑھ کر جو ماحول ہمارے سامنے ابھرتا ہے وہ بھی (قطع نظر سودا کی شہر آشوب نظموں، میر صاحب کی مثنوی "تنگ نامہ" کے بعض حصوں اور نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے) خالصتاً ایرانی ماحول ہے۔ مرزا غالب کے دیوان اردوئے معلّے کے کئی ایک اشعار تو محض ایک آدھ لفظ کی تبدیلی سے مکمل طور پر فارسی اشعار کا روپ اختیار کر لیتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ اس دور میں فارسی شاعری کے شاہکاروں کے تراجم کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اردو میں منظوم تراجم کی ابتداء انگریزی ادب کے اثر و نفوذ کے بعد ہوئی چنانچہ دنیا کی بعض مشہور نظموں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ اردو شاعری کے سانچے میں ڈھالا گیا ان میں سے بعض کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا مثلاً سید ابن الحسن فکر نے Mid Summer Night Dream کا ترجمہ "خواب نیم شب" کے نام سے کیا۔ عنایت اللہ دہلوی نے "شیکسپیر" کے چار ڈراموں Antony Cleopatra، Macbeth، King Lear اور Hamlet کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ نظم طباطبائی نے گرے کی کئی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا جن میں Elegy Written in the Country Churchyard کے ترجمے نے جو "شام غریباں" کے عنوان سے کیا گیا لافانی شہرت حاصل کی۔ سرور جہان آبادی نے بھی کئی انگریزی نظموں کے ترجمے کئے۔ تلوک چند محروم کی مشہور نظم "موت کا موسم" بھی انگریزی سے ترجمہ شدہ ہے۔ سورج نرائن مہر کی نظم "خواب دنیا" ورڈز ورتھ کی مشہور نظم (All the world's a fleeting show) کا کامیاب ترجمہ ہے۔ اسی طرح نادر کاکوروی نے "ٹامس مور" کی نظم (Irish Melodies) کا ترجمہ "مرحوم کی یاد" کے عنوان سے کیا اس کے علاوہ انہوں نے "بائرن" کی بعض نظموں کا بھی ترجمہ کیا۔ جعفی لکھنوی کی مشہور مثنوی "تنظیم الحیات" " اکانومی آف ہیومن لائف" کا ترجمہ ہے۔ انگریزی نظموں کے آثار علامہ اقبال کے یہاں بھی موجود ہیں اور "بانگ درا" میں بہت سی نظمیں ایسی بھی موجود ہیں جو انگریزی سے ترجمہ یا ماخوذ ہیں آرزو لکھنوی نے بھی کئی غیر ملکی نظموں کے نظم آزاد اور نظم معریٰ میں کامیاب ترجمے کئے۔ عبد المجید سالک کی نظم "تنہائی" انگریزی اور شاکر میرٹھی کی "بدھ کھارت" سنسکرت کے مشہور شاعر "کالیداس" کے ایک فن پارے کا ترجمہ ہے۔ خاطر کی غزنوی نے پشتو، جسیم الدین کوہی نے بنگلہ، انشائے چینی اور حکیم حبیب اشعر نے خلیل جبران کے عربی زبان میں لکھے گئے شہ پاروں کو اردو نظم میں کامیابی کے ساتھ منتقل کیا۔

عبد العزیز خالد نے منظوم ترجمے کی اس قابل قدر روایت کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے نامور شعراء کی منظومات کا ترجمہ جس خوبی کے ساتھ کیا ہے اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر خالد تراجم کی طرف توجہ نہ کرتے تو اردو کا دامن کئی ایسی نظموں سے خالی رہتا جو ادبیات عالم میں مستقل اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے تراجم میں ہیئت و تکنیک کے نئے تجربات کئے ہیں اور شاعرانہ موضوعات کے نئے امکانات کی راہ دریافت کی ہے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں چند اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جو خالد کی مشہور و معروف

کتاب "سرودِ رفتہ" سے لیے گئے۔ جس میں انہوں نے یونان کی عظیم شاعرہ سیفو کے فکری کمالات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

پل بھر جو تیرے روئے نگارین کو دیکھوں
سینے میں ولولے بھڑک اٹھتے ہیں گونا گوں

آواز گھٹ سی جاتی ہے محرابِ نطق میں
کس منہ سے ماجرائے دلِ مبتلا کہوں

پژمردہ ہے مزاج، طبیعت ملی ڈلی
دل میں مچی ہے اشک و رقابت کی کھلبلی

"گلِ نغمہ" رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف "گیتانجلی" کا منظوم ترجمہ ہے۔ ایک مختصر سا اقتباس پیشِ خدمت ہے اس سے اندازہ لگائیے کہ خالد نے ٹیگور کی روحِ فکر کو کس چابکدستی سے اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے۔

طالبِ راہِ نجات
کچھ پتہ ہے تجھے نروان کہاں ملتا ہے
دیکھ آقا نے خوشی سے از خود
فرضِ تخلیق کا لے رکھا ہے اپنے ذمے
ہم سے ہر آن وہ وابستہ ہے
چھوڑ یہ ورد، وظیفے، پاگل
اپنے حجرے سے نکل
دھوپ بتی کو بجھا
اور پھولوں کو مسل
کیا برا ہے ترا ملبوس، اگر
ملگجا ہو، شکن آلودہ ہو
اس کے ہمراہ کھڑا ہو جا کر
عرق آلود جبیں سے سرِ میدانِ عمل
تیری امید بر آئے تری محنت ہو پھل۔

خالد کے منظوم تراجم کے سلسلے کی تیسری کتاب "غزل الغزلات" ہے جس میں عہد نامہ عتیق کے "گیتوں کا گیت" (Song of Songs) کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس مشکل کام سے خالد جس حسن و خوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں اس کے مدِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ کتاب ایک قابلِ ذکر شعری کارنامہ ہے۔ "پرواز عقاب" مشہور حریت پسند ہوچی منہ کی ان نظموں کا منظوم ترجمہ ہے جو انہوں نے عہدِ اسیری میں لکھیں (کتاب ر جو حال ہی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہے) کو پڑھ کر جہاں خالد کی (بطور ایک منظوم مترجم کے) صلاحیتوں پر اعتقاد پختہ ہوتا ہے وہاں آزادی کے ساتھ والہانہ محبت بھی بیدار ہوتی ہے اور شدائد و مشکلات کے مقابلے میں ناقابلِ تسخیر چٹان بن کر ڈٹ جانے کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ اور یہی ان نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

شعر خوانی کی مجھے عادت نہیں
(گو رہا اکثر غمِ دل نکتہ چیں)
لیکن اب زنداں میں میں اس کے علاوہ کیا کروں؟

(بے قراری سے بھی ملتا ہے طبیعت کو سکون
باعثِ جمعیت خاطر بنے شورِ جنوں
دل نہ تڑپے تو رگوں میں منجمد ہو موجِ خوں
انشراحِ صدر ہے سرگردنِ سوزِ دروں)

خالد پر عموماً المعنی فی البطن شاعر والی پھبتی کسی جاتی ہے اور ان کی شاعری کو ناقابلِ فہم قرار دیا جاتا ہے لیکن انہوں نے جس فصاحت و بلاغت کے ساتھ شعری عمل کو اپنی شاعری میں برتا ہے وہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ وہ ناقابلِ فہم نہیں ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔

خالد کی شاعری کو چیستان یا معمہ کہنا اور اسے سرحد ادراک سے ماورا قرار دینا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔ جینئس یا نابغہ روزگار افراد پر اس نوع کا اعتراض عموماً عائد کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً ملٹن، نیوٹن، غالب، آئن سٹائن، جیمز جوائس، کافکا، خلیل جبران، ٹی ایس ایلیٹ اور کسی حد تک اقبال کے بارے میں بھی اس قسم کی بات کہی گئی۔ اور یہی اعتراض آج عبدالعزیز خالد کی شاعری پر بھی کیا گیا ہے لیکن کیا نیوٹن، ملٹن، غالب، آئن سٹائن، جیمز جوائس، ٹی ایس ایلیٹ، کافکا، اقبال اور خلیل جبران کی عظمت سے زیادہ دیر تک انکار کیا جا سکا؟ اگر ان حضرات کے بارے میں جواب نفی میں ہے اور یقیناً ہے تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ مستقبل میں اس سوال کا جواب خالد کے بارے میں بھی نفی ہی میں دیا جائے گا۔ میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ اگر کلامِ خالد کا اچھے اور سچے قاری کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمارے قلب و ذہن کو متاثر کرے گا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھے قاری سے ہماری مراد کیا ہے۔ اس ضمن میں لان جانسن کا خیال بڑا اچھوتا اور دلچسپ ہے اس کا کہنا ہے کہ اچھا قاری وہ ہے جو غیر متعصب ([illegible]) اور ([illegible]) ہو۔ چنانچہ اگر ہم خود کو لان جانسن کے قائم کردہ معیار کا قاری ثابت کر سکیں تو خالد کے کلام میں مشکل پسندی اور اغلاق نویسی کی شکایت بہت حد تک ختم ہو جائے گی اور ان کی شاعری اپنی تمام تر معجز نمائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہوگی۔ علاوہ ازیں ہمیں اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر نہیں کرنی چاہیئے کہ خالد کی شاعری [illegible] D سے زیادہ [illegible] ہے اس میں وضاحت کم ہے اور رمزیت زیادہ۔ اس حقیقت کا احساس جوں جوں ہمارے پڑھے لکھے اور شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب میں بڑھتا جائے گا۔ خالد کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں تعصب کم ہوتا جائے گا۔

آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کے مقام و مرتبہ کا تعین کرتے ہوئے اس کے موضوعاتِ شعر کو کسی طور نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جتنا کسی کی شاعری کا کینوس وسیع ہوگا اتنا ہی وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوگا۔ ایک ایسے شاعر کے لئے جس کا مطالعہ سطحی اور خیالات محدود ہوں عام بول چال اور روزمرہ کی زبان میں اپنے خیالات کی ادائیگی ممکن ہو سکتی ہے لیکن ایک ایسے صاحبِ علم شاعر کے لئے جو دنیا کی بیک وقت چھ سات زبانوں پر نہ صرف عبور رکھتا ہو بلکہ ان کے شعروادب پر بھی اس کی گہری نظر ہو یہ توقع رکھنا کہ وہ روزمرہ کے گھسے پٹے الفاظ میں ہی اپنا مافی الضمیر بیان کرے اس پر بہت بڑا ظلم ہوگا۔ غالب، اقبال اور خالد جیسے شعراء کا طائرِ خیال نت نئے آسمانوں کی خبر لاتا ہے اور ان کی بے چین طبیعتیں "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے" کے مصداق ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہتی ہیں۔

محمد خالد اختر

عبدالعزیز خالد کے نام :-

بھائی اِس کلبۂ احزان میں تین شاعر ایسے ہوئے کہ میں نے ان کو سلام کیا۔ دو خلدِ بریں کو کوچ کر چکے۔ ایک ابھی جیتا ہے۔ وہ پہلے دو غالب اور اقبال تھے۔ تیسرے تم ہو۔ اللہ اللہ! اردو زبان کے شیرِ مصفیٰ میں قندِ فارس و ہریرۂ بلادِ عرب جس کو جس ارزانی سے تم نے گھولا ہے۔ سزاوارِ صد ستائش ہے۔ اساتذۂ مسلم الثبوت میں اس نوعمری میں جگہ پانا تمہارا حصہ ہوا۔ جن اشخاص کو بہرۂ زبانِ عربی سے نہیں۔ ان کو البتہ مقصود تمہارے کلام کا شتابی سے فہم میں نہیں آتا — فقیر نے اپنے بچپنے میں مولوی کرامت اللہ صاحب سے قرآن مجید مع ترجمہ کے پڑھا۔ تھوڑی شُد بُد عربی زبان سے اس کے طفیل سے ہوئی مگر جو کچھ سیکھا بوجہ عارضۂ نسیان اب حافظے میں نہیں۔ ہر چند کہ کلیتہً کلام تمہارے کو سمجھ نہیں پاتا، اس کی شوکتِ الفاظ اور فصاحتِ بیان کا قائل ضرور ہوں۔ کتابیں تمہاری اسی خاطر پسندیدہ جمہور ہوتیں اور تمہاری حیاتِ جاودانی کی ضامن۔

یاد ہوگا، سال گذشتہ تمہارے محکمہ کے دفتر میں تم سے ملاقات ہوئی۔ فقیر تب شہرِ آشوب کراچی میں ایک مہاجن، آدم جی سے بتوسطِ انجمنِ مصنفین پانچ ہزار روپے کی ہنڈی اور ایک سند وصول کرتے پہنچا تھا۔ فقیر تمہاری صحبت میں شاد و خرسند ہوا۔ تمہاری شیرینیٔ گفتار کے وصف میں کیا کہوں۔ مزے آ گئے۔ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس فقیر کے طور پر فرش پہ بستر جمایا ہے۔ لکھنا پڑھنا وہیں ہوتا ہے۔ کہیں آتے جاتے نہیں۔ سرہانے کی جانب لُغتِ عربی و فارسی کی موٹی ضخیم کتب ایک صف میں آراستہ ہیں۔ جاتے ہوئے ایک ڈھیر اپنی تصنیفات کا تم نے بندے کی خاطر جمع کے لئے مرحمت فرمایا۔ ایک من وزنی ہوگا۔

صاحب اس روانی اور قادر الکلامی سے چشمۂ سخن سرائی جاری رہا تو عجب نہیں وقتِ وصال تلک کم و بیش ڈھائی سو دیوان پانچ پانچ سو صفحے کے مکمل کر جاؤ۔ عہدِ حاضر میں سکندرِ قلمروِ سخن دری و لغت دانی تم ہو۔ حضرت علامۂ مجتہدُ الدّہر سیّدنا و مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یونہی تم کو اپنے سینے سے نہیں لگایا۔

یہ تو تھی ہنسی۔ بندہ سچ مچ تمہارے اوصافِ حمیدہ کا گرویدہ ہو کر لوٹا۔ جو کراچی سے آتا ہے یا نہیں آتا، اس کے رُوبرُو تمہاری مزے کی صحبت، اور جودتِ تخیل اور تحقیقی لگن کی تحسین کرتا ہوں۔ ہو بھی اس لائق — اساطیرِ یونانی کی ہمکلامی بعینہٖ اہلِ یونان کی بولی ٹھولی میں، درد و درماں کے مدارج کا اظہار۔ ہجر و وصال کی رودادِ جگر پاش۔ رزم و بزم کی مرقع بیانی۔ شاہِ دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰؐ کی مدحتِ دلپذیر۔ سب کچھ تمہاری تصنیفات کا مضمون ہے۔ تمثیل نگاری کے خاتم تم ہو۔ صحبت تمہاری پھر کب میسّر آئے گی؟ —

والسلام مع الاکرام

خالد بزمی

خالد کی آسان شاعری

غالب نے جب اس قسم کے اشعار کہے کہ

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اور

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

(وغیرہ)

تو حکیم آغا جان عیشؔ نے ایک مشاعرے میں تنگ آکر کہہ دیا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

پہلے تو مرزا غالب مرحوم نے اپنے اس قسم کے معترضین کو "جاہل" قرار دے کر ڈانٹ دیا:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل! — سُن سُن کے علول ہوتے ہیں "جاہل"

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن جب اُن کی مشکل پسندی کے خلاف آوازوں میں اضافہ ہوگیا اور مرزا کو معلوم ہوگیا کہ آساں کہنے کی فرمائش کرنے والے صرف "جاہل" نہیں بلکہ اُن میں بڑے بڑے سخن شناس بھی شامل ہیں تو مرزا نے اپنی مذکورہ بالا رباعی کے دوسرے مصرعے میں ترمیم کرلی اور اس رباعی کی یہ صورت ہوگئی کہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل! — سُن سُن کے اُسے "سخنورانِ کامل"

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

غالب جن لوگوں کو کچھ ہی دیر پہلے "جاہل" قرار دے چکے تھے، اب وہ انہیں "سخنورانِ کامل" تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اُردو شاعری کے لئے یہ شگون نہایت مبارک تھا۔ اس کے بعد غالب نے جو کہا اُس کا بیشتر حصہ دماغوں کے راستوں سے دلوں میں اُتر گیا اور غالب پر مشکل پسندی کا جو الزام تھا، وہ کسی حد تک دور ہوگیا۔

اُردو شاعری میں غالب کے بعد عبدالعزیز خالد دوسرا شاعر ہے، جس کی شاعری کو مشکل قرار دیا گیا اور اس طرح خالد پر بھی مشکل گوئی کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔

لاہور میں عبدالعزیز خالد کی تازہ ترین کتاب "پرواز عقاب" کی تقریب [illegible]

ویت نام کے صدر ہوچی منہ کی نظموں کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ اس موقعے پر اُردو کے معروف طنزیہ اور مزاحیہ شاعر ضمیر جعفری نے خالد کی مشکل پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہوچی منہ کی نظموں کے بعد اب عبدالعزیز خالد کو اپنی نظموں کا بھی ترجمہ کر دینا چاہیے۔

اگر آپ کو مجموعی طور پر خالد کی مشکل گوئی کا اندازہ نہیں تو مثال کے طور پر صرف حسبِ ذیل اشعار پر ایک نظر ڈال لیجیے:

ہیں آنسو شفائے مبتلائے دل — رسولِ سلام و سفیرِ سکون
ہیں عشاقِ سرمست کو الجیاں — غیاب و حضور و بروز و کمون
تب و تاب و تمکین و فقر و غنا — خروش و خشوع و ہراس و ہدون
نظر چیر جائے حجابات کو — مٹے فرق و فصلِ ظہور و بطون
ینابیعِ حکمت، مصابیحِ علم — شناسندۂ کیفیات و شئون
خرد خواہشوں کی غلامی کرے — کہاں ہے دلِ مطمئن و طموں
جہالت چھپر کھٹ پہ سرمستِ ناز — اور ادراک و افکار رہنِ سجون
ہو کیوں بحر و بر میں نہ ظاہر فساد — ملیں ہم قافلہ جنگ و جوع و جنون

(مزمورِ میر مغنی۔ پہلا حصہ)

یہ اشعار پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ میں نے اس انتخاب میں وہ اشعار شامل نہیں کیے، جن کا ایک ایک مصرعہ اور کہیں کہیں دونوں مصرعے خالصتاً عربی زبان میں ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی مشکل گوئی کا اندازہ کرنے کے بعد آپ کو یہ معلوم کر کے یقیناً مسرت ہوگی کہ گذشتہ دو تین برس میں مختلف اخبارات و رسائل میں خالد کے قلم سے جو منظومات منظرِ عام پر آئی ہیں اُن کا بیشتر حصہ مشکل پسندی کے الزام سے پاک ہے۔

ابھی چند ماہ پیشتر ماہنامہ نیرنگِ خیال، راولپنڈی کے ایک شمارے میں اُن کی ایک غزل دیکھنے میں آئی۔ یہ غزل پڑھ کر میرا خیال ہے اُن کا انداز کچھ کچھ راہِ اعتدال پہ آ رہا ہے۔ وہ غزل آپ بھی دیکھیے:

زیست کو مغتنم سمجھ غافل — تازیانہ ہے دُوریِ منزل
کب پیاسا سراب کو دریا — عشق دشوار ہے وفا مشکل
نہ سے نفرت بھی ہے، محبت بھی — کوئی سمجھا نہ سمجھے منطقِ دل
چمک آئے نہ روشنائی میں — جب تک اس میں لہو نہ ہو شامل
خود فریبی ہے پردۂ غفلت — خود ستائی سے کچھ نہیں حاصل
کب تک آوارگی و رسوائی — خود کو پہچان اپنے آپ سے مل
چپ رہوں تو دماغ جلتا ہے — ہونٹ کھولوں تو سب اشہ زائل

اے پریشاں نظر خدا سوں ڈر
زامِ مجنوں ہے لیلیٔ محمل

مزمورِ میر مغنی کے محولہ بالا اشعار کے مقابلے میں یہ غزل بہر حال خالد کی آسان شاعری کے ضمن میں آئے گی۔ آخری شعر کے پہلے مصرعے میں "سے" کی جگہ پر "سوں" خالد کی "کلاسیکیت" کا شاہد ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی کوششوں پر شاید کسی کو اعتراض نہیں ہوگا بلکہ میری

رائے میں یہاں اس لفظ کا استعمال لطف دے گیا ہے۔

میں نے ان سطور کے آغاز میں خالد کی جن آسان منظومات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ابھی تک اُن کے کسی ایسے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں جو کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ گیا ہو بلکہ ایسی منظومات حال ہی میں اخباروں اور رسالوں کے ذریعے سامنے آئی ہیں یا عبدالعزیز خالد کی بیاض میں موجود ہیں۔ اب میں ایسی نظموں، غزلوں وغیرہ سے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں، جن سے میرے اس دعوے کی دلیل مل جائے گی کہ خالد کی مشکل شاعری آسان ہو رہی ہے۔ خالد نے اپنی ایک نظم میں مجاہدینِ وطن سے خطاب کیا ہے۔ اس کے دو بند ملاحظہ فرمایئے:

اے موت کے ہمرازو! اے سرمدی آوازو!
اے زمزمہ پردازو! خوش معرکہ جانبازو!
تم بجلی کا کوندا ہو، تم رعد کا کڑکا ہو
وہ شعلہ جو باطل کی جھنکار سے بھڑکا ہو
وہ دل جو وطن کی ہر افتاد پہ دھڑکا ہو
تم تارے شبِ غم کے، تم نور کا تڑکا ہو

اے اہلِ وطن! تم بھی گھر گھر یہ صدا کر دو
جو پاس ہے لے آؤ، درِ فیض کا وا کر دو
سنگِ درِ میخانہ کو قبلہ نما کر دو
ہر شاعرِ بزم آرا کو شعلہ نوا کر دو
دامن کی ہوا سے کرۂ مہر کو صبا کر دو
جو سانس میسر ہے وہ وقفِ دعا کر دو

پہلے بند میں لطفِ قوافی بھی خالد ایسے "خشک شاعر" کی شاعری میں شاید ایک اچھا شگون سمجھا جائے گا۔ خالد کی ایک اور نظم کے یہ اشعار دیکھئے:

جاتا نہیں برباد کبھی خونِ شہیداں

ہوتے ہیں اسی خوں سے دروِ دشت فروزاں
کرتے ہیں اسی خوں سے حنا بندیٔ خوباں

ہوتی ہے اسی خوں سے صحیفوں کی کتابت
دھلتی ہے اسی خوں سے گناہوں کی سیاہی

ہے بندۂ مومن ہی فقط وارثِ جنت
تا زندگی اُس کو ہے ارمانِ شہادت

وہ موت تری راہ میں جو آئے الٰہی!
اُس موت پہ خود تجھ کو بھی رشک آئے الٰہی!

"اے مجاہد" کے زیرِ عنوان ایک غزل نما نظم کے یہ اشعار بھی اسی ضمن میں آ جائیں گے:

روئی کی طرح پہاڑوں کو دھنک سکتا ہے
حشر سے پہلے تو کر سکتا ہے برپا محشر

تجھ کو زیبا ہے مقیمِ دلِ خوباں ہونا
لیتی ہے تیرے قدم خاکِ سرِ راہ گذر

مثل و مانند زمانے میں نہیں آج ترا
رحمتیں ہر دو جہاں کی ہوں نچھاور تجھ پر

"اے سر بکف مجاہد" غالباً نومبر ۱۹۷۱ء کی جنگِ پاک و ہند کے موقعے پر کہی گئی تھی:

دیتا ہے دل دعائیں، کرتے ہیں لب ثنائیں
آ آ کے جب ہوائیں، قصے ترے سنائیں
لیتی ہیں پُرنم آنکھیں جُھم جُھم تری بلائیں

تاجِ سرِ زمانہ، خاکِ رہِ حجازی
اے سر بکف مجاہد! اے سرفروش غازی

نسبت تجھے حرم سے، بیزار تو صنم سے
پروائے بیش و کم سے، فکرِ نشاط و غم سے
اللہ کے کرم سے، اس کے نبیؐ کے دم سے

مجھ میں گداز و رقت، تجھ میں ہے بے نیازی
اے سر بکف مجاہد! اے سرفروش غازی!

تو نور کا منارا، تو مان ہے ہمارا
اس قوم، اس وطن کی تو آنکھ کا ہے تارا
جس کی بہادری کا شاہد جہان سارا

باطل کے ہاتھ جس نے ہاری کبھی نہ بازی
اے سر بکف مجاہد! اے سرفروش غازی

مذکورہ جنگ کے زمانے میں خالد نے حقیقی طور پہ ایک شاعرِ ملت کا کردار انجام دیا اور ان دنوں بہت کچھ لکھا۔ یہ نظم بھی غالباً انہی دنوں کی پیداوار ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

اے ارضِ زندہ دلاں! اے دیارِ پاکستان! — تو میری روحِ رواں، تجھ پہ جان و دل قربان
تری ہواؤں کی بخشش، تری فضاؤں کی دین — میری نمود، مری آگہی، میرا عرفان
تو میری ہستیِ ناپائیدار کا شاہد! — تو میری زندگیِ جاوداں کا مرتبہ داں

ہے تیرے ساختہ ہی جو بھی ہے آبرو میری — میں تیرا زمزمہ خواں، تجھ سے میرا نام و نشاں
ہوئے ازل میں وفاداریوں کے قول و قرار — نہ جیتے جی کبھی نکلیں گے چاہ کے ارماں!
کیا شکار مجھے تیرے حسن نے ورنہ — اُٹھاؤں نازِ بتاں مجھ میں اتنی تاب کہاں
جو اہلِ دہر کا ہے آسماں، وہ تیری زمیں — تیری ثنا کے لیے لفظ ڈھونڈتی ہے زباں
اسی کے نام پہ تیرا قیام و استحکام — اسی کے نام پہ تیری بقا کا ہے امکاں

یہ نعتیہ نظم بھی غالباً اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس میں "سقوطِ ڈھاکہ" پر شاعر کے تاثرات کا اندازہ ہو سکتا ہے:

یا رحمۃ للعٰلمین! یا رحمۃ للعٰلمین!
پُرجوش، سادہ، سخت کوش انسان کی یہ سرزمیں

راہِ وفا میں جان کے نقصان کی یہ سرزمین
کھوٹے کھرے کردار کی پہچان کی یہ سرزمین

یہ بہرے، گونگے، اندھے، بے بس بھولے بھالوں کا وطن
ٹھکرائے، دھتکارے، جیالے، خستہ حالوں کا وطن

اے کالی کملی والے! تیرے آستاں پر آئے ہیں
ساتھ اپنے آہوں، آنسوؤں، زخموں کے تحفے لائے ہیں

اک قہرِ واحد میں کا قہر تھی پانی طاقتیں
تیرے سوا حالِ دلِ آفت زدہ کس سے کہیں
آہوں سے دم گھٹتا ہے سینے میں خدایا کیا کریں

ڈر ہے مبادا ضبطِ گریہ سے کلیجے پھٹ پڑیں
مرنے کی کیا صورت نکالیں، کس طرح زندہ رہیں

علامہ اقبال نے "شاعر" کے زیرِ عنوان فرمایا ہے:

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

عبدالعزیز خالد علامہ اقبال کے مذکورہ "شاعر" پر بہت حد تک پورے اُترتے ہیں۔ اُن کے سینے میں ایسا احساس دل موجود ہے جو ملک و ملت پر گزرنے والے کسی حادثے یا ابتلا پر خاموش نہیں رہ سکتا اور ایسے ہر موقعے پر اُس کی دھڑکن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گذشتہ سال جب سیلاب آیا تو خالد کی آنکھوں سے درد کے آنسو حسبِ ذیل اشعار کی صورت میں ڈھلک آئے:

اے فلک رک جا! نگل لے اپنا پانی اے زمیں!
کیا یہ عالمگیر بربادی ابھی کافی نہیں؟
موجیں اُٹھتی ہم نے دیکھیں ہیں پہاڑوں کی طرح
دہشتِ نظارہ سے سکتے میں ہے جانِ حزیں
پھوٹ کر رو دیا ہمالہ یا کر برسے ٹوٹ کر
وہ سمندر جو کہ ہے بالائے چرخِ ہفتمیں

اے خدائے عادل و قادر! دلوں کے ممتحن
شدتِ اندوہ سے رُوحیں پریشاں ہو گئیں
کیا اسی کا نام ہے سُنتے تھے جو طوفانِ نوح
وہ زمیں سے آسماں کا انتقامِ اوّلیں
بے قرار و بے دیار و بے خود و بے خانماں
کیا اب ان اُجڑے ہوؤں کا بھی ٹھکانا ہے کہیں
یہ دردو ونعت کا گھر، لوک گیتوں کا نگر
سادہ دل لوگوں کی بستی، یہ اذانوں کی زمیں
اس کی ویرانی کا کن آنکھوں سے اندازہ کریں
ہے یہ خاکِ پاک ناموسِ دو عالم کی امیں
مرنے والوں کو بچالے تیری قدرت ہے بڑی
اے خداوندِ خدا! اے عرش کے بالانشیں
ڈھالتا ہوں شعر کے پیکر میں دل کی آگ کو
کیا کروں مجبور ہوں، شاعر ہوں، پیغمبر نہیں

جنگی قیدیوں کی واپسی پر خالد نے جن الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا، اس سلسلے میں یہ تمین شعر ہی اندازے کے لئے کافی ہیں:

زمیں شادماں ہو، منائے خوشی آسماں
اسیری سے آتے ہیں واپس ہمارے جواں

ہواؤں کے ہونٹوں پہ ہیں خیر مقدم کے گیت
درختوں کی شاخیں بجاتی ہیں شہنائیاں

مبارک جو اُس کے سبب سے ستائے گئے
خدا کی رہوں میں جنہوں نے سہیں سختیاں

خالد کی ایک نظم "حکایتِ نے" ہے۔ یہ عنوان مولانا رومیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؛

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

اِس نظم میں نہایت آسان انداز سے معروف رومانی کرداروں کے ناموں کا ذکر ہے۔ اِس نظم سے خالد کی قادر الکلامی کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف غیر مربوط طور پر چند اشعار درج کیے جا رہے ہیں ؛

ترے دیار کی خوشبو سے اے چمن آرا
مشامِ جاں کو معطر کرے نسیمِ صبا

میں سوہنی تو مہینوال اے مرے دلدار
ہیں صاحباں ہوں تو مرزا میں ہیر تو رانجھا

نہ ہو یہ عاشق و معشوق کی خوشی میں شریک
حسد زمانے کی عادت ہے کیا گلہ اُس کا

معاملاتِ محبت نہ رہ سکیں مخفی
نظر سے لوگ لگالیں سراغ باطن کا

میں دل کی آگ کو حرفوں میں کس طرح ڈھالوں
مجھے فسانہ و افسوں کا فن نہیں آتا

"محاورۂ حسن و عشق" خالد کی ایک لطیف نظم ہے۔ چند منتشر اشعار سے لطف کا اندازہ کر لیجئے !

اب تابِ انتظار نہیں، پہلے ہی بہت
دل خستۂ کشاکشِ نزدیک و دور ہے

بے بس ہیں دونوں، دونوں ہی مجبورِ شوق ہیں
میری خطا ہے اس میں نہ تیرا قصور ہے

آ میری بزمِ ناز میں جب لوگ سو چکیں
مجھ کو ترے خلوص پہ فخر و غرور ہے

بولی کہ دیکھتا ہے خدا کیا کہے گا وہ
میں نے کہا، وہ ذات رحیم و غفور ہے

"تسخیرِ قمر" کی بات دو شعروں میں مکمل ہو گئی ہے :

چاند کی فتح مبارک ہو بنی آدم کو
دورِ سیاحیٔ افلاک کا آغاز ہوا

تھک وہ رو جس کی تھی میخواری و عریانی تک
علم کے زور سے وہ گنبدِ گردوں پہ چڑھا

الف لیلیٰ میں ابوالحسن نامی ایک شخص کا قصہ مذکور ہے۔ جو خواب میں بادشاہ بن جاتا ہے لیکن خواب کا طلسم ٹوٹتے ہی اُس کی حکومت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ یہ سارا قصہ خالد نے ایک نظم میں بیان کیا ہے اور بہت آسان انداز سے بیان کر دیا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے قصے کا ربط تو قائم نہیں رہ سکے گا۔ البتہ یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سارا واقعہ کس آسان انداز میں منظوم کر دیا گیا ہے :

دلربائی ہے شیوۂ خوباں
کافروں میں وفا کے عہد کہاں

جس کے رخسار تھے گلاب کے پھول
ہونٹ جس کے انار کی کلیاں

کتنا پیارا تھا رات کا تارا
آہ ! وہ انتظار کی گھڑیاں

کیا کروں ذکر چشمِ ساقی کا
کیا کہوں حالِ گردشِ دوراں

آنکھ جھپکی، بدل گئیں آنکھیں
دے کے جھٹکا چھڑا لیا داماں

کیسی پرسش، کہاں کی دلداری
دیدہ کوندے سے دیدۂ حیراں

اب نہیں سر میں پیار کا سودا — اب نہیں دل میں جاہ کے ارماں

ایک اور نظم کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیے اس سے بھی خالد کی مشکل گوئی کا خوف دُور کرنے میں مدد ملے گی :

اگر دیکھو تو ہر محفل میں شامل — اگر ڈھونڈو تو بے نام و نشاں ہیں
نہیں عرضِ ہنر کا ہم کو سودا — فقط سوزِ دروں سے نغمہ خواں ہیں
بڑی نعمت ہے بے برگ و نوائی — سر و ساماں لٹا کر شادماں ہیں
افق پر یہ اندھیرے کے پھریرے — چراغِ آخرِ شب کا دھواں ہیں
خداوندانِ بحر و بر سے پوچھیں — نگاہیں بے زبانوں کی زباں ہیں
کٹی عمرِ عزیز اندوہ و غم میں — ہمارے حصے کی خوشیاں کہاں ہیں
در و دیوارِ شہرِ آرزو پر — لہو کے چھینٹے یا جلنے کے نشاں ہیں
لگے یوں دوستوں کے جھمگٹے میں — کہ جیسے دشمنوں کے درمیاں ہیں
تکلف بر طرف اربابِ اردو — نرے بس نام کے اہلِ زباں ہیں
اگرچہ رہنے والے ہیں زمیں کے — مگر دانائے رازِ آسماں ہیں

حسب ذیل چھوٹے چھوٹے شعروں میں کتنی بڑی بڑی باتیں کہی گئی ہیں :

مجلسیں ہیں امانتوں کے ساتھ — فرض ہے پاسدارئ پیماں
بے خطر آگ کے سمندر میں — کود جاتے ہیں صاحبِ ایماں
ہے دل و جاں سے عزیز مجھے — دارالاسلام ارضِ پاکستان

لیجئے اب آپ کو خالد کی غزلوں سے کچھ اشعار سنائیں :

صبا کے رس میں تجھے گھونٹ گھونٹ پیتا ہوں — گلِ بہار کی خوشبو میں سونگھتا ہوں تجھے
سحر کی پلکوں سے ڈھلتا ہے رات کا کاجل — ستارے ڈوبتے جاتے ہیں ایک اک کر کے
مگر مری جدائی کی روزانہ بڑھتی جاتی ہے — دل آرزو سے لبالب مژہ مژہ چھلکے
کبھی سراب سے صحرا کی پیاس بجھتی ہے — ندی کنارے پہنچ کے بھی ہونٹ تر نہ کئے
عدم سے آدم خاکی ہے حسنِ نقش گری — اماں نہیں ہے تہ آسمان خاک کے لئے
نہیں ہے میری محبت جواب کی طالب — کہ سوز و سازِ تمنا ہے آپ اپنا صلہ
میں مثل تاروں کے شب بھر سفر میں رہتا ہوں — میں منتظر ہوں مگر انتظار ہے کس کا
حیا سے عارضِ گلناء تمتمائے ہوئے — لبوں پہ موجِ تبسم شراب آلودہ

کس نے سیکھی ہے فغاں بلبلِ خوش الحاں سے — محرمِ حیرتِ گل کون ہے شاعر کے سوا
ایسے اترا کے نہ چل اے صنم حشر خرام — جسم پہ ناز نہ کر، خاک میں مل جائے گا
تیری آنکھوں میں کئی بھید بھری باتیں ہیں — دیکھنا اے اُٹھے ان کو نہ ہوا کی چڑیا

ہے تیری پلکوں پہ کس کے زوال کا سایہ
ہے تیرے ماتھے میں کس کے خیال کا داماں

ہوا ہے کس کا جگر خوں؟ بجھا ہے کس کا چراغ
شفق کی آگ میں شامل ہے کس کے دل کا دھواں

کٹی ہے مرگِ مسلسل میں زندگی جن کی
یہ جرمِ عشق کی تعزیر ہے اے اہلِ جہاں

گرہ میں مال ہے جن کے وہ اہلِ ذوق نہیں
جو اہلِ ذوق ہیں مفلوک و بے سر و ساماں

رقم ہیں چہروں پہ اسبابِ خانہ ویرانی
عیاں ہیں آنکھوں سے اسرارِ گردشِ دوراں

اے رونے والے! رونے سے کچھ فائدہ نہیں
ہے ضبط ہی علاجِ غمِ لا علاج کا

اے دل! کہاں ہیں تیری پرانی محبتیں
تھا حُسنِ ظاہری پہ تو کتنا فریفتہ

برپا ہے اس میں فرض و محبت کی کشمکش
خالد کا دل ہے درد کی لذت سے آشنا

الفاظ ہیں پُر آواز مگر قحطِ نوا ہے
یہ ساعتِ نامحکمیِ حرفِ دعا ہے

کانوں پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی
وہ شورِ قیامت ہے کہ شل دستِ دعا ہے

اعجازِ مسیحا کی بڑی بات ہے لیکن
یارب! کہیں بربادیِ دل کی بھی دوا ہے

مُرغانِ قفس کشمکشِ دام سے چھوٹے
یا نظم و نسقِ باغ کا برباد ہوا ہے

اے غرورِ پارسائی! یہ بتا
تیری نیکی سے خدا کو نفع کیا

تاج دے، دولت دے لیکن دل نہ دے
بیچ دے ہر چیز عزت کے سوا

پھر نہ کچھ کہنے کو تو خاموش رہ
بے تفکر جوش ہے بے فائدہ

کون واقف تھا دلوں کے بھید سے
کشمکش نے راز افشا کر دیا

دل کو ہاتھوں سے مسلتا ہے کوئی
ہر طرف ہے مہوشوں کا جمگھٹ

ان مثالوں سے آپ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ خالدؔ کی غزل اگرچہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے غزل کے تسلیم شدہ سانچے کے مطابق ہے لیکن اس کی معنویت اُس کی انفرادیت کی عکاس ہے۔ ذیل کے اشعار سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گی۔ دیکھئے یہ اشعار بظاہر ایک روایتی غزل کے سے ہیں لیکن اپنے مفاہیم و معانی کے اعتبار سے وہ روایتی غزل سے بہت حد تک مختلف ہیں:

جادۂ راہِ عدم میں رکھ قدم آہستہ تر
کر تب و تابِ دلِ پُرخوں کو کم آہستہ تر

موت بھی ہم کو ہے پیاری زندگانی بھی عزیز
سو رگِ جاں میں اُترا لے زہرِ غم آہستہ تر

مسجدیں معمور، گھر آباد، میخانے بھرے
ان کی پیدائی کی لیکن کھا قسم، آہستہ تر

گرچہ ہنگامے نشاطِ زندگی کے ہیں وہی
ہے صدائے سازِ ہستی دم بدم آہستہ تر

خالدؔ کی غزل میں تغزل کے یہ شاندار نمونے بھی ملتے ہیں:

ازل کی صبح سے شامِ ابد تک
محبت داستاں در داستاں ہے

کئی عالم ہیں از خود رفتگی کے
ہر اک عالم جہاں اندر جہاں ہے

خزاں کا چاند پیلا ہے مگر کیوں　　کسی کے غم میں یہ بھی سرگراں ہے

اے شیشہ گر دیا ہے کوئی پیوند کی صورت　　ٹوٹا ہے وہ آئینہ کہ جو قبلہ نما ہے
جو چاہو کرو اس ورقِ سادہ پہ تحریر　　ہر لمحہ جو آتا ہے، اچھوتا ہے، نیا ہے

خالد کی غزلوں میں اس قسم کے غیر معمولی اشعار بھی ملتے ہیں:

تکلم میں نہ ہو رنگِ خطابت
کہ ہے یہ سوزِ دل کا کھیل سارا

صدا لگاتے ہیں اہلِ فسانہ و افسوں　　نئے چراغ پرانوں سے کون بدلے گا

ہو جن کی دوستی و دشمنی خدا کے لئے　　کبھی کریں نہ خیالِ ملامتِ دنیا

تم کہاں جاؤ گے آخر زندگی سے بھاگ کر　　خیر و شر کی جنگ میں جم کر دلیرانہ لڑو

ہے جزوِ اعظمِ ایماں محبتِ انساں　　نہیں ہے مردِ مسلماں کو شاید اس کی خبر

ہر کس و ناکس کے آگے جھکنے سے فائدہ　　بے خبر فریاد کر فریاد رس کے سامنے

زندگی سے موت کم پیاری نہیں مجھ کو مگر
زندگی بہتر ہے جب تک زندہ رکھ یا رب مجھے

سرگرمِ سخن دل سے جو رہتی تھی ہمیشہ　　اُن آنکھوں میں اب کوئی حکایت نہ شکایت

ہے مجھ میں کوئی عیب تو اک حسن پرستی　　دل شیشۂ حسرت، نظر آئینۂ حیرت

یہ دل مرا کسی قیصر کا خیر خواہ نہیں　　چلے نہ اس پہ فریبِ فسانہ و افسوں

گر آرزو ہے ہم آغوشیِ نگار کرو گے　　تو رفتہ رفتہ رہِ ترک اختیار کرو گے

عاشقِ حسن مگر پاک نگاہ
ہم سے دیوانے زمانے میں کہاں

خالد بنیادی طور پر اسلامی روح کا شاعر ہے۔ نظموں کے علاوہ اس کی غزلوں میں بھی حمد و نعت کے ساتھ اسلامی فکر کی مثالیں موجود ہیں:

انام و نورِ ہدایت ہے، ذکر و رحمت ہے

دمِ طلوع تلاوت سے دل کو تازہ کروں

ہے اٹھتے بیٹھتے تیرا ہی نام وردِ زباں
ترے ہی نام پہ یارب جیوں اسی پہ مروں

پچھلے پہر اٹھ کے کرے سرگوشیاں رب سے
خالد جو نظر آتا ہے کچھ اس سے سوا ہے

کرتے ہیں باہم ثنا جس کی ستارے صبح کے
آخرِ شب مجھ کو بھی یارب! جھلک اس کی دکھا

ہر طرف جلوہ ہے تیرا، ہر طرف تیرا ظہور
اسمِ اعظم ہے ترا اسم، اے محمدؐ مصطفےٰ

اطاعتِ نبی پاکؐ ہے اطاعتِ حق
ثنائے احمدِ مختارؐ ہے ثنائے خدا

جو خود کتاب بھی ہے صاحبِ کتاب بھی ہے
بنا کے اس کو مشیت نے سانچہ توڑ دیا

مشرق و مغرب پہ چھانے کے لئے
سمتِ بطحا سے اٹھا ابرِ کرم

نامِ احمدؐ پہ فدا ہے خالدؔ
کر گیا نام یہ بے نام و نشاں

مجموعی طور پر خالد کی شاعری میں حکمت و ادراک اور شعور و عرفان کی بیشتر مثالیں موجود ہیں۔ شعر کے بارے میں اس کا نظریہ بھی یہی ہے۔ وہ ایک شعر میں کہتا ہے:

شعر کیا حکمت و ادراک نہیں؟
کیا نہیں شعر شعور و عرفاں؟

حکمت و ادراک اور شعور و عرفاں کی شاعری بالفاظِ دیگر ایک دعوتِ فکر ہوتی ہے اور فکر کا تعلق دل سے زیادہ دماغ سے ہے۔ جن لوگوں میں عبدالعزیز خالد کی مشکل گوئی کے نام پر ایک خوف اور ہیبت سی چھائی ہوتی ہے انہیں فکر کو بروئے کار لا کر یہ خوف اور ہیبت دل سے دور کر دینی چاہئیے۔ لیجئے آخر میں خالد کا ایک خوبصورت قطعہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ میرے اس دعوے کا مزید ثبوت فراہم کرے گا کہ خالد کی مشکل پسندی رفتہ رفتہ آساں گوئی کی طرف آ رہی ہے:

میں خوشی کی طرح تہِ دل سے
رنج و غم کو قبول کرتا ہوں
دوست کا یہ گراں بہا تحفہ
مسکرا کر وصول کرتا ہوں

عبدالرؤف عروج

عبدالعزیز خالد کی شاعری

احمد ندیم قاسمی، شان الحق حقی اور سلام مچھلی شہری کے بعض منظوم ڈرامے واقعی اس قابل ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ ان کے بعد جن شاعروں نے منظوم ڈراموں کو ایک مستقل صنف کی حیثیت سے آزمایا ہے ان میں عبدالعزیز خالد کا نام نمایاں اور سب سے الگ نظر آئے گا۔

مجھے ۲۵ ستمبر ۵۸ء کی وہ شام اچھی طرح یاد ہے، جب جگر مرحوم نے عبدالعزیز خالد کی طویل مختصر نظموں کا مجموعہ "زرداغ دل" اپنے دستخط کے ساتھ دیتے ہوئے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اسے پڑھوں۔ اس مجموعے کو پڑھنے سے پہلے میں نے اس کے بارے میں بڑی الٹی سیدھی رائیں سن رکھی تھیں، اس کے نتیجہ میں یہ مجموعہ میرے پاس بیکار محض بن کر پڑا رہا اور بڑے دنوں تک طبیعت اس کے دیکھنے یا پڑھنے پر آمادہ نہ ہو سکی۔

میرے ایک دوست رفیق خاور نے ایک دن مجھ سے عبدالعزیز خالد کی شاعری کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ وہ تشبیہوں کے ذریعہ مشرق کی عظیم کلاسک کو اتنی خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، یہ پہلا موقع تھا جب میں نے گھر آ کر "زرداغ دل" کو پڑھا۔

عبدالعزیز خالد جالندھر میں ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے ان کا گھریلو ماحول شاعرانہ نہیں تھا۔ ان کے گھر کے افراد شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے چونکہ انہوں نے لاہور میں تعلیم و تربیت پائی اور وہیں پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا ہے اس لئے ان کو جو ماحول ملا وہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے عبارت تھا۔ آئے دن کی شعری نشستیں اور ادبی جھگڑے ان کی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

انہیں یہ یاد نہیں ہے وہ کب سے شعر کہہ رہے ہیں اس کے باوجود وہ یہ بات یقینی طور پر کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں پہلی نظم کہی تھی اور اسے سر عبدالقادر نے پسند بھی کیا تھا۔

ان کی شاعری میں فارسی، عربی اور انگریزی کلاسیکیت کا رچاؤ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ انہوں نے فارسی، عربی اور انگریزی میں بھی نظمیں کہی ہوں گی میں نے اس سلسلہ میں ان سے دریافت کیا تو یہ قیاس درست نکلا۔ وہ آج کے دور میں جب کہ اردو کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کی ہمہ گیری زندگی کے ہر شعبہ پر اپنی پرچھائیاں ڈال چکی ہے عربی فارسی اور انگریزی میں نظمیں کہنا شغل بیکاری سمجھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن میں کئی انگریزی اور عربی کتابوں اور داستانوں کو منظوم کیا تھا وہ پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا میں مقبول بھی ہوئی تھیں۔ چونکہ وہ ان سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے اس لئے ان کو تلف کر دیا۔

"زرداغ دل" عبدالعزیز خالد کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کئی مجموعوں کو مرتب کیا اور وہ یکے بعد دیگرے دو تین سال کے مختصر عرصہ میں چھپ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں ان میں سرود رفتہ، غزل الغزلات، دکان شیشہ گر، برگ خزاں، ورق ناخواندہ، گل نغمہ، زنجیر رم آہو، کلک موج، ماتم یک شہر آرزو قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ ان کے دو اور مجموعے دشت شام اور کف دریا کے عنوان سے بہت جلد شائع ہونے والے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کے پڑھنے والے اس پر مشکل گوئی کا الزام لگاتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ اس کی شاعری میں نامانوس اور اجنبی ترکیبوں اور لفظوں کی کثرت نظر آتی ہے، لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظوں اور ترکیبوں کی روایت پر نظر ڈال لی جائے۔ اپنی سرشت اور مزاج میں نہ کوئی

لفظ عجیب ہوتا ہے نہ غریب۔ غالب کے یہاں ایسے لفظوں اور ترکیبوں کی کمی نہیں جو ان کے دور میں حد درجہ اجنبی اور نامانوس ہونے کے باوجود آج قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ لفظوں اور ترکیبوں کی روایت ان کے محل و موقع کے علاوہ مسلسل استعمال اور تواتر سے بھی بنتی ہے۔ اگر عبدالعزیز خالد کسی خاص تحریک یا رجحان کے علمبردار ہوتے، ان کے پس منظر میں کوئی عوامی نقطۂ نظر ہوتا یا وہ بھی دوسرے شاعروں کی طرح اپنے معتقدوں کی کھیپ تیار کرتے تو ان کی ان اجتہادی کاوشوں کو بھی پیرایۂ قبول ملتا۔ یہ ان کا نہیں، ان کے اپنے معاشرے اور ماحول کا قصور ہے کہ وہ میراجی، ن۔م راشد، فیض احمد فیض یا سردار جعفری سے متاثر ہو جاتا ہے لیکن عبدالعزیز خالد کی شاعری اس پر اپنی چھوٹ نہیں ڈالتی ہے۔

اقبال کے اکثر شعروں کی تفہیم گوئٹے، نطشے، برگساں، غزالی، رومی، مارکس اور دوسرے مغربی و مشرقی مفکروں کے خیالات کے ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔ جس نے ان کو نہیں پڑھا، جس کو ان کے نقطۂ نظر اور فکر سے واقفیت نہیں، اس سے یہ توقع رکھنا غلط ہوگی کہ وہ اقبال کے فکری سرمایہ کا وارث ہوگا۔ اقبال کی تلمیحیں، استعارے، اشارے اور کنائے مطالعہ و بصیرت کے بغیر سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہیں۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری بھی مطالعہ چاہتی ہے۔ اس کی تلمیحیں اور استعارے بھی ایک وسیع پس منظر رکھتے ہیں ان کا ادراک بھی مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، علیؓ کے خطبات، بایزیدؒ کے ملفوظات، منوچہری، سعدی، حافظ، سنائی، نظیری، کعب بن زہیر اور اسی قسم کے دوسرے عربی و فارسی اکابر و مشاہیر کے اشعار نہ پڑھیں تو آپ کو عبدالعزیز خالد کی شاعری لطف نہیں دیگی۔ آپ کو جب تک قرآن، انجیل، توریت پر عبور نہیں ہوگا آپ اس کے شعروں کا احاطہ نہیں کر سکیں گے۔ آپ کو جب تک یونان، عرب، ایران، ہندوستان اور دوسرے مشرقی و مغربی ممالک کی کلاسک کا علم نہیں ہوگا، اس کی شاعری آپ کے کام نہیں آئے گی۔

خالد کی شاعری عام معلومات میں اضافہ کرنے کی بجائے انسان کے فطری جذبے یعنی جستجو کو مہمیز کرتی ہے۔ اس نے اپنے اظہارِ خیال کے لئے نئے الفاظ اور ترکیبیں تراشی ہیں، زبان و بیان کی ایجاد و تحقیق کی مہم میں جعفر طاہر کے علاوہ ایک بھی ایسا شاعر نہیں ہے جسے ہم اس کا شریک سمجھ سکیں۔

ہمیں اردو شاعری سے وہ نظم ہو یا غزل، سستی جذبات نگاری ملی ہے یا معاملہ بندی، ہم غزل میں گل و بلبل، رسن و دار، طوفان و کشتی، رہبر و ناخدا، نور و ظلمت اور ہجر و وصال سے آگے نہیں بڑھے ہیں، نظم میں بھی ہماری فکر عورت، شراب، نغمہ، رقص، مزدور، کسان، ساقی، انقلاب اور اسی قسم کے دوسری کم سواد آوازوں میں بند ہو کر رہ گئی ہے۔ خالد نے اپنی طویل مختصر نظموں کے ذریعے اس فکری نقص کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اس کی نظر مشرق و مغرب کے ان تاریخی کرداروں اور شخصیتوں کا احاطہ کرتی ہے جن کو دانشِ حاضر کی بے مائگی نے نہفتہ کر رکھا ہے۔

عبدالعزیز خالد کی شاعری کا ایک بڑا حصہ سادہ و پرکار ہے وہ واقعہ طرازی، جذبات نگاری، منظر کشی میں بڑی واضح اشاریت سے کام لیتے ہیں اس حصہ کو پڑھ کر ان کا قاری ان سے غیر مطمئن نہیں بلکہ متاثر ہوتا ہے اور یہ بات اس پر کھل کر ظاہر ہو جاتی ہے کہ خالد پر ادق نویسی اور مشکل گوئی کا الزام محض الزام ہے۔ سہلِ ممتنع میں اس کے چند شعر دیکھئے۔ کیا ان سے آپ کے دل و دماغ میں بالیدگی پیدا نہیں ہوتی ہے۔

قدرت بقدرِ ہمت و کوشش ہے رہنموں — آذر ہے بت تراش براہیم بت شکن

اپنی ہی سانس کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں — قربتِ حسن میں کم حوصلہ اربابِ ہوس

خالد کی شاعری میں ابلاغ بھی ہے اور پیغام بھی، لوگ اس سے کس قسم کی توقع رکھتے ہیں یہ میں نہیں جانتا، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ شاعر مفکر بھی ہو سکتا ہے اور مورخ بھی، مدرس نہیں، اسے درس و تدریس کی ضرورت نہیں، ادب کے بعض پروفیسر اس کی شاعری پر بے معنی ہونے کا فتویٰ لگاتے ہیں تو مجھے تعجب ہوتا ہے۔ انہوں نے ذاتی پسند اور ناپسند کا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ اس پر پوری اترنے والی ہر چیز بہتر یا خراب ہوتی ہے۔ اس جانب داری کے دور میں جہاں ہر کم سواد عالی ظرف اور ہر عالی ظرف کم سواد نظر آتا ہے، وہاں خالد کی اپنی شاعری اجتہادی حیثیت سے غور و فکر کی منزلیں متعین کرتی اور زمان و مکان کی قدیم و جدید وسعتوں سے آشنا کرتی رہے گی۔

چاکر خان بلوچ

عہدِ حاضر کا عظیم و منفرد شاعر

سچی بات تو یہ ہے کہ جناب عبدالعزیز خالدؔ پر جن کو پاک و ہند کے نامور ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور مفکروں نے شاعرِ اعظم اور اسلامی شاعر قرار دیا ہے اور جن کی شاعری نہایت دقیق و مشکل سمجھی جاتی ہے، اور بلکہ بقول شورش کاشمیری "خالدؔ اردو میں عربی کا شاعر ہے" پر لکھنے کا مجھ ایسی کم علمیت رکھنے والے لوگوں کو کوئی حق ہی نہیں پہنچتا۔ خالد کو اسلام اور نبی کریمؐ سے بے پناہ عشق ہے۔ اور اس کے اظہار کے لیے انہوں نے اکثر عشق کی زبان عربی کو اپنایا ہے اور تکلف برطرف ہم عربی سے صرف اس قدر واقفیت رکھتے ہیں کہ عربی قرآن کی زبان ہے۔ اور اسی رعایت سے ہم عربی کا روایتی احترام کرتے ہیں۔ جناب عبدالعزیز خالد کی شاعری کا بیشتر حصہ عربی سے مزین ہے کہ وہ اس کے مزاج اس کی وسعت بلکہ اس کی لذت سے آشنا ہیں۔ ہم ایسوں کے لیے تو جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق فارقلیط' کا اردو ترجمہ بھی ساتھ دینا چاہیے تھا۔

جناب خالد کو عربی، اردو، فارسی، سنسکرت، ہندی، عبرانی، یونانی، انگریزی، پنجابی اور پشتو پر عبور حاصل ہے اور ہماری تازہ ترین معلومات کے مطابق آجکل کشمیری اور بلوچی اور سرائیکی کو بھی بڑی دلیری اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی شاعری میں جگہ دے رہے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان زبانوں کی تراکیب کو بڑی سلاست کے ساتھ اشعار میں ڈھالنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کی شاعری —— جلوہ ہائے رنگ رنگ۔ اسلام —— اخلاق، انسان دوستی، دردمندی، خودداری، حسن و محبت، پرہیز و تقویٰ غرضیکہ ہر موضوع پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ فارقلیط —— آپ کی عظیم تخلیقی نظم ہے جو تیرہ سو چوراسی اشعار کی نعت مسلسل ہے جس میں رسول پاکؐ کی سیرت سے لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے عہدِ خلافت تک کے جستہ جستہ حالات و واقعات کو مستند کوائف کے ذریعہ نہایت عقیدت و احترام سے پیش کیا گیا ہے اور اس پر بھی شاعر کے عجز و انکسار کا یہ عالم ہے ؎

کہاں نعت و نامِ رسولِ تہامیؐ   کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے!

نعت گوئیؐ کا رواج نہایت قدیم ہے۔ اس موضوع پر مسلم و غیر مسلم شعرا نے بھی نہایت اعلیٰ قسم کی چیزیں کہی ہیں۔ نعت گوئی نہایت مشکل فن اور نازک مرحلہ ہے۔ حضورؐ کے وقار و احترام کو ملحوظ رکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ اس میدان میں ڈگمگانے اور بھٹک جانے کا زیادہ خطرہ رہتا ہے لیکن شاعر کا کمال تو دیکھئے کہ "فارقلیط" ایسی طویل نعت سے بھی اس کا جذبۂ عقیدت و شیفتگی تشنہ کام رہا اور اس نے "منحمنا" کے نام سے چار سو چوالیس اشعار کی ایک اور نعت مسلسل کہہ ڈالی۔ اس میں قرآن، احادیث اور تاریخی تلمیحات جگہ جگہ نظر آتی ہیں اور بعض مقامات پر تو فارقلیط اور منحمنا میں پوری کی پوری آیات نہایت سلیقے اور حسن سے بٹھا دی گئی ہیں —— لیکن کیا مجال کہ طوالت کے باوجود کہیں جھول کا احساس تک ہو۔ اندازِ بیان میں روانی اور لہجے کی گرمی قاری کو مسحور کر دیتی ہے اور زبان و تلفظ کو نہ سمجھتے ہوئے بھی قاری پر شاعر کی طرح جذبات و وارفتگی کا عالم طاری

ہو جاتا ہے اور وہ برابر سرشار ہوتا ہے ؎

مُطاعِ آدم و انجم متاعِ لوح و قلم — محمدؐ اُمّی محبوبِ کبریا صلعم
جمیل و اجمل و کامل مکمل و اکمل — ستم زدہ بشریت کا محسنِ اعظم
محمدؐ انجمنِ کن فکاں کا صدر نشیں — محمدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم
وہ عبدہٗ و رسولہٗ و اسمہٗ احمدؐ — کتاب و حکم و نبوت کا خاتم و خاتم
محمود و حامد و احمدؐ، محمدؐ و محمودؐ — کریم و میرِ کرام و مکرم و اکرم
ہے جس کا وصف بیاں کان خلقہ القرآن — جو ہر جہت سے ہے افخم و مفخم و افخم

آپ کی ہندی و سنسکرت کی شاعری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ جوگن کے روپ میں یوں گویا ہیں ؎

میں شبدوں کی پیاسی، میں چرنوں کی داسی — تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے
نشیلے کنول نین گھرانے تیرے — چھپا کر نظر دل تجھے دیکھتا ہے
میں جوگن برہ گن میں کملی کمینی — تو سرتاج میرا، میرا دیوتا ہے
تو دیپک میں کاجل تو درپن میں سیسہ — میں کالک تو پربھات کی لالما ہے
میں راتوں کو کوئل کی مانند کوکوں — کبھی لب پہ ڈھولا کبھی ماہیا ہے
میں ساجن کی بندی ہوں چنگی کہ مندی — اسی کی مجھے چاہ ہے لالما ہے
جگن ناتھ تجھ بن بھلا کون میرا — ابھاگن کو ہر کوئی دھتکارتا ہے

الفاظ کی بندش روانی، شوق و ولولہ اور ہندی و سنسکرت تراکیب کے علاوہ روزمرہ اصطلاحات جوگن برہ گن۔ کملی کمینی۔ ڈھولا۔ ماہیا۔ چنگی کہ مندی اور ابھاگن کو ہر کوئی دھتکارتا ہے۔ یہ پیوند کاری اور سحر بیانی صرف اور صرف خالد کا ہی حصہ ہے۔ یہی انفرادیت شیر افضل جعفری کی ہے جو اردو شاعری میں پنجابی و سرائیکی کے الفاظ و تراکیب کے علاوہ چناب رنگ یعنی جھنگ کے مخصوص بول، موتیوں کی مانند پرو دیتے ہیں اور اپنے مجموعہ کلام کا نام بھی مقامی اصطلاح "سانولے من بھالولے" تجویز کر دیا۔ بلاشبہ یہ طریقہ قومی زبان اردو کو مالدار کرنے میں نہایت ممد و معاون ہو سکتا ہے۔

شاعر ـــــ عاشق ضرور ہوتا ہے۔ عشق چاہے فارقلیط کی صورت میں یا منموہنا کے نام سے ہو۔ بہرحال عشق کے بغیر شاعر کیا ہے۔ خالد صاحب عاشق ہیں۔ عشق فرماتے ہیں۔ حقیقی بھی اور مجازی بھی۔ حسن جہاں بھی نظر آئے وہ بغور دیکھتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہونے کا پورا پورا حق استعمال کرتے ہیں۔ غزل کے دو شعر ؎

پھر بھی نہ جانے قلب و نظر منتظر ہیں کیوں — مدت سے کوئی سایہ لبِ بام پر نہیں
صحرائے آرزو میں جرس ہے نہ سنگِ میل — دریائے خاک و خوں ہے تیری رہ گزر نہیں
کون ہے محرم یہاں رسم و رہِ شوق کا — زندگی محرومیاں ـــ عاشقی رسوائیاں

اے زلیخا میں ہوں تیرا دل ربا — از سرِ نو ہو جواں میرے لیے!

خالد کی عشقیہ شاعری میں حسن اور وہ بھی عورت کے حسن کو بڑا دخل ہے۔ بالکل بلوچ شاعر کا جذبہ ـــ "میں نے رات بھر محبوب سے باتیں کی ہیں اور اس کو کچھ اس طرح دیکھا ہے جیسے میں قرآن کے ایک ایک ورق کو پڑھتا ہوں"۔

جناب خالد کا ایک سراپا پیش خدمت ہے:

گوشے بلور و عاج و مرمر — ریشم کے لباس میں چھپائے
غارت گرِ جنسِ پارسائی — انگور کے خوشے سُرخ گوشے
محراب، عمود، برج، قوسیں — رس میں ڈوبے بھرے بھرے سے
جھلمل جھلمل بدن کا سونا — لہرائیں لٹیں کمر کے نیچے
اے چاند اگر تو اس کو دیکھے — کوٹھے پہ کبھی اکیلے سوتے
تیرے چہرے کا رنگ فق ہو — تو اپنی سب آن بان بھولے!

جناب خالد نے عورت کے جسمانی حسن کی جی بھر کے تعریف کی ہے مگر وہ عشق کو عشق کا حاصل سمجھتے ہیں اور وہ جسمانی ملاپ کو روح کی تسکین قرار نہیں دیتے ہیں ؎

اٹھتی ہے دل سے فغانِ تشنہ لبی — پیاس بدن کی بدن سے بجھ نہ سکی

شاعر نہایت حساس ہوتا ہے۔ جہاں وہ حسن کی پوجا کرتا ہے اور حسن و عشق کی باتیں کرتا ہے وہاں وہ لوگوں کو پیار بھی سکھاتا ہے اور جہاں کہیں اسے ناہمواری، مجبوری و نارسائی کا احساس ہوتا ہے وہ اس پر آنسو بہاتا ہے۔ وہ لوگوں کو آزاد، خوشحال اور مطمئن دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ ظلم، تاریکی اور جہل سے، استحصال سے اور غلامی سے شدید نفرت کرتا ہے اور وہ آزادیٔ تحریر و تقریر اور انسانوں کے بنیادی حقوق کا محافظ دکھائی دیتا ہے ؎

مامور من اللہ بنے ہر آمر — اور اک مقاماتِ بشر سے قاصر
افکار و خیالات کا گھونٹے وہ گلا — ہیچ کا کرے قتل عام مثلِ نادر
جب تک نہ ہو آزادیٔ اظہار و بیاں — ناممکن ہے نشو و نمائے انساں
ہو جس میں نہ تاب و تبِ ادراک و شعور — ہے ہر دو جہاں میں رائیگاں وہ ایماں

شاعر کی دردمندی اور انسان دوستی ملاحظہ ہو۔ وہ پُرعزم رہنے اور کامیابی پر ایمان رکھنے کا درس دیتے ہیں اور کامیابی کی بشارت بھی دیتے ہیں ؎

عزم زندہ ہے تو ویرانے گل افشاں ہوں گے — ہر روش امین و ہر گام گلستاں ہوں گے
آج صحرا میں جو تہمت کشِ رسوائی ہیں — ایک دن عصمتِ عالم کے نگہباں ہوں گے
خاک میں تخمِ تمنا جو دبائے ہم نے — اب وہی تخم نمو پا کے گلستاں ہوں گے
زیرِ خاکسترِ پروانہ جو پنہاں تھے شرر — طرفۃ العین میں وہ شمعِ شبستاں ہوں گے
اے خوشا مشربِ نایاب تُو ہے زندہ رہے — آدمی بندہ و خواجہ نہیں —— انساں ہوں گے!

جناب عبدالعزیز خالد کی تازہ ترین کتاب "پروازِ عقاب" حال ہی میں چھپی ہے اور اس کے علمی ادبی حلقوں میں خوب چرچے ہیں۔ پرواز عقاب بطلِ حریت ہوچی منہ کی قید میں کہی گئی نظموں کا نہایت سلیس، صاف و شستہ اور عام فہم ترجمہ ہے۔ ہوچی منہ کی انقلابی روح کو زندہ رکھا گیا ہے۔ ہوچی منہ نہ صرف ویت نام کی آزادی کا علمبردار تھا بلکہ وہ ساری انسانیت کی جنگ آزادی کا سپہ سالار تھا۔ وہ استحصال و استبداد جہالت، غربت سے نفرت کرتا تھا۔ ہوچی منہ کی یہ نظمیں ان قوموں کے جذبۂ شوق کو تیز تر کرنے کے لیے آج بھی باعث کشش ہیں جو اپنی قومی آزادی اور بیرونی استبداد

کے خلاف جد و جہد میں مصروف ہیں —— اہل پاکستان بھی کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔ ایسے وقت میں جناب خالد نے چاچا ہو کی نظموں کا ترجمہ شائع کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔ 'پرواز عقاب' اُن مجاہدین سے منسوب کی گئی ہے جو بنگلا دیش میں مقید ہیں۔ اس سے شاعر کا جذبۂ حب الوطنی واضح ہوتا ہے۔ شاعر نے منظوم انتساب نہایت دردمندانہ انداز سے کہا ہے لیکن حقیقت پسندی کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو دوسرے مصرع میں بنگلہ دیش کے عوام کو "ظفر مند" کہا گیا ہے۔ انتساب کا ایک حصہ ملاحظہ ہو :-

ان نظر بندوں کی آبادی کے نام	ان ظفر مندوں کی بربادی کے نام
جن کے جسموں پر لباسِ خوف و جُوع	زرد رُو آشفتہ مو ژولیدہ مُو
بال بے ترتیب کپڑے میلے	(کوچ کا نقارہ جانے کب بجے ؟)
وہ مرقعِ عشق و فرض و آن کے	جن کو اب لالے پڑے ہیں جان کے

ہوچی منہ نے اپنی نظموں میں جیل کی جو تصویر پیش کی ہے یوں لگتا ہے جیسے ہمارے ملک کی جیل کی بات کی جا رہی ہو یا شاید جیل دنیا کے کسی خطے میں ہو اس کا ایک ہی دستور ہوتا ہے اور ہر جیل میں قیدی کے ساتھ ایک سا سلوک کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جیل میں داخلے کے وقت تمہیں فیس ادا کرنی ہے
ہو نہ پچاس یُوآن سے جو عموماً کسی صورت سے بھی کم
اور بالکل ہی اگر تم ہوتہی دست تو پھر
مستقل تم کو اذیت سے گزرنا ہوگا
سامنا مضحکہ وطعن کا کرنا ہوگا
مستقل بننا پڑے گا ہدفِ مشقِ ستم
(کہ یہ قیمت ہے زمانے میں سیہ بختی کی)

گذشتہ دنوں جناب خالد ملتان تشریف لائے تو ملتان کے سنگت نے ان کے ساتھ ایک شام منا ڈالی —— خالد نے ڈھیر سارے شعر سُنائے۔ ایک نظم غالباً "قیدی شوہر سے بیوی کی ملاقات" بھی سُنائی۔ کاش! مجھے اس کے کچھ اشعار یاد ہوتے تو پیش کر سکتا۔ وہ نظم بھی ایک شاہکار سے کم نہیں ہے۔

حق ادا نہ ہوا —— کا احساس باقی ہے۔ خالد صاحب اِس عہد کے عظیم و منفرد شاعر ہیں۔ ان کے لیے تو دفتر چاہئیں اور میں نے اپنی کم علمی کا شروع میں ہی اعتراف کیا ہے۔ البتہ خالد کے پروانوں میں شامل ہونے کا موقع دینے پر جناب حفیظ صدیقی کا شکر گذار ہوں ؛

عفت موہانی

عبدالعزیز خالدؔ

اگر غالبؔ کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو کر اقبالؔ کے پیکرِ محسوس میں سماگئی تھی تو یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ علامہ اقبالؔ کی روح نے زندگی ہی میں اپنا ایک پیکرِ شعر منتخب کر لیا تھا! ان کا شعری آہنگ ایک بار اور گھن گرج کے ساتھ عبدالعزیز خالدؔ کے فکر و فن کے قالب میں جلوہ گر ہوا۔
عبدالعزیز خالدؔ کے فن و شخصیت پر ماضی قریب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یقیناً مستقبل قریب میں بھی بہت کچھ لکھا جائے گا! لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فن ایک ترشا ہوا ہیرا ہے اور ؎

ہیں ہزاروں اس کے پہلو رنگ ہر پہلو کا اور

اور باوجود ان تصریحات و تشریحات کے ہر پہلو بخوبی واضح ہونے سے رہ گیا۔ (اس مضمون پر بھی اتمام ستائش کا دعویٰ نہیں ہے)
خالدؔ فلاسفر ہیں۔ فلاسفر پہلے اور شاعر بعد کو۔ ایک ایسے جینیئس جو دنیا کی کئی مشہور زبانوں پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں! خالدؔ آج کے بھی شاعر ہیں۔ اور کل کے بھی! ان کا علم تحیر خیز حد تک وسیع ہے۔ رفعتِ فکر اور عظمتِ تخیل کی کہیں حد نہیں ہے۔
اظہارِ خیال کی بلندی کے ساتھ ساتھ یہ امر باعثِ مسرت اور کیف آور ہے کہ ان کا کلام سرتاسر روحانی ہے جو قلبی تاثرات میں مدغم ہو کر ایک آفاقی چیز بن گیا ہے۔ یہی وہ روحانی شاعری ہے جو فارقلیط میں سموئی ہوئی ہے اور جس کا اختتام منحمنّا پر ہوا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا میں اپنی وارداتِ قلبی کا اظہار یوں کرنا جیسے نعت کے چمن میں عقیدت و محبت کے پھول کھلا دیئے ہوں، بڑے حوصلہ اور مرحلے کا کام ہے
خالدؔ نے اتنی خوبی ایسی نزاکت اور اس قدر ماہرانہ انداز میں طویل نعتیہ نظم کہی ہے کہ از مطلع تا مقطع وہی آہنگ ہے وہی دلکشی ہے اور وہی تاثر . . . ! اس میں جا بجا عربی فارسی اور ہندی کے خوبصورت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک جوہری کے آگے بیچے نگینوں کا انبار لگا ہے۔ جس نگینے کو چاہا ہار میں پرو دیا۔ اور وہ وہیں جگمگانے لگا! اس طرح فارقلیط تقدیسِ خیال اور حسنِ معنی کا ایک اعلیٰ شاہکار بن گئی ہے! فارسی اور عربی کی عظیم الشان تراکیب اور تلمیحات کا ایک دریا ہے جو کوزے میں بند ہے!
خالدؔ صاحب کے تخیل اور اظہار کا معیار نہایت اعلیٰ، منفرد اور شاعری کا میدان بے انتہا وسیع ہے۔ مثلاً فارقلیط کے بعد منحمنّا کے ذریعہ دنیا کے نجات دہندہ کی شان میں خراجِ اشک و عقیدت پیش کرتے ہوئے شاعر کو کوتاہیٔ دامن کی شکایت نہیں رہ جاتی لیکن بعض بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفورِ مسرت، فرطِ جوش اور ہیجانِ عقیدت سے شاعر کی زبان بند ہو گئی ہے اور محبت کے آنسوؤں نے محسوسات کو گویائی عطا کر دی ہے! یہ ہے تو منحمنّا وہی ماہتاب جو آفتاب کی ضیا باری سے ضو فشاں ہوا۔ لیکن جس کا مقام بالکل الگ اور مقدس ہے!
نظموں کے علاوہ خالدؔ صاحب نے دنیائے ادب و شعر کو بہترین و اعلیٰ پایہ کی غزلوں کا بھی نہایت وافر اور قیمتی سرمایہ دیا۔ غالبؔ کی صوتی آہنگ سے خالدؔ کا شعری ایوان گونج رہا ہے! اُن کی غزلیات کا لب و لہجہ، نزاکتِ بیان اور بلیغ ترین پیرایۂ اظہار انہیں اپنے معاصرین سے ممیز کرتا ہے، اور وہ اس مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ان کے نقشِ قدم پر بھی کسی آنے والا کا پتہ نہیں! غالباً یہی راہ ایسی پُرخطر اور کٹھن ہے جس نے خالدؔ کو ایک بالکل ہی نئی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ ان کا اسلوب اور لب و لہجہ بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی لاہوتی آواز اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ ہمارے

دلوں تک پہنچے، ٹکرائے اور اپنی گونج چھوڑ جائے۔ جس سے ہم مرعوب و متاثر ہو جاتے ہیں! لیکن جسے قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے! ہم سیدھی سادی شاعری کے عادی ہیں! جہاں زلف و رخسار کے افسانے ہیں۔ ہجر و وصل کی داستانیں ہیں گل و بلبل کی کہانیاں ہیں۔ اور وہ سب کچھ ہے جسے حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں جو دم توڑ رہی ہیں! ان کی جگہ ایک نئی صنف "شعرِ جدید" نے لے لی ہے! جسے شعر کا "تجریدی تجربہ" کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ جس میں مطلقاً اتنی جان نہیں کہ وہ سو برس کے بعد تو درکنار صرف دس ہی برس زندہ رہ جائے۔ اور جب ہم اس فرسودہ شاعری کے پس منظر سے ایک نئی آواز سنتے ہیں تو چونک پڑتے ہیں۔ جسے پسند کرتے ہیں لیکن قبول کرتے میں ہچکچاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ آواز پُرشکوہ اور نامانوس ہے۔ وہ محسوسات کی آواز ہے۔ ایک ایسے بیقرار دل کی پکار جسے حسرت ہے ؎

خالد! لب گویا ہے نہ گوش شنوا ۔۔۔ بے نور ہوئی روشنیٔ شہرِ نوا
انبوہِ خلائق میں ہے گم صم شاعر ۔۔۔ دل خستہ۔ جگر سوختہ۔ تنہا تنہا

شعر کی کونسی صنف ایسی ہے۔ جو خالد کے قلم سے چھوٹ گئی ہو۔ منظوم ڈرامے ان کی مشکل پسندی کے مظہر ہیں۔ ترجمے میں وہ ڈرامہ کی اصلی روح کو جوں کی توں برقرار رکھتے ہیں اور اپنی طرف سے طرح طرح کی بوقلمونیوں کے شاعرانہ گل و گلزار سجاتے چلے جاتے ہیں! ان ڈراموں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ وہ نثری چیز ہے جس میں ACTION اور کرداروں کی فعالیت اگر ماہر قلمکار کے ذریعہ طریق اظہار نہ اختیار کرے تو کس قدر گراں بار و بیزار و بے دلچسپ بن جاتی ہے لیکن وہی صنف ایک قادر الکلام شاعر کے قلم سے کتنی حسین اور موثر ہو جاتی ہے کہ قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لئے چلتی ہے۔ جہاں ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں ہوتا کہ ہم شاعر کے ہمراہ نہیں ہیں۔

سلومی بھی ایک ڈرامہ ہی ہے۔ اس کے بہت سے نثری تراجم ہو چکے ہیں۔ اس منظوم نظم سے خالد کی قوتِ اظہار کا پتہ چلتا ہے! سلومی ادراک واحساس کا ایک المیہ ہے! جس میں سب سے زیادہ متاثر کن ڈرامہ کا نقطۂ عروج ہے:

آسکر وائلڈ نے کہیں کہا ہے کہ

"THE REACTION OF AN ARTIST IS UNBORN OUT-COME OF HIS UNIQUS NATURE."

اور یہ قول بلاشبہ عصرِ حاضر کے شاعروں میں صرف خالد پر پورا اُترتا ہے! اُن کا ہر عمل اُن کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمرہ ہے! انہوں نے علوم جدید و قدیم کا جو بیش قیمت ذخیرہ ادب کو بخشا ہے۔ اسے بہت جلد قبولِ عام کا شرف حاصل نہیں ہوا! ان میں بھی نہیں جو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اُن میں بھی نہیں جو سرے سے کچھ نہیں سمجھتے یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

خالد کی شاعری کا رنگ اپنے اندر ایک بہارِ تازہ رکھتا ہے۔ گل بداماں شاعر سود و زیاں کو بیگانہ اور شاعری کو محض مبالغہ تصور نہیں کرتا اس کی فطرت پرستی، وطن دوستی، ذوقِ آگہی۔ جرأتِ رندانہ۔ شکوہ سنجی، شدتِ معنویت، تعمیقِ جذبات، غرضیکہ ان کا ذہنی ارتقاء ہر موڑ اور ہر منزل پر نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کے دل و دماغ کی بیکراں رفعتیں ان کے کلام پر اثر انداز ہیں وہ جس رنگ کا جامہ پہن لیں۔ ان کا اندازِ قامت چھپ نہیں سکتا۔

ان کے کلام کی اہم خصوصیات، اُردو شاعری میں ان کا مقام، یہ موضوعات ایسے ہیں کہ ان پر ایک تفصیلی کتاب لکھی جا سکتی ہے محاسنِ کلام کا احاطہ مختصر سے مضمون میں نہیں کیا جا سکتا!

خالد ایسے شاعر ہیں کہ فلسفہ جن کی فکر میں رچا ہوا ہے۔ فلسفیانہ اظہارِ احساس شاعر کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔

لیکن شاعر کا فلسفہ خشک موضوعات اور ان کی صراحت پر مبنی نہیں۔ اندازِ بیان ضرور فلسفیانہ ہے۔ ہر شئے کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں ہر چیز پر فلسفیانہ نظریں ڈالتے ہیں۔ مثلاً فلسفۂ تکوینی، فلسفۂ حیات و ممات اور فلسفۂ اسلام جو ان کی شاعری کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے

لیکن ایک خاص پیرایہ جو فلسفہ کو خشک اور غیر دلچسپ مضمون ہونے سے بچاتا ہے وہ ان کے کلام کی موسیقی اور ترنم ہے: مثلاً

(فلسفۂ تکوینی)
اگر کوئی دیکھے بچشمِ بصیرت — یہ دنیائے دوّار عبرت کی جا ہے
کہیں آفرینش میں اے چشمِ ناظر — فتور و تفاوت نظر آ رہا ہے؟ (فارقلیط)

ہے خاتمہ بالخیر تمنا - حسرت — ہم کاسہ و ہم کاس ہیں جہل و حکمت
العجز عن درک الادراک - ادراک — تقدیرِ خرد - حیرت - حیرت - حیرت (لحنِ حریر)

(فلسفۂ حیات و ممات)
میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے — میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے
ہے درکِ حقیقت سے ادراک عاجز — بجز خامشی چارۂ کار کیا ہے (فارقلیط)

وہ اشعار جو مترنم ہیں، اب ان کی مثالیں دیکھئے!

کریم السجیہ جمیل الطویہ — تو خیر البریہ شہِ دوسرا ہے
رفیع العماد عظیم الرمادہ — طویل النجاد سراپا عطا ہے
کرے شکر مومن علیٰ کل حال — جو تحفہ ہے مولا کا بھیجا ہوا ہے
اک ازلی التہاب اک ابدی اضطراب — مبداءِ فیاض سے قسمتِ آزادگاں
مری رائیگاں نہ زندگی کا بیاں - — نہ مقصد نہ مصرف نہ منشاء کوئی
رم جھم برس رہی ہے گھٹا جی نڈھال ہے — اے یارِ دلنواز شبِ برشگال ہے

اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے ہر ہر لفظ سے عشقِ رسولؐ جھلکتا ہے - اور خالد کی تشنہ لبی جس چشمہ سے سیراب ہوتی ہے وہ اسلام ہے! اس جلیل القدر شاعر کا یہ ذہنی کرشمہ ہے کہ اس کی متعدد کتابوں کے ورقوں پر ورق الٹتے چلے جائیے سوائے چند ایک خامیوں کے ہی لبوں سے نکلے گا -

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

شاعر کے فنی کمالات پر تبصرہ کرنے سے پہلے ان کے فن کے لوازم پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے - ان کی جدوجہد کا تمام مقصد حیات ہے - دنیا بھر کے علوم اسی عظیم مقصد کے تحت آتے ہیں - بہترین فن وہی ہے جو قوتِ ارادی کی نشوونما کرے کارزارِ حیات میں مقابلہ کی طاقت عطا کرے - ان کے پاس زندگی اور زندگی سے وابستہ ہماہمی کا احساس اس قدر زبردست ہے کہ کہیں بھی یاس و قنوطیت کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں ہے - زندگی کی آگ ہے جو شرر فشاں آہوں، شعلہ ریز فریادوں اور جگر گداز نالوں میں فروزاں ہے - یہی پیغامِ رازِ حیات ہے - انسان اور انسانیت سے محبت جسے وہ بڑی کاوشوں کے بعد سمجھ سکے! اور اب دوسروں کو سمجھانے کے لئے بے تاب ہیں - لیکن محرمِ راز ایک بھی نہیں ملتا! ؎

ہجومِ شوق ہے شاعر ہے اور تنہائی — جگر فگار نفس سوختہ مژہ پُر نم

خدا نے شاعر کو صاحبِ بصیرت کیا لیکن افسوس کہ اس بصیرت سے مستفید ہونے والا کوئی نہیں - ان کی بصیرت افروز روشنئ طبع نے اکثر جگہ بلکہ ہر جگہ مادرائیت کی حدیں بھی توڑ ڈالی ہیں - علم و دانش کی یہ فراوانی منازلِ المختلف عبور کرکے روحانی بیداریوں کا سہارا لینے پر مجبور ہے! لیکن اپنی فراخدلی وسیع المشربی اور وسعتِ نظر کے باوصف وہ بارگاہِ ایزدی سے رحمت و رافت کے ملتجی ہوتے ہیں -

خالد شمعِ رسالتؐ کے پروانے اور مئے وحدت کے شیدائی ہیں

کی ہستی مرجع صفات ہمہ صفت موصوف ذات نے اسلام اور بانیٔ اسلامؐ کی خاکِ پا سے عشق و محبت کے نورانی ذرات نوکِ پلک سے چنے۔ اور انہیں آفتاب و ماہتاب بنا کر چشمِ عالم کے سامنے پیش کیا۔

خالد پر بہت زیادہ اعتراضات کی بارش ہوئی۔ انہیں مشکل پسند، ابہام پرست بنایا گیا ہیئت پرست شاعر کا الزام لگایا گیا۔ جب کہ واقعہ یہ ہے ؎

فن پارے میں دونوں کی ہے یکساں اہمیت

اور اعلیٰ فن دونوں کے مکمل اور کامیاب امتزاج ہی کا نام ہے۔ اور اگر مقابلہ دونوں میں ہو تو ؎

الفاظ و معانی میں معانی ہیں اہم تر

اس سلسلے میں وہ اپنی علمیت سے مجبور ہیں۔ وہ الفاظ جو ان کے نزدیک اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے گرانبار نہیں۔ دوسروں کے لئے معنی خیز و مشکل بن جاتے ہیں۔ انہوں نے مسلسل ریاض اور بے پایاں ذوق و شوق سے اس نخل کی آبیاری کی ہے کہ اپنے معاصرین کے لئے ایک نہایت قیمتی ذخیرہ مہیا کیا ہے۔

پہلے پہل انہوں نے اقبالؔ کی زبورِ عجم اور پیامِ مشرق کو انگریزی شعر میں منتقل کیا۔ ایبر کرامبی کی — PRINCIPLES OF LITERARY CRITICISM کو اردو جامہ پہنایا۔ کرسٹوفر مارلے کی المیہ روداد کو اردو کا قالب دیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ کوششیں ان کی اپنی نہیں مانی گئیں۔ آئن سٹائن کی THE WORLD AS I SEE IT کا ترجمہ کیا اور جس پر سر شیخ عبد القادر نے مقدمہ بھی لکھا، (اور یہ سب چیزیں بعد کو تلف بھی کر دی گئیں)

یہ انکشاف قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ عبد العزیز خالدؔ نے اوائل عمر ہی سے لکھنا شروع کیا۔

اوّل اوّل انہوں نے بایزید تخلص کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک صہبائی اختیار کیا۔ انہی ناموں سے انہوں نے ۱۹۴۳ء میں اپنی کچھ تخلیقات ہمایوں کو بھیجیں جو اس لئے قابلِ قبول نہ ہوئیں کہ اس میں "غالبی اردو" زیادہ تر استعمال کی گئی تھی۔

۱۹۴۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام میں ایک قومی نظم پڑھنے کے سلسلے میں اقبال گولڈ میڈل حاصل کیا اور یہ نظم سہ روزہ کوثر میں شائع ہوئی۔ اس زمانے میں خالدؔ نے فارسی اور انگریزی نظمیں بھی کہی تھیں اور فارسی سے منظوم تمثیلیں بھی لکھیں۔ انگریزی کے متعدد ایلکلکی ڈراموں اور تنقیدی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا جنہیں تاجور نجیب آبادی نے بہت سراہا۔

خالدؔ کی شاعری کا باضابطہ اور باقاعدہ آغاز ۱۹۵۲ء میں ہوا اور پہلی طویل نظم راہ و رسمِ منزلہا سالنامہ ساقی ۵۲ء میں چھپی یہ بھی سنئے کہ شاعری کا اہتمام و انصرام کیوں کر ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"میں صرف تنہائی اور یکسوئی کی حالت میں لکھ سکتا ہوں۔ طبیعت میں انتشار ہو یا ذہن و نگاہ دوسری طرف متوجہ ہوں تو فکرِ شعر نہیں کر سکتا۔ زوال سے غروب تک میں عموماً لکھنے کا کام نہیں کر سکتا۔ میری شاعری طلوع سے زوال اور غروب سے آخرِ شب کی پیداوار ہے"

تو یہ ہیں عبد العزیز خالدؔ! علامہ اقبال نے جو ورثہ چھوڑا تھا اس کے حقیقی معنوں میں امین و متولی۔

سید یونس شاہ

سیدنا محمدؐ کے دو سراپا نگار

تاریخ عالم شاہد ہے کہ تخلیقِ کائنات کے روزِ اوّل سے لے کر آجتک سوائے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی ایسی ہستی کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جس کی زندگی کے جملہ حالات و کوائف صحت کیساتھ محفوظ ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا کے سینوں کے خزینوں میں اپنی تمام جزئیات سمیت موجود ہوں۔ قرآن تو ذاتِ باری تعالیٰ کا کلام ہے جس کی بقا اور حفاظت کا وہ خود ذمہ دار ہے لیکن یہ فخر صرف امتِ مسلمہ کو ہی حاصل ہے کہ ختم الانبیاءؐ کی زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک پل کی مصروفیات، جس میں روحانی واردات اور بشری کیفیات کی مکمل تفصیلات پائی جاتی ہیں آجتک وردِ زبان ہیں اور انشاء اللہ العزیز رہتی دنیا تک اس کے نقوش مٹائے نہ مٹ سکیں گے۔ ایسی بےنظیر اور بے عدیل ہستی، جو فخرِ موجودات ہو، محبوبِ خدا ہو اور وجہِ تخلیقِ کائنات ہو، کی مدّاحی کا حق کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟ اس ضمن میں یہ شعر قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نعت کے ضمن میں شاعر کو مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بقول کسے "با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار" کی منزل کچھ سہل نہیں۔ یہاں عرب کی فصاحت اور عجم کی بلاغت گنگ نظر آتی ہے اور بڑے بڑے سخنورانِ کامل کا رہوارِ قلم گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ شاعر دنیائے تخیل کا باسی ہوتا ہے اور اس برتے پر کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، یہاں تک کہ کبھی وہ "یزداں گیر" بن جاتا ہے اور کبھی برملا کہتا ہے کہ "آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر"! لیکن مدّاحیٔ حبیبؐ کے کوچے کا رنگ و روپ ہی نرالا ہے۔ یہاں تو سانس بھی آہستہ لینے کا حکم ہے۔ اپنے عجز اور اعتذار کی کیفیات ملاحظہ کیجئے:۔

ثنا لم از کسی، می نالم از خویش	کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم	(اقبالؔ)
جوہرِ طبعِ من از وصفِ کمالت دوش	گوہرِ نظمِ من از نسبتِ ذاتت ممتاز	(عرفیؔ)
غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم	کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است	(غالبؔ)
مدحتِ شاہ دوسرا مجھ سے بیاں ہو کس طرح	تنگ مرے تصوّرات، پست مرے تخیلات	(نواب بہادر یار جنگ)

اگر خموش رہوں میں تو، تو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو، ترا حسن ہو گیا محدود
(اصغرؔ گونڈوی)

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے
شہنشاہِ لولاک و مولائے سدرہ
تو میرے تخیّل سے بھی ماورا ہے
(العبد العزیز خالد)

باوصف اس کے عاشقانِ رسولؐ نے سعی دامن نہیں چھوڑا اور محبوبِ ذوالمننؐ کے حضور عقیدت کے وہ گلدستے نذر کئے ہیں جن کی خوشبوئے لازوال سے مشامِ جاں ہمیشہ معطّر رہے گی۔ چنانچہ آپؐ کی صفت و ثنا اور مدح و قصیدہ کے سلسلے میں دنیا

کی ہر زبان میں اتنا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے، جس کی مثال دنیائے ادب میں ڈھونڈے سے نہ ملیگی۔

آپؐ کی زندگی میں حضرت حسانؓ اور حضرت زیدؓ خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ آپؐ نے ان دونوں حضرات کے کلام کو پسند فرمایا۔ صحابہ کے عہد میں فرزدق نے اپنی شاعری عشق رسولؐ کے لئے وقف کر دی تھی۔ عباسیوں کے دور میں متنبی دیگر نعت گو شعراء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ فارسی ادب و شعر میں کم و بیش تمام صوفی شعراء نے مداحیٔ رسولؐ کا فریضہ انجام دیا ہے۔ تاہم خواجہ عطار، حکیم سنائی، شمس تبریز، سعدی، رومی، قدسی مشہدی اور امیر خسرو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سعدیؒ کا یہ بند زبان زد خاص و عام ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلّو علیہ و آلہٖ

امیر خسرو کی یہ نعت آج بھی دل کو سرور اور آنکھوں کو نور بخش رہی ہے۔

"محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم"

اسی طرح قدسی مشہدی کی اس نعت کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کی سند مل چکی ہے اور اس کا ہر مصرعہ کانوں میں رس گھول رہا ہے۔

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اُردو شعراء میں امیر مینائی، شہیدی، محسن کاکوروی، غالب، حالی، اقبال، ظفر علی خاں، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، حافظ مظہر اور عبدالعزیز خالد کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد شعراء نے نعت میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس میدان میں کسی بڑے شاعر نے نعت گوئی کو باقاعدہ طور پر اپنا مسلک و منشا قرار نہیں دیا۔ البتہ رسمی طور پر شعراء اپنے دواوین کے آغاز میں حمد و نعت اور منقبت کے مضامین کو جگہ دیتے رہے۔ اس رسم و رواج کا آغاز اردو شاعری کی ابتداء سے ہی مل جاتا ہے اور آج تک یہ روایت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اس سے یہ تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ اُردو شاعری میں نعتیہ کلام کا فقدان نہیں مگر اس قسم کے ذخیرے میں نہ تو شاعرانہ محاسن نظر آتے ہیں اور نہ فنی حیثیت سے اس کا کوئی بلند مرتبہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں جہاں غزل و دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل ضخیم دیوان اور کلیات نظر آئیں گے وہاں نعتیہ شاعری کے مجموعوں کی قلت ضرور محسوس ہوتی ہے[1]۔ اس کمی کا ازالہ محسن کاکوروی اور عبدالعزیز خالد نے بجا طور پر کر دیا ہے۔

محسن کاکوروی غالباً پہلا اُردو شاعر ہے جس نے نعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور نعتیہ شاعری میں آب و تاب اور ادبی شان پیدا کر کے اسے فنی حیثیت دی۔ اس قلبی لگاؤ کی وجہ سے انہوں نے اس صنف میں وہ شاعرانہ صناعیاں پیدا کیں کہ اگر انہیں اس صنف کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ محسن کے بعد دورِ حاضر میں عبدالعزیز خالد نے فارقلیط اور منحمنا جیسی عظیم کتابیں لکھ کر محسن کاکوروی کی روایت کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے۔ خالد بے شک ایک ذہین اور طباع نوجوان ہے اور ہماری اس مداحِ حبیبؐ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ منجملہ دیگر نعتیہ کلام کے فارقلیط کی کتاب اول کم و بیش سراپائے نبیؐ پر محیط ہے۔ خالد سے قبل اُردو شاعری میں سوائے محسن کے کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس نے باقاعدہ سراپائے رسولؐ کا بیان کیا ہو۔ محسن نے الگ رسالے کی شکل میں ستر کے اسّی بندوں پر مشتمل ۱۲۶۶ھ میں سراپائے نبیؐ تصنیف کیا ہے۔ جسے ۱۲۹۱ھ میں مطبع العلوم لکھنو نے چھاپا ہے۔ تاریخ ذیل کے شعر

---

[1] میری نظر سے ایک مجموعہ نعت از قمر قصوری مطبوعہ سٹیم پریس لاہور اور "ثنائے خواجہ" از حافظ لدھیانوی گزرا ہے۔ ایک پنجابی شاعر کا حلیہ شریف بھی طبع ہوا ہے۔

سے نکالی ہے۔

حلیۂ اشرف نسلِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
۱۲۶۶ھ

خالد نے سراپائے رسولؐ کے بارے میں کم مائیگی اور بے بضاعتی کا اعتراف یوں کیا ہے۔

سراپا ستودہ، سراپا محمدؐ — کسے اس کی تعریف کا حوصلہ ہے
قلم بند ہو کس طرح کلک نے سے — بیاں تیرے حسنِ گلو سوز کا ہے

خالد کے یہ شعر ملاحظہ کیجئے جو سراپا کی تمہید ہے۔ لیکن تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

سنی ام معبد سے تعریف تیری — بہت تجھ سے ملنے کو جی چاہتا ہے[1]

محسن نے سراپائے سے پہلے مثنوی صبح تجلی اور مشہور قصیدہ مدیح خیر المرسلینؐ لکھا تھا۔ محسن کو اپنے کلام پر بڑا ناز تھا اور وہ اس کی قدر و قیمت سے بھی واقف تھے۔ اپنے "سراپا" کے متعلق کہتے ہیں۔

ہے یہ امید کہ جب گرم ہو بازارِ نشور — یوں کہے بادشہِ بارگہِ عالمِ نور
لو سراپا ہمیں دو تم، عوضِ حور و قصور — میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں منظور

صفت حاضر ہے مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں کے یوسف کی یہ تصویر نہیں

خالد نے اگرچہ سراپا میں ایجاز سے کام لیا ہے۔ مگر اس اجمال میں تفصیل کا مزہ آتا ہے۔ اسلوب اتنا پیارا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ خالد نے جہاں استفہامیہ انداز اختیار کیا ہے اس سے شعر میں شدتِ تاثیر کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ اگرچہ عربی عبارات کو بے تکلف اشعار میں باندھا گیا ہے۔ اور تاریخی تلمیحات کو بکثرت استعمال کیا ہے۔ تاہم مصنف کی چابکدستی اور روانیٔ طبع کے سبب یہ

---

[1] حضور پاکؐ مکہ سے مدینہ کو بسلسلہ ہجرت روانہ ہوئے۔ راستے میں آپؐ کا تھوڑی دیر کے لئے ام معبد کے خیمے میں قیام ہوا۔ آپ کی روانگی کے بعد اس خاتون کا خاوند آیا، تو گھر کے تمام برتنوں کو دودھ سے بھرا پایا۔ استفسار کرنے پر بیوی نے کہا کہ ایک مسافر ادھر سے گزرا تھا۔ جس نے بکری کے تھن میں ہاتھ لگا کر دودھ دوہنے کی اجازت مانگی۔ بس یہ دودھ اس کے مبارک ہاتھوں کا عطیہ ہے۔ شوہر نے کہا" وہ کون تھا، ذرا حلیہ تو بتاؤ"۔ ام معبد نے عربوں کی روایتی فصاحت سے سراپائے رسولؐ کا جو بیان کیا وہ تصویر کشی کا نایاب نمونہ ہے۔ اگرچہ ام معبد کو چند ساعتوں کے لئے شرفِ صحابیت عطا ہوا تھا۔ لیکن حضورؐ پُر نور کی متوازن صورت و سیرت نے وہ اثر کیا کہ شوہر کی واپسی تک انتظار نہ کیا اور دولتِ ایمان سے مالا مال ہوگئی۔ اختصار کے ساتھ آپ بھی سنیئے:۔

"پاکیزہ رُو، تاباں و کشادہ چہرہ۔ خوش وضع سر، زیبا قامت کہ دیکھنے والی آنکھ پستہ قدی کا عیب نہیں لگا سکتی، نہ طویل کہ طوالت آنکھوں کھٹکے، آواز جان دار کچھ ایسی کہ خاموش ہو جائیں تو وقار چھا جائے اور کلام فرمائیں تو پھول جھڑیں، روشن مردمک، سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، مخدوم و مطاع، نہ تنگ نظر نہ بے مغز، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو، اس کے ساتھی اسے گھیرے رہتے ہیں، جب کوئی حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لئے سب ٹوٹ پڑتے ہیں"۔

سب کچھ ذوقِ سلیم پر بار نہیں ہوتا۔ نیز خالد بیک وقت علم تاریخ، سیرت، فلسفہ، قدیم مذاہب اور قدیم زبانوں کے الفاظ بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے۔ اس کے باوجود یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ موزوں اور منتخب الفاظ کے پرے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔ اگرچہ ہمارا تمام علمی سرمایہ عربی اور فارسی زبانوں میں مدفون ہے لیکن ان زبانوں سے مادرِ وطن میں جس بے التفاتی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ تاہم خالد کی اس سعیٔ بلیغ سے عربی علم و ادب کے احیا کی ایک حد تک امید بندھ گئی ہے۔

خالد و محسن میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں نے مدّاحِ حبیب صلعم کا فریضہ ایسے ماحول اور معاشرہ میں سرانجام دیا جو اپنی بے راہ روی اور مادیت پرستی کے چنگل میں بری طرح گرفتار رہا ـــــ محسن نے اپنے امتیازی رنگ اور خلوص کے بل بوتے پر اپنے زمانے کے بگڑے ہوئے ماحول کو متاثر کیا۔ جس میں روحانیت کا کہیں وجود نہ تھا اور شاعری محض دربار سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس دَور میں جبکہ دماغی تعیش کے علاوہ خلوص و محبت اور جذبات و احساسات کی چنداں اہمیت نہ تھی محسن نعت رسولؐ کا علم بلند کئے میدان میں اُترے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنوں اور بیگانوں سے دادِ تحسین حاصل کرنے لگے۔ محسن کی نعتیہ لَے میں وہ طلبِ صادق اور عقیدت و محبت تھی کہ ماحول ان کے تابع ہو گیا۔ اگرچہ وہ لکھنوی ادب کی رکاکت اور ابتذال کے سیلاب کو بڑھنے سے روک تو نہ سکے۔ مگر اس کی رفتار ضرور دھیمی پڑ گئی[1]۔

یہی سب کچھ خالد کے ماحول پر بھی صادق آتا ہے۔

خالد نے خیر البشرؐ کی صورت و سیرت کو الفاظ کا جامہ پہنا کر ایک ایسا چراغ روشن کیا ہے۔ جس کی ضیا باری سے ظلمتوں کی اندھیری شب ختم ہو جائیگی۔ یہ نہ صرف اہلِ وطن کی خدمت ہے۔ بلکہ انسانیت پر ایک احسانِ عظیم ہے۔

حضور پر نورؐ کا جسمِ اطہر بحیثیت مجموعی نہایت موزوں، متوازن اور جلال و جمال کے امتزاج کا نادر نمونہ تھا۔ آپؐ کی شخصیت کا دیکھنے والے پر فوری اثر ہوتا اور وہ اس شاہکارِ خدا کو دیکھتا رہ جاتا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے ایمان لانے سے قبل جب آپؐ کو پہلی دفعہ دیکھا تو بولے "خدا کی قسم یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں"

؎ یہ تن جوت ہے یا کہ جل دیپ مالا جیسے دیکھ کر چاند بجھ سا گیا ہے۔ (خالد)

چہرہ مبارک کے متعلق جابر بن سمرہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شب مطلق ابر نہ تھا اور چاند نکلا ہوا تھا۔ میں کبھی آپؐ کو اور کبھی چاند کو دیکھتا تھا تو آپؐ مجھے چاند سے زیادہ خوب رُو معلوم ہوتے تھے۔ خالد نے چہرۂ مبارک کے لئے جن تشبیہات اور تمثیلات کو برتا ہے وہ لاجواب ہیں:

تیرا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ　　تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے
طلوعِ سحر کی طرح تیرا رویا　　تو بدر الدجیٰ ہے تو شمس الضحیٰ ہے

مصحف کا زرکار ورقہ اتنی اچھوتی اور برمحل تشبیہ ہے کہ ذوقِ سلیم جھوم اٹھتا ہے۔ طلوعِ سحر کا منظر خالقِ کائنات کی بیّن دلیلوں کا مظہر ہے۔ پرندوں کا چہچہا کر ربِ قدوس کی تسبیح و تہلیل ادا کرنا ایک ایمان افروز نظارہ ہوتا ہے۔ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ جوش ملیح آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

؎ ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے　　اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

محسن اور خالد کی سوچوں کا محور و مرکز ایک سا ہے۔ بلکہ زبان و بیان کی مماثلت بھی واضح ہے۔ محسن کی نقش کاری ملاحظہ کیجئے

---

[1] راقم الحروف کا مقالہ "مداحِ حبیب محسن کاکوروی" ماہِ نو کراچی سیرت رسول نمبر اگست ۱۹۶۳ء

ے رخِ پُر نور ہے قرآن کا پہلا نسخا ہاتھ سے اپنے جسے خاص مصنف نے لکھا
مشکل از بس تھا مضمونِ دہن کا نکتا اس لئے حاشیہ لکھا ہے خطِ رنگیں کا

اہلِ عرب کو اپنی فصاحت اور شیریں مقالی پر بڑا ناز رہا ہے۔ لیکن نبی اُمّی کے حُسنِ تکلّم، حسنِ گفتار اور حُسنِ خطابت کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکا۔ چنانچہ آپ کو افصح العرب متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ قریشی ہونے کی نسبت سے معیاری زبان کے مالک تھے۔ نیز آپؐ نے قبیلہ سعد میں پرورش پائی جو فصاحت کے لئے سارے عرب میں ممتاز تھا۔ اس طرح فنِ گفتگو میں کمال گویا آپؐ کو ورثہ میں ملا تھا۔ نیز وحی کی لسانِ حق نے آپؐ کی زبان میں تاثیر بھر دی تھی۔ آپؐ سے متعدد موقعوں پر لوگوں نے آپؐ کی شیریں بیانی اور اثر و تاثیر کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ کا جواب تھا کہ :- اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ اَدَّبَنِی فَاَحْسَنَ اَدَبِی وَنَشَاْتُ فِی بَنِی سَعْد " یعنی میری لسانی تربیت خود خدائے عزوجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوقِ ادب کو خوب تر بنا دیا ہے۔ نیز میں نے قبیلہ بنی سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے۔ آپؐ نے فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے وقت جو خطبے ارشاد فرمائے ان کا ادبی معیار بہت بلند ہے۔ مثال کے طور پر وہ واقعہ چشمِ تصور میں لایئے۔ جب کہ آپؐ نے تالیفِ قلوب کی خاطر مکہ کے بعض نو مسلم اکابرین کو مالِ غنیمت میں سے انعامات عطا فرمائے تو انصارِ مدینہ میں سے بعض نے دبی زبان سے اپنی حق تلفی کا اظہار کیا۔ اس موقعہ پر آپؐ نے جو مختصر خطبہ دیا وہ بلحاظ الفاظ، بلحاظ اسلوب اور بلحاظ اثر و تاثیر ادب کا ایک شاہپارہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ پہلے تم لوگ گمراہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں متحد و متفق کیا۔ تم مفلس تھے۔ خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں آسودہ حال کیا۔ ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! تم کو لوگوں نے جب جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی، تم کو لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ تم یہ کہتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا۔ ہاں تم سچ کہتے ہو لیکن اے گروہ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں۔ اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ۔"

اُف ان الفاظ میں کیا برقی رَو تھی کہ سننے والوں کے جسم و جان میں دوڑ گئی۔ ایسا سوز تھا کہ پتھر کو بھی گداز کرے۔ انصار مدینہ بے اختیار چلا اُٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں"۔ اس ضمن میں خالدؔ نے جو گلہائے عقیدت پیش کئے ہیں وہ خلوص کی مہک سے رنگِ بزم کو معطر کئے ہوئے ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے ممدوح کی تصویر دل میں چھپائے بیٹھا ہے اور وہ اپنے مالک کا قدر شناس مملوک ہے:۔

دمِ گفتگو منہ سے کرنوں کی بارش دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے
نصوص الحکم تیری پُر مغز باتیں نہاں ان میں رمزِ دوام و بقا ہے
نہ یہ قولِ شاعر، نہ یہ قولِ کاہن یہ میزان و معیارِ حسن و بہا ہے
وہی تو کہے جو خدا منہ میں ڈالے ترا نطق روحِ روانِ خدا ہے

ے وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی اِن ھُوَ اِلَّا وَحیٌ یُوحیٰ (قرآن)

عبدالعزیز خالدؔ کے دیگر کلام کا اکثر حصہ اگرچہ اپنی عالمانہ شان، مکلف زبان اور شاعرانہ صناعی کے اعتبار سے بڑا وقیع ہے۔ لیکن جہاں تک بے ساختگی، روانی اور سریع الفہمی کا تعلق ہے اشعار کی ایک کثیر تعداد آورد کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن زیرِ نظر موضوع کے بارے میں یہ رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ایسا رواں دواں اندازِ بیان بہت کم شعراء کو نصیب ہوا ہوگا۔ یہ اللہ کی دین ہے

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اُردو شاعری میں خالدؔ نے نعت میں شاید پہلی دفعہ ہندی شاعری کے عشقیہ جذبات و احساسات کی روایت کو 'سراپا' میں پیش کیا ہے۔ اس طرح غالباً موضوع میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے ساتھ ہی ہندی الفاظ کا انتخاب اتنا مناسب، موزوں اور برمحل ہے کہ فارسی کے ذہن کو کسی قسم کا دھچکا نہیں لگتا۔ اور پیکر تراشی کے زندہ نمونے شاداں و فرحاں چشمِ تخیل کے سامنے ابھرتے نظر آتے ہیں۔ لیجئے خالدؔ کی زبان سے چشمِ محبوبِ کائنات کا ذکر سنئے

نشیلے کنول نین کجرارے تیرے
چھپا کر نظر دل تجھے دیکھتا ہے
وہ انیارے رتنارے، متوالے نیناں
جنہوں نے مرے دل پہ جادو کیا ہے
اَنوٹھے انیندے چھبیلے رسیلے
پپوٹوں میں مدہ شالہ ہر میکدہ ہے
وہ بانکا سجیلا ہے ریشم کا لچھا
لجیلی ہنسی سے وہ من موہتا ہے

آیئے آپ کو ان گہرے، روشن اور کجرارے نینوں کے پڑوس میں لے چلیں۔ جہاں ابروئے خمدار کا نشیمن ہے۔ ان سرگیں، خماریں، چھبیلی اور رسیلی آنکھوں کے دریا میں کہیں متاعِ دل ڈوب نہ جائے جبکہ غواص کے دم کی بے بضاعتی بھی ظاہر ہے۔ طاقِ ابرو کی پناہ گاہ میں چلیے۔ یہ پناہ گاہ خالدؔ کے پیش رو محسنؔ کاکوروی کی سعیٔ مشکور کا ثمرہ ہے:۔

ہیں دو ابروئے سیہ زیبِ جبینِ انور
طاق یا خانۂ خورشید کے آتے ہیں نظر
نقش ابرو کا دکھائے جو عطارد لکھ کر
نہ تو تیغ سے مریخ کے ہو دو پیکر
خواب میں بھی جو وہ زہرہ سی جبیں پیش آئے
مشتری یوسفِ کنعاں کی زحل ہو جائے

دیکھو ہم پہلوئے پیشانیٔ انور ابرو
ہیں اس آئینۂ صاف کے جوہر ابرو
آبروئے دمِ خنجر ہیں مقرر ابرو
موج دریائے شجاعت ہیں سراسر ابرو
دیکھئے آئینۂ ماہ میں تصویریں ہیں
یا کبھی معرکۂ بدر میں شمشیریں ہیں

ہائے یہ دو بند ہیں یا محسنؔ نے جگر کے دو ٹکڑے پیش کیے ہیں۔ محسنؔ نے دریب فن اور شاعرانہ صنعت گری کو مات کر دیا ہے۔ ابنِ معتبد اور ربیع کے پاس تو اختصار کا اعجاز تھا لیکن محسنؔ کو اپنے ممدوح کی طرف سے تفصیل کا اعجاز بخشا گیا ہے۔

نعتیہ شاعری میں اکثر شعراء وفورِ جذبات کے سبب حفظِ مراتب کا خیال نہیں کرتے اور اس حد تک مبالغہ آرائی کرتے ہیں کہ ان کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے لیکن خالدؔ و محسنؔ نے یہ منزل بڑی آسانی سے سر کی ہے۔ محسنؔ چونکہ لکھنوی شاعری کے پروردہ تھے اس لئے وہ اپنی خاص ادبی روایت کو چھوڑ نہیں سکے۔ یہی وجہ ہے کہ محسنؔ کے ہاں مضمون آفرینی، خیال بندی، رعایتِ لفظی اور صنائع بدائع کا استعمال بکثرت ہے۔ لیکن اس کے باوجود بے اعتدالی کہیں نہیں ملتی بلکہ اسلوبِ بیان اور ندرتِ الفاظ کے اعتبار سے ہر بند پھولوں کا ایک خوشنما مرقع معلوم ہوتا ہے۔ بیشتر شعراء نے محبوب کی کمر کے بارے میں جو موشگافیاں کی ہیں اس سے شاعری میں معتد بہ اضافہ تو ضرور ہوا ہے لیکن کمرِ یار کو فی الواقعہ عدم کے برابر کر دیا ہے۔ چلیئے محسنؔ کے محبوب، جانِ بہاراں اور رشکِ ارم کی کمر کی لطافت و نزاکت ملاحظہ فرمایئے:

گرچہ پروازیں اندیشہ بے بالِ جبریل — اور ہے فکرِ رسا سیرِ دو عالم کی کفیل
نہ ملی پر کوئی نازک سی کمر کی تمثیل — ہے بجا ہم عدد نقطۂ عدم ہے جو عدیل
قاف تک ہم نے بہت کافِ کمر ڈھونڈا ہے
کمریں دیکھی ہیں پر ایسی کمر عنقا ہے

مشہور ہے کہ رسولِ مقبولؐ نے ایک سے زائد بار محسنؔ کو خواب میں اپنی زیارت سے فیضیاب فرمایا اور ان کی شاعری کو سراہا۔ محسنؔ کی والہانہ شیفتگی اور خلوص کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ فنا فی الرسول کا درجہ رکھتے تھے۔ اب دعا اور خاتمہ کے موقعہ پر محسنؔ کے دل کی تڑپ دیکھئے۔

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی — نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ نہ غزل
صفتِ محشر میں ترے ساتھ ہو مداح ترا — ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ و غزل
سر کے بل جاؤں جو نقشِ قدمِ سرورؐ پر
صاف محشر کی زمیں رکھ لوں اٹھا کر سر پر

خالدؔ کی بے چینی، اضطراب اور تڑپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

کہوں کس سے دکھ ویر ہے چین وبری — تمہاری محبت میں دل بھر گیا ہے
ہیں اس سے ملوں دودھ جیسے پانی — زباں کب مگر مستجابِ دعا ہے

بے شک خالدؔ قمارِ محبت میں دل ہار چکا ہے لیکن ہاں یہ دیوانہ ہزاروں فرزانوں پر بھاری ہے اور بکارِ خویش ہشیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کوچے میں ہارنے والوں ہی کی جیت ہوتی ہے جو کریم السجیہ، جمیل الطویہ اور خیر البریہ ہو اس کے حضور کہاں ٹھہرا جاسکتا ہے۔ جس کا سینہ علمِ لدنی کا گنجینہ ہو۔ جس کی گھنگھریالی گرہ در گرہ اور شکن در شکن چلیپائی زلفوں کے بیچوں بیچ روئے تاباں یوں دکھائی دیتا ہو جیسے ابرِ سیاہ میں برق خندہ زن ہو۔ جس کے دانتوں کے نگینوں کو دودھ سے مل مل کے دھویا گیا ہو، جو چلے تو خوبانِ عالم دست بستہ قطار اندر قطار پذیرائی کریں۔ جس کی پیشانی تقدیرِ عالم کو بے حجاب کر سکتی ہو اور جس کا دل بیاضِ کلامِ خدا ہو۔ ایسے رفیع العلا، امیر الغنا اور سرا باصفا کے سامنے اپنی ہار کا اعتراف ہی دراصل فوزِ عظیم ہے۔ خالدؔ عشقِ رسولؐ میں اتنا بے خود ہے کہ بے تال اور بے سُر محبوبِ زمن کی قصیدہ گوئی پر رقص کناں ہے۔ خالدؔ نے کتنی سچی بات کہہ دی ہے۔

سمندر میں دریا سما جائیں جیسے — محبت عجب قوتِ جاذبہ ہے
جو بے خود ہے ناچے گا بے تال و بے سُر — محبت کا آئین بے ضابطہ ہے

حرفِ آخر یہ ہے کہ فنِ نعت گوئی اور اس کے لوازمات کو اگر کسی نے لفظاً و معناً فن شریف بنایا ہے تو محسنؔ کاکوروی کے بعد تنہا عبدالعزیز خالدؔ کی ذات ہے۔

ان کے تمام سرمایۂ کلام پر اگر تفصیلی نہیں محض اجمالی نظر بھی ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تعمیرِ حیات کا درس دیا ہے۔ ان کے اشعار متصوفانہ تصورات کے حامی تو ہیں لیکن وہ تصوف نہیں جو گوشہ گیری اور رہبانیت سکھائے۔ بلکہ یہ تصوف تزکیۂ روح و نفس اور تسخیرِ کائنات کا پیامبر ہے۔

تحسین فراقی

خالدؔ اور خارجی متعلقاتِ حسن

اُردو ادب میں حسن اور اس کے خارجی متعلقات کا بیان کوئی نئی بات نہیں۔ لکھنؤ کے اکثر شعرائے تصوف کو غزل سے خارج کر دیا اور حسنِ مطلق کے برعکس حسنِ مجاز اور اس کے متعلقات غزل میں داخل کئے۔ ان کے ہاں لب و دنداں، رخ و عارض، زلف و خال، پنجۂ مرمریں اور دیگر نسوانی اعضا کے بیان کا مجازی پیرایۂ اظہار موجود ہے۔ حسنِ مجاز اور اس کے متعلقات کے بیان سے اُردو غزل نے ایک اور انگڑائی لی اور یہی غزل جو دلّی میں اب تک داخلی کیفیات اور واردات کے اظہار کا آلۂ کار بنی ہوئی تھی، وسعت سے ہمکنار ہوئی۔ میرسوزؔ، جراتؔ، انشاؔ، رنگینؔ، برقؔ، جلالؔ اور امانتؔ وغیرہ کے ہاں حسن کے خارجی متعلقات کے بیان سے غزل کو ایک نیا پیرایۂ بیان ملا۔ تاہم ان شعرا کے ہاں، جن کے اس خاص اسٹائل کو دبستانی کا درجہ حاصل ہے اور جسے لکھنویت سے موسوم کیا جاتا ہے، حسن اور متعلقاتِ حسن کا بیان اس قدر اچھوتا، ہمہ گیر اور حلاوت آگیں نہیں ہے جس قدر عبدالعزیز خالدؔ کے ہاں، اس کے باوصف کہ وہ نہ دلّی سے غرض رکھتے ہیں نہ لکھنؤ سے متعلق ہیں بلکہ صرف زلف کمال کے اسیر ہیں!

ایک ایسا موضوع جس پر پہلے ہی سینکڑوں ادیبوں نے خامہ فرسائی کی ہو، اس پر کچھ لکھنا اور وہ بھی اس انداز میں لکھنا کہ جدت اور تازگی برقرار رہے، واقعی ایک کارنامہ ہے۔ خالدؔ نے جہاں تہاں حسن اور اس کے لوازمات کو اپنا موضوع بنایا ہے، اس کے بیان میں اس قدر تازگی، نضارت، جدت اور بہجت ملتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ حسن کے کیف و کم کا بیان خالدؔ کے ہاں ایک بار نہیں کئی بار ہوا ہے لیکن لطف یہ ہے کہ ؎

ہر شب بلباسِ دگر آں بیا مد دل بُرد و رواں شد

کی کیفیات پیدا کر گیا ہے۔ ہر بار اس میں نیا روپ رس، نکھار اور تازگی ملتی ہے۔ حسن کا یہ بیان کم و بیش خالدؔ کی ہر تصنیف میں بکھرا پڑا ہے، اور تو اور فارقلیط اور منحمنّا جیسی خالص مذہبی تصانیف میں بھی جہاں حسن کے بیان کی گنجائش نسبتاً کم تھی، خالدؔ کے معجز نگار قلم نے وہ وہ پھول بکھیرے ہیں جن کی بُو باس، مشامِ دل کے لئے لذت آگیں بھی ہے اور نزہت افزا بھی!۔ خالدؔ کے ہاں حسنِ مجاز کی اس بوقلمونی اور رنگا رنگی کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے ؎

در بندِ آں مباش کہ مضموں نماندہ است صد سال میتواں سخن از زلفِ یار گفت

فارقلیط کی پہلی کتاب میں حضور اکرمؐ کی شکل و شباہت کے بیان میں خالدؔ نے جو اشعار لکھے ہیں، انہیں اگر نعت و منقبت سے الگ کر کے پڑھا جائے تو ان میں تغزل کی کئی جھلکیاں ملتی ہیں۔ تشبیہات کی ندرت نے خالدؔ کے بیان کو کس درجہ جاندار بنا دیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

ہے چشمِ حیا دستگہ نجم ثاقب رُخ دلربا صبح کا کوکبہ ہے
کنارِ شفق میں لڑی موتیوں کی گل نو دمیدہ لبوں پہ فدا ہے

ہے یہ سلکِ الماس و بسطِ لآلی	نہیں تیرے دانتوں کی موجِ ضیا ہے
یہ برجستہ محراب و پیوستہ ابرو	بتا شیرِ فجر و بساطِ دُجیٰ ہے
یہ حبلِ متیں ہے کہ موئے معقد	کہ مرغولۂ ریشمِ نا فتہ ہے
خماریں، سیہ، سرمگیں، چشمِ رعنا	طبیعت مچلتی ہے، دل جھومتا ہے
قمیصِ موشح میں بالا قدی کا	وہ عالم ہے ہمدم کہ دل جانتا ہے
ہیں بلساں کی کیاریاں اس کے عارض	مہک اٹھ رہی ہے نشہ چھا رہا ہے
ستوں سنگِ مرمر کے ہیں اس کی ٹانگیں	جو کندن کے پایوں پہ سیدھا کھڑا ہے

——— فارقلیط۔ پہلی کتاب

دیکھا آپ نے! خالد کے ان اشعار میں کس قدر روانی ہے اور کس قدر البیلاپن۔ دانتوں کی چمک کی موج کو الماس اور موتیوں کی لڑی سے تشبیہ دی ہے جو اگرچہ نئی نہیں مگر طرزِ بیان کے اعتبار سے نئی لگتی ہے۔ گھنگھریالی زلفوں کو حبلِ متین یا پھر بٹے ہوئے ریشم کا مرغولہ قرار دیا کس قدر حسن آفریں ہے!۔ محبوب کے عارض کو چاند، کلی یا سپیدہ سحر سے مماثل ٹھہرانا ایک عام سی بات ہے مگر خالد نے اسے بلساں کی کیاریوں سے تشبیہ دی ہے۔ گویا اس کے نزدیک اس عارض کا ثانی اسی طرح ناپید ہے جس طرح بلساں کا مہندی کے پودے سے مماثل چھوٹا سا درخت مصر میں مقام عین الشمس کے سوا اور کسی جگہ نہیں اُگتا!

اب "دشتِ شام" کو لیجیے۔ "دشتِ شام" کی پہلی نظم کے پہلے شعر ہی میں خالد اگرچہ اعتراف کر لیتے ہیں کہ حسن کے بیان میں الفاظ کما حقہٗ ساتھ نہیں دیتے اور "وصفِ مہ دلجو" کی تفصیل و تعریف ممکن نہیں مگر اس اعتراف پر بھی ان کا بیان جوہر آبگینہ کی طرح صاف و شفاف ہے۔ بندش کی چستی کے ساتھ مرکب تشبیہات کس قدر لطف آگیں ہیں:

آواز میں آہنگِ رباب و دف و سُرنا	رفتار میں سرمستئ رود و رمِ آہو
زنبورِ عسل ہے کہ کنول کنج کا بھونرا	خالِ سرِ پستانِ عروسانِ پری رو!

(دشتِ شام)

موزوں لفظوں کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈا چلا آتا ہے۔ الفاظ کا یہ عمدہ در و بست شاعر کی نادر الکلامی پر دال ہے۔

"دشتِ شام" کے صفحہ ۸۲ پر حسن کی گوناگوں کیفیات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

نار پستان و نار دون قامت	سرو قد، دردِ خد، شفق چہرہ
سحرِ بنگالہ، گندمی عارض	مار ضحاک، جعدِ مشکینہ
آنکھ میں آگ، سانس بے قابو	عنفوانِ شباب کا نقشہ
سہی قامت گداز چکیلی	رنگ جیسے انار کا دانہ

ان اشعار میں نادر تراکیب، تلمیحی تشبیہات، صنعتِ تقابل اور موسیقیت نے اس قدر نکھار پیدا کر دیا ہے کہ بیان سے باہر

"دشتِ شام" ہی کی ایک اور نظم "تلاش" اس مجموعے کی نہایت عمدہ نظموں میں سے ہے۔ نظم کی مجموعی حیثیت تو خیر ایک طرف، اس کے ایک شعر میں خالد نے ہندی کے شیریں اور سبک الفاظ سے اور دوسرے اپنی نازک خیالی کے اعجاز سے لیلائے حسن کو جس طرح

خراج پیش کیا ہے، وہ اسی کا حصّہ ہے:

کنک کنگ سے اُروج، انگ اگن، اتوپ، اپار | سمکھ، سروپ، سلوچن، جگر نگر سُکمار
لب و نگاہ میں رمز د رضائے بوس و کنار | کہ جیسے آتشِ پنہاں سے دیکھے شاخِ چنار

شعرِ ثانی کے پہلے مصرعے میں رمز کا لفظ لائے ہیں اور اس کے بالمقابل دوسرے مصرعے میں اسی مناسبت سے "آتشِ پنہاں" کے لفظ، تقابل دیکھیے کہ شاخِ چنار کی سُرخی کے لئے آتشِ پنہاں کی ترکیب کتنی موزوں ہے! چنار کے درخت کو دیکھیں تو واقعی یوں لگتا ہے کہ اس میں آگ ہے بھی اور نہیں بھی۔ شاید ایسی ہی کیفیت نے غالب سے یہ شعر کہلوایا تھا ؎

در شاخ بود موجِ گل از جوشِ بہاراں | چوں بادہ بہ مینا کہ نہاں است و نہاں نیست!

حسن اور متعلقاتِ حسن کے بیان کے لئے ہندی اور بھاشا کی زبان بے حد موزوں اور منجھی ہوئی ہے، خالد اس حقیقت سے آگاہ ہیں، اسی لئے انہوں نے ان کا فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ خالد کے درج ذیل اشعار پڑھ کر حسن کی ایک سچی اور مکمل تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے:

رس منتی، رنگ بھری، روپ وتی للنائیں
نازک اندام، چتر، چندر مکھی کنیائیں
جنہیں دیکھیں تو غزالانِ ختن شرمائیں
طالب دید ہو کوئی تو اسے ترسائیں

— (دشتِ شام)

"غزل الغزلات" خالد کی طبع زاد تصنیف نہیں، عربی کی "نشید الانشاد" کا اردو منظوم ہے۔ یہ کتاب سلیمانؑ کے چند نغمات پر مشتمل ہے۔ مگر ان چند نغموں میں خالد کے قلم نے عربی زبان کی ساری لطافتوں کو اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ ان نغمات میں حسنِ مجاز اور اور اس کے لوازمات کا بیان عام پیرایۂ اظہار سے اس قدر ہٹ کر ہے کہ اُردو کے شعری ادب میں کم ازکم اس سے پہلے ایسا اچھوتا نمونہ نہیں دیکھا گیا۔

سلیمانؑ کا جلوس اور نغمہ کے زیرِ عنوان (خالد نے یہ عناوین کتاب کے آخر میں اشارات کی ذیل میں دیئے ہیں) اشعار دیکھیے جو حسن کے بیان کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ تراکیب میں جدّت اور ندرت اور تشبیہات میں تازگی اور نکھار ہے۔ کم و بیش حُسن کے تمام خارجی جزئیات کے لئے نادر تشبیہات ملتی ہیں۔ قطع نظر ان صوری خوبیوں کے ان اشعار میں خلوص اور سپردگی کا روپ رس بھی وافر مقدار میں ملتا ہے:

دیکھ تو ہے دلربا اے میری پیاری دیکھ تو ہے خوبرو
خیزراں قد، ارغواں خد، ضیمراں مو، مشک بو
تیری آنکھیں فاختائیں دو تہِ دامِ نقاب
بال تیرے بکریوں کے گلے کے مانند ہیں
جو اترتی ہیں کوہِ جلعاد سے
دانت تیرے بال کتری اور نہلائی ہوئی

ریشمیں بھیڑوں کے بالوں کی طرح
قرمزی ڈورے ہیں گویا تیرے ہونٹ
ترا منہ ہے دلفریب
اور کنپٹیاں تری زیر نقاب
مثلِ اجزائے انار
تیری گردن برج ہے داؤد کا
اسلحہ خانے کی جو خاطر بنا
تیری دونوں چھاتیاں توأم ہیں دو آہو برے
سوسنوں میں روز جو چرتے ہیں جب تک دن ڈھلے، سایہ بڑھے
تیرے عطروں کی مہک ہر گونہ نکہت سے فزوں
اے مری زوجہ! ٹپکتا ہے ترے ہونٹوں سے شہد
بلکہ ہے تیری زباں اک سوت شہد و شیر کی
میری محبوبہ، مری زوجہ ہے گویا اک مقفل باغیچہ
وہ ہے اک محفوظ سوتا، ایک چشمہ سربمہر
...... اور جھرنا وادیٔ لبنان کا

غزل الغزلات

شولمیت کا تساہل آمیز مقدم اور طویل جستجو کے عنوان سے خالد کے طرز ادا کے روپ ریکھا دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محبوب کی آنکھوں کے سفید حصے کو دودھ میں نہائے ہوئے کبوتروں سے، رخساروں کو بلسان کی کیاریوں سے، لبوں کو سوسن سے اور پیٹے کو اس کی صباحت کے پیش نظر ہاتھی دانت کے کام سے مماثل ٹھہرانا، کیا یہ اردو شعر میں ایک نیا آہنگ نہیں؟ ذیل کے شعر میرے بیان کی تصدیق کریں گے:

گھنگھریالے بال اس کے کوّے سے کالے سیاہ
اس کی آنکھیں وہ کبوتر بیٹھے ہوں با تمکنت
جو لبِ دریا نہا کر دودھ میں
دانت گویا دودھ سے دھوئے ہوئے
تابناکی میں نگینوں کی طرح
یاسمیں رخسار، پھولوں کے چمن، کیاریاں بلسان کی ابھری ہوئی
سوسن اس کے سرخ لب
جن سے رقیقِ مُر کی ہوتی ہے تراوش روز و شب
ہاتھ اس کے ہیں زبرجد کے مرصع طوق زر

پیٹ اس کا کام ہاتھی دانت کا
جس پہ ہوں نیلم کے پھول!

اس کی ٹانگیں کندنی پایوں پہ خالص سنگِ مرمر کے ستوں
دید میں لبنان ہے، خوبی میں سروِ سربلند!

——— غزل الغزلات

"طلسم زندگی"، "ورقِ ناخواندہ" کی پہلی تمثیل ہے۔ اس میں خالد سمسون (Samson) کی زوجہ دلیلہ کی آمد کی تصویر کشی کرتے ہیں دلیلہ کا ہے کو ہے، انبساطِ ارژنگ ہے یا نقشِ مانی، رنگینی و رعنائی کا ایک دل پذیر مرقع، ایک شعلہ، ایک بھبھوکا!

اب دلیلہ بصد انداز چلی آتی ہے ۔۔۔ جوشِ مستی سے لچکتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی
تازہ پھولوں کے مہکتے ہوئے گجرے کی طرح ۔۔۔ سُرخ دیبا ہے گلے، سر پہ خمارِ اطلس
دھانی بانکیں کڑے بلدار، جڑاؤ جھمکے ۔۔۔ چہرے پر سوچ کے آثار ہویدا کم کم،
زلف ہے یا کہ مسلسل خطِ تعلیق و رقاع ۔۔۔ اپنے ہی مشک میں مست آہوئے مشکیں کی طرح!

——— طلسمِ زندگی۔ "ورقِ ناخواندہ"

زلف کو خطِ نستعلیق سے تشبیہ دینا تو عام سی بات ہے، خالد نے تعلیق کے ساتھ خطِ رقاع کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جو اس کی علمی گیرائی اور گہرائی پر شاہد ہے۔ خطِ رقاع ابن مقلہ خوش نویس کے ایجاد کردہ چھ خطوں میں سے ایک ہے۔ چہرے پر سوچ کے آثار ہویدا کم کم، کہہ کر خالد نے دلیلہ کے باطنی اضطراب کی عمدہ تصویر کشی کی ہے اور پھر یوں بھی حسین چہرے پر اضطراب کی موج حسن کو دو آتشہ کر دیتی ہے!

سیف الملوک "ورقِ ناخواندہ" کی تمثیل "چراغ تہِ داماں" کا ایک نہایت اہم کردار ہے۔ وہ اپنی لالہ رُخ کے حسن و جمال کی عکاسی اس طرح کرتا ہے کہ اس کی جیتی جاگتی، مٹکتی، لچکتی، سندر اور کومل تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے۔ یہاں خالد کا بیان اس قدر مکمل ہے گویا اس نے شعریت اور مصوری دونوں کے امتزاج سے لالہ رُخ کے حسن کا خمیر اٹھایا ہے۔ لالہ رُخ کے حسن کی تصویر کشی تو اسی ایک مصرع نے کر دی ہے جہاں سیف الملوک اسے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

ع تری بھرپور جوانی ہے قرابہ مے کا

اور پھر اپنی سرتاپا سپردگی اور والہانہ پن کا اظہار اس طرح کرنا کہ

ع جذب کرے مجھے خود میں ابدیت کی طرح

انتہائے بلاغت ہے! شعر دیکھیے:

تری بھرپور جوانی ہے قرابہ مے کا
گرمیِ حسن سے رنگت تری سنولائی ہے

جذب کرلے مجھے خود میں ابدیت کی طرح
قد سفیدے کی طرح سرو سا اونچا لمبا

سُرخ یاقوت سے لب۔ دانت شفق ہیں تارے

چہرہ مرجاں کی طرح، گولڑے ہتھ برگِ چنار۔

رد کش قاقم و سیغور و پرندین و عرار

نشے کے بار سے بوجھل ہیں گھنیری پلکیں

جسم کندن سا ترا، رنگ پدم سا پارس!

——— چراغِ تہِ داماں۔ "ورقِ ناخواندہ"

"وشتِ تمنا" کی نازاد فرشتے سے اپنی شدید خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ وہ "دنیا" کی رنگینیوں اور وہاں کے باسیوں کی بود و باش دیکھنے کے لئے بے چین ہے۔ وہ اس عالم آب و گل کی اس قدر عمدہ تصویر کھینچتی ہے کہ اس کا یہ بیان کیفیاتِ حسن کا ایک شہپارہ بن گیا ہے۔ حسن اور اس کی جزئیات کا بیان بڑا مکمل ہے اور پھر ساتھ ہی ساتھ تراکیب میں اس قدر ندرت ہے کہ باید و شاید۔ غوغایانِ گندم گوں، شنگولبانِ جادوگر، فسوں ماجرا کس قدر نادر تراکیب ہیں۔ خالد نے ترکیب سازی میں حسن و لطافت کا خوب خوب خیال رکھا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شاعری علم کلام کا شعبہ نہیں ہے! اسے علم ہے کہ جب حافظ جاحظ اور جب عراقی اشراقی بننے کی کوشش کرے تو اپنی شاعرانہ اپیل کھو بیٹھتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

بتانِ آذری و دلبرانِ روم و خطا
یروشلیم کی غوغائیانِ گندم گوں

وہ کوہ قاف کی شنگولبانِ جادوگر
اگر کی بُو سے معطر شقائقِ نعماں

غزال چشم و فسوں ماجرا و بوقلموں
جو دیکھنے میں ہیں لبنانِ سروِ خوبی ہیں

ہمہ وصال، ہمہ لذتِ ہم آغوشی
مہک سنہرے بدن میں گلاب و نسریں کی

سُریں گول، اٹھا سینہ، جوڑ بند سڈول
حریرِ گل پہ نمودار چھاتیوں کی کچیں

مواصلت کا چکھیں ذائقہ، ٹھٹھول کریں

——— دشتِ تمنا۔ "ورقِ ناخواندہ"

"گنجِ رائگاں" "ورقِ ناخواندہ" کی ایک اور تمثیل ہے۔ کنعان اس کا بڑا کردار ہے۔ کنعان اپنی محبوبہ عدہ کی یاد میں گم ہے، وہی عدہ جو لعل و مرجاں سے بیش بہا ہے، جو کنعان کی سب کچھ ہے۔ کنعان فطرتِ نسوانی سے بحث کرنے سے پہلے اس کی نازک بدنی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ عورت سراپا رامش و رنگ ہے، شوخی و شرم کی تقویم ہے، نزاکت و صباحت کی بلورستان ہے، پھولوں کی نزاکت ہے، موجوں کا جوش ہے، شاخِ گل کی لچک ہے، نجمِ سحری کی دمک ہے!

بظاہر ان کے بدن پھول سے بھی نازک ہیں
دمِ خرام لچکتے ہیں شاخِ گل کی طرح

تمام رامش و ریحاں، تمام دستنبو
ہے کارخانہ نگاہوں میں شرم و شوخی کا

وہ سینے کا گھریں، مرمریں بلورستاں
ہے جس میں نازکی پھولوں کی، جوش موجوں کا

فروغِ رنگِ بدن سے لباس گلگوں ہو
رگوں میں خونِ جوانی کا کف کرے پیدا

"گنجِ رائگاں"۔ "ورقِ ناخواندہ"

کنعان کا دوست الوشن اس کی باتیں سنتا ہے تو اسے بھی ان ایام کی یاد آجاتی ہے جب وہ حسن سے پیمانِ وفا باندھا کرتا تھا ؏ یاد ایام کہ تھے لالہ رُتوں سے پیماں۔ جب حدیثِ بادہ و مینا و جام چھڑا کرتی تھی ؏ جام مے در دستِ من، مینائے مے در دست

وے ، کے مراحل طے ہوا کرتے تھے۔ عنیزہ کی سراپا نگاری ملاحظہ ہو۔ حسن کی لطافت، نزاکت، ملاحت، سادگی و پرکاری، شوخی و شرارت کون سا پہلو ہے جو بیان کرنے سے رہ گیا ہو اور اس پر مستزاد بعض ہندی تراکیب کی ندرت اور مٹھاس :

کنک لتا سی، وہ اک کامنی چھبیلی نوَل
وہ موتیے کی کلی، شاہدِ سراپا ناز
نکیلی، ہوش رُبا تھی، سجیلی ماہ لقا
بشر کے روپ میں دُرجِ درر تھی، بُرجِ عزر
ہجوم مخمل دکم خواب، ڈھیر سُنبل کا
سیاہ زلف تھی یا نامۂ گناہ گاراں
بسانِ ابرِ سیاہ کھل کے سایہ گستر ہو
پریم باس، مدن مد، رسی بسی تن میں
وہ چہرہ کہیئے جسے حاصلِ نکوکاراں
کہ جیسے دودھ سی بربت پہ چاندنی چھٹکے
کہ جیسے شعلۂ نارنجی، شفق دمکے
قبائے زریں صنوبر کا ارغوانی رنگ
کہ جیسے لولوئے لالا میں خطِ احمر ہو
سفید دانت، گہر تاب سلک خرمہرہ
مشام رائحہ طیب سے معطر ہو
دمِ خرام وہ بجناد فِ وجلاجل کا
کہ جس سے حال، دلِ مبتلا کا ابتر ہو
کنارِ شوق میں یوں مستِ ناز ہوتی تھی
کہ مہکے جس طرح آنگن میں رات کی رانی
وہ چاندنی کی کلائی، کنک وہ نورانی!!

—— گنجِ رائگاں: "ورقِ ناخواندہ"

"کلکِ موج" خالد کی طبعزاد منظومات کا مجموعہ ہے، حسن و جمال کی لطافتوں سے مالامال ہے۔ حسن کے بیان میں وہی نازک خیالی اور ندرت ہے۔ چھوٹی بحر کی ایک غزل کے چند شعر دیکھیے۔ ان میں بندش کی چستی کے علاوہ الفاظ کا زیر و بم بھی ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ کس درجہ بچے تلے اور متوازن الفاظ کا انتخاب کیا ہے :

ردائے معقّر، خندِ منوّر	جعدِ معطّر، ریحان و راحت
بردالشراب و بُردالشبابِ	زہرہ شمائل، ناہید طلعت

—— "کلکِ موج"

خالدؔ تشبیہ دیتے وقت ایک مشبہ بہ پر تو قانع نظر ہی نہیں آتے۔ ان کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ ان کے سامنے ایک ہی شے کی تشبیہ کے لئے کئی مماثل اشیاء کے پرے باندھ دیتا ہے۔ خالدؔ کو ان میں سے اکثر مشبہ بہ اشیا موزوں اور دل پسند لگتی ہیں اور وہ ان کو اٹھا کر مشبہ کے مقابل لے آتے ہیں:

گوٹے بلوّر و عاج و مرمر ریشم کے لباس میں چھپائے
کیا چاند سی صورتیں بنائیں، قربان اے نیلی چھتری والے!

——— کلکِ موج

گات کو گوٹے بلوّر و عاج و مرمر کہہ کر اور ریشم کے لباس میں چھپا کر خود خالدؔ نے نہایت فن کارانہ انداز میں اس عریانی کو بھی الفاظ کے پردے میں ڈھانپ دیا ہے جو ایک غیر فن کار اور پوچ نگار کے ہاتھوں جعفر زٹلی اور سعادت یار خاں رنگین کی غیر محتاط الفاظ پر مشتمل ریختی کا روپ دھار لیتی!

خالدؔ صرف چند الفاظ میں حسن کی گوناگوں کیفیات و کمیّات کو جس خوبی سے سمیٹتا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس کی ترکیبیں ہیں تو اپنی، الفاظ ہیں تو اپنے، انداز و اسلوب ہے تو اپنا لا تکرار فی التجلّی کی مثال اگر دیکھنا ہو تو اس کے حسن کے تو بہ تو اور نو بہ نو بیانات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خالدؔ کی سراپا نگاری کی مثال اُس تہ در تہ طلسمی ڈبیا (Casket.) جیسی ہے، جسے کھولیں تو اس میں سے ایک نادر شے نکلتی ہے، اس نادر شے کا ڈھکنا اٹھائیں تو نیچے سے ایک اور تحیّر زا چیز کا ظہور ہوتا ہے اور یہ معجز نما سلسلہ کافی دیر تک اسی طرح چلتا رہتا ہے ع رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پُو بہ پُو

ملاحظہ ہوں کلکِ موج ہی کے چند اور شعر:

نگار نوش لب، ماہ قصب پوش بنفشہ جعد، گلرخ، ماہ طلعت
غزالانِ سمن اندام، گلفام سیہ چشمانِ میگوں، ساج قامت
جھروکوں میں کھڑے معشوقِ رعنا شہابی، دودھیا، مرمر کی مورت
اناشیدِ قماری، سجعِ بلبل حمام بان دایکہ کی قرائت!

پہلے شعر میں محبوب کو ماہِ قصب پوش قرار دینا خوبصورت بھی ہے اور عام روایت سے ہٹ کر بھی۔ عام روایت یہ ہے کہ اگر چاند (بدر) کے سامنے کتان پھیلا دی جائے تو وہ پھٹ جاتی ہے، مگر خالدؔ کا محبوب (ماہ) دیکھئے کہ وہ اس نقص سے بھی کلی طور پر پاک ہے اور وہی کتانی جوڑا پہنے ہوئے ہے، جو عام چاند کی روشنی میں تار تار ہو جاتا ہے۔ (غالبؔ نے اس عام روایت کو اپنے خطوط (اردوئے معلیٰ) میں مشاہدہ کی روشنی میں باطل قرار دیا ہے اگرچہ اسے اقرار بھی ہے کہ ع شبنم خراب مہر، کتاں سینہ چاک ماہ! الخ)

قامتِ محبوب کو عام طور پر سرو و صنوبر یا شمشاد وغیرہ سے تشبیہ دی جاتی ہے مگر خالدؔ نے اشعارِ بالا میں اسے ساج (ساگوان) سے مماثل قرار دیا ہے۔ پھر آوازِ محبوب کی شعلگی کو کبوتر کی آواز سے مماثل ٹھہرانا اور کبوتر بھی حمام الایکہ یعنی جنگلی کبوتر جو اپنی نرمی نزاکت اور پامردی کے لئے مشہور ہے اور چٹانوں اور گہرے غاروں میں بسیرا کرتا ہے، کس قدر بلیغ ہے!

"کلکِ موج" میں حسن اور خواصِ حسن کا ایک اور نمونہ دیکھتے چلئے۔ خالدؔ کے نزدیک حسن ارض و سما کا جوہر اور رنگینی و زیبائی کا افشردہ ہے۔ اس نے اس حسنِ بہاریں کے لئے کیا کیا تشبیہیں چُنیں ہیں۔ خالدؔ کے نزدیک حسن ضیمران (نازبو) بھی ہے، ترن (نسترن) بھی، اُقحوان (بابونہ) بھی ہے، عرار گاؤ چشم، جنگلی نرگس) بھی! خالدؔ نے عام اسمائے تشبیہات کے عربی مترادفات اُردو

زبان میں داخل کر کے زبان کو وسعت دینے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس کے یہاں الفاظ اور تشبیہات کا ایک جہانِ معنی آباد ہے:

یہ عنفوانِ جوانی، یہ رنگ و بوئے بہار — تو حنیمراں وہ ترن ہے تو اُفتوانِ و عرار
مٹھاس شہد کی، صہبائے ناب کی تلخی — سکوتِ سبزۂ خوابیدہ، التہابِ شرار
دھنک کے رنگ، پہاڑوں کی برف، آگ کے پھول — زمیں کا علم، سپہرِ زبرجدی کا وقار
شکن شکن ہے حریری لباسِ شب خوابی — جھلک رہے ہیں سنہری ترنج دستِ افشار
کریں اسیر بعینِ علیل و قدِ رشیق — خدایگانِ تدلل، لواہِ ابکار!

"کلکِ موج" ——————

خالد نے بعض سخن ہائے ناگفتنی کو اپنے رمزی اور اشاراتی اندازِ بیان سے سخن ہائے گفتنی بنا دیا ہے۔ یہ اس طرح کہ اسے زبان و بیان پر حیرت انگیز عبور ہے، اس کا اندازِ بیان عامیانہ نہیں، عالمانہ ہے، بالصراحت نہیں بالکنایہ ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ حدیثِ خلوتیاں رمز و ایما ہی کے پردے میں لطف دیتی ہے۔ اسے علم ہے کہ رمز و کنایہ کا حسن اسی میں ہے کہ پرتو شاخ گُلے، سایہ دیوار گُسنے! ۔ وہ جانتا ہے کہ کنایہ تصریح سے کہیں زیادہ ابلغ اور افصح ہوا کرتا ہے پھر ساتھ ہی الفاظ و تراکیب کی تازگی سے وہ حسنِ معنی کو نکھار بخشتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے، اس کے رمزیہ انداز کی کتنی اچھی مثال ہے:

شکن شکن ہے حریری لباسِ شب خوابی — جھلک رہے ہیں سنہری ترنج دستِ افشار

"منمنا" میں خالد کے اسی رمزی انداز کے ثبوت میں صرف ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔ قارئین خود اندازہ کر لیں کہ وہ موزوں اشارات میں کیا کچھ کہہ گئے ہیں:

دہانِ خم پہ ہو خشتِ کلیسیا جیسے — ہیں یونہی نور کے قبّوں پہ دیدبانِ حَلَم!

دیگر بیشتر تصانیف کی طرح "سلومی" بھی خالد کی طبع زاد تصنیف نہیں بلکہ آسکر وائلڈ کی سلومی کا منظوم اُردو ترجمہ ہے۔ مگر خالد یہاں بھی حسبِ معمول محض مترجم نہیں رہے بلکہ انہوں نے اپنی ذہنی اُپج، اُفتادِ طبع اور مخصوص شعری مزاج کو کام میں لا کر اس دلچسپ تمثیل کو ایک نیا روپ رس دیا ہے۔ اور بعض جگہ تو اس کا بیان وائلڈ سے کہیں اونچا نکل گیا ہے۔ اس نے اصل روح کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے مزید جِلا دی ہے خصوصیت کے ساتھ جہاں خالد سراپا نگاری کرتے ہیں، ان کے قلم کو ایک لمحے کے لئے بھی پژمردگی کا احساس نہیں ہوتا۔ شامی شہزادی سلومی کے سراپا کی بہاریں یوں دکھاتا ہے:

شاہزادی نے چھپا رکھا ہے منہ پنکھے میں
سیمگوں ہاتھ پھڑکتے ہیں کچھ اس شدت سے
قمریاں جیسے ہوں بے تاب نشیمن کے لئے
چھاتیاں ہلتی ہیں پر تولتے پنچھی کی طرح
تتلیاں کرتی ہوں پرواز چمن میں جیسے
اس نکھور انگ میں ہے نکلی رُت کی خوشبو
چشمِ مخمور میں صہبائے جوانی کا خمار!

اب اس کے مقابلے میں وائلڈ کا بیان پڑھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں وہ روپ رس اور گُلتا نہیں ہے جو خالد کے محولہ بالا اقتباس میں ملتی ہے:

"The Princess has hidden her face behind her fan! Her little white hands are fluttering like doves that fly to their dove-cots. They are like butterflies. They are just like white butterflies." Salome.

سلومی میں حسن اور اس کے متعلقات کے بڑے نتھرے ستھرے بیانات ملتے ہیں مگر یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ اجمالاً اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ جہاں شہزادی سلومی یوحنا (ابن ذکریا) کے حسن کی تعریف کرتی ہے، وہاں اس قدر نرالی تشبیہات ملتی ہیں جو کہ کم از کم اردو ادب میں اس سے پہلے نہیں دیکھی گئیں۔ حضرت یحییٰؑ (یوحنا) کی زلفوں کی سیاہی کے متعلق یہ کہنا کہ:

گھنے جنگل میں جو بستا ہے وہ سناٹا بھی　　اس قدر تیرہ و تاریک نہیں ہوتا ہے

بلاغت کی انتہا ہے اور حد توصیف سے باہر! ایسے اشعار کا لطف صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسے شعر خالص وجدانی ہوا کرتے ہیں تشریح کا لمس برداشت نہیں کر سکتے!

سلومی کے رقص کی تفصیل دیکھئے، یہاں بھی خالد نے سلومی کے لطیف پیکر کے زیر و بم کے لئے نادر تشبیہات چنی ہیں۔ ——

—— رقص کے اس بیان میں اپنے عمیق مشاہدات سمو دیئے ہیں۔ اس نے وائلڈ کے مواد کو اس انداز میں استعمال کیا ہے کہ وہ اس کا اپنا بن گیا ہے۔ ارسطو نے سچ کہا تھا: "شاعر کو طبعزاد تخلیق پیش کرنی چاہیئے یا پھر کم از کم جو لوازمہ (Material) اس کے ہاتھ لگے، اسے فن کارانہ مہارت سے کام میں لائے۔" خالد نے ایسا ہی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو رقص کی تفصیل:-

واہ وا ایک شہابِ ثاقب

ایک شعلہ جیسے جوالا کہیں

جل پری صحنِ چمن میں رقصاں

موجِ بادہ کی طرح جوش میں سارے اعضا

ایک طوفاں کہ مقید تنِ بلوریں میں

مجدلاں کا ہے گلاب تازہ

بیتِ عنیا کی مہکتی سوسن!

—— سلومی

"مردِ رفتہ" جو یونان کی دسویں میوز سیفو کے نغمات کا بے مثل منظومہ ہے، خالد کی ترجمہ کردہ تخلیقات میں خاص مقام کی حامل ہے۔ سیفو جذباتِ عشق کے طبعی اثرات کے اظہار پر جس قدر غالب تھی وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس کے ذاتی احساسات اور داخلی واردات من حیث المجموع فطرت اور کائنات سے گتھے ہوئے ہیں۔ سیفو حُسن کے متعلقات پر کس قدر قادر تھی، اس کی ایک جھلک خالد کے ہاں دیکھئے:

پائلیں رن جھن، چھنکتی پاؤں میں

بربط و مردنگ و طنبورہ کے سنگ

جیسے سونے پر سہاگہ۔ جیسے میدے میں شہاب

یہ حسین، شمشاد قد، خورشید خد، نسریں شباب!

——— سرودِ رفتہ

خالد کے ہاں حسن کی کچھ اور تصویریں ملاحظہ کریں۔ یہاں بھی آپ کو اس کی روایتی تازگی اور جدت ملے گی:

بال کالے، چکور سی آنکھیں — طلعتِ ناز، لالۂ حمرا
نرم جیسے کہ سیپ کا موتی — سخت جیسے کہ صخرۂ صما

دوسرے شعر میں محبوب کی نزاکت کے پیشِ نظر اسے سیپ کا موتی قرار دینا اور سخت گیری کے اعتبار سے اسے پتھر ٹھہرانا اور پتھر بھی کوئی عام پتھر نہیں بلکہ صخرۂ صما جو بیت المقدس کی فضا میں معلق بتایا گیا ہے! محبوب کی درشتیٔ طبع کو صخرۂ صما سے مماثل ٹھہرا کر خالد نے شعر کو پُراسراریت کا حامل بنا دیا ہے!

خالد کے حسن اور اس کے متعلقات اور لوازمات کے بیان میں جو خلوص رچاؤ، گھلاوٹ، مٹھاس شیرینی اور صباحت ہے اس کا اندازہ قارئین کو مندرجہ بالا اقتباسات سے ہو گیا ہو گا۔ مگر یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ حسن کاری کے اس عمل میں خالد کے ہاں کہیں کہیں عریانی بھی دَر آئی ہے۔ اور وہ شاید اس لئے کہ فراق کے الفاظ میں "انسانی جمال کا احساس شہوانیت اور جنسیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا"۔ پھر بھی ایک ادیب اور شاعر پر لازم آتا ہے کہ وہ شعر میں صحت مندانہ رجحانات داخل کرے اور اسے مریضانہ میلانات سے ملوث نہ ہونے دے۔ خالد نے اپنی صنعزاد تخلیق "زنجیرِ رمِ آہو" کی نظم "اختر شناس" میں جل پریوں کو غسلِ آفتابی کرتے دکھایا ہے مگر وہ عریاں نگاری اور ژولیدہ بیانی سے نہیں بچ سکے:

کنارے گوکل و گنگا کے جیسے جل پریاں — ادائے دلبری سے غسلِ آفتابی کریں
فضا کو عکسِ رُخ و راں سے گلابی کریں — خمارِ چشم سے ہر شخص کو شرابی کریں

——— اختر شناس: زنجیرِ رمِ آہو

پہلا شعر تو پھر بھی غسلِ آفتابی تک محدود تھا لیکن اگلے شعر میں جہاں وہ عکسِ رخ و راں سے فضا کے گلابی ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں، اس میں جنسیت اور لذتیت کی بُو آتی ہے۔ روس کے عظیم ناول نگار لیو کاؤنٹ ٹالسٹائی نے اپنے ایک دوست موپساں سے کہا تھا "جانی! غسل کے بعد عورت کے جسم پر ٹھہرے ہوئے قطروں کا ذکر کرنا تھا۔ تو یہ کونسا ضروری تھا کہ تم ان قطروں کی رنگت بھی بتانے بیٹھ جاتے کہ پانی کے یہ قطرے جسم کی رنگت کے باعث گلابی ہو رہے تھے۔ یہیں سے تو اس جنسیت اور لذتیت کا آغاز ہوتا ہے جس کے ڈانڈے فحاشی سے جا ملتے ہیں"۔

خالد نے یقیناً کئی جگہ ایسی لغزشیں کھائی ہیں جہاں اس نے ندرتِ مضمون آفرینی کے جوش میں بعض لکھنوی شعراء کی طرح عریاں نگاری کا سہارا لیا ہے۔ اس کے بعض شعر واقعی لائقِ احتساب ہیں لیکن بیس اکیس تصانیف میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے تاہم تعداد کی اس کمی کے باوصف عریاں نگاری کا اعتراض اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ دراصل خالد کے جسم میں مجھے تو دو روحیں بیک وقت برسرِ عمل نظر آتی ہیں۔ ایک روح عالمِ علوی سے تعلق رکھتی ہے جس نے اس سے فارقلیط اور منحمنا جیسی عشق و والہانہ پن سے مالا مال تصانیف لکھوائیں۔ دوسری روح وہ جو عالمِ سفلی کی باشندہ ہے اور اسے کبھی کبھی ایسے اشعار کہنے پر مجبور کر دیتی ہے جو مہذب طرزِ فکر کے نقیض اور خود خالد کے شاعرانہ آدرش سے ہٹ کر ہیں۔ تاہم خالد کی رنگا رنگ اور بوقلموں شاعری کے پیشِ نظر کہنا پڑتا ہے ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی، — مباش منکرِ خالد کہ در زمانۂ تست

بعض شخصیتیں پہلی ملاقات ہی میں اپنے فن سے روشناس کرا دیتی ہیں اور بعض شخصیتوں کا فن ان سے تعارف کا سبب بنتا ہے۔ شخصیت سے مرعوب ہونا میری فطرت کے منافی ہے لیکن فن کا ایسا پرستار ہوں کہ جو بات دل کو لگ جاتی ہے اس کا لگاؤ کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔

جب میں فن کی راہوں سے گزر کر جناب عبدالعزیز خالدؔ کی شخصیت تک پہنچا تو پہلی ہی ملاقات میں یہ احساس لاشعور سے نکل کر شعور میں جگمگا اٹھا کہ "جاندار فن بے جان شخصیت کے بل بوتے پر بہت دنوں تک زندہ نہیں رہتا"۔ خالد صاحب کو جستہ جستہ رسائل میں پڑھ چکا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کے کچھ مجموعے پروفیسر علی عباس صاحب حسینی مرحوم نے بھجوا دیئے جن کے سرسری مطالعہ سے اندازہ ہو گیا کہ اس عہد کا ذہن فکری تنوع کی رنگا رنگی سے خالی نہیں ہے —— اسی احساس نے میرے اور خالدؔ صاحب کے درمیان ایک مخلصانہ رابطہ قائم کیا۔ پاکستان پہنچنے سے پہلے سلسلۂ مراسلت بھی قائم ہو چکا تھا۔ کراچی پہنچا تو شرفِ نیاز بھی حاصل ہوا اور پہلی ملاقات ہی نے مجھے ان کی شخصیت سے قریب تر کر دیا۔ پھر ملنے جُلنے کا سلسلہ جو شروع ہوا تو اس وقت تک باقی رہا جب تک وہ کراچی میں قیام پذیر رہے۔ میں نے خالدؔ صاحب کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کے فن کو بھی —— ! اور جہاں تک سمجھ سکا ہوں اُن کی شخصیت اور فن میں ایک ایسا باوقار عالمانہ رچاؤ ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

میری دسترس میں اس وقت ان کے کوئی مجموعے نہیں ہیں، اس لئے تنقید کا وہ حق ادا نہیں کیا جا سکتا جس کی ضرورت ہے لیکن بعض ناقدین کا یہ غیر متوازن جائزہ میرے لئے قابلِ قبول نہیں ہے کہ فلسفہ و حکمت کے رموز و رموز اگر حکیم الامت ڈاکٹر اقبال نظم فرما دیں تو شعر و ادب میں لافانی اضافہ ہیں لیکن جب فکر و نظر کی اسی گیرائی کو عبدالعزیز خالدؔ شعر کا آہنگ بخشیں تو سخن سنجی و سخن فہمی پر اوس پڑ جائے۔

خالدؔ صاحب روایتی غزل کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی نظمیں حالیؔ۔ آزادؔ اور حکیمیتؔ کے رنگ کا چربہ بھی نہیں ہیں۔ انھوں نے قدیم تلمیحات کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ ان کے فکر و فن کا سفر فلسفۂ قدیم و فلسفۂ جدید کی اُن متوازن قدروں سے ہم آہنگ ہے جنہیں مشرقی روایات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے دیو مالاؤں اور دساتیر کے پس منظر کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ انہیں قدیم و جدید تاریخوں پر بھی عبور ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کو بندشوں اور عہدِ حاضرہ کی نئی قدروں سے سنوارنے کی بھی کوشش کی ہے۔ وہ غالبؔ و اقبالؔ سے متاثر تو نظر آتے ہیں مگر انھوں نے کسی کا رنگ اڑانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مجموعی حیثیت سے ان کا فن ایک ایسی انفرادیت لئے ہوئے ہے جسے آنے والا عہد کبھی نظر انداز نہ کر سکے گا۔ تنقیدی نقطۂ نگاہ سے ان کے یہاں بھی فکر و فن کی کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن ان کے کلام کو دیکھتے ہوئے اس کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

(بقیہ ص ۲۲۵ پر)

سید شمیم اختر

عبدالعزیز خالد

میں عبدالعزیز خالدؔ کو کب سے جانتا ہوں؟ - یہ مجھے بخدا یاد نہیں - مگر ہاں اتنا جانتا ہوں کہ بہت عرصے سے جانتا ہوں - یہ دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ میں بہت زیادہ پڑھتا ہوں مگر ہاں اتنا ضرور ہے کہ زیادہ وقت پڑھنے میں گزرتا ہے - میرے ہاتھ میں جو رسالہ یا کتاب آجاتے ہیں اسے شوق سے پڑھتا ہوں اور لکھنے والے کا نظریہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا نظریہ کیا ہے - ہند و پاکستان کے تمام اچھے رسائل کو پڑھتا ہوں اور اچھا یا بُرا جو مجھے آتا ہے لکھتا بھی ہوں - یہ شغل ۱۹۴۴ء سے ہے مگر قیام پاکستان کے بعد میں نے اپنا زیادہ وقت ادب کی خدمت میں گزارا ہے اور میری متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں -

بہرحال عبدالعزیز خالدؔ کو میں نے رسائل میں دیکھا اور پھر پڑھا - مجھے ان کا کلام بہت پیارا اور دلکش معلوم ہوا اور میں نے ان کے یہاں ایک خاص رنگ پایا - موجودہ فضا سے بالکل الگ ایک ماحول اور کیفیت پائی - یعنی ایک بالکل الگ روش - خالدؔ صاحب نے اپنے لئے وہ میدان پسند کیا جس میدان میں بہت کم قلم کار داخل ہوئے ہیں -

انہوں نے اساطیر کو اپنایا ہے اور اساطیر سے ہٹ کر بھی جو کچھ کہا ہے وہ بہت خوب ہے - اسی لئے جب بھی کسی جریدے میں خالدؔ مجھے نظر آئے میں نے بہت شوق سے پڑھا - اسی لئے یہ کہا کہ میں خالدؔ صاحب کو بہت عرصے سے جانتا ہوں -

پھر جس تیزی سے خالدؔ صاحب کے "مجموعے" منظر عام پر آئے وہ بھی حیران کن ہے - میں نے ان کا ہر مجموعہ تو نہیں پڑھا مگر ہاں آٹھ مجموعے ضرور پڑھے ہیں - میں ان کو پڑھ کر بہت زیادہ متاثر ہوا اور میرے ذہن میں یہ بات بہت دنوں سے گردش کر رہی تھی کہ میں اُن پر اور ان کی شاعری پر ایک کتاب لکھوں - اس سلسلے میں تیاری کرتا رہا اور برابر سوچتا رہا - مگر کتاب کی ابتدا باقاعدہ طور پر نہیں کی تھی چونکہ گذشتہ دو سال سے میں بیماری کا شکار رہا پھر اپنی کتاب "فنون لطیفہ جنس اور مذہب" کو بھی مجھے مکمل کرنا تھا لہٰذا جب ۱۹۶۴ء میں کتاب سے فارغ ہوا تو اب خالدؔ کی شخصیت میرے ذہن پر چھا گئی - اور میں نے مکمل طور پر کام شروع کر دیا؛ مگر اس دوران میں بھی میں خالدؔ صاحب سے نہیں ملا - خالدؔ صاحب ایک بڑے آدمی ہیں اور میں ان کے سامنے کچھ نہیں - وہ ہفت زبان ہیں اور میں اپنی مادری زبان کا بھی ماہر نہیں - وہ شاعر ہیں میں شاعر نہیں - پھر کس طرح ان سے مل سکتا تھا؟ لیکن یہ شاید میری غلطی تھی - ٹینی سن کا قول ہے "جتنا بڑا آدمی ہوگا وہ اتنا ہی خوش اخلاق ہوگا"

میں اس قول کو بھلائے رہا یا مصروفیات نے مجھے اجازت نہ دی - چونکہ غریب "قلم کار" کے پاس تو وقت بھی کم ہوتا ہے اس کو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے زیادہ وقت مزدوری یا ملازمت میں صرف کرنا ہوتا ہے - میں بھی ملازمت اور پھر پڑھنے لکھنے کے چسکے میں وقت صرف کرتا رہا - میں اپنے کرم فرما جناب وزیری صاحب پانی پتی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ایک روز یہ مژدہ دیا کہ میں نے خالدؔ صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا وہ بھی آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں - میں کھل اٹھا ـــــ پھر ایک روز وزیری صاحب تشریف لے آئے کہ چلئے - یہ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کا دن تھا - میں نے دفتر سے چھٹی لی اور وزیری صاحب کے ہمراہ چل دیا اور جس وقت ہم ان کے دفتر پہنچے تو دوپہر ہو گئی تھی - خالدؔ صاحب ایک بڑے کمرے میں جس میں بہت سکون تھا تشریف فرما

(بقیہ صـ ۲۳۵ پر)

نسرین حبیب

شاعروں کا شاعر

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے

ہاں یہ وہی خالد ہے جو اپنے فن میں ڈوب ڈوب کر اُبھرا۔ اور اُبھر اُبھر کر ڈوبا۔ وقت کے بہتے سمندر میں سے اُس نے ایسی سیپیاں چنیں جن میں انمول موتی ہیں۔

ادبی دنیا میں عبدالعزیز خالد کے نام اور اُن کی مایۂ ناز شاعری سے کون واقف نہیں، اور اگر کوئی بدقسمتی سے واقف نہیں تو میں یہی کہوں گی کہ وہ ان تک پہنچنے اور اُن کو پانے کی استعداد ہی نہیں رکھتا:

شاعر کا نام ہمارے ذہن میں آتے ہی معاً خیال آتا ہے ——— تنگ پاجامہ اور شیروانی میں ملبوس ——— بے پناہ سوچوں کا غماز ——— جھریوں دار چہرہ ——— کچھ جھکی ہوئی کمر ——— بکھرے بکھرے بال، ——— ہونٹوں پر پان کی سُرخی ——— اردگرد پھیلی ہوئی کتابیں اور موٹے شیشوں میں سے دو گھومتی ہوئی پتلیاں ——— کبھی کوئی گھرداری کی بات کرنی بھی تو سرسری اور وہ بھی بڑے ادبی طریقے سے' اور پھر شاعری کے ساگر میں ڈوب جانا ——— ہاں بس یہیں تک شاعر کی محدود شخصیت ہمارے ذہن کے تانے بانے بُنتی ہے اور بس! لیکن خالد ان سب باتوں سے مختلف ہیں، شاید اس لئے کہ وہ عشق و محبت کے زلف و رخسار کی تخیلی دنیا میں اُلجھنے کی بجائے عملی اور حقیقی شاعری کے ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔

شاعر ہوتے ہوئے بھی خالد پہلی نظر میں شاعر نہیں لگتے خوش گفتار، خوش پوش، خوش شکل ...... بس دیکھنے میں ایک دم سوشل انسان معلوم ہوتے ہیں ...... جیسے ان کا ذہن معصوم ہو اور اس پر کسی علم کے چشمے کے چھینٹے نہ پڑے ہوں ...... یا پھر ایک زندہ دل انسان، جو بڑے سلیقے اور بڑی فراخدلی سے ہر بات کو دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور ہوئے ہوئے قہقہوں میں اُڑانا جانتا ہو ...... لیکن ایسا قطعاً نہیں، ہاں بہتر رہے کہ پہلی نظر میں شاید عبدالعزیز خالد کی بجائے صرف عبدالعزیز نظر آئیں۔ دوسری نظر میں عبدالعزیز خالد ...... اور پھر تیسری نظر میں جب آپ عبدالعزیز خالد کو محض تخلص کا شاعر نہیں، بلکہ علم کا خزانہ بھی پائیں گے تو یقیناً آپ پر سکتہ طاری ہو جائے گا ...... لیکن پھر جلد ہی آپ اپنی دنیا میں اس سوچ کے ساتھ لوٹ آئیں گے: "اوہو میں تو واقعی خوش نصیب انسان ہوں جو اتنے عظیم شاعر، اتنی بہترین شخصیت سے ملا اور کوئی بعید نہیں اگر آپ یہ بھی سوچ بیٹھیں کہ یہ ہی میرا آئیڈیل بھی تھا۔

شاعری اور پھر زندگی کے ہر پہلو میں ذوقِ سلیم ...... یہ دو مختلف چیزیں ہیں لیکن آپ کو ان کا سنگم خالد میں ملے گا وہ اپنی سلیقے سے سجی ہوئی لائبریری اور ستھرے اور جدید فرنیچر سے آراستہ کمرے میں بیٹھے یوں نظر آئیں گے جیسے اپنی دنیا کا بادشاہ بیٹھا ہو۔ ہر نئے ماہ کے رسالے اور کتابیں میز پر اس خوب صورتی سے چنی ہوئی ملیں گی کہ بے ساختہ آپ اس ادبی، نکھری اور ستھری فضا میں مچل اٹھیں گے کچھ نہ کچھ پڑھنے کو ——— خداوندِ کریم نے خالد کو دیا ہے اور بہت دیا لیکن یوں نہیں کہ انھوں نے جھولی پھیلا دی اور اللہ تعالیٰ نے اولوں کی طرح علمی خزانہ اس میں انڈیل دیا ——— نہیں ——— بلکہ چیز لینے کا بھی ڈھنگ ہوتا ہے ——— اور وہ ڈھنگ ——— مستقل مزاجی، محنت ——— محنت ——— محنت اور بس محنت ہی تو ہے۔ ——— جب محنت کی انتہا ہوتی ہے تو اس سے ایک یا دو تخلیقات ہو جاتی ہیں جن میں ہر سُو فنکار کی زندگی کا نچوڑ ہی نچوڑ ہم کو نظر آتا ہے

لیکن خالد نے کئی کتابیں لکھیں ہیں اور ان کتابوں میں ہی انھوں نے اپنی زندگی کے نچوڑ کو اس طرح سمویا ہے کہ بے اختیار ان کی بلندیوں کا قائل ہونا پڑتا ہے

غالب گزرے تو اقبال آئے اور پھر ان دونوں کے اہم موڑوں اور انفرادیت نے ان دونوں کو ایک اہم مقام دے دیا گو نشستیں الگ تھیں لیکن تعین برابر اور اب تیسری نشست جو ان کے برابر بچھنے والی ہے تو اس کے لئے خالد اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ وہ مشکل پسند شاعر ہیں، اس مشکل پسندی میں کیا ہے؟ اس کو پانے کے لئے جب قاری ان کی شاعری کے ساگر میں ڈوبتا ہے تو ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے اور مشکل پسندی کے سرسراتے پردے خود بخود ایک طرف ہٹتے چلے جاتے ہیں اور جب وہ اس ساگر میں سے ڈوب کر نکلتا ہے تو وہ مکمل طور پر خالد میں کھو چکا ہوتا ہے جس میں علم و ادب کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ ان کے ایک معصر ان کے متعلق کہتے ہیں:

"اتنا علم لئے لئے پھرنا انسان ضعیف البنیان کے لئے بڑی ہمت اور خطرے کی بات ہے۔ ان کا یونانی۔ لاطینی، عربی۔ عبرانی کلاسکس کا گہرا مطالعہ ہے"

راستہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو منزل تک پہونچنے کے لئے کانٹے بھی ملتے ہیں اور پھول بھی، لیکن خالد نے دھیرے دھیرے لگن سے ان کانٹوں کو اس راستہ سے یوں پرے کیا کہ کانٹے بھی پل بھر کو اس کی مستقل مزاجی پر اتنا حیران ہوئے کہ آگے بڑھ کر ان کا دامن تھامنا ہی بھول گئے۔

میں نے خالد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اصل میں وہ کچھ بھی نہیں۔ میں بھلا اس قابل ہی کب ہوں کہ ایسے شاعر کے بارے میں کچھ کہہ سکوں جو سچے موتیوں کی مالا پرونا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کی عظمت کے سیلاب سے مجبور ہو کر قلم کے لب خود بخود کا غذ پر ٹک گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو بھی ان کے بارے میں کچھ کہے گا ہر بار غالب کا یہی شعر ورق کے اختتام پر صادق آئے گا ۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

بقیہ عبدالعزیز خالد۔ نادم سیتاپوری

خالد صاحب ایک وضعدار، مہذب و خلیق انسان ہیں۔ مشاعروں کے شاعر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی نجی صحبتوں میں بھی کسی کو اپنا کلام نہیں سناتے۔ آپ انہیں صرف پڑھ سکتے ہیں۔ سُن نہیں سکتے لیکن ان کے اخلاق میں "مروّت" کا "پرسنٹیج" اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایک طرح سے ان کی کمزوری بن گئی ہے۔

بقیہ عبدالعزیز خالد ۔ سید شمیم اختر

تھے۔ وہ بڑے تپاک اور بڑے اخلاق سے ملے اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ میں خالد صاحب کے اس انداز اور اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔

وہ بہت ہنس مکھ ہیں اور ان کے ہونٹوں پر ایک رسیلی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ پیشانی بلند ہے اور روشن۔ وزیری صاحب نے جب تعارف کرایا تو خالد صاحب نے ایک مرتبہ اور گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور مسکرا کر میرے مشاغل دریافت کئے۔ یہ رسمی باتیں تھیں پھر خالد صاحب سے ادبی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اور بہت دیر تک ادب اور فن پر باتیں ہوتی رہیں۔ ہم نے ملک کی عام ادبی فضا اور ماحول پر باتیں کیں اور افسانہ، ناول، ڈرامہ اور شاعری غرض تمام اصناف پر تفصیل سے گفتگو رہی۔

[illegible] "جتنا بڑا آدمی ہوگا اتنا ہی خوش اخلاق ہوگا"

اکرام ہوشیارپوری

خالدِ آشفتہ نوا

شاہد احمد دہلوی نے خالد صاحب کو بڑا شاعر، بڑا انسان، اور بڑا افسر کہا ہے۔ میں خالد صاحب کو بڑے افسر کی حیثیت سے کم لیکن بڑے شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس لئے اُن کی افسری سے زیادہ میں اُن کی شاعری سے متاثر ہوں اور مجھے امید ہے کہ آنے والے ادوار میں بھی اُن کی شاعری اُن کی افسری سے بلند تر رہے گی کیونکہ وہ ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اُردو ادب میں اپنے ڈھنگ کے منفرد اور ہمیشہ زندہ رہنے والے شاعر ہیں۔ انسان وہ کتنے بڑے ہیں، یہ بات ان کی تخلیقات کو پڑھ کر پوری طرح قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اُن کے کلام میں ہی اُن کی شخصیت، مزاج اور انسانیت کا تعین ہو جاتا ہے۔ جو خصوصیات ایک شاعر کو بڑا انسان بناتی ہیں یا یوں کہیئے کہ جو چیزیں ایک انسان کو بڑا شاعر بناتی ہیں وہ ان کے اشعار اور اُن کی ذات میں نمایاں ہیں۔

خالد صاحب کے کلام میں ایسے ایسے انقلابات بھی دیکھنے میں آئے کہ خالدِ نظم گو کو غزل خواں ہوتے دیکھا۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے خود جلتے ہیں اور دوسروں کو اُجالتے ہیں۔ حقیقت میں وہ دورِ حاضر کے شعرا میں کوہ پیکر کی حیثیت کے حامل ہیں جن کا کلام گوہر فروشی اور شیشہ گری ہے۔ اُن کو اپنے فن سے لگاؤ ہے اور وہ اس کے مقابلے میں مے اور عشق کو بھی ترک کر سکتے ہیں لیکن شاعری کو وہ اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔

اس ہمہ رنگ ہمہ صفت شاعر کے یہاں آپ کو ہر جگہ رنگا رنگی و بوقلمونی نظر آئے گی، گویا اُن کی شخصیت اور قدِ ہشت پہلو ہیرے کی مانند ہے جس میں سے ہر سمت کو شعاعیں نکلتی ہیں۔

اُن کے یہاں آپ کو قدیم و جدید علوم و فنون کا میل جول ہوتا ہوا نظر آئے گا اور آپ بہت سی ایسی، علمی، ادبی، تاریخی شخصیات سے متعارف ہوتے ہیں جو آج تک آپ کے مطالعہ و مشاہدہ میں نہیں آئی تھیں، بہت سی زبانوں اور دیگر علوم و فنون کی اصطلاحیں، الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات بکثرت ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ باوجود مشکل نویسی کے قاری ان کے کلام سے بہت کچھ نئی معلومات حاصل کرتا ہے اور ملکی و غیر ملکی اقوام کے علمی و ادبی ذخائر سے خالد صاحب نے بے شمار جواہرات اکٹھے کئے ہیں جن کی جھلکیاں اُن کے کلام میں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اُردو، فارسی، ہندی، پنجابی اور انگریزی کے قریب قریب تمام باکمال شاعروں سے متاثر ہوئے ہیں اور اُنہوں نے وسیع طور پر ان کے پُورے پُورے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اُن ہی کے زیر اثر اپنی ایک الگ راہ بھی نکالی ہے۔ جہاں ہمیں اُن کے کلام میں میر تقی میرؔ، غالبؔ، اور سوداؔ سے لیکر اقبالؔ تک کے کلام کا عکس نظر آتا ہے وہاں فارسی میں حافظ شیرازی، سعدی شیرازی، ہندی میں کالی داس، پنجابی میں بُلھے شاہ، وارث شاہ اور سلطان باہُو کے کلام کا اثر بھی نمایاں طور پر اُن کے وسیع مطالعے کا پتہ دیتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے اُن کا لگاؤ گیتا نجلی کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ یونانی متھالوجی، ہندی متھالوجی، قرآن مجید اور احادیثِ نبویؐ انجیل، زبور، گیتا اور مہابھارت وغیرہ و دیگر قدیم علمی ماخذ سے خالد صاحب نے بھرپور فائدہ حاصل کیا ہے۔ جو لوگ اُن کی شاعری کو مشکل گردانتے ہیں، وہ اُن کے پورے کلام کو مشکل نہیں کہہ سکتے کیونکہ اُنھوں نے ،کفِ دریا، دشتِ شام، زنجیرِ رمِ آہو، اور برگِ خزاں جیسی نئی تخلیقات اُردو شاعری کو دیکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہر صنفِ شعر میں اشعار کہہ سکتے ہیں اور وہ میرے خیال میں ہر زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں اور ہر قاری کو مطمئن کر سکتے ہیں

اِس کے علاوہ وہ ایک سب رنگ شاعر ہیں جنھوں نے کلاسیکل، قومی، غیر قومی ملکی و غیر ملکی شعر و ادب کا اثر اختیار کیا ہے۔ زندگی کے ہر ایک پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ ہر ایک موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً تراجم میں ویٹ نام کی تحریکِ آزادی کے سرفروش راہنما ہوچی منہ کی نظموں کا منظوم ترجمہ جو پروازِ عقاب کے نام سے کیا ہے وہ اُردو ادب میں ایک کامیاب تجربہ گِنا جاتا ہے۔

کبھی خالد صاحب "برگِ خزاں" میں قابیل، فلکناز اور آشور بینی پال کے قصّوں کو تمثیلی رنگ میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی قدیم داستان میں جدید اور مقامی زبان کے الفاظ و ترکیب استعمال کر کے اپنی ہمہ دانی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

خالد صاحب کے کلام میں منفرد لب و لہجہ کی مثال وہاں نمایاں ہوتی ہے جہاں اُن کی شاعری میں کہیں یوسفؑ زلیخا اور عزیزِ مصر کا بیان ہے۔ کہیں سسّی پنّوں، کنیا، کنہیا، رادھا، شام، رام چندر جی، لچھمن، سیتا اور راون کے نام کے سامنے آتے ہیں۔ کسی جگہ گورونانک کے دربار میں مردانہ اور بالا حاضری دے رہے ہیں اور کہیں شکنتلا جلوہ افروز ہے کہیں احادیثِ نبویؐ اور آیاتِ قرآنی کا بیان ہے اور کسی مقام پر اقوالِ صحابہؓ میں حضرت علیؓ کا نعرۂ حق اور عمر فاروقؓ کے دُرّے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اگر ایک طرف خلیفہ ہارون الرشید کا دربار ہے تو دوسری طرف پُرانی یادوں کے در و دیوار مہک رہے ہیں۔

خالد صاحب کہیں تو اقبال کے رنگ میں مثلاً اپنی ایک نظم "اے خاک کے پُتلے" میں حجاباتِ خودی اُٹھاتے ہیں۔ کسی شخصیت کی پہچان، طلسماتِ خدائی کے رموز اور اپنی شبوں کو اُجالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری وہی انسانِ کامل اور مردِ مومن کے ہاتھ تقدیر کی مات اور افلاک کو تسخیر کرنے کی جرأت پیدا کر کے ہر طاق کو

منوّر اور ہر کوچہ کو ایک مصوّر بنا دینے کا عزم پایا جاتا ہے۔ "زنجیرِ رمِ آہو" کی جس نظم کو میں خالد صاحب کی نمائندہ اور ایک شاہکار نظم کہہ سکتا ہوں اُس کا عنوان "اختیار" ہے جس میں شاعر نے بڑی مہارت سے زندگی گزارنے کا نصب العین اور ایک باقاعدہ دستور العمل دے دیا ہے۔

خالد صاحب کے یہاں، حُسن پرستی، سراپا نگاری، حسن و عشق کے معاملات شباب و جوانی کا ذکر بھی انوکھے انداز میں ملتا ہے۔

ہر کُنج سے آتی ہیں ترے جسم کی لپٹیں ——— یادوں کے پری خانے تری سانس سے مہکیں
یہ آہستہ سے دروازے کو کس نے کھٹکھٹایا ہے ——— یہ آدھی رات کو خلوت گہِ شاعر میں کون آیا
ہر ایک آدمی سپنے پہ سپنے بُنتے سپنے ——— ہراک بشر ہے اسیرِ طلسمِ خوش فہمی

خالد صاحب کی شاعری کیا ہے، ایک تصویر خانہ ہے — یا یوں سمجھیئے - کہ ایک عجائب خانہ ہے جہاں مختلف اقوام کی قدیم تہذیب و تمدن، شعر و ادب، قومی تاریخ و داستان کے عجائبات و نوادر اُسی شکل میں جگہ جگہ قرینے سے سجے سجائے دھرے ہیں — ایک طلسم خانہ ہے، یا اُن کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ ہے کہ جب اور جس وقت جا ہتے ہیں اُس کو رگڑ کر ہر لمحہ ایک نئی دُنیا، نئی تہذیب سامنے آتے ہیں۔ کہیں شکنتلا مسند آرا ہے تو کہیں نگار ارضی ہے۔ ایک جانب مدھو بالا ہے اور دوسری جانب سلوٰی و شیفو لیٹے ہیں۔ یہاں قلوپطرہ جلوہ نما ہے تو وہاں وینس کی دلآویز شام میں لے جاتے ہیں۔ کبھی پیرس کے طلوع میں جا کھڑا کرتے ہیں کبھی یونان و ایران میں، کہیں عرب کے ریگستان میں لئے پھرتے ہیں۔ غرضیکہ دشت و جبل، دریا، سمندر ہر شئے کی مرقع کشی کرتے چلے جاتے ہیں اور کبھی زمانہ موجودہ کا احساس جلاتے ہوئے کراچی کے رونق و رنگ دکھا دیتے ہیں تو دوسری جگہ لاہور کے گل برگ کی سیر کراتے ہیں۔

اُن کی ہر کتاب اپنی جُدا اور منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ کسی کتاب میں ارسطو کی مسندِ حکمت پڑی ہے اور کہیں تخت سکندری دھرا ہے۔ کہیں یونانی فرمانرواؤں کے دربار لگے ہیں اور کہیں ہند میں سنجوگن کا سوئمبر رچا ہوا ہے کہیں رام چند جی کو لچھمن اور سیتا کو بن باس دیا جا رہا ہے کہیں لنکا کو راون سے جدا ہو رہا ہے۔

کبھی خالد صاحب حیدر آباد کے راتی باغ کی سیر کو نکلتے ہیں، کہیں فرہاد کی خارا تراشی ہے اور کہیں مجنوں کی خانماں خرابی بائی بائی جاتی ہے۔ کسی وقت وہ خود کو آوارہ دیار قرار دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خالد صاحب کی شاعری کے اس تصویر خانے میں میر کی کُل جواہر بھی ہے۔ اور اقبال کی دشتِ ختن مُشک بو بھی، غالب کا اندازِ بیان بھی اور اُن کی آشفتہ نوائی بھی۔ کسی جگہ تلسی داس اور کبیر داس دھونی رمائے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں اور اُس کے پاس سے کسی وقت یہ صدائے بازگشت بھی سنائی دینے لگتی ہے۔

دھیاں جوانی لے گئے   بہو واں لے گئیاں پوُت
جو بن تریا لے گئی   رہے اُوت کے اُوت

کسی جگہ اُن کی شاعری کے طلسم خانے میں حافظ شیرازی پیالہ و صراحی لئے کھڑے نظر آتے ہیں اور نیچے لکھا ہوا ہے

”روزی تفقدے کُن مسکینِ بے نوا را“

خالد صاحب کے یہاں وہی تفکر و فلسفہ، وہی سوز و گداز وہی احوالِ قلبِ سوزاں، وہی افسونِ شعر و حکمت، تخلیق کی لگن کی سعادت اور عشق میں جاں کا زیاں ملتا ہے۔ فردوسِ گمشدہ کے آثار ڈھونڈنے کی کوشش اور عظمتِ رفتہ کا سراغ لگانے کی سعی ملتی ہے۔ قومی و ملّی دردمندی ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ دیس کی مٹی اور اس کی بوباس سے تعلق اور اُنس پایا جاتا ہے جو ایک سچّے کامل اور عظیم شاعر کے دل میں ہونا لازمی ہے۔ وہ واقعی فردِ منتخب ہیں اور اُن کے درپے ہمیشہ فکرِ زوالِ اُمّت رہتا ہے۔

کبھی خالد صاحب کو دوآبے کے پنگھٹ یاد آتے ہیں۔ بسنت کی کہکشاں، رہس لیلا، سہاگ رات میں کامنی کا گھونگھٹ اور کبھی پھاگ کھیلتی ہوئی کنھیا کی گوپیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کالی داس کا خیال کبھی گوکل اور گنگا کے کنارے جل پریاں اشنان کرتی ہیں اور کبھی لاہور کے پری وش جن کی ملاحتوں میں پُرکار سادگی کی فن کاریاں نمایاں ہیں۔

گل برگ پیکروں کو خوگر ہیں کہیں کہ سیر میں   آرائشِ خیاباں، آسائشِ شبستاں

میرے خیال میں خالد صاحب کی شاعری وہ آئینہ خانہ ہے جہاں ایک چیز کے کئی کئی رُخ اور رنگ و روپ نظر آتے ہیں ۔ گویا جدید و قدیم روایات و تلمیحات اور رزمیہ و بزمیہ داستانوں کا ایک مرقع ہے ۔ جہاں حسن و عشق کے بھی معاملات ہیں اور قومی و ملّی شعور و علم و حکمت اور دانائی کا احساس بھی ، تصوف و تقویٰ بھی ہے اور حب الوطنی اور ملکی وفاداری کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے ۔

ان کے یہاں پنجاب کی لوک کہانیوں کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہے اور صوفی شاعروں کے کلام کا عکس بھی موجود ہے ۔ دیس کی مٹی سے پیار اور بین الاقوامی سرحدوں کو پار کرکے انسانیت اور انسانی قدروں کا پاس بھی ۔ مختلف اقوام کی تہذیب و تمدن ، کلچر اور زبان و بیان کے کرشمے بھی ہیں ۔ دوسری زبانوں اور ان کے ادب کے بیش بہا علمی خزانوں سے بہرور ہو کر اُن کو اپنی زبان اپنے شعر و ادب کے سانچے میں ڈھالنے کا فن اور اُس کا گہرا احساس خالد صاحب کی شاعری کا طرۂ امتیاز کہا جاسکتا ہے ۔

کہیں قیس و لیلیٰ ، شیریں فرہاد ، ہیر رانجھا ، سسّی پنّوں ، مرزا صاحباں کے حسن و عشق کی داستانیں ، وہ ان لوک کہانیوں کے نقشے اس طرح کھینچتے ہیں کہ منظر آنکھوں کے سامنے بکھر جاتا ہے ۔ یا کسی جگہ یہ بتایا جاتا ہے کہ کس طرح بلخ بخارے سے عزت بیگ آکر مہینوال بنتا ہے ۔ کس طرح سوہنی کمہارن کچے گھڑے کا سہارا لیکر چناب کی لہروں کی گود میں سو جاتی ہے ۔

خالد صاحب کی شاعری میں تمام اساتذہ کے کلام کا گہرا اثر ہے ۔ ولی دکنی ، میرؔ ، مصحفی اور غالبؔ سے لیکر اقبال اور حسرت موہانی کی غزل و نظم ، اس کے بعد ہم عصروں میں فیض احمد فیض اور جوش ملیح آبادی کی شاعری کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں اور وہ عصری زندگی کے تقاضوں سے بھی بےخبر نہیں رہتے ۔ ان کی شاعری میں موجودہ زندگی کے تقاضوں کا بھرپور احساس پایا جاتا ہے ۔ میرے خیال میں زمانہ حاضرہ میں خالد صاحب اس وجہ سے ایک منفرد شاعر ہیں کہ انہوں نے دوسری بہت سی زبانوں سے بڑھیا قسم کے فن پاروں کو منتخب کرکے ایک مترجم کی حیثیت سے غزل و نظم اور آزاد نظم کی شکل میں ڈھال کر اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے ۔ آج کی اُردو شاعری کے دامن کو وسعت بخشی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر شاہد احمد دہلوی نے خالد صاحب کو بڑا شاعر اور پروفیسر ارشاد احمد حقانی نے ان کو ایک نابغہ کہا ہے تو کوئی زیادتی یا مبالغہ نہیں کیا ۔ بعض نے ان کو مستقبل کا ولی قرار دیا ہے کیونکہ مستقبل کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ایک عظیم شاعر کرتا ہے وہ خالد صاحب کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں ۔ ان کی شاعری میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک شاعر اور اُس کے کلام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوتی ہیں اور جن جن شاعروں سے خالد صاحب متاثر ہوئے ہیں ان کا اُستادیٔ فن کا اعتراف انہوں نے اپنے کلام میں کیا ہے ۔ میرؔ اور سوداؔ کے اسلوب ، غالبؔ کی خوشہ چینی ، اقبال کی ذوقِ بندگی کا ذکر بار بار اُن کے اشعار میں آیا ہے ۔ تغزل اور حُسن پرستی کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اُن کے شہرِ دل سے کوئی رعنا غزال گذرتا ہے ۔

ان وجوہ کی بنا پر اُن کی شاعری کو ایک فسانۂ عجائب اور مجموعۂ غرائب بھی کہا جاسکتا ہے ۔ اُن کا گہوارہ فطرت و فن کے نشیمن میں پایا جاتا ہے اور اُن کے خیالوں کے چراغ روغنِ درد سے جلتے ہیں اور خالد صاحب کے کلام میں بیداری کا پیغام ایک للکار کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

"سلومی" نظم متعرا میں انجیلِ مقدس کا قصہ ڈرامایا گیا ہے ۔ اِس میں خالد صاحب کی قدرتِ زبان و بیان اور

یونانی متھالوجی سے رغبت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا خصوصی امتیاز بے قافیہ ڈرس اور بلینک ورس کو انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ کاوش اردو شعر و ادب کے لئے ایک بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اس میں خاص طور پر وہ حصہ زیادہ جاندار ہے جہاں سلومی کا رقص دکھایا گیا ہے۔

غزل الغزلات میں بھی ترجمہ کرتے وقت اس عظیم شاعر نے اپنی عظمت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ نغمۂ سلیمان کا ترجمہ ہے۔ مترجم شاعر نے نئے ماحول نئے موضوع اور نئی شاعری کے لئے زبان اور لب و لہجہ بھی نیا اپنایا ہے عہد عتیق کی وہی رنگینی اور شعری فضا برقرار ہے۔

ان اسباب سے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس ہمہ صفت اور ہمہ رنگ شاعر کو مختلف اور اعلیٰ صلاحیتیں عطا کرنے میں قدرت نے خوب فیاضی سے کام لیا ہے۔ مختلف قسم کے رنگا رنگ اور متنوع مضامین اور موضوعات انتخاب کر کے اُن کے بارے میں مطالعے کی وسعت اور جہان بین کرنے کے بعد اُن کو نئی شکل نئی زبان اور نئے انداز اور پیرائے میں تخلیق کی صورت دیکر پیش کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔

بہت سے نقاد حضرات کو اِن کی گوناگونی اور مشکل گوئی پر غالبؔ کی طرح اعتراضات بھی رہے ہیں لیکن میرے خیال میں دوسری زبانوں کے جتنے شہ پارے خالد صاحب نے اُردو ادب کو دے دیئے یہ سب اعلیٰ قسم کے اضافے ہیں۔ تراکیب الفاظ، تشبیہہ، استعارے اور نئے موضوعات اور دوسری زبانوں کے ادب اور عظیم مصنفوں، شاعروں، ادیبوں، مفکروں اور فلاسفروں سے ہمیں متعارف کرایا۔ علمی و ادبی اور تاریخی تلمیحات سے آگاہی بخشی اور یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ موجودہ اور آئندہ زمانے کا قاری اور نقاد خالد صاحب کی اِن ادبی و علمی خدمات کو اردو ادب کے لئے ایک بہت بڑا کارنامہ تصور کرے گا۔

اگر خالد صاحب نے خود کو عصر رواں کا البیرونی، ایاز و غزنوی دونوں کا محرم، کو ہم قدح ابوذر غفاریؓ کا ہم قدح اپنے پیر مغاں ابوبکرؓ و عمرؓ کو بنایا ہے تو درست ہے کیونکہ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں کتابوں کے شاعر ہیں۔ اور اُن کی گوشہ نشینی، اُن کا فقر اور قلندرانہ شان اور درویش منش طبیعت اور اولوالعزمی ان کو یہی درجہ عطا کرتی ہے۔

اگر دیکھو تو ہر محفل میں شامل　　اگر ڈھونڈو تو بے نام و نشاں ہے

لیکن اِس کے باوجود وہ یہ بھی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

کٹی عمر عزیز اندوہ و غم میں　　ہمارے حصے کی خوشیاں کہاں ہیں

یہ سب کچھ صحیح اور برحق لیکن اُردو شاعری کے اس اسکندر اعظم نے بھی آج تک لوح و قلم کے بہت سے قلعے تسخیر کئے ہیں اور اپنا ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے جہاں اُن کی اپنی آواز اپنا لب و لہجہ نمایاں نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

یوں جیو وقتِ عمل جیسے کبھی مرنا نہ ہو　　ہے بقدر ہمت او حج و مرتبہ ہر شخص کا

اور میرے خیال میں جن لوگوں نے خالد صاحب کو ایک نامور شاعر گردانا ہے اِس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں اپنی انفرادیت اور ذات کا احساس کھُل کر سامنے آتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

روح ہے آزاد میری جسم گو پابند ہے　　نام ہے خالد مرا، بندہ ہوں اپنے نام کا

عاصم صحرائی

خالد ـــــ ایک بحرِ بیکراں

خالد کی شاعری یا اس کے فن کو سمجھنا اور اس کا تنقیدی جائزہ لینا بہت مشکل کام ہے اس کی بنیادی وجہ خالد کی مشکل پسندی کے علاوہ خالد کی طبیعت کا تنوع ہے۔ خالد نے شاعری کی کسی ایک صنف میں طبع آزمائی کی ہوتی تو شاید نقادوں کے لیے اتنی مشکل پیدا نہ ہوتی لیکن خالد نے خود کو کبھی محدود نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فن مختلف رنگوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اور اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ خالد کے فن کے ہر رنگ میں قوس و قزح سے زیادہ کشش اور جاذبیت موجود ہے۔ وہ جو بات بھی کہتا ہے اس میں پوری دلآویزی ہوتی ہے۔

میں خالد کی شاعری کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس میں سنجیدگی و متانت کے علاوہ شگفتگی، جاذبیت، دلآویزی اور علم کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ خالد کے نظامِ فکر میں صرف اسکی اپنی ذات، شخصیت یا تخلیقی جبلت ہی کار فرما نہیں بلکہ اس کے نظامِ فکر کی جڑیں اس کے اپنے ہم عصر علم و ادب کے علاوہ کلاسیکی ادب میں بھی دور تک پہنچی ہوئی ہیں۔ خالد کی باتوں میں سطحیت کی کئی نسلوں کا تجربہ شامل ہوتا ہے۔ اس کے ہاں شاعرانہ تضاد کی بجائے فلسفیانہ ارتباط ہے۔

خالد کی شاعری کی مثال یقیناً ایک بحرِ بیکراں کی سی ہے جس میں سے غوّاصی اپنی اپنی پسند کے مطابق معانی و مطالب کے لعل و گوہر نکالتے رہتے ہیں۔

خالد محض عظمتِ رفتہ ہی کا شاعر نہیں بلکہ وہ حال اور مستقبل کی صداقتوں کا نقیب بھی ہے۔ اس کے فن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے فن میں دوسرے شاعروں کی طرح شعوری اور لاشعوری کشمکش نہیں ملتی۔ بلکہ خالد کا کلام پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایک واضح نصب العین موجود ہے۔ وہ سعی و خطا کے ذریعے مسائل کی گتھیوں کو نہیں سلجھاتا بلکہ اپنے بے پناہ مشاہدات و تجربات کے علاوہ ادراک و بصیرت سے بھی بھرپور استفادہ کرتا ہے۔

خالد زلف و کاکل کے قصے چھیڑ کر قوم کو جنسی مارفیا کے انجکشن لگانے کی بجائے لوگوں میں عقل و خرد اور شعور و ادراک کی دولت بانٹتا ہے۔ وہ سنجیدہ موضوعات کے انتخاب ضرور کرتا ہے لیکن اپنے فن پر یاسیت و قنوطیت کے سائے نہیں آنے دیتا بلکہ اس کے کلام میں لطف و سرور اور کیف و اہتزاز کی ہلکی ہلکی لہریں ملتی ہیں جو قاری کے ذہن میں ایک خاص قسم کا تہیج پیدا کرتی ہیں۔

سقراط نے ایک بار کہا تھا کہ بہترین سنگ تراش وہ ہے جس کے مجسموں سے اس کے ذہنی کوائف و اعمال کا زیادہ سے زیادہ سراغ ملتا ہو۔ مجھے سقراط کی اس بات سے جزوی اختلاف ہے۔ ہم کسی فنکار کے فن میں محض یہی نہیں دیکھتے کہ اس کے فن سے اسکی شخصیت یا اس کے جذبات و احساسات کس حد تک نمایاں ہوتے ہیں بلکہ اس کے فن کی تکریم و توقیر کا فیصلہ اس وقت تک صادر نہیں ہو سکتا جب تک ہمیں اس بات کا علم نہ ہو کہ فن کار نے اپنے فن کی تخلیق کے لیے جو مواد حاصل کیا گیا ہے وہ کس نوعیت کا ہے اور اسے کس انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہی حال شاعر کا ہے۔ ہم شاعر کو فقط اس بات کی داد نہیں دیتے کہ شاعر نے بہت خوبصورت شعر تخلیق کر لیا ہے بلکہ ہم یہ دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ اس نے اپنے شعر کی تخلیق کے سلسلے میں جن تجربات و مشاہدات کو منتخب کیا ہے وہ

کی جائے تو غالباً زیادہ مفید ہوگا۔

خالد نے اپنی شاعری میں صرف اپنی وارداتِ ذہنی کا زیادہ سے زیادہ اظہار نہیں کیا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام جذباتی تقاضوں سے واقف ہے۔ خالد کے ہاں انفرادی کشمکش کی بجائے، اجتماعی شعور کی بہتات ہے۔ اس کے شعروں میں صرف اس کی اپنی ذات ہی نہیں جھلکتی بلکہ اس نے قوم کے ماضی کے علاوہ پورے حال کو بھی اپنی شاعری میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ خالد کے ہاں ماورائی تعقلات کی بجائے ایسے تعقلات کی کثرت ہے جنہیں عقل و بصیرت کی کسوٹی پر بار ہا پرکھا جا چکا ہے۔ خا نے اپنی ذاتی ہیجانات کی بجائے اجتماعی ہیجانات کو زیادہ تر اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

ہیگل کی یہ بات کہ فن اپنے دورِ انحطاط کے سوا کسی خارجی قانون اور اصول کی پابندی نہیں کرتا، آج بھی ایک اصول کی حیثیت رکھتی ہے اردو ادب میں سرسید سے لے کر اقبال تک نظر دوڑائیے یہ اصول اپنی شدت کے ساتھ ہر جگہ نظر آتے گا۔ اقبال کے بعد اگر اُردو زبان نے واقعی کوئی قابلِ ذکر شاعر پیدا کیا ہے تو وہ ہے عبدالعزیز خالد، خالد کا لہجہ اقبال سے لاکھ مختلف سہی، اس کا اندازِ تخاطب بھی اور ہی سہی، اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہاں بھی اُسی مقصد کے لاشعوری تکمیل موجود ہے، جسے سرسید نے شروع کیا تھا، حالی نے آگے بڑھایا اور اقبال نے اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی۔ قوموں کے لئے آزادی حاصل کرنا مشکل بلکہ جاں گسل کام ہے لیکن آزادی کو برقرار رکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے کبھی ماؤ زے تنگ کی ضرورت ہوتی ہے تو کبھی ہوچی منہ کی۔ ہوچی منہ کی نظموں کا مطالعہ کیجئے۔ تو وہاں ایک مسلسل کرب اور پیہم اضطراری کیفیات ملتی ہیں۔

یہ جہانِ اشک و آہ
آفت و افتاد کی آماجگاہ
دیتے فرزندِ آدم نت نئے آلام و غم
لیکن آزادی کی محرومی سے بڑھ کر ابنِ آدم کے لئے
کوئی کشٹنائی نہیں سامانِ رسوائی نہیں

خالد کا مشن بھی چونکہ یہی ہے۔ اس لئے اس نے ہوچی منہ کی نظموں کو اُردو کے قالب میں اس خوبصورتی سے ڈھالا ہے کہ وہ ہماری اپنی قوم کی خواہشات کا آئینہ دار بن کے رہ گئی ہیں۔

خالد کی شاعری میں دوسرے عوامل کا ذکر کرنے کے بعد اب میں خالد کے فنِ تغزل کی طرف آتا ہوں۔ غزل بہت ہی لطیف شئے ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں غزل ہی کو زیادہ تر بیا پیگنڈہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

شاعری میں غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو شاعر کی ذات کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ غزل ذات کے اظہار کا مکمل آئینہ دار ہے۔ اظہارِ ذات کا تعلق براہِ راست ہمارے وجدان سے ہوتا ہے۔ غزل کی ساخت میں تیقن کا شائبہ تو ناگزیر ہے لیکن یہ لطیف شئے استدلال کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن خالد کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تیقن اور استدلال جیسے کثیف عناصر کو بھی، غزل میں اس خوبصورتی سے سمویا ہے کہ وہ غزل کا ایک حصہ ہی بن گئے ہیں۔

خالد کی غزل میں شاعرانہ تخیلی بصیرت اور بے تصنع و برجستہ وجدان کا اظہار موجود ہے۔ خالد اپنی شاعرانہ حسیت کے ذریعے انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کی طرف جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک قسم کی تخلیقیت ہے۔ کیونکہ فن کی صداقت کو پرکھنے کے لئے جہاں انفرادی بصیرت اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ہم اجتماعی تجربات اور اجتماعی شعور کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اجتماعی شعور اور تجربات

خالد نے غزل کے لیے بھی نئی نئی راہیں منتخب کی ہیں۔ وہ روایات کا احترام ضرور کرتا ہے لیکن اس کا اسیر نہیں ہو جاتا۔ اُسے اقبال کی طرح نئی نئی تراکیب و تلمیحات وضع کرنے میں بہت لطف محسوس ہوتا ہے۔ غزل کے لیے نئی نئی زمینوں کا انتخاب اور ان میں نئی نئی تشبیہات کے سدا بہار پھول کھلانا اس کی طبیعت کا خاصا ہے۔ ان تراکیب میں عربی و فارسی کا حسین امتزاج اور ہندی و سنسکرت کا دلکش آہنگ ہوتا ہے۔ خالد کے کلام میں خیال کی ندرت، لفظوں کی خوبصورت تراش خراش، محاورات کی حسین بندش، فکر کی گہرائی اور زبان کی چاشنی، سبھی کچھ موجود ہے۔ اشعار میں صوتی ترنم اور سُر کا زیر و بم بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

شاعر کو دمِ فکرِ سخن شعلہ روشن
غلغلاں کی آواز ہے پیارے کو کو

یا

میں شام کا عاشق ہوں لبھاتی ہے مجھے شام
جب گیسوئے مشکیں سے مہک لٹتے ہیں مشکو

نظیر اکبر آبادی کی طرح خالد کی شاعری میں بھی قرآن پاک کی آیات کا حسین سنگم موجود ہے

جبیں غیر کے آگے جھکتی نہیں
ہے دنیا گواہ اِنّا مسلمون

ہو عین الیقیں ہی سے دل مطمئن
قل اما ترینی ما یوعدون

کلیمی یہی ہے ان الق عصاک
اذا ہی تلقف ما یافکون

خالد کی شاعری میں رنگِ تغزل بہت نمایاں ہے۔

مجھے بخشا ہے قسامِ ازل نے
نوا سنجی کا سودا شعر کی دھن

حقیقت کے لچکتے تار دے کر
کہا! جا ان سے خوابوں کی قبا بن

خالد کی شاعری پر عربی، فارسی اور ہندی کا اثر نمایاں ہے، بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اردو کے نہیں عربی زبان کے شاعر ہیں اور ایک آدھ مصرعہ محض تفنن طبع کے لئے کہتے ہیں۔

خالد سے اگر اس کی وجہ پوچھئے تو وہ بے تکلف کہتا ہے کہ میری شاعری پر عربی کا اثر اس وجہ سے ہے کہ قرآن اور حدیث ہمارا تہذیبی سرمایہ ہے۔ اسے ہماری زبان میں ضرور شامل ہونا چاہیئے۔ جب تک یہ نہیں کیا جاتے گا ہم خلا میں چکر لگاتے رہیں گے اور مستقبل کی تعمیر نہ کر سکیں گے۔

خالد کو اس بات کا شکوہ ہے کہ ہم مغربی مفکرین کی تحریروں میں سے تو اکثر و بیشتر حوالے دیتے رہتے ہیں لیکن قرآن و حدیث سے استفادہ نہیں کرتے۔ مذہب کو ہم نے صرف عبادت تک محدود کر لیا ہے اور زندگی کے بقیہ شعبوں میں اسے خشک شے سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔

خالد نے مختصر سے عرصے میں ادب کی جو گراں بار خدمت سر انجام دی ہے وہ تو اس بات کی متقاضی ہے کہ اُسے تاریخ ادب میں سنہری حروف سے لکھا جاتے گا لیکن زمانے کی سرد مہری کا کیا شکوہ کیجئے کہ عوام تو ایک طرف ابھی تک خواص بھی اس طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ خدا کرے کہ ادب میں کساد بازاری کا دور جلد ختم ہو جائے۔

ارشد کمال

ایک بیدار مغز شاعر

مصور ہو یا شاعر، افسانہ نگار ہو یا ڈرامہ نویس، سنگتراش ہو یا موسیقار، مورخ ہو یا نقاد، یہ لوگ قوموں کی تاریخ کے اہم ستون تصور کئے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی اپنی قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے اپنے تہذیبی، ثقافتی، مذہبی، روحانی اور اخلاقی ورثے کو منارِ راہ کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے سنگِ میل ثابت ہوں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی قوم سے دانشور طبقہ ختم کیا گیا، یا ان کی فکر، کاوشوں کو پسِ پشت ڈالا گیا، وہ قوم تباہ و برباد ہی نہیں ہوئی بلکہ صفحۂ ہستی سے ہی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ میرے نزدیک قوموں کی سیاسی یا اقتصادی موت طبعی موت نہیں، بلکہ اس کی موت تو دانشور طبقہ کی ناپیدگی ہے، یا دوسرے لفظوں میں اس کی نظریاتی اساس کی موت ہے۔ تاریخ کے ورق الٹیے تو آپ دیکھیں گے کہ جب کوئی قوم روبہ تنزل ہوئی، تو اس کو جھنجوڑ کر بیدار کرنے والے یہی لوگ سرگرم عمل ہوئے۔ برصغیر کی ۱۸۵۷ کے بعد کی تاریخ کا مطالعہ کیجیئے، آپ سرسید، حالی، شاہ ولی اللہ، ظفر علی خان، قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال ایسے لوگ آپ کو منارۂ نور کی طرح جگمگاتے نظر آئیں گے۔

میں نے عبدالعزیز خالد کو بہت زیادہ تو نہیں پڑھا، البتہ مختلف رسائل میں اس کا کلام اور اس کی دو کتابوں کو (فارقلیط، پرواز عقاب) کو پڑھا تو خالد میرے سامنے پرگو، منفرد اور حقیقت پسند شاعر کے روپ میں آیا۔ گو خالد مشکل الفاظ اور نامانوس بندشوں کا استعمال کثرت سے کرتا ہے مگر اس کے ہاں عام فہم اور آسان ترکیب اور محاورات کا استعمال بھی بہت زیادہ ہے۔ تخلیق کار کے لئے وہ لمحہ انتہائی کٹھن ہوتا ہے جب وہ اپنی کسی تخلیق کے لئے الفاظ کی جستجو ہوتی ہے، اور الفاظ جو لغت سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ منفرد شاعر کے ہاں الفاظ موقع محل کے مطابق ابھرتے ہیں اور فنی و معنوی لحاظ سے اپنی جگہ بے حد موزوں ہوتے ہیں۔ شاعر الفاظ کے سہارے ہی آگے بڑھتا ہے۔ یہی بات خالد کے کلام میں بڑی شدت سے محسوس کی ہے، جس سے اس کی تخلیق نے معنوں میں رچ بس کر بلندیوں کو چھوتی ہے۔ غالباً یہ پہلا شاعر ہے جس نے بہت کم مدت میں شہرت کی بلندی کو چھوا ہے، اور اپنے ہم عصروں میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس نے شاعری کے نئے موضوع دیئے ہیں۔ وہ بیدار مغز شاعر ہے۔ اس کے کلام میں شعری شعور، معنویت کا بہاؤ اور فنی جدت طرازی بھی ہے۔

جہاں اس کے اعلیٰ ذہنی شعور کا احساس ہوتا ہے وہاں شعور کی پختگی کا بھرپور احساس بھی۔ وہ کسر نفسی سے کام نہیں لیتا بلکہ جو کہنا چاہتا ہے، برملا کہہ کر اس پر فخر کرتا ہے۔ یہ اس کی انفرادیت ہے کہ بے دھڑک الفاظ کا استعمال بڑی سادگی سے کرتا ہے۔ مشکل بندشیں ہونے کے باوجود اس کے کلام میں تخیل پر شعور کی بالادستی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ شاعری کے بارے میں براؤننگ نے کہا تھا، کیا تم سمجھتے ہو کہ شاعری کبھی پوری طرح سمجھی گئی ہے، یا سمجھی جا سکتی ہے۔ ادب کا ہر قاری اس بات کا جواب نفی میں دینے کا حق رکھتا ہے۔

شاعر کوئی بھی ہو اس کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے اور یہی معاملہ کچھ عبدالعزیز خالد کا بھی ہے۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری میں جو چیز اسکی انفرادی حیثیت کی حامل ہے وہ مشکل پسندی اور بوجھل الفاظ کا کثرت سے استعمال ہے۔ ادب کا عام قاری اسے مشکل گو کہتا ہے تو کوئی اس کی شعور اور زبان کی بیگانگی پر اعتراض ہے۔ حالانکہ خالد اپنے شعور اور زبان کی تشنگی اسلامی نظریہ حیات کے چشمہ سے بجھاتا ہے، یوں بھی "NATURAL" ہونا برائی نہیں۔ رہا ادب کے قاری مسئلہ تو وہ اس حد تک (NATURAL) ہو چکا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کو تسلیم کرنا وہ بدنامی تصور کرتا ہے، اور وہ سارا الزام عبدالعزیز خالد پر یہ کہہ کر ڈال دیتا ہے، کہ وہ خیال اور

زبان کی نامیاتی وحدت کو توڑ رہا ہے اظہارِ واردات کے لئے ثقیل اور غریب الفاظ کا سہارا لے کر شعور کی نعلقی، واقعی، اثر سیل بنتا مشکل تو ہو جاتی ہے لیکن اس طرح ابلاغ اور اظہار کے امکان کو خارج از بحث قرار دے دیا جائے۔ نادرست ہے۔ شعر گوئی کے اس اسلوب میں رجائیت اور وقار موجود ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

میرے نزدیک شاعر وہ ہے جو تمام حیثیتوں کو کسی نفسیاتی بحران میں الجھے بغیر قبول کرے، اور حوادث و واردات کو شاعرانہ اظہار و اسلوب عطا کرے اور لفظوں کے آہنگ قاری کی توجہ اپنی طرف آپ سے آپ کرے۔ الفاظ تخیل کے ساتھ یوں گوندھے کہ ان کی حیثیت ایک بامعنی مقصد کی ہو جائے۔ شاعر پر ذمہ داری اگر عاید ہوتی ہے تو عبدالعزیز خالد کی قادر الکلامی میں کلام نہیں۔

• یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا ہے؟ کہ ہم قرآنی استعارے، تشبیہات اور تلمیحات کو ادب میں استعمال کرنے سے گریز کرتے رہے ہیں۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری کی اساس اسلامی نظریہ حیات پر ہے اور کہیں کہیں تو حقیقت پسندی کا عنصر اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ خالد اس بات کی طرف کوشاں نظر آتے ہیں کہ سچائی ایک سے دوسرے اور تیسرے تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں، وہ فطرت سے وابستگی کا اظہار جگہ جگہ کرتے ہیں۔ ان کی فکر میں خالص اسلامی مزاج اور انداز فکر ہے وہ اپنے عقائد کو فخر کے ساتھ پیش کرنے میں تامل سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کا کلام اہل فکر و نظر کے لئے دعوت فکر و عمل ہے۔ اور صرف اظہار ذات یا اظہار حقیقت ہی عبدالعزیز خالد کا مقصود فن ہے تو یقیناً شاعر یا فن کار کے روپ میں خالد سے یہی توقع کی جا سکتی تھی تو وہ اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی شاعری کوئی انوکھی شاعری نہیں بلکہ اردو شاعری کے دامن کو اس نے وسیع تر اور مختلف زبانوں کے الفاظ سے فن و اسلوب کو نیا نکھار دیا ہے۔ غالباً اقبالؒ کے بعد وہ پہلا شاعر ہے جس کو مختلف زبانوں پر دسترس حاصل ہے وہ گاہے بگاہے ان کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کرتا ہوا شعر کو چار چاند لگاتا ہے۔ اس کے ہر شعر کے پیچھے فن و معنویت کا بحر بیکراں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر محسوس ہوتا ہے۔ وہ خوابوں کے شہر سے دور حقیقت کے اجالوں سے اپنے کلام کے "تارو" بنتا ہے تو اس کے کلام میں تحریکی پہلو بے حد نمایاں ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی فکر سخن ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ انسان بڑے بڑے مسائل مختصر طور پر اشعار میں موثر انداز سے بیان کر سکتا ہے۔

تاریخ قوموں کی تعمیر و ترقی میں بڑا اہم کام انجام دیتی ہے۔ خالد اپنے اسلاف کی روایات کو بڑی نفاست کیساتھ سامنے لاتا ہے۔ کہ ہم میں پلٹ کر دیکھنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ زندگی نہ تو رو رو کر گزارنے اور نہ ہو نقوں کی طرح قہقہے اڑانے کا نام ہے زندگی دشوار راستے پر چلنے اور اسے چمنِ لالہ و گل بنانے اور اپنی شخصیت کی تکمیل کرنے کا نام ہے، شاعر بار بار دعوت فکر دیتا ہے۔ جو افادی نہیں بلکہ تعمیری بھی ہے۔ اکثر شعراء بلند بانگ دعوؤں اور لفظوں کے جادو سے اپنی شہرت کے زینے استوار کرتے ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا اثر دیرپا نہیں ہوتا، ان کی شاعری دلوں پر اثر تو کرتی ہے مگر دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچتی۔

خالد کے ہاں فنی چابکدستی میں [illegible] اعلیٰ شعور کی اپج باعث حیرت ہے، غالب کی تمکنت، سحر بیانی اور کہیں اقبالؒ کا آہنگ اور تراوت ہے۔ اس کا احساس ہر لمحہ بیدار، تخیل مائل بہ پرواز ہے۔ وہ اگر تخلیق کے دوران اصل حقائق سے پہلو تہی کر کے محض خوابوں کی بات کرے، تو وہ ادب برائے ادب کا مجرم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا کلام بصیرت افروز اور اردو شاعری کی اوج کمال ہے اور بیسویں صدی کے ادب میں قابل تعظیم مقام کا حامل ہے۔ ملت اسلامیہ میں عمل و اتحاد کی نئی روح پیدا کی اور نہ صرف مملکت خداداد پاکستان معرض وجود میں آئی بلکہ خطہ ارض کے دوسرے مسلم ممالک نے بھی غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکا اور آزاد ہو گئے۔ گو ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مگر آج کے دور کو خالد کا دور کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یہ آتش نوا شاعر بہت کچھ بن چکا ہے اور ابھی بہت کچھ بنے گا۔ اس کے قلم کو قدرت نے بڑی قدرت بخشی ہے اس کی صلاحیتیں بے پناہ ہیں اور وہ قدرت کی فیاضیوں کا اظہار جگہ جگہ کرتا ہے۔

سعید ٥ چوہدری

خالد کی شاعری کا سرسری جائزہ

عبدالعزیز خالد کی ذات ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موجودہ دور کے علماء و فضلاء، شعراء و ادباء میں سے علم و فضل کے لحاظ سے بہت کم ایسے ہوں گے۔ جن کو خالد صاحب جیسا تبحر حاصل ہو۔ مختلف زبانوں اور متعدد علوم میں مہارت کے سبب ان کا کلام عوام کی علمی سطح سے بہت بلند ہے اور یہی اُنکی امتیازی شان ہے۔

خالد ملک الکلام خالد　　　مشہور انام نام اُس کا

عبدالعزیز خالد بلاشبہ پاکستان میں اسلام کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ہمارے ملی ادب کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ مستقبل کا مؤرخ ان کے رشحاتِ فکر کا جائزہ لئے بغیر اس زمانے کے مسلمانوں کی ذہنی سرگزشت پہ قلم نہیں اٹھا سکے گا۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ اس کے شہسوار ہیں اور جہاں تک بیان کا معاملہ ہے۔ اِن کی سحر طرازی ایک آہنگ اور ایک نئی امنگ سے مالا مال ہونے کے علاوہ لہو ترنگ بھی ہے۔ علامہ اقبال اپنے نوجوانوں سے جس ادب کے خواہاں تھے خالد صاحب اِس قافلۂ ادب کے سرخیل ہیں اور اسلامی اقدارِ حیات کے نقیب بھی!

نیا ذہن لکھتا ہے فرہنگ تازہ　　　یہ اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہے
فضا میں پر افشاں ہے تحریکِ احیاءٔ　　　یہ احیاء تحریکِ مصطفویہ ہے

عبدالعزیز کی شاعری میں سبزہ زاروں کی دلکشی، مہکتی ہوئی وادیوں کا بانکپن، بھرپور کھلیانوں کی ہنسی، ہرے بھرے کھیتوں کی نغمگی، سمندر کی گہرائی اور لالہ و گل کی روئیدگی ہے۔ سانس لیتے ہوئے انسانوں کی جیتی جاگتی دنیا، زمانوں کی داستانیں اور ارمانوں کی روداد ہیں جنہیں فنکار کی نگاہوں نے ناقدانہ انداز میں دیکھا ہے اور شاعرانہ دل سے چاہا، ہمیں عبدالعزیز خالد کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اپنی تمثیلی تمثیلوں اور صنمیاتی ڈراموں کی مدد سے ہمیں اُن تہذیبوں سے روشناس کرایا جن کی راکھ بھی اب وقت کی دہلیز پہ نہیں ملتی ہمیں رفتہ زمانوں کے ان نگارخانوں اور شبستانوں کی جی بھر کہ سیر بھی کرائی جن کے نقش و نگار بھی ماضی کی بے رحم ظلمتوں نے باقی نہیں چھوڑے۔

خالد ایک خوش فکر فلسفی ہے۔ ان کی شاعری کا میدان بہت وسیع ہے۔ وہ صنمیات اور الہامی صحائف کے سایہ میں اس طرح طرح خراماں خراماں گزرتے ہیں کہ خود ان کا جزو معلوم ہوتے ہیں، اِن کے دلآویز استعارے، ان کی دلکش اور فکر انگیز تلمیحات، ان کی اچھوتی تراکیب، اور ان کے وسیع مطالعہ نے ان کے ادبی کارناموں میں حسن اور عظمت بخشی ہے۔ اردو شاعری کی کائنات میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی حیثیت اردو شاعری کے افق پہ ایک آفتاب نو کی سی ہے، جس کی ضیا افشانی، جو آنکھوں کو روشن اور دلوں کو منور کر رہی ہے۔

خوباں شکستہ رنگ خجل ایستادہ اند　　　در محفلے کہ تو بمقابل نشستہ ای

پر شکوہ الفاظ اور دقیق مضامین کی بنا پہ انوری اور خاقانی کو صدیوں سے شعراء کی صفِ اول میں جگہ دی جاتی ہے اور خالد بھی

ان صفات سے متصف ہونے کی وجہ سے اس دور کے خاقانی ہیں ۔

توای کہ مو سخن گستران پیشینی
مباش منکر خالد کہ در زمانۂ تست

خالد صاحب محض شاعری ہی نہیں کر رہے بلکہ اس معاشرے کے گرتے ہوئے سقف و بام کے نیچے ستون بھی تعمیر کر رہے ہیں۔ آپ نے تن تنہا جو کچھ کیا ہے اس کے لئے ایک ادارے کی ضرورت تھی۔ "نارتلیط" اور "منمنا" لکھنے والے خالد کام اور نام دونوں کے خالد ہیں۔ خدا ان کی خالدیت قائم رکھے ۔

وہ دن دور نہیں جب خالد زندگی کی ایک علامت اور ایک مکتب فکر بن جائیں گے اس لئے کہ وہ محض کتابیں نہیں لکھتے، ابدیت کے میثاق پہ اپنا نام تحریر کر رہے ہیں۔ اُن کی شاعری ایک لازوال تحریر ہے جسے وقت کے ہاتھوں کی تخریب کاری بھی لوحِ محفوظ سے کھرچ ڈالنے پہ قادر نہیں ہوگی

طلعت قادری

خالد ایک تجدید پسند شاعر

عبدالعزیز خالد صاحب ایک نظریاتی شاعر ہیں۔ انہوں نے شعری اور تہذیبی اقدار کی روایت میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ زندگی کی پامال ہوتی ہوئی قدروں کو سہارا بھی دیا ہے۔ وہ ایک اچھوتے اسلوب اور منفرد طرزِ فکر کے حامل ہیں۔ انہوں نے جہاں اردو زبان کو لاتعداد نئے الفاظ، تلمیحات اور استعارے دیئے ہیں وہاں اظہارِ خیال کا ایک مثالی انداز بھی دیا ہے۔ عبدالعزیز خالد کے شعر پڑھ کر اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کس طرزِ فکر کے نمائندے ہیں جو کام علامہ اقبال نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل خالد کی قسمت میں لکھی تھی۔ خالد انسانی عظمت کے نقیب ہیں وہ خود شناسی کے اس شعلے کو حیات نو بخش رہے ہیں جس کو دینِ مبین کے داعی نے روشن کیا تھا۔

فضا میں پر افشاں ہے تحریکِ احیاء
یہ احیائے تحریکِ مصطفویہ ہے

خالد کی شاعری ایک تحریک ہے، ایک نصب العین ہے اور اسی طرح عظیم جس طرح ان کا سرچشمہ۔ خالد کی شاعری کا بڑا حصہ اخلاقی اور دیو مالائی ہے وہ مسلمانوں کو خاص طور سے اور دوسرے لوگوں کو عام طور سے عرفانِ ذات کی منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ "دکانِ شیشہ گر" "برگِ خزاں" "ورق ناخواندہ" اور "فارقلیط" میں جو منظوم داستانیں ہیں وہ اخلاقی قدروں کی عظمت اور انحطاط کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ جگہ جگہ شعروں میں قرآن کی آیات اور احادیث نظر آتی ہیں یہ صرف اس لئے کہ خالد کو قرآن اور رسول کی ذات سے عشق ہے جس عشق اور فقر کی تعلیم علامہ اقبال نے دی تھی اس خودی کے راز کو خالد نے پالیا ہے۔

قدیر اور قادر علی کل شیٔ
وہ مالک ہے کرتا ہے جو چاہتا ہے

زمیں پر خدا کا خلیفہ ہے انساں
اسی واسطے رنج میں مبتلا ہے

جو مردانِ دانا ہیں ڈرتے ہیں تجھ سے
کہ دانش حقیقت میں خوفِ خدا ہے

خالد ایک تجدید پسند شاعر ہیں۔ وہ بامقصد شاعری کر رہے ہیں۔ ان کے شعروں میں زندگی ہے۔ فکر و عمل کی دعوت ہے۔ ان کے بیان میں قوت اور الفاظ میں معانی کا بیکراں اظہار ہے، ان کی نظموں میں والہانہ پن ہے، ڈرامائی تاثیر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک ایسا خطیبانہ اور رزمیہ انداز ہے جو ذہن انسانی میں سوئی ہوئی قدروں کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے واقعہ پر آنسو بہاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

تمہیں رحم نہ آیا آلِ نبی پہ
سنا کرتے تھے نیکیوں کی جزا ہے

دکھاؤ گے منہ حشر کے روز کیسے
یقیناً! یہ سبطِ رسولِ خدا ہے

اردو شاعری میں کسی شاعر نے تمثیل نگاری کے وہ پہلو اجاگر نہیں کئے جو خالد کی شاعری کا حصہ ہیں۔ جنابِ خالد کی نظموں میں تمثیل نگاری کے جو پہلو نظر آتے ہیں ان سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اردو شاعری کے دانتے ہیں۔ "فارقلیط" کے پانچویں حصے میں حضرت عمرؓ سے متعلق اشعار خالد کی تمثیل نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ خود رسول مقبولؐ کی شان میں جو شعر کہے ہیں شعری اعتبار سے بہت بلند ہیں۔

خالد کو نبی اکرمؐ کی ذات سے جو والہانہ عشق ہے اس کا اظہار اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب وہ ان کا سراپا بیان کرتے ہیں۔

وہ ترشے ہوئے صندلیں ہاتھ اُس کے
طلائی کڑے میں زبرجد جڑا ہے

کڑے عاج پر پھول نیلم کے گویا
وہ سینہ نہیں شاہکارِ خدا ہے

طلوع سحر کی طرح تیرا رویا — تو بدر الدجے ہے تو شمس الضحے ہے

فکر و عمل خالد کی زندگی ہے۔ شاعری خالد کی روح میں رچی ہے۔ خالد خود بھی علم و عمل کی منزل کے مسافر ہیں اور بنی نوع انسان کو بھی حکمت کی راہ کی طرف آنے کی دعوت دے رہے ہیں کیونکہ اُن کا ایمان ہے کہ انسان حکمت کی تجلی سے اُس وقت تک روشناس نہیں ہوتا جب تک علم و عمل کی منزل کا اسے عرفان حاصل نہیں ہو جاتا۔

ہوں نہ اسرار نہانی منکشف — جب تک استعداد ذہن و دل نہ ہو
شے کوئی ملتی نہیں ہے "تحفتہ" — یا تو بن حق دار یا سائل نہ ہو

خالد اقدار کے ہی شاعر نہیں، آزادیٔ فکر کے بھی مبلغ ہیں جیسا کہ ان کی حالیہ تصنیف "پرواز عقاب" سے ظاہر ہے۔ وہ آزادیٔ فکر کو انسان کا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جس معاشرے میں آزادیٔ فکر کا بنیادی حق بھی انسان کو حاصل نہ ہو وہ کسی بھی طرح مہذب معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ اختلاف رائے بھی درحقیقت تہذیب و تمدن کے ارتقا کی اساس ہے۔

تمدن ہے آزادیٔ فکر و رائے — وہی ہے ریاست جو جمہوریہ ہے
اختلاف رائے کو دیتے ہیں غداری کا نام — جو مرا ابھرے کس طرح فن کس طرح پھولے پھلے

خالد کے شعروں میں جگہ جگہ حسن کی عقیدت مندانہ تعریف ملتی ہے جب وہ کائنات میں حسن کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہیں تو الفاظ نہیں رہتے امیج بن جاتے ہیں۔

خالد کے یہاں محرومی کا شدید احساس بھی ملتا ہے۔ انہیں تنہائی کا احساس ہے اور حالات کے ذہنی طور پر نامساعد ہونے کا قلق بھی ہے۔ خالد کا تصور جہاں نرم و گداز کیفیت پیدا کرتا ہے وہاں کہیں کہیں وحشت ناک بھی ہو جاتا ہے۔

رم جھم برس رہی ہے گھٹا جی نڈھال ہے — اے یار دلنواز! شب برشگال ہے

ملاحظہ فرمائیے برسات کی رم جھم بھی غم و اندوہ کا پیغام بن گئی ہے۔

خالد کے ہاں مذہبی اقدار کے علاوہ رومانوی اور عشقیہ شاعری کے رجحانات بھی ملتے ہیں "دشتِ شام" "فلکِ موج" اور "زنجیر رم آہو" کا بڑا حصہ رومانوی ہے۔ وہ عشقیہ شاعری کے بھی نمائندے ہیں لیکن یہاں بھی خالد کا اپنا اسلوب ہے۔

شام ہو گئی تو میں دروازہ کھلا — چھوڑ کے راہ تکوں گا اُس کی
میرے خوابوں میں ملاقات کا جس — "دشمنِ جاں نے کیا ہے وعدہ"

خالد کی پوری رومان انگیز شاعری میں محرومی اور تنہائی کا شدید احساس بڑا موجود ہے اور اس کا بھرپور اظہار بھی۔

خالد کسی روایتی شاعر سے متاثر نہیں ان کا اپنا اسلوب ہے، اپنا سوچنے کا انداز ہے۔ خالد کے ہاں روایت زبان و ماحول کے رچاؤ کی ہے اور وہ اسی حد تک روایتی ہیں۔

زمیں گویا عروس آسماں ہے — ذرا آپس میں ان کی گفتگو سُن!
زنجیر کی جھنکار ہے آواز جرس ہے — زنداں کے در و بام سے اُٹھتا ہے جو نالہ

خالد کو زبان و بیان پر جو قدرت حاصل ہے۔ اس دور میں اُس کا فقدان ہے اور یہ حقیقت ہے کہ خالد اس دور کے عظیم شاعر ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اس صدی نے دو بڑے تجدید پسند شعراء کو جنم دیا ایک علامہ اقبال اور دوسرے عبدالعزیز خالد ___ تو بیجا نہ ہوگا۔

فارقلیط

احسان دانش

میں ایک عرصہ سے یہ آرزو لئے پھرتا تھا کہ میں حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک پر ایک مبسوط کتاب منظوم لکھوں لیکن فارقلیط دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کام کو جناب عبدالعزیز خالد نے بطریق احسن انجام دے دیا۔

فارقلیط انجیل کا لفظ ہے جو بمعنی احمد رسول کریم کے لئے بطور پیش گوئی آیا ہے۔ یہ تمام کتاب رسول مقبول کی حیات متبرکہ کے مختلف پہلوؤں پر منظوم سرمایہ ہے جو قابل قدر ہے اور اس سے عبدالعزیز کے مشرب اور عقیدے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہرچند کہ مصنف نے ٹیگور کی گیتانجلی کو بھی نظم کا جامہ پہنایا ہے لیکن انسان اور خدا کا ممدوح جدا جدا نظر آتا ہے — یہی فرق ان دونوں کتابوں میں ہے۔

یہ کتاب مصنف نے اپنے والدین کے نام معنون کی ہے جس سے ان کی حقوق شناسی اور فرض کی ادائیگی اجاگر ہوتی ہے اور والدین کی روح کے لئے اس سے بہتر کوئی اور تحفہ بمشکل ہی دستیاب ہو سکتا ہے۔

تعلیقات و شروح کو مصنف نے امواج کے نام سے جزو کتاب کیا ہے جس سے ان کی عربی و انگریزی معلومات پر تیز روشنی پڑتی ہے اگر وہ یہ تعلیقات و حواشی نہ لکھتے تو ممکن ہے کہ بعض کم علم قارئین ان کے بہت سے الفاظ کے معنی اور وجوہ معنی سے محروم رہ جاتے۔

عبدالعزیز خالد صاحب ایک قادر الکلام، زود گو اور صحیح الحقائد انسان ہیں۔ ان کی ہر کتاب میں ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے جو کہ علمی سطح کے لوگوں میں نہیں بلکہ شوقین قسم کے لوگوں پر ایک گومگو کا عالم طاری کر دیتی ہیں اور وہ مصنف کی کھل کر داد نہیں دے سکتے۔ جس کی کتاب مستحق ہوتی ہے۔

جب میں جناب عبدالعزیز خالد سے ملا تو مجھے ان سے مل کر بھی مسرت ہوئی۔ وہ گفتگو کے معاملے میں اپنی کتابوں سے زیادہ معلومات دیتے ہیں اور ان کی گفتگو اسی معیار کی ہوتی ہے جو ایک صحیح العقیدہ مسلمان کی ہونی چاہیئے۔ ان کی گفتگو میں ایک تبلیغ کا پہلو بھی ہوتا ہے جو اپنی آمیزش کی حدوں پر انفرادیت نہیں رکھتا بلکہ موضوع کا جزو معلوم ہوتا ہے اور ہمارے ملک کو ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرہ میں ایسے لوگوں کی بڑی گنجائش ہے اور یہی وہ منصب ہے جو اس دور زبوں کار میں بڑی چھان بین کے بعد کہیں کہیں نظر آتا ہے۔

اس دور میں جبکہ پورے معاشرے پر علمی زوال مسلط ہے اور اس دور حاضر کا انسان اپنے دینی مرکز سے دور ہوتا جا رہا ہے عبدالعزیز کا وجود خدا کی رحمت ہے۔

عبدالعزیز خالد شعرا کے اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتے جو اپنی بے دینی کو طرۂ امتیاز بناتے ہوئے ہے اور قدم قدم پہ شراب و الحاد کے اشعار سے اپنی گمراہی کے پرچم اُبھارتا ہے۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری ان کے علمی تبحر میں ڈوبی ہوئی ہے

وہ ایک سچے مسلمان کی طرح اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی زبان اور دل ہم آہنگ ہیں۔ ان کی یہ ہم آہنگی میرے خیال سے انہیں عوام کی مقبولیت تک تو نہیں آنے دے گی لیکن نہ تو عوام تاریخ لکھتے ہیں اور نہ ان کی مقبولیت کوئی پائیدار انعام دے سکتی ہے۔ جن لوگوں کو جاہل عوام اور خام علم خواص نے بلند مقام بخشے ہیں، وہ ان لوگوں کی نظر میں اچھی اور وقیع نظر سے نہیں دیکھے جاتے جو عوام کی نظر سے اور دوسرے درجے کے خواص کی دسترس سے دور تاریخ سازی میں مصروف رہتے ہیں اور ان کا ایک ایک لفظ نقش کالحجر ہوتا ہے۔

عبدالعزیز خالد اپنی فطری صلاحیتوں کے باعث کثیر التصانیف شاعر ہیں اور ان کی ہر کتاب ان کے علم، مطالعہ اور معلومات کی گواہ ہے۔

رئیس احمد جعفری

اردو شاعروں میں ایسے حضرات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو الفاظ کی صنعت گری سے کام لینے اور جذبات کا طلسم کدہ بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے نزدیک شاعری ہے بھی یہی لیکن ایسے شاعر بہت کم ہیں جن کا کلام فکر آفرین ہو اس لئے کہ ایسے کلام کی تخلیق اس وقت ہو سکتی ہے جب شاعر علوم و فنون میں مہارت رکھتا ہو۔ صاحب علم بھی ہو اور صاحب ادراک بھی۔ صرف مشاہدہ کافی نہیں۔ عمیق مطالعہ بھی ضروری ہے۔

اس طرح کی شاعری کا آغاز اقبال نے کیا اور ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔ اب اقلیم شاعری میں ایک تاجدار ابھرا ہے۔ یہ ہفت زبان شاعر عبدالعزیز خالد ہے۔ عربی، فارسی، لاطینی، یونانی، اردو، انگریزی وغیرہ پہ اسے وہی دستگاہ کامل حاصل ہے جو ایک اہل زبان کو ہو سکتی ہے۔ ان زبانوں سے اس نے پورا علمی استفادہ کیا ہے۔ یہ تاریخ، آثار، اسرائیلیات، صنمیات و روایات پر گہری اور دقیق نظر رکھتا ہے۔ اور سب چیزیں اس طرح اس کی شاعری میں اجاگر ہوتی ہیں جیسے صاف شفاف آسمان پر کہکشاں۔ فارقلیط عبدالعزیز خالد کا نیا شاہکار ہے۔ خالد کی شاعری کا عروج یہی کتاب ہے۔ اس میں آنحضرتؐ کی سیرت اتنی صحت، جامعیت، استناد اور ساتھ ہی ساتھ والہانہ، مجذوبانہ، عارفانہ اور عالمانہ طور پر شاعرانہ شعر میں بیان کر گیا ہے۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ سیرت کا موضوع بے حد نازک ہے۔ یہاں جنید و بایزید بھی دم بخود نظر آتے ہیں لیکن وہ اس پل صراط سے بڑی کامیابی کے ساتھ گذر گیا ہے۔

الفاظ جیسے تراشے ہوئے نگینے، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات میں جودت بھی، جدت بھی، شگفتگی بھی۔ ایک مرتبہ شروع کر لینے کے بعد جب تک کتاب ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ اس کے بعد بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی ——— یہ دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔

مالک رام

اتنی طویل نظم ایک ہی قافیے، ردیف میں قلم بند کر دینا شاعر کی قادر الکلامی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ خالد صاحب بہت وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ نہ صرف خالد صاحب کا مطالعہ وسیع ہے بلکہ ان کا عربی، فارسی زبانوں کا علم اور حافظہ بھی غیر معمولی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خالد صاحب اردو ادب میں ایک نئی آواز ہیں۔ انہوں نے گھسی پٹی لکیروں کو چھوڑ کر اپنی شاہراہ آپ بنائی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ انہوں نے اردو نظم

حکیم محمد سعید دہلوی

دعائے خلیل، بشارت مسیح حضرت خاتم النبیین احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو انجیل مقدس میں "فارقلیط" کہا گیا ہے ؎

نامِ ختمِ رسل انجیل میں ہے فارقلیط

زیر تبصرہ کتاب جناب عبدالعزیز خالد کی ایک ہزار تین سو چوراسی اشعار کی ایک طویل نظم ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل دنیا کے حالات، کتب قدیمہ الہٰیہ میں آپ کے بارے میں بشارتیں اور پیش گوئیاں، آپ کی ولادت باسعادت حضور کی شانِ رحمۃ للعالمین، فیوض و برکات اور تعلیمات رسول اور اس کے دنیا پر اثرات، ان تمام چیزوں کا احاطہ اس نظم طویل میں بہ کمال احتیاط اور پورے دل و جگر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک ہی بحر و قافیہ میں زبان کی شستگی اور کیف آوری، اسلوبِ بیان اور ولولہ انگیزی کی پوری شان کے ساتھ اتنی طویل نظم شاید اردو فارسی اور عربی میں اب تک کسی نے نہیں کہی ہے۔ زیرِ نظر نظم نہ صرف کتب سیرتِ طیبہ میں ایک مقام پیدا کرتی ہے بلکہ اپنی علمی ادبی اور فنی خوبیوں کے لحاظ سے اردو شاعری کے نعتیہ لٹریچر میں ایک بے مثال حقیقت کی مالک ہے۔ اس پر بھی عبدالعزیز خالد (ساتویں کتاب میں) کہتے ہیں ؎

کہاں نعت و نامِ رسولِ تہامی
کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

زبان کی لکنت نے عبدالعزیز خالد کو بولنے سے خوب باز رکھا۔ خیالات بکھرے نہ پریشان ہوئے اور قوتوں کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جس نے عمیق فکر اور قدرتِ سخن عطا کی اور ان کی پاکیٔ طبع نے حضور رسالت مآب کی ذات گرامی سے بڑی گہری عقیدت پیدا کر دی اور اس سب نے ان کو مشاہیر اربابِ شعر و ادب میں لا کھڑا کیا۔

"فارقلیط" کے بعض ناقدین نے عبدالعزیز خالد سے کہا کہ ان کو مشقِ سخن اور کرنی چاہیئے اور ان سے اصلاح بھی لینی چاہیئے۔ اسکے باوجود عبدالعزیز خالد نے اردو زبان میں ایک نیا تجربہ پیش کیا ہے اور اس میں وہ قطعی کامیاب ہیں اور لائق مبارک باد اور سزاوار تحسین ہیں۔

یونس احمر

اردو کے اصنافِ ادب میں شاعری ہی وہ صنف ہے جس کا دامن ہمیشہ اور ہر عہد میں مالا مال رہا۔ ولی سے لے کر اب تک اس زبان میں بیشمار ایسے شعرا پیدا ہوئے ہیں جن کا مقابلہ دنیا کی دیگر زندہ زبانوں کے صفِ اول کے شعرا سے کیا جاسکتا ہے اگرچہ ہمارا شعری ادب بہت قدیم نہیں ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ تھوڑی مدت میں جو گراں بہا اضافہ ہوا ہے وہ اتنا حوصلہ افزا ہے کہ ہم اپنا سر بلند کر سکتے ہیں۔

لیکن آجکل نہ جانے کیوں ہمارے نقادوں کو (بیشتر نقاد) اردو ادب میں جمود نظر آرہا ہے۔ مختلف حلقوں سے اور اکثر باتیں سنائی دے جاتی ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں جمود تو نظر آتا ہے مگر یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ اگر واقعی جمود ہے تو اس کو توڑا کیسے جاسکتا ہے۔ اس کے اسباب و علل کیا ہیں۔ ہمارے ادب میں کون سی خرابیاں گھر گئی ہیں جن کی وجہ سے جمود طاری ہو چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔

کیا جمود کا نعرہ تو اس لئے بلند نہیں کیا جاتا کہ نعرہ بازی ایک فیشن ہے، اگر فیشن نہیں تو پھر کیا بات ہے کہ اردو کی کتابیں ہر صنف کی دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں نئے اور پرانے اور اچھے بڑے رسالے ضخیم سے ضخیم نمبر شائع کر رہے ہیں۔ اچھی تحقیقی تصنیفات پر ہر

ہے جو میرے خیال میں کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ہم اس نعرہ بازی میں یہ جائزہ لینا بھول گئے کہ ہمارے ادب میں آئے دن کیا کیا اضافے ہو رہے ہیں۔ نہ جانے جمود کا یہ گھپ اندھیرا کب دور ہوگا؟

اگر واقعی ہم جمود کے گھپ اندھیرے میں سانس لے رہے ہیں تو عبدالعزیز خالد کی حالیہ تصنیف فارقلیط ہماری بصیرت کیلئے مینارۂ روشنی کا کام دے گی۔

خالد دراصل اردو شعری ادب میں شہاب ثاقب بن کر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس بلندی پر پہنچ گئے جس تک پہنچنے کے لئے سخت ریاضت اور صبر و استقلال کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ وہ ادب میں کسی چور دروازے سے آئے اور نہ ان کی شہرت میں دوست نوازی کو دخل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ شاعروں میں خالد کو سب سے زیادہ ہدفِ تنقید بنایا گیا کسی کو ان کی مشکل پسندی ناگوار گزری تو کسی نے ان کے موضوع کے انتخاب پر بھویں سکیڑیں۔ کسی کو ان کا تسلسل اور سنجیدگی سے کام کرنا اچھا نہ لگا۔ ان کے بعض ہمعصر ناک بھوں چڑھانے لگے کہ "خالد دنیا کے بہترین کلاسیکی ادب سے اردو کا دامن بھر رہا ہے"!

خالد کی اب تک بارہ تصنیفات منظر عام پر آگئی ہیں۔ جن میں غیر ملکی کلاسیکی شعری ادب کے ترجمے بھی ہیں اور ان کی اپنی تخلیقات بھی ان کی ان ساری تصنیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ایک حوصلہ افزا بات یہ نظر آئے گی کہ ان کا شعری وجدان زیر تبصرہ کتاب "فارقلیط" میں اپنی بلندی کو پہنچ گیا ہے۔ یہ تصنیف "سات ابواب" کی بجائے "سات کتاب" پر مشتمل ہے اور ہر کتاب خالد کی وجدانی کیفیات کا ایک مرقع عظیم ہے۔ ۴۳۸ اشعار پر محیط ایک ہی قافیہ ردیف اور ایک ہی بحر میں خالد کی یہ تخلیق اردو کے شعری ادب میں بے مثل اضافہ ہے۔ اس میں اگر ایک طرف جابجا زبان کی جادوگری ہے تو دوسری طرف ان کے تبحر علمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تبحر علمی کی بات نکل پڑی ہے تو مجھے ان کے چند تبصرہ نگاروں کے خیال پر بے ساختہ ہنسی آگئی کہ وہ چونکہ بیک وقت اردو، فارسی، عربی، عبرانی اور فرانسیسی پر قدرت رکھتے ہیں اس لئے ان کی علمیت پر کسی کو کلام نہیں ہوسکتا

افسوس تو یہ ہے کہ وہ بھول گئے کہ خالد کی شاعری میں ہمہ گیری اس لئے نہیں کہ اتنی بہت سی زبانوں پر ان کو قدرت حاصل ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا وہ وجدان ہے جو ان کو شاعری کے بلند ترین کنگرے تک لے جاتا ہے اور پھر ان کے قلم سے گلہائے رنگارنگ بکھیر دیتا ہے۔

"فارقلیط" میں خالد نے کوئی انوکھا فلسفہ بیان نہیں کیا۔ خیالات کی کوئی پیچیدگی بھی نہیں بلکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے [illegible] عشق کا یہ ایسا بحر بے کراں ہے جس میں جذبات و خیالات کی موجیں برابر ساحل شکن ہیں مثلاً کتاب کا پہلا شعر ہے ؎

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے
ہیں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے

اس شعر میں شعریت کے علاوہ وہ نازک تخیل بھی ہے جو قاری کے ذہن کو بلندی پر لے جاتا ہے۔ سانسوں کا مہماں اور یہ "موجِ ہوا" کی ترکیب کا کوئی جواب نہیں۔ اسی طرح

کنارِ شفق میں لڑی موتیوں کی
گلِ نَو دمیدہ لبوں پر فدا ہے

سرِ شاخِ گل غنچۂ ناشگفتہ
جو بادِ چمن سے بھی شرما رہا ہے

نشیلے کنول میں کجرائے ترے
چھپا کر نظر دل تجھے دیکھتا ہے

بسا ہے تو جس من سے من کے نگر میں
رہے من کا اس دن سے پٹ کھل گیا ہے

پپیہے نے پی کی سنائی جو بانی
تو سینے میں دیپک سا روشن ہوا ہے

مذکورہ بالا چند اشعار سے خالد کے وجدان، ان کے فلسفہ اور ان کی ذہنی کیفیات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا وہ اپنے اس شعری مجموعے میں شاعری کی بلندی تک پہنچتے نظر آتے ہیں۔

حسن مثنیٰ ندوی

عبدالعزیز خالد ان شاعروں میں سے ہیں جو فکرِ سخن کو ایک طرح کی ریاضت تصور کرتے ہیں۔ ان کا تذکرہ کسی شاعر کے ضمن میں سنا جاتا ہے نہ وہ کسی ادبی محفل میں نظر آتے ہیں وہ ایک شاعر گوشہ نشین ہیں اور اس گوشے میں شعری مکاشفوں اور مجاہدوں سے گزرتے رہتے ہیں اور کئی سال سے فکر و سخن کر رہے ہیں اور انہوں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ وہ بے حد زود گو ہیں اور اتنے ہی پُرگو بھی۔ انہوں نے عربی اور فارسی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور یونانی و عبرانی ادب کا بھی اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ کبھی یونان کی قدیم شاعرہ سیفو کے نغمے سناتے ہیں اور کبھی ریختے کے نغمے۔ انہوں نے گیتانجلی بھی منظوم کر دی ہے، اور سلومی بھی اور عہد نامہ عتیق کا نغمہ سلیمانؑ "غزل الغزلات" بھی وہ داستانوں، قصوں، ڈراموں اور واقعات کو بڑے اہتمام سے نظم کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں عربی و فارسی کی خوبصورت تشبیہیں اور تلمیحیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اور یونانی، عبرانی اور عربی کے وہ قدیم نام جو عام طور پر اردو والوں کے لئے مانوس نہیں ہیں۔ فراوانی سے نظر آتے ہیں اور بڑے پُراسرار معلوم ہوتے ہیں۔

اب تک ان کے کئی ضخیم مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور انہیں میں سے ایک تازہ مجموعہ فارقلیط کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ برنباس کی انجیل میں حضور اکرمؐ کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئی "فارقلیط" کے نام سے درج ہے اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بشارت دی تھی کہ "میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔" فارقلیط کے معنے "احمد" کے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کا اگر عربی ترجمہ کیا جائے تو "احمد مجتبیٰ" ہوگا۔ یہ کتاب ایک طویل نعتیہ نظم ہے اور سات ابواب میں تقسیم ہے۔ نظم شروع سے آخر تک غزل کے انداز سے قوافی و ردیف کی پابند ہے۔ عبدالعزیز خالد نے یہ نظم بڑے جذبے سے لکھی ہے۔ اردو، فارسی، عربی اور ہندی، ترکیبیں اور بندشیں امڈتی چلی آتی ہیں۔ ایک موج رواں ہے کہ کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی۔ کہیں پوری پوری آیت اور کہیں فقرے اور جملے مصرعوں کی صورت میں ڈھل گئے ہیں۔

عبدالعزیز کچھ مشکل پسند بھی ہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے بھی ان کے مجموعے بوجھل معلوم ہوتے ہیں کہ قدیم اسماء و القاب اور تشبیہات و تلمیحات کی ان کے ہاں بڑی فراوانی ہے۔ تاہم یہ مجموعہ زیادہ رواں ہے۔ عبدالعزیز خالد کی ان کوششوں سے اردو شاعری ایک طرزِ جدید سے آشنا ہو رہی ہے۔ اور ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر خان رشید

اچھی شاعری وہ ہے جس کا کوئی اچھا مقصد ہو اور سب سے عظیم مقصد انسانیت اور اس کی اعلیٰ قدروں کی ترجمانی ہے۔ تاکہ اس کی رہنمائی کر سکے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا کے ہر عظیم شاعر نے یہی کیا ہے۔ اس نے آفاقی اقدار حیات کی جب بھی ترجمانی کی اس کی شاعری بھی آفاقی اور زندۂ جاوید ہو گئی۔ عربی، فارسی اور اردو کا لفظ شاعر خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میرا تعلق شعور سے ہے۔ سنسکرت کا کوی بھی صاحب ادراک اور باشعور کے معنی دیتا ہے۔ اور یونانی اور انگریزی لفظ "پوئٹ" بھی واقف راز اور صاحب شعور کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور غالباً اہل روما کا لفظ "ویٹس" اس کا ماخذ ہے جو شاعر اور نبی دونوں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح شاعر اور شعور لازم و ملزوم ہیں۔ شعور کی ضرورت عام اور حیوانی صداقتوں کے لئے نہیں بلکہ افاقی

جکڑ بندیوں سے انحراف کو تحریک دے اور اس کو انسانیت کی معراج کی طرف گامزن کر دے۔ اس طرح شاعری اگر فطرت اور ماحول کی محض ترجمانی ہو اور ماحول کے ذہن اور روح کی ترجمانی نہ کر سکے۔ تو نہ آرٹ ہے نہ شاعری۔ اس لئے کہ اس طرح زندگی کی رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ اور کون نہیں جانتا کہ معاشرہ کی حقیقی رہنمائی کے لئے انسانیت کی بنیادی اقدار ناگزیر ہیں۔ دنیا کا ہر عظیم شاعر انہی کو اساس بناتا اور جمالیات کو جذبات کا سہارا لے کر انہی کی ترجمانی کرتا ہے۔ مذہب ان اقدار کا سب سے بڑا محافظ اور موثر ذریعہ رہا ہے۔

یہ حقائق ایک طرف تو ادب و شعراء کے لئے لمحۂ فکریہ پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف مجھے یہ کہنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ نے عبدالعزیز خالد کی حالیہ نظم "فارقلیط" پر آدمجی انعام کا اعلان کر کے خالد پر نہیں بلکہ ملک اور قوم پر احسان کیا ہے۔ اور اس دور 'ہاؤن' میں خالد کی بالغ نظری قابلِ صد ستائش ہے۔ جس نے محمد مصطفےٰ صلعم کو (ہماری جانیں ان پر قربان ہوں) اپنی نظم کا موضوع بنایا ان کا موضوع اس مادی دور کی مناسبت سے جبکہ ہم اعلیٰ اقدار خیر کو بھی مادی رشتوں سے مربوط کئے بغیر سمجھنے سے قاصر ہیں۔ رومی و عطار کی طرح "قرآن" نہیں ہے بلکہ وہ "قرآن مجسم" ہے۔ جس کے خلق عظیم کی اطلاع ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ کہہ کر دی کہ اے اخلاق محمدیؐ کے بارے میں پوچھنے والو، کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟۔

خالد کا موضوع سخن وہی "فارقلیط" ہے۔ جو انسانوں میں سب سے بڑا انسان اور شرافت' انسان دوستی اور شفقت کے اعتبار سے مجسم رحمۃ اللعالمین ہے۔ زمین و آسمان جس کی سیرت بخیر بر "وما ارسلنٰک الا رحمۃ اللعالمین" کی گواہی دیتے ہیں مجھے خالد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ کاش ایسی نظم میں بھی لکھ سکتا مگر وہ عقیدت اور دل کہاں سے لاؤں کہ

ع " ایں سعادت بزور بازو نیست

خالد کو میں صرف شاعر نہیں بلکہ "شاعروں کا شاعر" یا ایک تخلیقی شاعر جانتا ہوں۔ اور کیوں؟ شاید میں آپ کو اپنا ہم خیال بنا سکوں اور اس وقت موقع نہیں ملا تب بھی آئندہ اس موضوع کو زیر بحث لاؤں۔ اس وقت تو مجھے مولانا شبلی یاد آ رہے ہیں۔

ایک عرصہ سے خالد کے فن پر لکھنا چاہتا تھا مگر کچھ تو مصروفیات مانع اور کچھ ان کے لکھنے کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ ابھی ان کے ایک مجموعہ کا بھی غائر مطالعہ نہ ہو پایا کہ دوسرا سامنے آجاتا اور مجھے محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی کی بات یاد آئی کہ خالد پر لکھنے کا جی تو بہت چاہتا ہے۔ مگر وہ سمجھنے کا موقع بھی تو دے۔ اور شاید یہی بات مانع رہی کہ اب تک قلم نہ اٹھا سکا۔ عرصہ تک وہ یونانی صنمیات اور ہندو دیومالا کے چکروں میں الجھے رہے۔ پھر اساطیری ادب اور مقدس کتابوں کی ترجمانی میں لگ گئے۔ ہر دیوی دیوتاؤں کا چکر کچھ ایسا چلا کہ اکثر میں متعلقہ کتابیں ہی تلاش کرتا رہ گیا۔ اور "زرداغ دل" "کلاک موج" بن گئی "ورق ناخواندہ" "شرمندہ خواندگی نہ ہو پایا تھا کہ "سلومی" اور "دکان شیشہ گر" سجانے لگے۔ "دمِ رو رفتہ" میں گم ہو جانا چاہا تو برگ خزاں ٹپک پڑی اور کہا جاتا ہے کہ جب تک انسانی شعور بالیدہ نہ تھا۔ مافوق الفطرت اور صنمیات کے چکروں میں الجھا رہا۔ خالد کو دیکھ کر اس بات میں کچھ صداقت محسوس ہونے لگتی ہے۔ شکر ہے دیولوک کی سیر کے بعد اب وہ زمین پر اتر آئے۔ اور ایک انسان کو موضوع سخن بنایا۔ کائنات کے عظیم ترین انسان کو۔ اور حق یہ ہے کہ گویا "فارقلیط" ہی کی تزئین کے لئے وہ ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔ اور سراپا "مازاغ البصر" بن کر۔ اس لئے کہ ان کی تمام منظومات کی تہہ میں بھی ان کے شعور کی وہ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جن کا محور "فارقلیط" ہی تھا۔

حق یہ ہے کہ نعت گوئی جتنی آسان نظر آتی ہے۔ اتنی ہی مشکل ہے اور اس کا موضوع جتنا محدود دکھائی دیتا ہے۔ اتنا ہی وسیع ہے۔ خالد کا کمال یہی ہے کہ اس نے نعتیہ شاعری میں ایک نئے انداز کی بنا ڈالی ہے۔ اور موضوع کی وسعت کی طرف بڑی کامیابی سے

اور اعتراف عظمت کا احساس بیدار کیا ہے۔ رسول اقدس کا اس محبت اور والہانہ بیخودی کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ قاری جھوم اٹھتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے "فارقلیط" بلاشبہ خالد کا ایک شاہکار اور ایک عظیم اور تخلیقی نظم ہے جو ایک قدیم سخن کی نئی بناو ڈالتی ہے۔ جس پر آئندہ نسلیں بآسانی عظمت انسانی کے منارے تعمیر سکیں گی۔ اور پاکستان رائٹرز گلڈ کی ژرف نگاہی بھی قابل داد ہے جس نے "فارقلیط" کو انعام دے کر پاکستانی قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ اس لئے کہ یہ نظم ہماری ثقافت اور تہذیب کی صحیح معنوں میں ترجمان ہے۔ جسے دوسری قوموں کے سامنے پیش کرتے وقت ہم کبھی بھی شرمساری نہ محسوس کریں گے۔

حضور سے متعلق جس قدر ابوالی اور موضوعاتی انداز میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ باعتبار کمیت اور کیفیت قرآنی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کے مماثل ہیں۔ قرآن سے تفسیر کے علاوہ جس قدر علوم پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی تعداد ایک سو بیس کے قریب ہے۔ ان سب کی نوعیت اساساً و معناً نظام علم کی سی ہے۔ حضور پر لکھے جانے والے سارے موضوعات کی حیثیت بھی علم کی ہے اور ان کی تعداد بھی بلاشبہ ایک سو بیس سے متجاوز ہے۔ علمی جہت میں یہ مماثلت اس بات کی شہادت ہے کہ حضور کی ذات میں قرآن اور قرآن میں حضور ضم ہیں۔ قرآن اور محمد رسول اللہ کا یہ انضمام پہلو توحید کا انضمام پہلو ہے۔ یہ انضمام پہلو نہایت اہم ہے اگر حضور کی سیرت اور زندگی کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ پہلو نظر انداز ہو جائے تو ہم کماحقہ نہ تو قرآن کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا امکان ہے کہ حضور رسالت مآب کی ذات گرامی کو سمجھا جائے۔ یہ انضمام مسئلہ قرآن کا اس قدر اہم حصہ ہے کہ اس کو بار بار مختلف نہج اور مختلف سیاق میں معرض بحث میں لایا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ فارقلیط کے لائق مصنف نے حضور رسالت مآب کی نعت کو ایک خاص نہج میں پیش کیا ہے۔ اس پیش کش سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ جس طرح سیرت پاک کے مختلف عناوین اور موضوعات نظام علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح نعت بھی ایک نظام علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ نعت کے وہ عناوین جن کی بناو پر نعت علم اور نظام علم کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ ان میں ایک اسمائے رسول تہامی ہے۔ حضور کے بھی خدا عزوشان کی طرح ننانوے نام ہیں۔ یہ تمام نام اسمائے الٰہی کی طرح توحید میں مدغم ہیں۔ حضور کا ہر نام آپ کی کسی نہ کسی صفت کا حامل ہی نہیں بلکہ ان کی دوگانہ علتیں ہیں ایک تو ان کا انسلاک اسماء صفات الٰہی کے دوسرے ان کا توالی ربط قرآن سے، اول الذکر کا تعلق توحید کی اُس شق سے ہے جس کو ہم صعودی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کا تعلق اس زمرے سے ہے جس کو ہم افقی کہہ سکتے ہیں۔

حضور کے ناموں کی دو اور علتیں بھی ہیں ایک تو تاریخی دوسری ان ناموں کی انفرادی اور اجتماعی پیش گوئیاں، نام کی مناسبت سے ان پیش گوئیوں کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو تاریخی اور دوسرے استقبالی یعنی مستقبل کے متعلق بشارتیں اور ایمائی اشارے، اس کا ثبوت فارقلیط ہے۔ فارقلیط انجیل میں حضور رسالت مآب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ یونانی نام ہے اس کے معنی احمد کے ہیں۔ احمد، حمد کی ایک خاص صورت ہے۔ انجیل میں حضور کے تمام ناموں کے منجملہ احمد کیطرف اشارہ اس بات کی طرف دلالت کرتا ہے کہ قسام ازل نے آپ کو عالم کون و فساد کے وجود میں لانے سے پہلے ہی لائق ثنا و صفت قرار دیا تھا۔ آپ لائق ثنا و صفت اس اعتبار سے ہیں۔ کہ خدا کی وحدانیت کی تکمیل اور اس کا کلی اظہار آپ کی ذات سے ہوا۔ چونکہ آدم سے لے کر آپ کی بعثت تک جتنے نبی آئے ہیں وہ سب کے سب توحید کے اظہار پر مکلف تھے۔ ان کے اظہار کا نقطۂ کمال حضور رسالت مآب کی ذات والا صفات ہے۔ اس لئے انبیاء کا اظہار توحید اور اس کی نبوت تکمیل اسی وقت ہوئی جب کہ یہ محمد رسول اللہ کو تسلیم کر چکے۔

جہاں تک حضور کی احمدیت کے اظہار کا تعلق ہے۔ یہ بات خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہیئے کہ منجملہ تمام انبیاء

کے جو آپ کے خاتم النبیین اور سید المرسلین ہونے کے قائل تھے۔ احمدیت کا منتہائے کمال اور اس کے اظہار کا نکتہ صحائف و انبیائے کرام ہیں جو حضورؐ سے عین قبل آئے۔ چنانچہ حضور کے اوصاف کا منتہائے کمال آپ کی صفات احمد و محمدؐ ہیں۔ اس لئے انہیں کے خصوصی ذکر کے ساتھ حضورؐ کی آمد کی زبور و توریت و انجیل میں بشارت دی گئی ہے۔

عبدالعزیز خالد صاحب نے نعت رسول میں جس جدت اور اپج سے کام لیا ہے۔ اس میں متذکرہ تاریخی عوامل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ حضورؐ کی عظمت، ختم نبوت، رحمۃ اللعالمین ہونے کے متضمنات اور واجبات کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ان تاریخی متضمنات اور عوامل کا سمجھنا ضروری ہے۔ غالباً اس اہم نکتے کی طرف جو فرائض توصیف کی کنہ اولین میں قابل مصنف نے سب سے پہلے توجہ مبذول کرائی ہے۔ تاریخی عوامل میں صحیح طور پر حضور کے مقام اور منصب رسالت کو متعین کرنے کے لئے یقیناً تقابلی ادیان میں صحف سابقہ بالخصوص زبور و تورات اور انجیل کے بالاستیعاب اور تدقیقی انداز میں مطالعہ ضرور ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ تقابل ادیان میں دین اسلام کا صحیح موقف اس پر موقوف و منحصر ہے کہ حضور کے منصب و مقام کو متعین کر لیا جائے۔ تعینات کے اہم متضمنات ہیں جیسا کہ زبور و توریت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حضورؐ کی وہ صفت کلی ہے جس کی اساس پر وہ احمد بھی ہیں اور محمدؐ بھی۔ بلاشبہ دوسرے انبیاء نے توحید کی تعلیم دی ہے۔ اور توحید ہی کی اساس پر انہوں نے اپنی اپنی امتوں کی صورت گری کی ہے لیکن اس تمام مساعی کے باوجود وہ احمدیت اور محمدیت کے مقام پر فائز و سرفراز نہ تھے۔ یہ صفات توحید کا انتہائے کمال ہیں۔ توحید کے صحیح متضمنات اور ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے زبور سے انجیل تک کے حامل انبیاء بالخصوص اور ان سے پیشتر کے تمام انبیاء علی العموم حضور کی احمدیت اور محمدیت کے ماننے اور حضور کو سید المرسلین اور منتہئ توحید تسلیم کرنے پر مکلف و مجبور رہیں۔ حضور کی ذات و صفات میں احمد و محمدؐ کے اوصاف جمیلہ کی بناء پر حضور خاتم النبیینؐ اور رحمۃ اللعالمین قرار دیئے گئے۔ احمدیت اور محمدیت کے فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے امت محمدی تاقیامت مکلف اور پابند کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت محمدی کو امت وسطیٰ قرار دیا گیا ہے۔ امت محمدی کے لئے حضور کی ذات نمونہ بھی ہے اور شاہد کلی بھی۔ اسی طرح تمام ادیان اور اقوام کے بالمقابل امت محمدی شاہد و عادل بنی رہے گی۔

مختصر کہ توضیح کی روشنی میں اگر اس شعر کو تحت اللفظ بھی پڑھا جائے تو حضورؐ کی عظمت، تاریخ میں آپ کا مقام، کائنات کی تخلیق کا منشاء اور زندگی کی غایت انعامات اور ان سب کے بالمقابل اسلام اور اسلامی کلچر کے سارے متضمنات و واجبات سمجھ میں آسکتے ہیں۔

توبیت الغزل ہے خدائی غزل کا   تو مضمون کونین کا مدعا ہے   (صفحہ ۶۰)

کلچر کی اساس، کلچر کی بقا و استحکام اور کلچر کی وسعت و ترقی تین اہم عوامل کی شیرازہ بندی، توافق اور قوام کلی پر موقوف ہے۔ نظام تعلیم، نظام اشخاص اور نظام ترسیل یہ تینوں عوامل ایک دوسرے سے وابستہ اور ممزوج ہیں اور انہیں تین کے اشتراک کا نام "وجودی علتیں" ہے۔ اسلام اور اسلامی معاشرت اور ثقافت اور روحانیت کے ان واجبات کو فارقلیط کے مصنف نے بااحسن الوجوہ سمجھا اور سمجھ کر اپنی کتاب کی شیرازہ بندی کی ہے۔ وجودی علتوں کی ترتیب میں نہایت ہی موزونیت اور منطقی مضمرات کو ملحوظ رکھ کر کچھ تبدیلی کی ہے۔ بہ اعتبار ترتیب نظام معنی، نظام اشخاص اور نظام ترسیل کے مقامات متعین ہیں نظام معنے اور نظام ترسیل کو چھوڑ کر فارقلیط کے مصنف نے اولاً نظام اشخاص یعنے حضور رسالت مآب کو لیا ہے۔ نظام معنی یعنے توحید اور نظام ترسیل یعنی قرآن حضور کی ذات میں ممزوج و مدغم ہیں۔ اس لئے حضور کا بالاستیعاب اور ابوابی انداز میں سمجھنا ضروری ہے۔ قابل مصنف نے کتاب اول و دوم کو اسی موضوع کی توضیح و تشریح اور تجزیاتی تحلیل کے لئے وقف کر دیا ہے۔ تحلیل و توضیح کے واجبات اگر

تو اسی طرح کہ منطق کے معقولاتی منہاج کو ملحوظ رکھا جائے ۔ ذات وصفات جو نعت کا جزو اساسی ہیں اپنی معقولاتی اور ابوابی ترکیب میں اس کے متقاضی ہیں کہ اسلامی کلچر اور اسلامی دینی اور روحانی نظام کی شیرازہ بندی میں ان کی جو اہمیت ہے اس کو بخوبی واضح کر دیا جائے ۔ انہیں کی وضاحت سے اسوۂ رسول اور قرآن کے اس اٹل ضابطے کی غایت اور کنہ اولیں سمجھ میں آسکتی ہے کہ ملت اسلامیہ بغیر اتباع رسول نہ تو باعزت انداز میں زندہ رہ سکتی اور نہ ہی امت وسطیٰ کی حیثیت سے اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہوسکتی ہے، جن کی وضاحت سورہ بقرہ اور آلِ عمران میں کی گئی ہے ۔

جس طرح اسمائے الٰہی اسلامی معاشرتی ثقافتی اور روحانی نظام کے لئے نظام معنی و قدور کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اسی طرح اسمائے مصطفوی کا درجہ ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ اسمائے الٰہی کی حیثیت محکمات کی ہے اور اسمائے محمدی کی متشابہات کی اس مماثلت سے حضور حمید، احمد، محماد، محمود، حامود و حمدہ بنے ہیں ۔

ممدوح و کریم و حمید و محمدؐ، وہ سرمنزلِ جادۂ اصطفا ہے، محماد و محمود و حامود و حمدہ وہ الہام و اخلاق کا تکملہ ہے (ص ۶۲)

محمد رسول اللہ کی بنیادی اور وجودی حیثیت کی وضاحت کے بعد قابل مصنف نے نظریہ توحید پر توجہ مبذول کی ہے ۔ کائنات کا مدعا کیا ہے انسان کیوں پیدا کیا گیا ہے، عبد و معبود میں کیا رشتہ ہے ۔ کائنات اور انسان میں توالی ربط کیا ہے ۔ یہ اور اسی قبیل کے سوالات کے تجزیے کے بعد مصنف نے ان کا جواب وہی دیا ہے جس کی طرف قرآن نے بار بار انسانی توجہ مختلف سورتوں میں مبذول کرائی ہے ؎

ہر اک شے جسے میں نے پیدا کیا ہے
مجھے سجدہ کرتی ہے طوعاً و کرہاً

خدا کی خدائی اور منشائے تخلیق کے اہم سوالات کی تنقیح کے سلسلے میں اضطراراً اضداد کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اسی کے نہ سمجھنے کی بناء پر ہندومت، بدھ مت وغیرہم کے علاوہ خود مبعوثہ مذاہب بالخصوص یہودیت اور عیسائیت میں بھی جو تناقضات اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کی لم و حقیقت کو واضح کیا جائے ۔ اجتماع نقیضین کا نام نہیں، اضداد میں توافق کی صورت اس پر منحصر ہے کہ خود اضداد کے ظاہر و باطن ان کے مرئی بغیر مرئی حدود و متضمنات علل و معنی، عموق و سطوح کو قرار واقعی سمجھا جائے ۔ یہودیت اور عیسائیت کے علاوہ ان کے ماقبل کے مذاہب یعنی ہندومت اور بدھ مت ظواہر کے دلدل اور فریب میں پھنس گئے ۔ اسی کید نفس کا نتیجہ تھا کہ وہ ظواہر حیات اور مرئیات کے منکر ہو کر ایک اور تناقض کے دلدل میں پھنس گئے ۔ معنی کا وجود ظاہر کے بغیر ممکن نہیں ۔ دین دنیا کے تابع ہے ۔ غیر حسیات یا ماورائے حسیات کی کنہ اولین اور اساسی علت خود حسیات ہیں ۔ مادہ اور غیر مادہ، جسم اور روح دین و دنیا کے توالی ربط کو نہ سمجھنے کا آسان طریقہ یہ تھا کہ حسیات اور مرئیات کی تردید کر دی جائے ۔ بنا بریں ماورائے حسیات اور ماورائے دنیا کو حقیقی مان لیا گیا ۔ اس طریق عمل سے مسئلہ سلجھا نہیں بلکہ الجھ کر رہ گیا ۔ نتیجتاً یاس، المناکی شکست خوردگی، مردم گریزی اور ترک دنیا سے وہ ماحول اور معاشرتی نظام وجود میں آگیا جس نے انسان کو ہر آن مبتلائے آزار رکھا اضداد کی لم ان کے باطن میں تلاش کی جانی چاہیئے ۔ ظاہری تشدد کے اندر جو معنوی وحدت ہے اس کا صحیح علم دین و دنیا جسم و روح، مادہ اور غیر مادہ کے اشتراک کلی ہی سے ہوسکتا ہے ۔ اس مسئلے کو اس تقویمی، ترکیبی اور انضمامی انداز میں حل کرنے سے جو جواب شافی دیا نی ملتا ہے، اس کی صراحت خالد نے تیسری کتاب کے ان اشعار میں کی ہے جو صفحہ ۱۲۰ سے شروع ہوتے ہیں ۔

ہے اضداد سے رونقِ بزمِ عالم
بہار و خزاں ہے نمو زوشتا ہے
تنوع پہ قائم ہے یہ کارخانہ
ہر اک شے کا منہاج و مسلک جدا ہے

ثقافتی اور معاشرتی نظاموں کے وجود میں لانے والے عوامل اور موثرات کی وضاحت کی روشنی میں اسلام اور اسلامی ثقافتی و معاشرتی قوانین کا جائزہ بہ اعتبار ترتیب لیتے ہوئے خالد صاحب نے قرآن کی اہمیت اور اس کی اساس پر توحید

اور محمد رسول اللہ کو سمجھنے کی ملت مسلمہ کو دعوت عام دی ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۲۴ تا ۱۲۵) اسلامی ثقافتی نظام کو وجود میں لانے والے باقی رکھنے والے اور حرکت و ترقی دینے والے عوامل کی کاملاً توضیح کے بعد قابل مصنف نے "اسلام کی طرف تجزیاتی انداز میں توجہ مبذول کرتے ہوئے" اسلام کی سپرٹ، اس کے مزاج اور ورعیات کی خوب توضیح کی ہے۔

نہ رہبانیت ہے نہ عزل و تبتّل — سلام و سکوں ہے قبول و رضا ہے
ہو کیونکر نہ غالب یہ سب مذہبوں پر — کہ یہ سر بسر قوت نامیہ ہے

اسلام کی تاریخ میں اسلام کی صحیح ترجمانی اور قرآنی بشارت کے متذکرہ شعر بالخصوص "قوت نامیہ" سے زیادہ بہتر تفسیر میری نظر سے نہیں گذری۔ ایک مسلمان مفکر اپنے فکر، مدرکات، استنتاجات اور بصیرت میں اگر قرآن سے استناد پر مجبور ہے تو پھر خالد صاحب دوگانہ انداز میں قابل صد ستائش ہیں۔ اولاً یہ کہ انہوں نے شخصیت کی تعمیر کی نظام اخلاق، مزاج عقلی اجتماعی توارثات اور نظام معنی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنی فکر کی تعمیر و شیرازہ بندی میں اسلام کے سوتوں سے استفادہ کیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تہذیب کے مسائل کے سلجھانے اور قرار واقعی مسلمانوں کی نہضت جدیدہ کے لئے قرآن ہی موضوع و سند بنایا ہے۔

سید قاسم محمود

عبدالعزیز خالد کی شاعری کا اپنا رنگ ہے اور یہ رنگ اتنا منفرد ہے کہ لاکھوں اشعار کے ہجوم میں بھی خالد کا شعر پہچانا جاتا ہے۔ انہوں نے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کی شاعری نے "فارقلیط" سے ہی ایک ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ جس میں کوئی بھی ان کا حریف نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

سجاد رضوی

عبدالعزیز خالد ہمارے جانے پہچانے شاعر ہیں اور وہ لوگ بھی جو ان کے موضوعات یا ان کے اسلوب کو پسند نہیں کرتے، ان کی قادر الکلامی کا لوہا ضرور مانتے ہیں ——— خالد کے جو موضوعات بار بار قاری کے سامنے آتے ہیں ان میں دین اور دینی واردات کا بہت اہم مقام ہے ——— خالد نے نعت گوئی کی عام روش سے ہٹ کر ایک نہایت وسیع کینوس اختیار کیا ہے۔ مجھے کوئی ایسی مثال یاد نہیں پڑتی۔ جس میں اتنے بڑے پیمانے پر مدح رسول کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

ذوالفقار تابش

فارقلیط عبدالعزیز خالد کا زندۂ جاوید شعری اور تخلیقی کارنامہ ہے جو اردو نعتیہ شاعری میں ان کے نام کو ہمیشہ تابندہ رکھے گا۔ یہ طویل نظم جو ہماری ادبی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اپنے اسلوب، ہیئت، لہجے اور سبھاؤ کے اعتبار سے بھی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی ——— خالد کی شاعری کی یہ وہ کتاب ہے جس نے ان کے قادر الکلام نعت گو اور خلاق شاعر ہونے کا فیصلہ صادر کیا۔

محمود مروش

——— واقعات کی تفصیل میں جائے بغیر صرف اشارات و کنایات میں ایک عظیم انقلاب، ایک عظیم

انقلابی اور اس کے عظیم ساتھیوں کا ذکر تیرہ سو اشعار میں نظم کر دینا، پھر اس عظیم شخصیت کے پیغام کو اس طرح پیش کر دینا کہ پورے مذہب کی رُوح اس میں سمٹ آئے خالد کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ جس پر ان کو مبارکباد نہ دینا منافقت اور جس کی اہمیت سے انکار کفر ہے۔

نعت گوئی کی روایت بہت پرانی ہے مگر اردو زبان میں نعت گوئی میں کماحقہٗ کام نہیں ہوا۔ جامی، محسن کاکوروی، امیر مینائی، ظفر علی خان اور بعض دوسرے بزرگوں نے بعض بہت اچھی نعتیں کہی ہیں مگر اس فن کو مسلسل آگے بڑھانے کے لیے کوئی نمایاں کوشش نہیں نظر آتی۔ عبدالعزیز خالد نے 'فارقلیط' اور 'منحمنا' کے ذریعہ سے جہاں نعت گوئی میں ایک وسیع خلا کو پُر کیا' وہاں نعت کو عقیدت کے اظہار سے آگے بڑھا کر بحیثیت ایک صنف کے بھی اس کی آبیاری کی ہے۔ چنانچہ ان مجموعوں میں جہاں مصنف کے حضورؐ سے عقیدت کے جذبۂ بے کراں کی نشان دہی ہوتی ہے' وہاں شاعرانہ محاسن کی کثرت بھی نظر آتی ہے ——

زیرِ نظر تصنیف 'فارقلیط' ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہی ہوئی ایک طویل نظم ہے۔ 'فارقلیط' حضورؐ کا نام ہے جو انجیلِ مقدس سے لیا گیا ہے نامِ ختم الرسل انجیل میں ہے فارقلیط

انجیل مقدس کے اس حوالے کا ذکر کتاب کے آغاز میں کر دیا گیا ہے تاکہ قاری شروع کرنے سے قبل اس لفظ کے معانی سے آشنا ہو جائے جو بظاہر اجنبی ہے۔ 'فارقلیط' روایتی انداز میں کہی ہوئی نعت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی شاعرانہ کاوش ہے جس میں فکر کی گہرائی، اظہار کی ندرت، فن پر گہری گرفت اور وسیع مطالعہ کے شواہد بھی ہیں اور شاعر کے شدید ترین جذبۂ عقیدت کی تصویریں بھی ——

خالد کی شاعری کے بارے میں ایک بات عام ہو گئی ہے کہ وہ مشکل گو شاعر ہیں مگر غالباً انہیں مشکل گو کہنے والے اپنے تساہل سے دامن کش ہونا چاہتے ہیں، اور تجسس اور تحقیق کی ذمہ داری اپنانے سے گریز کر جاتے ہیں۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ و تراکیب بے شک بہتات سے بھی آئی ہیں مگر اکثر و بیشتر مقامات پر مشکل الفاظ و تراکیب نے ایسا حسن پیدا کیا ہے جو شاید بالکل سیدھے سادے اور سپاٹ الفاظ سے پیدا نہ ہو سکتا مثلاً 'فارقلیط' کے یہ اشعار ؎

محماد و محمود و حامود و حمدہ وہ الہام و اخلاق کا تکملہ ہے
لگاتی ہے عیارہ گردوں میں ٹھگی چترنی کا چیرتر فریب و دغا ہے

اسی تصنیف میں اسی انداز کے بے شمار اشعار بھی ملیں گے جن میں سادگی ہی نے حسن پیدا کیا ہے ؎

یہ دنیا ہے گویا درختوں کا سایہ سہر کر جہاں راہرو چل پڑا ہے
تم اس کا لباس اور وہ ہے تمہارا حقوق و فرائض کا یہ رابطہ ہے

'فارقلیط' ایک ہی بحر میں اور ایک ہی زمین میں کہی ہوئی طویل نظم ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا اور ان کی سیرت کے علاوہ تاریخ اسلام کے بے شمار حالات و واقعات کی طرف اشارے بھی ہیں، جو تمام کے تمام مستند ماخذات کی بناء پر دیئے گئے ہیں۔ نظم طویل ہونے کے باوجود ایسی روانی اور تسلسل کے ساتھ چلتی ہے کہ قاری یقیناً اس کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جائے گا، بشرطیکہ اسے حضور صلعم سے گہری عقیدت کے علاوہ زبان و بیان اور فن شعر سے بھی دلچسپی ہو اور وہ اس مخصوص ذوقِ لطیف کا مالک ہو جو شعر فہمی کے لیے ضروری ہے۔ اس بہاؤ میں قاری مخصوص نوع کا کیف و سرور بھی محسوس کرے گا جس سے بلاشبہ اس کے جذبۂ عقیدت کو بھی تسکین ملے گی اور شعری

ذوق کی پیاس بھی بجھ جائے گی۔

'فارقلیط' سے کچھ اشعار دیے جاتے ہیں جو شاعر کی بے پناہ عقیدت کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور اس کی شاعرانہ عظمت کی منہ بولتی تصویر بھی پیش کرتے ہیں ؎

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے ۔۔۔ میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے

قلم بند ہو کلک و خامہ سے کیسے ۔۔۔ بیان تیرے حسنِ گلو سوز کا ہے

تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں ۔۔۔ تو صلِّ علیٰ، عینِ خلقِ خدا ہے

جو خاکِ مزارِ مبارک کو سونگھے ۔۔۔ وہ پھر عطر و عنبر کہاں سونگھتا ہے

'فارقلیط' میں تشبیہات کا انتخاب اور ان کا استعمال بھی لائقِ توجہ ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے ــــــ یہ تشبیہیں مصنف کے حسنِ انتخاب اور مہارتِ استعمال کے ساتھ عقیدت کے بے پایاں جذبے کی نشاندہی بھی کرتی ہیں ــــــ

چمکتی ہے بجلی سی ابرِ سیہ میں ۔۔۔ ترا چہرہ زلفوں میں لَو دے رہا ہے

یہ دنیا ہے گویا درختوں کا سایہ ۔۔۔ ٹھہر کر جہاں راہرو چل پڑا ہے

ٹپکتی ہیں شبنم کی مانند باتیں ۔۔۔ ادب منہ سے مینہ کی طرح رس رہا ہے

خالد کی شاعری میں اردو کے ساتھ عربی و فارسی ہی کا حسین امتزاج نہیں ملتا بلکہ جہاں انہوں نے ہندی الفاظ و تراکیب کی آمیزش کی ہے وہ بھی ظاہری و معنوی حسن سے خالی نہیں۔ فارقلیط میں بھی ہندی الفاظ کے استعمال کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً:

میں شبدوں کی پیاسی میں چرنوں کی داسی ۔۔۔ تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے

میں جوگن بروگن میں کملی کمینی ۔۔۔ تو سرتاج میرا، مرا دیوتا ہے

میں ساجن کی بندی ہوں جنگی کہ مندی ۔۔۔ اسی کی مجھے چاہ ہے لالسا ہے

جگن ناتھ تجھ بن بھلا کون میرا ۔۔۔ ابھاگن کو ہر کوئی دھتکارتا ہے

نعت میں سراپا نگاری بھی ایک روایت ہے مگر اسے کم از کم اردو میں اتنی کامیابی سے خالد سے پہلے کبھی نہیں نبھا گیا۔ بے شمار مثالوں میں سے چند ایک ملاحظہ کیجیے ــــــ

سپیدی ہے چہرے کی مائل بہ سُرخی ۔۔۔ بدل لعل و مرمر میں گویا ڈھلا ہے

نہیں نرم تر تیرے ہاتھوں سے ریشم ۔۔۔ انس کہہ رہا ہے جو لمس آشنا ہے

نشیلے کنول نین کجرائے تیرے ۔۔۔ چھپا کر نظر دل تجھے دیکھتا ہے

فارقلیط کے مصنف کے عشقِ رسول کا یہ ۔۔۔ سلسل ۱۳۸۱ اشعار کہہ چکنے کے بعد بھی اس کا احساس یہ ہے کہ ؎

کہاں نعت و نامِ رسولِ تہامی ۔۔۔ کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

گویا جی بھر کے شانِ رسولِ عربی کے بیان کے باوجود اس کا جی نہیں بھرتا اور وہ اپنی معذوری کا اعتراف کر کے نظم کو ختم کر دیتا ہے۔

'فارقلیط' بلاشبہ اس عہد کی ایک اہم شعری دستاویز ہے اور عبدالعزیز خالد کی شاعری کو سمجھنے اور بطور شاعر کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قبل 'فارقلیط' کا مطالعہ ناگزیر ہے جو جہاں شاعری کے جملہ محاسن کا مظہر ہے، وہاں ان تمام اعتراضات کا ساکت جواب بھی ہے جو خالد کی شاعری پر کیے جاتے ہیں ⁂

ڈاکٹر خان رشید

عبدالعزیز خالد کا مجموعہ "برگِ خزاں" جو ٹائپ کے ۱۹۴ خوبصورت صفحات پر مشتمل ہے، اور طباعت اور اشاعت کا ایک دیدہ زیب شاہکار ہے۔ متانت، سنجیدگی، وقار اور وسعتِ مطالعہ عبدالعزیز خالد کی زندگی اور یہی ان کی شاعری۔ اردو شاعری کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی رہی ہے کہ شعراء بالعموم مطالعہ پر توجہ نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اور اقبال خال خال ہی نظر آتے ہیں —— ہمارے شعراء اگر اپنے اور دوسرے ممالک کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ بھی کرتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ غالب و اقبال بھی قصہ ماضی بن کر رہ جائیں۔ عبدالعزیز خالد نے مختلف زبانوں کے کلاسیکی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا ہے اور یہ ایک ایسی خدمت ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، وہ ہر ممکن کوشش سے صلہ اور ستائش سے بے پروا ہو کر الفاظ، تراکیب، تہذیبی اور ثقافتی روایات کو زندہ کر رہے ہیں تاکہ مستقبل کی فکری اور تہذیبی زندگی فن اور فن کاری کی معراج حاصل کر سکیں۔

ان کی شاعری تخلیقی ہے وہ شاعروں کے شاعر ہیں۔ "زرداغِ دل" "ماتم شہر آرزو"، غزل الغزلات اور چار دیگر مجموعوں کے بعد "برگِ خزاں" بھی ایک چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے ان قافلوں کی داستان یاد ہے جو اپنے عروج کے دور میں دندناتے ہوئے راہِ کمال سے گزرے اور پھر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گئے۔

اس کتاب میں تین طویل نظمیں شامل ہیں۔ "قابیل"، "فلک ناز"، اور "آشور بنی پال"، جن سے قدیم تہذیبوں کے بے شمار گوشے سامنے آتے ہیں۔ شروع میں قرآن پاک اور توریت کے اقتباسات میں پھر منظومات کا آغاز ہوتا ہے۔ اشعار میں روانی کے باوجود متانت اور وقار نمایاں ہے۔ صوت و آہنگ کے خصوصی شعور سے کام لے کر عبدالعزیز خالد نے واقعات اور مواقع کی مناسبت سے فضا اور تاثر قائم کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ مکالموں میں ندرت ہے ڈرامائی کیفیات اور حاکات نگاری کے اعتبار سے یہ مجموعہ یقیناً بے مثل ہے۔

ابنِ فریاد

"برگِ خزاں" اس قدر حسین جمیل ہے کہ اسے غنچۂ بہار کہنے کو دل چاہتا ہے اور یوں بھی اس کتاب میں جو تمثیلات شامل ہیں وہ ذوق ادب کی نمو کا باعث بنتی ہیں۔ عبدالعزیز خالد کی مختلف کتابوں پر اور خود ان کے متعلق ہم متعدد بار اظہار خیال کر چکے ہیں، اس لئے اس مرتبہ ہم صرف کتاب تک ہی اپنے تبصرہ کو محدود رکھیں گے۔ اس کتاب میں تین تمثیلات شریک ہیں۔ جو اسٹر ٹیلیات سے مستفاد ہیں، البتہ ان تمثیلات میں افسانوی حسن پیدا کرنا خالد کا کام ہے۔ رفتہ رفتہ خالد اپنے فن کی بلندیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان تمثیلات میں زبان کی صفائی، بحور کے موزوں ترین انتخاب نے ایک حسن پیدا کر دیا ہے۔ کرداروں کے ادصاف مکالمات سے بڑی خوبی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، اردو میں منظوم تمثیلات کے سرمایہ میں یہ مجموعہ بڑا خوبصورت اضافہ ہے۔

خلوص اور تندہی نے خالد کو جس مقام پر پہنچا دیا ہے وہ قابلِ رشک ہے ۔

امریک انند

اس مجموعے میں منظوم ڈرامے شامل ہیں ۔ اپنے ڈراموں کے لئے مواد مصنف نے انسانی ثقافت کے اوّلین دور سے لیا ہے ۔ "قابیل" "فلکِ ناز" اور "آشور بنی پال" مختلف ادوار کی ثقافت، سیاست، محبت اور دیگر مسائل کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔ مصنف نے ان ڈراموں میں فنی اور شعری لطافتوں کو یکجا کرنے میں کمال ہنرمندی سے کام لیا ہے ۔ "آشور بنی پال" بہترین المیہ ہے جسے اسٹیج پر بھی کامیابی کے ساتھ دکھایا جا سکتا ہے ۔

نسیم گل

عبدالعزیز خالد کی تین منظوم تمثیلوں کا مجموعہ ہے ۔ پہلی تمثیل قابیل ہے ۔ یہ قرآن اور عہد نامہ عتیق سے ماخوذ ہے ۔ دوسری تمثیل فلک ناز طبعزاد ہے اور علامتی کرداروں پر مشتمل ہے ۔ تیسری تمثیل آشور بنی پال ہے یہ القوش تاحوم کی رویا کی کتاب سے ماخوذ ہے ۔

ان قصوں کا دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ خالد صاحب نے ان قصص کو اردو ادب سے روشناس کرا کے اردو ادب پر احسان کیا ہے ۔ جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ادب کے سطحی طالب علم آج ان کے خلاف آواز اٹھا سکتے ہیں مگر آئندہ نسلیں ان کو ہمیشہ اس عظیم کارنامہ پر خراجِ عقیدت پیش کرتی رہیں گی ۔

ان تمثیلوں کی زبان عامیانہ حد تک آسان نہیں ہے بلکہ اس میں عالمانہ وقار ہے معنویت ہے جہاں جہاں عام زبان کی ضرورت ہے وہاں بہت آسان زبان استعمال کی ہے انہوں نے بہت سے نئے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کی ترویج مستحسن ہے ۔ تشبیہات اور استعارات نئے اور اچھوتے ہیں ۔ ممکن ہے دوسری زبانوں میں مستعمل ہوں مگر اردو کے لئے نئے ہیں ملٹن کی طرح ان کی تلمیحات سے ہلکے پھلکے ادب کے قاری لطف اندوز نہیں ہو سکتے مگر ادب کے سنجیدہ طالب علم نہ صرف لطف اندوز ہوں گے بلکہ بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے ۔ مثلاً

ہر فسوں ساز نے افسونِ محبت پھونکا	کہیں مادام بواری تو کہیں ریبیکا
جوزفائن کا کہیں روپ متی کا چرچا	عالم آشوب کہیں مارگرٹ کا جلوہ
چتر لیکھا سی کہیں ہوش ربا رقاصہ	رُوست چندر بدن دو شنگ درقیبانہ
کہیں گلچہرہ پری دخت در باب و عذرا	ساحلِ بحر پہ اک میلہ ساحل پریوں کا

جن پہ ہوتا غترلہائے رواں کا دھوکا

رفیقِ خاور

بہر رنگے کہ تو ہی جامہ می پوش۔ ہم اس کو پہچان ہی لیتے ہیں۔ ہمارے ادبی ترجمان کا اندازِ قد —— وہ ہے بھی تو خاصا قد آور —— خود ہی ایک دم اس کی غمازی کر دیتا ہے۔ عبدالعزیز خالدؔ جس نے کتنے ہی شرقی و غربی ہم نفسوں کو اپنایا ہے اور خود بھی اپنایا گیا ہے۔ اس ایک بات میں سبھی بانٹیں ہیں۔ ہر ترجمہ کرنے والا دوسروں کو اپناتا بھی ہے اور خود بھی اپنایا جاتا ہے، اپنے مزاج یا صلاحیتوں کے مطابق کوئی کم کوئی زیادہ۔ ایک عجیب دوطرفہ دوگونہ عمل۔ داد و ستد کا سلسلہ۔ خالدؔ اپنانے کے پردہ میں ہتیاتا اور اپنے آپ کو بھی ہتیانے دیتا ہے۔ جس کے معنی ہیں اپنا طمع دوسروں پر چڑھانا اور خود کو بھی اپنانا —— بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم! اس لین دین میں کچھ سیفوؔ ہی خود کو لیے دیئے رہی ہے۔ جس کا ساز بڑی حد تک اس کا اپنا ہی ساز رہا ہے۔ خبر نہیں اس میں ہمارے جیالے شاعر کے صنفِ نازک سے طبعی گریز اور خوئے حجاب کو کس قدر دخل ہے۔ کیونکہ جس قدر گوشت پوست کے رومانوی پیکروں سے آہوئے دشتی کی طرح وہ خوکردہ رم ہے۔ اسی قدر تخیل کے شیش محل میں دیکھی اَن دیکھی حاضر و غائب، دیویوں، دیوداسیوں اور اپسراؤں کے بہشت نظر رومانوی، ناشنیدہ، ہوشربا جلوؤں کا سودائی ہے۔ شاید اس لئے کہ تخیل کو جسم و جسمانیت سے دور، لاتعلق، بے آمیز جمالیاتی سحر کاریوں سے سروکار ہے۔ جن کی حیثیت انتہا درجہ ارفع و اعلیٰ اور لطیف ہے۔ سیفوؔ کی حد تک شاید وہ اس تاریخی شعلۂ جوالہ کے نفسِ آتشیں سے گھبراتا اور کسمساتا بھی ہو۔ اس آتش نفس مغنیہ کے ہم سرشت و ہم زبان ہونے کا حق کوئی لااُبالی بائرن ہی ادا کر سکتا تھا۔ خالدؔ کے ہاں یہ خلا ملا سیفوؔ اور کٹّی اور ادبی رتنوں سے ہوتا ہوا ٹیگور جیسے گن کار اور اس کی گیت انجلی "تک پر بلکہ شاعر کے اپنے چمکتے دمکتے، طرحدار پرطاؤس ہیں۔ خالدؔ کے انداز سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی اور حیثیت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بنابریں ہمارا سروکار ٹیگور سے اتنا نہیں ہوگا جتنا خالدؔ سے۔

ایک بڑی بات یہ ہے کہ خیالات بڑی حد تک وہی ہیں تاوقتیکہ ان کے فہم یا اندازِ بیان سے فرق نہ پیدا ہو گیا ہو۔ الفاظ بھی اصل کے لگ بھگ ہیں یا زیبِ داستاں کے حامل۔ ہئیت اور پیرائے بڑی حد تک خالدؔ کے اپنے ہیں۔ وہ گیت انجلی کے تمام نذرانہ ہائے عقیدت کو ایک نیا روپ عطا کرتا ہے۔ زیادہ زیبِ داستاں کی حد تک ہم اس کا ساتھ نہ دیں تو نہ دیں۔ اس کے معنی یہی ہوں گے کہ اس کے یہاں بیان یا الفاظ ادق ہو گئے ہیں۔ اور کبر و لطر، زنجیر فعلہ، راتق و فاتق کی جگہ مانوس الفاظ ہوتے تو بہت بہتر ہوتا۔ خالدؔ میں کچھ وہ بھی ہے جو ٹیگور میں ہے "اور کچھ وہ بھی جو ٹیگور کی ضد ہے۔ نصف سے زیادہ نظموں میں وہ پہلے ٹیگور کو اپنانے میں کامیاب رہا ہے۔

خالدؔ، ٹیگور اور اس کی شاعری کی طرف شاعری کی راہ سے آیا ہے۔ نثر یا محض ترجمہ کی راہ سے نہیں۔ اس سے زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمیں اصلی بنگلا گیت انجلی کا علم نہیں کہ وہ کیسی ہے۔ اُردو میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ انگریزی

ہی سے پیش کیا گیا ہے۔ اور فراقؔ کی ترجمہ کی ہوئی "ایک سو ایک نظمیں" بھی اسی سے معلوم ہوتی ہیں۔ غالباً یہ انگریزی اصل کا زیادہ صحیح چربہ ہے۔ رواں دواں قسم کی آزاد نظم ایک یا زیادہ استانزے۔ غالباً بے عنوان۔ بحر لمبی، ہموار، ٹھہری ٹھہری، انگریزی ترجمہ کی اٹھان خاصی بلند اور لب ولہجہ متین۔ اکثر اردو ترجمے اسی نقل کی نقل ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر نثر میں۔ جس میں شعریت اور آہنگ کی عدم موجودگی پہلے ہی کچھ روکھی پھیکی وضع اور تشنگی پیدا کر دیتی ہے۔ بجنوریؔ نے، جو بقول خود دس پندرہ مقامات ترجمہ کئے ہیں، ان میں نثر کا عنصر غالب ہے۔ منظوم ترجمے گنتی ہی کے ہیں۔ نثر کے ترجمے محض عبارت ہی کو ادھر سے ادھر کر پاتے ہیں۔ جس میں اس کی انشائے لطیف اور فارسیت جا بجا اپنے نقش چھوڑ جاتی ہے خواہ وہ کتنے ہی کم نمائیوں نہ ہوں۔ سادگی و پُر کاری کا خلا ملا ان میں بے جوڑ پیوند کی وہ صورت پیدا کر دیتا ہے جو نیازؔ فتحپوری کے یہاں ایک بار وہ تکلف و تصنع کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ اور اس صحبت ناجنس کی سب سے ناپسندیدہ صورت ہے۔ بجنوری ہے اور وہی "محاسن کلام غالبؔ" کی انشا پردازی کنار بعید، پر پیچ عمق، ذی حیات حس تمام اعضا پر محیط، حیات کالمحہ خوش کامی، عالم امکان ترانۂ معرفت ہے۔ سلطان الاذکار۔ ان میں ادق ہونے کے ساتھ ساتھ عبارت آرائی اور لفظ بہ لفظ ترجمانی کی کوشش بھی نمایاں ہے۔ نظم میں جو بے ساختگی، سپردگی اور بہاؤ ہونا چاہیئے اس کے برعکس بناوٹ ہے۔ جیسے نثر کو کھینچ تان کر نظم کا جامہ پہنانے اور وزن میں کھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔

یہ ایک بڑی بنیادی بات ہے۔ اخذ و استفادہ کی کوئی بھی صورت ہو۔ من وعن یا آزاد سے آزاد۔ وہ طرفین کا آمیزہ ہوتی ہے۔ اس ضمن میں خالدؔ کی ایک ہی شرط ہے، کھیل بڑی حد تک اس ہی کا کھیل ہوگا۔ اور جو بھی کرتب برتے جائیں زیادہ تر اس ہی کے کرتب ہوں گے۔ دوسرے کا ذوق، مزاج، روح —— وہ ان کے پاس آ جائے تو آ جائے۔ ان کو پا جائے تو پا جائے۔ جس سے نقش ثانی پر پہلے نقش کی چھوٹ پڑے ورنہ وہ تو نرگس وار آئینہ میں اپنے ہی خد و خال دیکھے گا۔ ممکن ہے یہ ترجمہ یا اخذ و استفادہ کی اس بنیادی شرط کے منافی ہو کہ اصل کو اپنایا اور ابھارا جائے۔ وہ مقدم ہو اور اس کو اپنی زبان میں اجاگر کرنے والا موخر، لیکن خالدؔ اس شرط کو الٹ دیتا ہے ہر چند وہ بت شکنی میں سبک دست ہو۔ مگر وہ ہے تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور۔

ٹیگورؔ جیسے شاعر میں یہ بات کچھ اور بھی عجیب ہو جاتی ہے۔ ٹیگور سادگی اور محض سادگی کا شاعر ہے بڑی ہی اکھری، بڑی ہی کھری، بڑی ہی عنصری قسم کی شاعری کا رسیا جس میں نکھار ہی نکھار نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ بڑے ہلکے پھلکے لفظ، ہاتھی دانت کے پیارے پیارے نفیس نفیس کھلونوں کی طرح۔ اور ایسے ہی ہلکے پھلکے پیرایوں سے کام لیتا ہے۔ وہ ہم انسانوں کے بھولے بھالے بچپن کا شاعر ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے ساتھ خود بھی بھولا بھالا بن جانا پڑتا ہے تب کہیں اس کے لب و لہجہ اور اس بہاؤ کو پا سکتے ہیں، ورنہ دو انمل بے جوڑ چیزوں کے ٹکراؤ سے ایک نامانوس گنگا جمنی وضع پیدا ہو جائے گی۔ بعض اوقات بوجھل، بے ہنگم اور ناہموار۔ کبھی ہو بہو ٹیگورؔ۔ کبھی اس کے عین برعکس۔ خالدؔ نے ٹیگور کے ساتھ جو شرط باندھی ہے اس سے یہ، یعنی سادگی اور وہ، یعنی پُرکاری کی ہاتھ آتی ہے۔

ان دونوں کے ہونے میں کوئی برائی نہیں بشرطیکہ وہ ایک مناسب حد تک الگ تھلگ ہوں۔ اور سلیس بھی ہوں تو اس حد تک کہ وہ خوشگوار معلوم ہوں۔ اگر پُرکاری زیادہ پُرکار ہو جائے تو اس کے لئے یہی مناسب ہو گا کہ وہ بیدلؔ یا غالبؔ کی طرح بجائے خود محل نظر ہو۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم کھوٹے کھرے، اصل نقل کی بات بھول ہی جائیں۔ اور اس کی تعبیر میں جو اک صورت خرابی کی ہے، اسے نظر انداز کر کے پیش کش کو بمنزلہ طبع زاد تصوّر کریں۔ یعنی خواہ کیسے ہی بروئے کار آئی ہو ہم

اسے خالدؔ ہی کی تخلیق سمجھیں اور اس پر اسی ہی حیثیت سے نظر ڈالیں۔ ایک مدغم تخلیق "گل نغمہ" کوئی مستعار چیز نہیں۔ ہنس کے اُڑاتے ہوئے پَر بلکہ شاعر کے اپنے چمکتے دمکتے، طرحدار پر طاؤس ہیں۔ خالدؔ کے انداز سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی اور حیثیت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بنابریں ہمارا سروکار ٹیگور سے اتنا نہیں ہوگا جتنا خالدؔ سے۔

خوشی تیزی اسی میں ہے، تا اک جامِ گل مجھ کو
بھرے خالی کرے ہر دم زلالِ زندگانی سے
مبارک ہاتھ لافانی ترے چھوتے ہیں دل میرا
خوشی سے ہو کے بے قابو کر میں کیا تقریر کرتا ہوں
کرم تیرا ہے بے پایاں سدا کو تاہ پیمانہ
بھرے، خالی کرے ہر دم ہنوز اس میں ہے جا باقی

یہ شاعری کی سرخوشی سے بے قابو ہو کر تقریر نہیں بلکہ نثر کی بے کیفی کو زبردستی نظم کے سانچے میں ڈھکیلنے کی کھینچا تانی ہے۔ نثر میں بھی اسی طرح فارسی عربی کی تراش خراش اور طمطراق اس پر سایہ انداز:۔

"ایک جامِ سفال ہوں جس کو وہ رندِ حقیقی رنگا رنگ سے معمور کرتا ہے، توڑ دیتا ہے، اور اعجازِ کوزہ گری سے وجود میں لا کر الوانِ شراب سے لبریز کر دیتا ہے۔ نہ میرا کوتاہ پیمانہ بھرتا ہے نہ وہ میکش سیر ہوتا ہے، یہ ہماری ازلی اور ابدی لب تشنگی ہے۔"

نیازؔ فتحپوری کی "عرضِ نغمہ" کی ہر کوشش اس سے بھی سوا ہے۔ حمار الحطب۔ نہ مترجم خیال کی نفاست اور باریکی کو پا سکا ہے اور نہ اس کے لئے برجستہ شعریت سے بھرپور الفاظ تلاش کر سکا ہے۔ جامِ گل کی جگہ کمز ور ظرف یعنی اسم بامسمیٰ ہے۔ "بھرے، خالی کرے" میں ڈرامائی عمل کی بجائے بار بار خالی کرتا ہے کا سیٹھا پن ہے۔ زلال زندگانی محض تازہ زندگا بن گیا ہے۔ معمور۔ اس قدر بھٹوس! اور سب سے بڑھ کر دائم الجدت جس کے بارے میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ اس کا اس سے بہتر روپ ممکن نہیں! سوال جوں توں کر کے لغوی اور بے حس و حرکت مرادفات تلاش کرنے کا نہیں بلکہ بیان میں جان اور کیف و رنگ پیدا کرنے کا ہے۔

فراقؔ شاعر بھی ہے اور ہندی داں بھی۔ اس لئے توقع تھی کہ وہ ٹیگور کے کوِتا کو اُردو میں بڑے گن اور گمبھیرتا سے سموئے گا۔ لیکن وہ بھی بہت ہی ناپ تول کر بات کرنے پر قناعت کرتا ہے۔ وہ نہ اونچائیوں میں جا سکا ہے نہ گہرائیوں میں۔ جھاگ سطح ہی سطح پر کھیلتا پھیلتا ہے۔ اور لوٹ پھر کر بات وہی چھاپ کی ہے۔ کسی اور کی بات، کسی اور کی چھاپ۔ فراقؔ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اصل لکیر کو جوں کا توں پیٹے جاتا ہے ـــ "اگر میں جنم لیتا کالیداس کے زمانے میں" ـــ سوال ہے، "اگر میں کالیداس کے زمانے میں ہوتا" کیوں نہ ہو؟ کیا اس سے بات بگڑتی ہے۔ کوئی آزادہ رو کبھی اس طرح اصل کی پرچھائیں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ وہ بڑی بے باکی سے غزالانِ رم خوکو اپنے تخلیق کئے ہوئے الفاظ کی کمند میں گرفتار کرتا ہے۔ اور قادر الکلام ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک ہی نظم کو مختلف قلم کاروں کے ہاتھ میں دیکھئے۔

جہاں قلب بے خوف ہے، اور سر بلند رہتا ہے۔
جہاں علم آزاد ہے۔
جہاں دنیا خانگی دیواروں (کے جھگڑوں؟) میں ٹوٹ کر پرزے پرزے نہیں ہوگی۔ (نیازؔ)
جہاں دل خوف سے خالی ہے، جہاں سر اونچا ہے۔

گیان جہاں آزاد ہے، جہاں گھر کی چار دیواری نے دن رات اپنے آنگن میں دھرتی کو چھوٹا بنا کے نہیں رکھا ہے۔ (فراق)
آنگن اور دھرتی پھر بھی اس محل پر گورا ہیں، لیکن گیان؟ یا ٹھیٹھ ہندی ہو یا اردو خط کشیدہ حصّے میں خیال کسی انجانی چار دیواری میں گھر کر کچھ کا کچھ بن گیا ہے۔

اس ہی نظم کو ڈاکٹر خالد نے بھی عرصہ ہوا اُردو کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس کے چند اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

جس جگہ سر منتِ تسلیم سے آزاد ہو
دل کا آئینہ غبارِ بیم سے آزاد ہو
تنگیٔ دیوار ہائے خانگی کے ہاتھ سے
ٹکڑے ٹکڑے ہوں نہ جس جا عالمِ ایجاد کے
ہے تمنا یہ بہشتِ حریت آباد ہو
اے مرے آقا! جہاں میرا وطن آزاد ہو

گلِ نغمہ میں اس کا انداز یہ ہے:

جہاں ذہن بے خوف سر ہے بلند
جہاں علم کی دولت ارجمند
ہوا کی طرح مفت و آزاد ہے
جہاں خانگی تنگ تقسیم سے
نہیں ریزہ ریزہ تمام جہاں!
ہیں پروردۂ صدق، لفظیں جہاں

بے شک اس نقش کی حد تک خالد پہلے خالد کا حریف نہیں ہو سکا۔ مگر کیا خود ٹیگور بھی اس کا حریف ہے؟ غالباً اصل نظم میں بیان سادگی سے بڑھ کر شگفتگی اور شکوہ کی حد تک نہیں پہنچا۔ اُردو شاعر نے اصل پر نمایاں ترقی کی ہے۔ جہاں تک آخری نمونہ کا تعلق ہے یہ دوسروں سے بلند تر نہیں تو کم تر بھی نہیں۔

خالد کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے تراجم کو شعریت دی ہے، ان میں اپنا پن پیدا کیا ہے، کتنے ہی مقامات اصل کو بہت کچھ چمکایا اور بڑھایا ہے۔ اس نے وہی ایک آہنگِ مسلسل اور یکساں وضع و ہیئت ہی برقرار نہیں رکھی بلکہ اس میں بے حد رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ اس نے گنتی کی عام طور پر مروج بحریں ہی نہیں برتیں بلکہ ۶۰ بحریں برتنے کی مثال قائم کی ہے۔ اور ان میں سے اکثر بحریں خاصی کامیابی سے نئے امکانات کے لیے راہیں وا کر کے برتی گئی ہیں۔ بعض بحروں کا آہنگ ترتیلی ہے، نظم و نثر کے بین بین۔ وزن کی جکڑ بند اور کڑے ناپ تول سے آزاد۔ یہ بات ہمیں گائتری جیسے بھجنوں اور ڈرامہ میں کام آنے والی بحروں کا راستہ بتاتے ہوئے اُس مسئلہ کو سلجھانے میں مدد دیتی ہے جو ڈرامائی، رزمیہ اور طویل بیانیہ نظموں کی صنف اور بحر سے وابستہ ہے۔

"گلِ نغمہ" کا حقیقی اہم امتیاز اس کی بھرپور شعریت ہے۔ ایک سیلان جو ہر کہیں وضع و اسلوب اور شوخیٔ فکر کے نت نئے سجل جزیرے ہی جزیرے تراشے چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں خالد کا نابغہ اور علمی پس منظر دونوں مل کر کار نمایاں کرتے ہیں اور ہر قدم پر یادگار نقوش چھوڑ آتے ہیں۔ دوسرے ہمراہیوں کو پُر معنی کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے۔

بہار آفرینا! ترے فیض نے
کہ ہے گلشن آرائے کون و مکاں

یہاں گلشن آرائے کون و مکاں ٹیگور نہیں غالبؔ ہے اور بہار آفرینیاں میں غالبؔ کے ساتھ غالب بھی ہے۔ گو غالب کا شریک ہمیشہ شریک غالب ہی ہوتا ہے۔ اس سے ضمناً غالبؔ کا علمی و ذوقی پس منظر بھی جھلکتا ہے۔ پیشکش کی ایک نئی بُعد۔ کمر، در ظرف، جامِ گل۔ جام سفال، سبوئے سفالینہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ مگر پہلی دو میں شاعری کی مئے سُرخ نہیں ہے۔ سبوئے سفالینہ زندگی اور شاعری دونوں کی مئے سُرخ سے لبریز ہے۔ ذرا اور آگے بڑھیئے۔

ہے پت جھڑ کے پردے میں گویا بہار!
میں اک عُود نالندہ ہوں اور تو
مغنی کہ آتش نوا جس کا نام!
مدام اک نیا زمزمہ چھیڑ نا،
خیابان و وادی میں محوِ خرام

یہاں ذوق ہی ذوق ہے اور شاعری کی مخصوص علامات شدت سے نمایاں۔ اگر شاعر کوئی بات کہے تو اسے ایسے ہی کہنی چاہیئے۔ کیونکہ شاعری کا ٹھیٹھ پیرایہ یہی ہے۔ اس سے حُسن و جمال کی بوجہ احسن تسکین ہوتی ہے۔ ایک باذوق قاری کو یقیناً ایسی پیش کش کا آرزومند ہونا چاہیئے۔ ایک اور مصرع ہے ـــــ تو دریا نوال اور میں کوزہ دست۔ یہاں ادک کی تصویر بڑی اچھوتی بھی ہے اور دلنشیں بھی۔ اور پھر رہٹ کے کوزوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ دونوں صورتوں میں تخلیق اور جدت نمایاں ہیں۔ بڑے اونچے پیمانے پر۔ یاد کیجئے نیازؔ فتحپوری کی دائم الجدت اور اس کا موازنہ "مدام اک نیا زمزمہ چھیڑنا" سے کیجئے۔ یہ تمام پرانے اور نئے ذوق کا فرق ہے۔ فراقؔ کہتا ہے:

بارہو مہینے محنت کرتا ہے دھوپ اور بارش میں

اس کے برعکس: ـــــــ لُو چلے، دھوپ پڑے، مینہ برسے

اتنی زندگی، اس قدر حرکت! چند اور جستہ جستہ پارے:۔

صبحدم پہلی کرن کے سنہری رتھ پر سوار
اے حبیب ستارہ نظر
پتوں میں تھی سنسناہٹ
انجانی ظلمت سے کوئل
چنتا بھری لئے میں بولی

"گلِ نغمہ" کا دامن ایسے گل پاروں سے بہار اندر بہار ہے۔ جن میں فن کا قوام اور تخلیقی عمل زیادہ نادر ہے۔

توڑ لے شاخ سے یہ ننھا پھول،
مجھے ڈر ہے کہیں یہ آتش تر!
بُجھ نہ جائے ہوائے صرصر سے
یہ مہکتا گہر بہ خرمنِ زر
ہو نہ جائے بکھر کے، مرجھا کر

جز د گرد و غبار و خاکستر!

تلازمات بجائے خود اس کی ندرت کا ثبوت ہیں۔ ننھا پھول، آتش تر۔ ہوائے صرصر سے بجھ جانا۔ پھول مہکتا گھر بھی اور خرمن زر بھی۔ تینوں۔ آگ، گھر اور خرمن کا انجام ـــــ گرد اور راکھ۔ ہوائے صرصر کا دوہرا عمل۔ آگ کو بجھانا اور پھول کو مرجھانا۔ اس سے بھی زیادہ تخلیق کی نمود اس قلم پارے میں ہے:

خورشید بافیدہ پیلی تیرگی　　　　　کی زرم شیریں حریری خستگی

کیونکہ اس میں تصور و بیان دونوں تمثیل روپ ہیں۔ یہ بات اُردو میں فی الحال شاذ و نادر ہے۔ خورشید بافیدہ۔ پیلی تیرگی۔ زرم شیریں حریری خستگی۔ یہ سب فکر کے بالکل اچھوتے انجانے مگر کڑے موڑ کی خبر دیتے ہیں۔ ویسے ہر نوع کی شگفتہ اور اعلیٰ پایہ کی حسن کاریوں ـــــ الفاظ، ترکیبیں، تمثیلیں، تیور، اشارے، باریکیاں، بحریں ـــــ کی بہتات اس مجموعہ سے گزر کر خود اردو شاعری کو بھی اوی انت حد تک شاداب رنگ کرتی ہے۔

تیرے آہنگ کا نوریں جھرنا
گل و لالہ کے احمریں شہر ہیں
جب گل سرخ بنا غنچۂ نیلوفر صبح
اور زرپوش ہوا جادۂ براہ کویر
کف صندلیں سے نگار صبا
دن ڈھلا ہاٹ ہو گیا سُونا
چھا گیا کنج کنج سناٹا
شہپر لوالیں گے
تن گیا ہے سدا جاگتے نیلگوں چرخ پر
بادلے کا نقاب
بن میں بجتا نہیں
آبنوسی رباب
اور گونجے میرے سینے مدھ بھری گونجار سے
کیا کیا براتیں، جلوس کیسے

گل باریاں کرتے، غل مچاتے
شادی کی شہنائیاں بجاتے
چھم چھم گزرتے ہیں سامنے سے!
وہ کیف کے لمحات ارغوانی
اقلیم مسرت کے کاروانی
وعدے کے تعطر سے شیریں

میگوں، بسنتی
خوشبو سے بوجھل
روشن دنوں میں
جنگل کی ٹیڑھی
پگڈنڈیوں سے

وہ آرہا ہے
وہ آرہا ہے
نت آرہا ہے
اس کے قدم کا
لمس طلائی
اس سرخوشی کو
کرتا ہے صیقل!
نیلاب صبح سکوت آلودہ ہیں
موج نوائے فسوں پرور اٹھی
دور کوئی کڑکتی ہے بجلی
ہڑبڑا کر زمیں تھرتھرائی
اور دیوار و در زلزلائے
نیند میں بعض یوں بڑبڑائے
یہ تو پہیوں کی ہے گڑگڑاہٹ

روشنی یہ روشنی — میری ذاتی روشنی
انفس و آفاق میں — تھرتھراتی روشنی
پتلیوں کو چومتی — چھچھاتی روشنی
دل میں شکر گھولتی — گنگناتی روشنی

جب کبھی میں چومتا ہوں تجھ کو دلارے
تاکہ نکلیں گدگدی سے غنچے لبوں کے
تب میں سمجھتا ہوں نیل زار افق پر
رہگذر آسماں سے بہتی ہے کیسی
نور بھری چھچھاتی جوئے مسرت!
تو اپنے انجمینہ سینے پر کھریلی چادر

ہزاروں پیچ و خم سے گونہ گوں طرز و ادا سے
ہے ترکیب اس سحابی شال کی قوسِ قزح کی

ہے یہی نغمہ ، لچکتی ڈالیوں
سرسراتے پات کا
جب سنکتی ہے ہوا
بھیگے ساون کے اندھیرے صحن میں !

کوئی چیز طبع زاد ہو یا ترجمہ، دونوں میں ایک بڑا سوال یہ ہے کہ شاعری تاثر روپی ہو یا بیان روپی۔ خود ٹیگور کی بانی بعض اوقات بیان روپی ہوتی ہے۔ جس سے لازماً شاعری کی کسک اور کلپنا اُبھر کر گن روپی نہیں بن پاتی اور یہ بات کچھ خود ہی اور کچھ دوسرے ہاتھوں آنے سے اور بھی سوا ہو جاتی ہے۔

ہوئی تاخیرِ التوا، اتنی
اے خداوند رازق و فاتق
مجھ سے سرزد ہوئیں خطائیں بھی
جوق در جوق لوگ آتے ہیں

ظاہر ہے کہ ایسے مقامات پر اظہار کے ڈانڈے نظم و نثر سے جا ملتے ہیں، اور فن کی خلائی پرواز زمین گیر ہو جاتی ہے — نہ سوز نہ گداز، نہ کیف و رنگ — اور نہ شاعری۔ تاثر کو نوا بلکہ شہپرِ نوا دینے کے امکانات اتنے ہی ہیں جتنے خود شاعری کے امکانات۔ "گلِ نغمہ" میں یہ امکانات کسی حد تک روشن ہوئے ہیں، یہ اس سلسلہ میں آخری سوال ہے۔

صاحبِ غزامیات" — خالدؔ اور ہم راہِ سخن وا کر چکے ہیں۔ دیکھیں دوسرے رندانِ خرابات نشین اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

وفا راشدی

اس ناچیز کو "گیتان جلی" کا بنگلہ ایڈیشن پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ دوسروں کے نثر و نظم میں اُردو تراجم بھی دیکھے ہیں، لیکن خالدؔ کے اس ترجمے (گلِ نغمہ) کو اوّلیت حاصل ہے۔ ترجمہ اس قدر فکر انگیز و فکر آزما ہے کہ اردو کے قالب میں بھی وہی تاثیر، دل کشی، گیرائی و گہرائی پوری رعنائی و لطافت کے ساتھ سمو دی گئی ہے۔ جو ٹیگور کی اصل کیف آفریں نظموں کی خصوصیات ہیں۔

ترجمے میں ٹیگور کی شعریت کے ساتھ ساتھ خالدؔ کی ذہانت و فن کارانہ عظمت پوری طرح جلوہ گر ہے۔

محمود سعید کے

بڑا فن کار کسی ایک ملک یا قوم کا نہیں پوری انسانیت کا محبوب و محترم ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے متعدد مہذب ملکوں میں مہاکوی رابندر ناتھ ٹیگور کا صد سالہ یوم پیدائش بڑے جوش و خروش اور دھوم دھام کے ساتھ منایا گیا۔ اس موقع پر پڑوسی ملک پاکستان کے ایک نامور شاعر جناب عبدالعزیز خالدؔ نے اپنا نذرانۂ عقیدت "گیتان جلی" کے منظوم اردو ترجمے

کی صورت میں پیش کیا جسے مطبوعات مشرق (کراچی) نے بڑے سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب دبیز کاغذ کے ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا کے ۵۱ صفحات میں بعض نئے اور پرانے رسائل سے مختلف اہل قلم اور خود ٹیگور کی کچھ ایسی تحریریں نقل کی گئی ہیں جن سے مہاکوی کی پوری زندگی، ان کی شاعری، خصوصاً گیتان جلی کے گیتوں کا پس منظر اور فن اور ادب کے بارے میں مہاکوی کا اپنا نقطۂ نظر، یہ سب چیزیں بڑی وضاحت کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہیں اور اس طرح اس عظیم شاعر کے برتر مقام تک اس کے ذہن کی رسائی نسبتاً سہل ہو جاتی ہے۔ ان میں جو تحریریں خود مہاکوی ہیں (مثال کے طور پر اندرا دیوی چودھرانی کے نام لندن سے ان کا خط یا میں ایک شاعر ہوں) انہیں پڑھ کر ادب اور فن کے کئی اختلافی مباحث بھی صاف ہو جاتے ہیں۔ مہذب سماج میں ایک فن کار کا حقیقی منصب کیا ہو سکتا ہے؟ مہاکوی نے یہ بات کسی الجھاؤ کے بغیر دو ٹوک لفظوں میں بیان کر دی ہے:

"۔۔۔۔اور اب جبکہ میری عمر ۷۰ برس کی ہو گئی ہے لوگ مجھ پر بے پروائی اور غیر سنجیدگی کا الزام لگا رہے ہیں اور میرے رویے سے ان کے جذبۂ متانت کو تکلیف پہنچتی ہے۔ میں ایسے کاموں پر اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا جو میرے بس کے نہیں ہیں۔ میں اپنی ستر سال کی زندگی کے مدّ و جزر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں کہ میں ایک ایسی صداقت کا ساتھی ہوں جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ میں نے کچھ حاصل بھی کیا ہے یا نہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اپنے پیچھے کوئی قابل قدر چیز چھوڑوں گا یا نہیں میں دوام کا آرزو مند نہیں۔ بچہ کھیلتا ہے تو اس کا مقصد حصول نہیں ہوتا۔ اپنے کھیل کے لئے جو گھر وہ بناتا ہے اسے خود ہی ڈھا بھی دیتا ہے، یا اسے ڈھے جانے کے لئے سر راہ چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔" (میں ایک شاعر ہوں)

"گیتان جلی" کے کچھ اردو ترجمے پہلے بھی شائع ہوئے ہیں اور ان میں سے دو ایک کو شہرت دینے کی مصنوعی کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ "گل نغمہ" کی کامیابی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ایک ایسا شخص بھی جس کے لئے مہاکوی کی شاعری کا راست مطالعہ ممکن نہیں، ان کے شاعرانہ اوصاف و محاسن سے متاثر اور لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ جناب عبدالعزیز خالد اس سے پہلے بھی بعض کلاسکس کو اردو میں اسی حسن و خوبی کے ساتھ منتقل کر چکے ہیں۔ "گل نغمہ" ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ اور اس کے سرانجام پر سزاوارِ داد ہیں۔

تاج سعید

ٹیگور کی مشہور زمانہ شعری تصنیف "گیتانجلی" کے نثری ترجمے تو متعدد ہو چکے ہیں۔ لیکن منظوم ترجمہ ابھی تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری (مرحوم) نے اگرچہ اس کام کو شروع کیا تھا اور اس سلسلے میں چند عمدہ ترجمے پیش بھی کئے تھے لیکن ان کے اس ادھورے کام کو مکمل کرنے کے لئے عبدالعزیز خالد جیسے شعری صلاحیتوں کے مالک کی ضرورت تھی۔ مقام شکر ہے کہ انہوں نے اس نادر روزگار صحیفے کا مکمل ترجمہ "گل نغمہ" کے نام سے پیش کر دیا ہے۔ مترجم نے ترجمہ اس محنت سے کیا ہے کہ بعض جگہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شعری ترجمے میں خالد نے مشکل الفاظ کو برتنے سے احتراز کیا ہے۔

"گل نغمہ" کی ابتدا عبدالرحمن بجنوری کے ایک مضمون سے ہوتی ہے۔ جس میں انہوں نے "گیتانجلی" کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات کے علاوہ قیام انگلستان کے دوران وہاں کے عوام اور فن کاروں کے خیالات پیش کر کے اس کتاب کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ جن کو پڑھ کر "گیتانجلی" کی قدر و قیمت اور اس کی شہرت کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ انگلستان میں یہ کتاب ڈبلیو۔ بی۔ ایس کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ "گل نغمہ" میں اس دیباچے کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ٹیگور کے دو خط اور ایک مختصر سا مضمون بھی ہے جس میں انہوں نے اپنی شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے علاوہ ٹیگور کی زندگی کے حالات (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۱ء) بھی دیئے گئے ہیں۔ جن سے اس فن کار کی تخلیقی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے۔

رامانند چیٹرجی اور ابوالکلام آزاد کے تاثراتی نوٹس بڑے عمدہ ہیں جو ٹیگور کی شخصیت اور اس کی عظمت کو دل پر نقش کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ یہ نثر قریباً پچاس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور اس نے "گل نغمہ" کے معنوی حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

انیس خورشید

ہمارے جدید شاعروں میں عبدالعزیز خالد ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ خالد نے منظوم ترجموں میں بھی شاعرانہ حسن برقرار رکھنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس سال انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرۂ آفاق تصنیف "گیتان جلی" کا منظوم ترجمہ "گل نغمہ" کے نام سے پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادبی محاسن سے سرلبریز معمور ہے۔ اس ترجمے میں شاعرانہ حسن اور معنوی تسلسل کو برقرار رکھنے کی بھی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ زیر نظر کتاب کے ابتدائی حصے میں ٹیگور کی شخصیت اور ان کی شاعری پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ڈبلیو۔ ای۔ اٹیس، رامانند چٹرجی اور ابوالکلام کے مضامین بھی شامل ہیں ــــ "ٹیگور بیک نظر" کے عنوان سے ان کے حالات و واقعات کا ایک سن وار خاکہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب خوبصورت ٹائپ میں مطبوعات مشرق کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

ضیاالدین برنی

یہ "گیتان جلی" کا منظوم ترجمہ ہے۔ شروع میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور ملک الشعرا ییٹس کا "گیتان جلی" پر تبصرہ ہے۔ اس کے بعد دو خطوط درج کئے گئے ہیں، ایک اندرا دیوی چودھرانی کے نام اور دوسرا شانتی نکیتن کے ایک پروفیسر کے نام۔ یہ خود ٹیگور کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں "گیتان جلی" کی شانِ نزول بیان کی گئی ہے۔ ان کا اردو ترجمہ یونس احمد نے کیا ہے۔ ایک مضمون میں جس کا عنوان "ٹیگور بیک نظر" ہے ۱۸۶۱ء سے ۱۹۴۱ء تک کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ انہی واقعات میں نوبل پرائز کی پیشکش بھی ہے جسے ۱۹۱۴ء میں بنگال کے گورنر لارڈ کارمائیکل نے گورنمنٹ ہاؤس میں ایک تقریب میں پیش کیا تھا۔ جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام سے متاثر ہو کر شاعر نے ۳۰ رمئی ۱۹۱۹ء کو اپنا خطاب نائٹ ہڈ احتجاجاً واپس کر دیا تھا۔ اس واقعہ کو بھی نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ یہ مضمون وقار خلیل کا لکھا ہوا ہے۔ رامانند چٹرجی (ایڈیٹر "ماڈرن ریویو" کلکتہ) نے ایک مضمون میں ٹیگور کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ خود رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک مضمون میں اپنے متعلق یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ میں کیا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اگر میں نے دنیا کے کھیل گھر کے لئے کچھ کھلونے بنائے ہیں تو انہیں محفوظ رکھنے یا دوام بخشنے کا میں بالکل آرزومند نہیں ہوں۔ اگر میں ان وقتی کھلونوں میں روح ڈال سکا ہوں اور ان سے کچھ دلوں میں مسرت کی لہر دوڑی ہے تو میں اس سے مطمئن ہوں۔ اس سے زیادہ کی مجھے کوئی آرزو نہیں ...... میں زندگی کا رس اسی خاک، دھرتی اور گھاس پر نچوڑنا چاہتا ہوں۔ وہ لوگ جو دھرتی کی گود کے قریب ہیں، جو اسی دھرتی پر پہلا قدم اٹھاتے ہیں اور اسی کی گود میں چلے جاتے ہیں، میں ان سب کا دوست ہوں۔ میں شاعر ہوں۔ بس کوی ہوں۔"

ابوالکلام آزاد نے "ٹیگور کی شخصیت" پر جو چھوٹا سا مضمون لکھا ہے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے آخر میں وہ ٹیگور کے ذیل کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

> "افسوس اب وقت ہی نہ رہا۔ مجھے بہت کچھ ابھی کرنا اور سیکھنا تھا۔ بینائی جواب دے چکی ہے۔ ہاتھ بیکار ہو گئے ہیں۔ انگلیوں میں وہ پہلی سی نزاکت کہاں سے لاؤں؟ جسم میں وہ لچک نہ رہی۔ سب کچھ کھو بیٹھا۔ کاش کچھ وقت اور مل جاتا تو اور کچھ کر لیتا۔"

اس پر مولانا آزاد رقم طراز ہیں:

"جسے ساری قوم گرو دیو کہتی ہے اس کا طالب علمانہ ذوق و شوق ملاحظہ کیجئے۔ کتنے درد بھرے، حکیمانہ اور پُرخلوص تھے وہ بول۔ مایوسی کے پیکر میں حوصلہ مندی کا پہلو لئے ہوئے۔"

مترجم نے یہ سارے مضامین اس لئے دئے ہیں تا کہ ٹیگور کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملے اور اندازہ لگایا جا سکے کہ شاعر کی زندگی کس قدر بھرپور اور متنوع رہی ہے۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ زبردست مصوّر بھی تھے۔

بمبئی یونیورسٹی میں بھی انہوں نے چند لیکچر دیئے تھے۔ ایک لیکچر میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ شاعر کی پرشکوہ شخصیت کا اثر آج تک میرے دل پر ہے۔ وہ پرانے زمانہ کے رشی نظر آتے تھے۔ جوانی میں وہ بہت حسین اور وجیہہ تھے اور ان کے اس مردانہ حسن سے آخر وقت تک لوگ متاثر ہوتے رہے۔

میرا خیال ہے کہ "گیتان جلی" کی اشاعت سے پہلے اردو داں طبقہ شاعر سے زیادہ واقف نہ تھا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ لوگوں نے ان کی تحریر کی نقل اڑانی شروع کر دی۔ جس ادیب کو دیکھئے وہ شاعر کی سی بلند پروازیوں کی نقل میں مشغول ہے۔ میرے دوست خلیقی اس طرز کے بہت دلدادہ تھے۔ نگر نیاز صاحب ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں کہ "مجھے اب تو ٹیگور اور اس کے رنگ سے امتلا ہونے لگا ہے۔" بہرحال کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی نوع ٹیگوریت سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اسی زمانہ میں میں نے بھی "گیتان جلی" پڑھ لی تھی اور میں اس نئی شاعری سے بے حد اثر پذیر ہوا تھا۔ آج بھی جب کبھی اسے پڑھتا ہوں قلب پر وہی پہلا سا تاثر ہوتا ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو زندہ رہیں گی اور عبدالعزیز خالد نے شاید اسی لئے اس کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے کہ اُردو کے دلدادہ بھی "گیتان جلی" سے حظ اٹھائیں۔ اس کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں۔ ٹیگور کی بعض اور کتابوں کے بھی اردو میں ترجمے ہوئے ہیں۔ مگر جو پذیرائی "گیتان جلی" کو نصیب ہوئی وہ اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ عبدالعزیز خالد قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اردو داں پبلک کے لئے اس کا کامیاب منظوم ترجمہ پیش کر دیا ہے۔

یہ ترجمہ کیسا ہے، اس کا فیصلہ میں خود ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ لیکن اس کے چند نمونے حاضرِ خدمت ہیں۔ نمونے درج کرنے سے پہلے میں ایک بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ خالد صاحب بالعموم ادق اور مشکل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن اس کتاب میں وہ بالکل مختلف نظر آئیں گے۔ ترجمہ بالعموم صاف اور رواں ہے ایسا رواں کہ جی خوش ہو جائے۔ اگرچہ اس میں بھی چند جگہ آپ کو ادق پسندی کے مظاہرے ملیں گے۔ چند نغمے ملاحظہ ہوں:

تو دیتا ہے جب حکم نغمہ سرائی — تو دل کثرتِ شوق و فرطِ طرب سے
سماتا نہیں پہلوئے ناتواں میں — کہ جیسے اسے مل گئی ہو خدائی

ناسرائیدہ اب تک ہیں وہ زمزمے
جن کو گانے کی خاطر میں آیا یہاں
دن مرے کٹ گئے جوڑتے کھولتے
اپنے سازوں کے تاروں کو واحسرتا!
شبھ کہیں جس کو آیا نہیں وہ سمے
اور الفاظ بھی ٹھیک بیٹھے نہیں

ہے اگر دل میں کچھ تو عزمِ آرزو
ہونٹ کھولے نہیں ہیں کلی نے ابھی
صرف بھرتی ہے موجِ صبا سسکیاں

یہ دنیا بھی ہے ایک میلہ جہاں
مجھے اذنِ گلگشت بخشا گیا
مری آنکھ محوِ تماشا رہی
مرے گوش لذت کشِ نغمگی
یہ خدمت مجھے اسی میں سونپی گئی
کہ لوگوں کی دل بستگی کے لیے
میں گاتا رہوں دف بجاتا رہوں
تماشائی ہوں یا نہ ہوں ملتفت
میں نغماتِ شیریں سناتا رہوں

میں یہ کہتا ہوں فقط
صاحبو! ان کے مطالب سے کسے آگاہی!
مسکراتے ہوئے انگشت نمائی کرتے
ناک بھوں مجھ پہ چڑھاتے وہ چلے جاتے ہیں
اور تم خندہ بہ لب
بے نیازانہ، بلند و بالا
دور سے دیکھتے رہتے ہو یہ ناٹک سارا!

میں نے کی لاف زنی لوگوں میں
کہ مری تم سے شناسائی ہے
ہر طرف میرے صنم خانے سے
نظر آتے ہیں انہیں صرف تمہارے ہی نقوش
آکے وہ پوچھتے ہیں کون ہے یہ ؟
ان کی باتوں کا مرے پاس نہیں کوئی جواب
عذر خواہانہ یہ کہتا ہوں جناب

واقعی میں نہیں بتلا سکتا!

اس پہ وہ مجھ کو ملامت کرتے
تیوریاں ڈالے چلے جاتے ہیں
اور تم خندہ بہ لب
بے نیازانہ بلند و بالا
دور سے دیکھتے رہتے ہو یہ منظر سارا!
ہیں تمہارے متعلق جو حکایاتِ جمیل
ڈھالتا ہوں انہیں نغموں کے حسیں قالب میں
کیسے اس راز کو سینے میں مقید رکھوں؟
آکے وہ پوچھتے ہیں ان کے معانی مجھ سے
کیا کہوں ان سے، کردں ان کی تشفی کیسے؟

موت جس دن ترے دروازے پہ دستک دے گی
کون سی شے سے کرے گا تو سواگت اس کا؟
اپنے مہمان کو میں پیش کروں گا حضرات
جامِ خونابۂ دل، ساغرِ صہبائے حیات
ہے تہی دست کی سوغات یہی شاخِ نبات
روزِ پائیز و شب گرما کے
عسلِ ناب و تر و تازہ سے
اسے بہلاؤں گا مہمانی کروں گا اس کی
یہی پونجی ہے مری اور بس اتنی اوقات!

ان اقتباسات سے آپ شاعر کے مقصدِ حیات سے کچھ کچھ واقفیت بھی حاصل کر سکتے ہیں اور چونکہ یہ خیالات نئے تھے اس لئے

مشرق کی طرح مغرب بھی مبہوت سا ہو گیا۔ وہ پہلی مرتبہ ان بلند پروازیوں سے واقف ہوا تھا۔ "گیتان جلی" میں کل ۱۰۳ نغمے ہیں۔ خالد صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے ایسی لافانی کتاب کے نغموں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس سے جہاں اردو کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی ہے وہاں نئے نئے خیالات بھی اس میں آگئے ہیں۔

امید ہے کہ قارئین "گل نغمہ" سے پوری طرح لطف اندوز ہوں گے اس لئے کہ شاعری سے وجدانی طور پر جو حظ اٹھایا جاسکتا ہے وہ نثر کی کتاب سے ممکن نہیں۔

لحنِ صریر

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ابھی کل کی بات ہے کہ عبدالعزیز خالد شعر و ادب کے افق پر نمودار ہوئے۔ ان کی بات نئی تھی اور کہنے کا انداز بھی نیا پھر دیکھتے دیکھتے ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور آج صورت یہ ہے کہ ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں رہی۔ اور وہ طرزِ خاص بھی جو ابتداً اپنی ندرت اور طرفگی کے باعث اجنبی اور غیر مانوس محسوس کی گئی مجھے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ ان کے فکرِ صالح کے صحت مند رشحاتِ قلم ایک حسین و دلآویز مجموعۂ رباعیات کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں ہے عبدالعزیز خالد نے ابھی تک اس صنفِ شاعری کو نظر انداز کر رکھا تھا اب جو توجہ کی تو اس شان سے کہ کہنے کا حق ادا کر دیا۔

لحنِ صریر میں کل ۳۱۳ رباعیاں شامل ہیں ۳۱۳ کے عدد کا التزام بھی ایک صنعتِ معنوی ہے۔ جس کی معنویت اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خالد صاحب کا فن شیشہ بازی نہیں خارا شگافی ہے ان کے فن پر فنونِ لطیفہ کی نظر فریب اصطلاح کا اطلاق نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف جہاد بالقلم کے قائل ہیں۔ قلم کو لہو و لعب یا "بازی کردن از جوانی" کے لئے استعمال کرنا ان کا شیوہ نہیں اسلام میں حق و باطل کا پہلا معرکہ غزوۂ بدر تھا جس میں مجاہدین صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ میمون و مسعود ہیں وہ لوگ جو ان نفوسِ قدسیہ کے ساتھ ادنیٰ نسبت کو بھی اپنے لئے باعثِ خیر و برکت سمجھتے ہیں۔

پہلی رباعی حمد میں ہے

توحید ہے ایماں کا مدار و محور	توحید ہے مرکز و منبعِ فکر و نظر
ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ	لا تدع مع اللہ الٰھاً آخر

دوسری رباعی نعتِ پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

حق نے جسے بخشا ہے مقامِ محمود	مخدومِ زمانہ، محفود و محشور
ما ادری ما یفعل بی کہتا ہے	وہ ابن ابی قشم رم پڑھیں جس پر درود

اعجاز فاروقی

عبدالعزیز خالد کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ اس کی زیرِ نظر کتاب رباعیوں کا مجموعہ ہے خالد کے نزدیک اشعار "حدیث النفس شاعر" ہیں۔ یہ اس کی خود کلامی ہے جو شعروں میں ڈھل جاتی ہے۔ خالد دروں بیں ہے جیسا کہ ہر فن کار ہوتا ہے شعر اس کی داستانِ غم ہے اور اس اظہار میں وہ مخلص بھی ہے اور متوازن بھی۔ شعر اس کے نزدیک "تہذیبِ جذبہ و تمک دلبستین" کا کام کرتا ہے مگر وہ فن کے معاملے میں "جدت کا نقیب" ہونے سے زیادہ "روایت کا امین" ہے اس لئے وہ عام خیال کے مطابق شعر کو "وحیٔ یزداں" کہتا ہے اگرچہ کبھی وہ ایک معروف قرآنی آیت کے مطابق شاعر کو منزل سے دور رہنے والا "اور "راہوں میں بھٹکنے والا بھی کہہ جاتا ہے۔

عبدالعزیز خالد ایک بڑا اخلاق پرست، دین دار اور قلندر منش انسان ہے اور زیرِ نظر رباعیات میں اس کی یہ خوبیاں صاف جھلکتی ہیں یہ رباعیات دراصل ان اخلاقی اقدار کا آئینہ ہیں جو عبدالعزیز خالد کو بہت عزیز ہیں۔ اگرچہ یہ اخلاقی اقدار عالمگیر ہیں مگر عبدالعزیز خالد نے ان کو اسلامی تعلیم کے حوالے سے پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان رباعیوں میں جگہ جگہ قرآن کی آیات اور حدیثوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ خالد کو اپنے ملک کی پست اخلاقی حالت اور اسلامی تعلیمات کی فروگذاشت پر بھی دکھ ہوتا ہے اور کئی رباعیوں میں اس نے اس صورتِ حال کا ذکر بڑے دردناک لہجے میں کیا ہے۔ اس کو دنیا کی بے ثباتی کا بھی احساس ہے اور وہ برملا کہتا ہے کہ ع

"ملکیتِ آدم نہ زمانہ نہ زمین"

مگر اس احساسِ بے ثباتی نے اس کے ہاں فرار یا مایوسی کے جذبے کو جنم نہیں دیا جس سے عبدالعزیز خالد کی قلندر منشی سب سے الگ نظر آتی ہے۔

قرآن و حدیث اور اردو شاعری کی روایت کے ساتھ بے پناہ وابستگی نے ان رباعیوں میں فارسی اور عربی کے کئی نامانوس الفاظ شامل کر دیئے بلکہ مصرعے کے مصرعے عربی اور فارسی کے ہیں جو اردو کے سخن فہم کی طبع پر گراں گزرتے ہیں۔ اگر عربی اور فارسی کے یہ حوالے تلمیح و استعارہ کے طور پر آتے تو یقیناً اردو زبان کے لئے گنجِ گراں مایہ بنتے مگر زیادہ تر ایسا نہیں ہے البتہ جہاں انہوں نے ایسی تلمیحیں وضع کی ہیں وہ بڑی خوبصورت ہیں مثلاً

ہے چاکِ قمیص پاک بازی کا صلہ   کر سوزنِ آہ و اشک سے بخیہ گری

یہ تلمیح یوسف و زلیخا کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے مگر اس قصے کا "چاکِ قمیص" والا حصہ پہلی دفعہ معصومی و پاک بازی کی تلمیح کے طور پر اردو شاعری میں استعمال ہوا ہے۔

عبدالعزیز خالد کے اخلاصِ جذبہ سے انکار نہیں مگر یہ جذبہ جب فن کے سیال میں بہتا ہے تو عجیب دلکشی اور رعنائی سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے براہِ راست حوالوں کے بجائے اگر یہ تلمیحات ان کی شخصیت میں جذب ہو کر فنی روپ میں جلوہ گر ہوتیں تو فن کو ایک نیا عروج نصیب ہوتا۔

انور سدید

مصرعوں کی تعداد اور وزن کی مخصوص پابندی نے رباعی پر جو کڑی قیود عائد کر رکھی ہیں۔ انہیں ہر شاعر اپنی تخلیقی گرفت میں لینے سے قاصر ہے یہی وجہ ہے کہ رباعی شاعری کی کبھی مقبول صنفِ سخن نہیں بن سکی۔ البتہ خواص نے اس میں بھی جوہرِ طبع دکھایا اور بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ فارسی میں عمر خیام کی سرمستی اور سعید ابوالخیر کا تصوف رباعی کے پیمانے میں ہی جلوہ آرا ہو کر زندۂ جاوید ہو چکا ہے۔ "لحنِ حریر" اردو کے ایک ایسے شاعر کی رباعیات ہیں جو اس سے قبل ہر صنفِ سخن میں قادر الکلامی کا سکہ منوا چکا ہے اور اب اس نے اس صنف میں پوری ایک کتاب تخلیق کر کے اپنے مشاقانہ فن سے ایک اور پردہ سرکایا ہے۔

عبدالعزیز خالد کے ہاں فکر، فلسفہ اور علم کا بڑا گہرا امتزاج ملتا ہے۔ یہ طلائی تثلیث ان کی ہر رباعی میں موجود ہے۔ اس عالمانہ شاعری سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے خالد جیسی فضیلت اور علم کا ہونا بھی ضروری ہے افسوس ہے کہ اس دور کا قاری اب اس گوہرِ نایاب سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ خالد کا دم غنیمت ہے کہ روشِ زمانہ کے مطابق وہ عمومیت کا شکار نہیں ہوا بلکہ اس کے مخالف رخ چراغ جلا رہا ہے کہ "یہی ہے شانِ قلندرانہ"۔

فرمان فتح پوری

مجموعہ ہے عبدالعزیز خالد کی تازہ رُباعیات کا۔ اور رُباعی کی صورت یہ ہے کہ جب تک کوئی شاعر خلاقی و قادر الکلامی کے ساتھ

لحن و بحر کا گہرا شعور نہ رکھتا ہو، اس کا فن قابو میں نہیں آتا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عبدالعزیز خالد میں یہ اوصاف موجود ہیں وہ ایک خلاق شاعر بھی ہیں، موسیقی کی لحنوں کا بھی ادراک رکھتے ہیں متعدد زبانوں کے نبض شناس بھی ہیں اور ان زبانوں کی روایات و اصطلاحات اور تلمیحات کے ذریعے اپنے کلام میں رنگ بھرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

فکر و موضوع کے لحاظ سے عبدالعزیز خالد کی شاعری کی لے مولانا حالی اور اقبال کی اصلاحی لے سے ملتی جلتی ہے۔ یعنی ان کی شاعری ایک ایسے فرد کی آواز ہے جو مسلمان قوم اور ملت اسلامیہ کے لئے فطرت کی جانب سے ایک دردمند دل لے کر آیا ہے اور یہی دردمندی عبدالعزیز خالد کو شاعر کے اس بلند منصب تک پہنچاتی ہے جس کے متعلق خود انہوں نے کہا ہے کہ

شاعر طبعاً دروں پسند ہوتا ہے	از سرتا پا قلب و نظر ہوتا ہے
رہتا ہے وہ اپنے آپ میں گم لیکن	اخبارِ جہاں سے باخبر ہوتا ہے

زہراب کو رنگین بنا لیتا ہے	الحاد کو جزو دیں بنا لیتا ہے
ہے انفس و آفاق میں جو شے بھی اسے	شاعر ملکِ یقیں بنا لیتا ہے

لحن صریر کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس میلان خاص کو خوبصورت رباعیوں کا قالب دینے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اس درجہ کامیاب کہ اردو رباعیات کی تاریخ میں ان کا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چند رباعیاں دیکھئے کیسی پاکیزہ اور خیال افروز ہیں۔

جب تک نہ ہو آزادیٔ اظہار و بیاں	ناممکن ہے نشو و نمائے انساں
ہو جس میں نہ تاب و تب ادراک و شعور	ہے ہر دو جہاں میں رائیگاں وہ ایماں

ہے قلب و زباں دونوں پہ عرشِ حق کی صدا	ناداں ہیں یہ دونوں ان کی بخشش فرما
اغفرلی عمدی و خطئی یا رب	ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت سے بچا

گوپال متل

جناب عبدالعزیز خالدؔ ہندوستان اور پاکستان کے مشہور شاعر ہیں اور ادبی حلقوں میں ان کا نام بڑی عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کی علمی سطح کو بلند کیا ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بے حد وسیع ہے اور مختلف قدیم و جدید تہذیبوں کے علم و ادب اور ان کے اساسی تصورات پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی اسی علمی بصیرت نے ان کی شاعری کو وہ وزن و وقار عطا کیا ہے جس میں ان کا کوئی ہم عصر مشکل ہی سے ان کا شریک ہو سکتا ہے۔

خالد صاحب نے شاعری کی مختلف اصنافِ سخن میں دادِ سخنوری دی ہے۔ غزل، نظم، طویل نظمیں اور عالمی ادب کے بلند پایہ شاہکاروں کے منظوم تراجم سبھی اطراف میں ان کے قلم نے جولانی دکھائی ہے، اور اب وہ شاعری کی مشکل ترین صنفِ رباعی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ "لحنِ صریر" ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔

رباعی واقعی بڑی مشکل صنف ہے اور اس کے فنی تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، لیکن خالد صاحب کو زبان و بیان پر جو قدرتِ کاملہ حاصل ہے اس نے اس راہ کی بھی سخت سے مشکل کو ان کے لئے سہل کر دیا ہے۔ ان کی رباعیوں میں رباعی کے تمام اوزان استعمال ہوئے ہیں اور اس بے ساختگی کے ساتھ کہیں یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ شاعر نے ایسا کرتے ہوئے غیر ضروری کاوش سے کام لیا ہے۔ رباعی کے عمومی مزاج کو بھی خالد صاحب نے پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور اسے زندگی کی ان بصیرتوں کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے جن کی متحمل دوسری اصنافِ سخن نہیں ہو سکتیں۔ ان رباعیوں کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر میں کلام اللہ کی پوری پوری آیات ایک مصرعے کے طور پر شامل ہیں اور باقی تین مصرعے ان کی دلنشین تفسیر بن گئے ہیں۔

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ "لحنِ صریر" کی اشاعت سے اُردو رباعی کے سرمائے میں ایک وقیع اضافہ ہوا ہے۔

زنجیرِ رمِ آہو

ابنِ انشا

میں نے عبدالعزیز خالد کی دو کتابوں کو تبصرہ کے لیے چنا اس لیے کہ ان کے حوالے سے مجھے نئی اردو شاعری کے رجحانات کے متعلق وہ باتیں کہنے میں آسانی رہے گی۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ ہماری شاعری کئی سال سے کمی خون کا شکار چلی آ رہی ہے اور صحت کی لالی کی تلافی ہم غازے اور روج کی مدد سے کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ نئی شاعری میں تجربے کا زوال دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے لگ بھگ نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور پاکستان کے قیام کے بعد غزل کے احیاء کا جو نعرہ چلا وہ اس کی ظاہری علامتوں میں سے تھا۔ تن آسان طبیعتیں کب تک اپنا ہاتھ پتھر تلے دبا رہنے دیتیں۔ موقع پایا تو پھر دو مصرعے کی شاعری کو جسے غزل کہتے ہیں حیاتِ تازہ بخشی اور محنت اور ریاضت کی طرف سے بچنت ہو کے پڑ رہے یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس دور میں جوان اور نوجوان شعراء نے واقعی تغزل اور مضمون بندی دونوں کا حق اس طرح ادا کیا ہے کہ قدما کی یاد ماند پڑنے لگی۔ فصاحت و سلاست کے ساتھ ایک بانکپن ایک تیکھاپن غزل کو ملا لیکن آخر فنا آخر فنا۔ جم غفیر میں ایسے نادرہ کار چند ہی تھے باقی گروہ غزل گویوں کا صدیوں کی منزلیں سالوں میں طے کر کے شاہ نصیر سے چشمک کرنے لگا یعنی ردیف پرستی کا شکار ہو کے رہ گیا۔ شاہ نصیر تو خیر قافیے نئے نئے ڈھونڈ کے لاتے تھے اور تندیل ِ سخن کو منڈھتے تھے ہماری غزل کا تازہ ترین رجحان آدھے مصرعے کی ردیف کا پابند ہو کے رہ گیا ہے کس کس کا رونا رویا جائے۔ کس کس کا حوالہ دیا جائے۔ اس حمام میں ننگوں کا کوئی شمار بھی ہو۔ اب دیکھیے تو اس صنعت میں راہِ مضمون تازہ بند ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ کہیں کہیں جگنو چمکتے ہیں اور بس۔

اس غزل پرستی کے دور میں جب کہ دو ایک اہم شعراء کے حوالے سے یہ بات تعمیم کے ساتھ کہی جانے لگی کہ غزل کی تنگنا میں سے کسی مضمون کا جہاز نہیں گزر سکتا۔ کچھ لوگ تھے کہ شاعری کی دوسری اصناف کی تہذیب میں مشغول تھے۔ یہ لوگ نہ ہوتے تو ۱۹۵۰ تا ۱۹۶۰ کی دہائی غزل کی دہائی کہلاتی۔ جعفر طاہر اور عبدالعزیز خالد اس دہائی کے نصفِ اول کے نمائندے ہیں یہ اس دور کے یولی سس تھے جو لمبے سفروں اور دور کی منزلوں کے قابل تھے ان کا زادِ سفر مطالعہ ریاضت آئیڈیلزم سبھی کا آمیزہ تھا۔ اور یہ کاٹا اور لے دوڑی کے رجحان سے نفور تھے مبدا فیاض سے انہیں طبیعت خلاق ملی تھی اور قلم بھرپور اس لیے انہوں نے غزل اور دوہے کو پیش پا افتادہ جانا اور حالانکہ ہمارے نقاد ان کی کمک پر نہ تھے اور غزل و تغزل کے متعلق کتابیں تیار کرنے میں مصروف تھے تاہم ان لوگوں نے نظر رکھنے والے قارئین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا مقام آپ پیدا کیا۔ اب میں پھر تعمیم سے تخصیص کی طرف آتا ہوں۔ یعنی عبدالعزیز خالد کی کتابوں سے رجوع کرتا ہوں۔

یوں خالد کی بات زرداغِ دل سے شروع ہوتی ہے جس پر عجب ریویو ہوئے۔ فی الواقع خالد کی اس کتاب میں بعض ایسی شگوفہ بندیاں تھیں کہ ان کا ٹوکنا ضروری بھی تھا لیکن ہمدردی کے ساتھ کیوں کہ خالد کی ایک خوبی اس کی اثر پذیری ہے۔ اس کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ خالد مشکل پسندی اور ژولیدہ نگاری کی منزل سے بہت دور آ چکا ہے اب بھی اس کا عربی کا علم کبھی کبھی اس کی شاعری کا دامن کھینچتا مروڑتا ہے لیکن اس کی حیثیت غالب رجحان کی قطعاً نہیں رہی۔ زنجیرِ رمِ آہو جسے میں خالد کا بہترین مجموعہ گردانتا ہوں۔

میں اپنی ملکہ نئی منزلوں کے جہد و استقصا کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ طیور آوارہ اٹھارہ متفرق نظموں کا باب ہے جو سبھی مختصر ہیں۔ اور ایک نہ ایک پہلو علامتی کا لئے ہوئے ہیں۔ پھر غزلوں کے ساتھ کچھ اور نظمیں ہیں جن میں بعض غالباً خالد کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہیں لیکن ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خالد ہمیشہ سے اپنی ناتمامی دور کرنے کا آرزومند رہا ہے۔ اس مجموعے میں خالد کے رنگِ سخن کی معراج اختر شناس اور اس سے بھی زیادہ غبارِ خاطر میں نظر آتی ہے۔ غبارِ خاطر تکنیکی اعتبار سے قصیدہ ہے جس میں متعدد تراکیب بند معنوی ربط سے باہم پیوستہ ہیں اور فکری اعتبار سے خود کلامی۔ اس نظم کے حسب ذیل مقامات خالد دلنوازِ رنگِ سخن کا صحیح تعارف کرانے میں مدد ہوں گے ؎

دستِ صبا نے کھولا منشورِ صبح گاہی — آشفتگانِ شب کو نجمِ سحر پکارا

حل ہو گئے شفق میں ناسفتگانِ گردوں — مجمر میں جل بجھے ہیں اسپند دانہ دانہ

کیفیتِ صبوحی مینائے زر میں ڈھل کر — دیتی ہے بام و در کو اذنِ طلوعِ نشہ

خونابۂ جگر سے چھلکے ایاغِ مستاں — دیکھو اے شرارِ جستہ، سلگی قبائے لالہ!

کھولی دکانِ جلوہ غنچوں نے غرفہ غرفہ — پھر کوچہ گردِ غم ہیں خانہ بدوشِ صحرا!

آخر میں ایک بات آج کے تنقیدی رجحانات کے متعلق نقادوں میں سے عام طور پر ایک شخص کسی کی تخلیق پڑھ کر غلط یا صحیح لیکن اوریجنل رائے دیتا ہے باقی بھی اسی کی بازگشت پیش کرتے ہیں۔

خالد کے کلام پر ابتدا ہی میں مشکل پسندی کی تہمت لگی تھی اس کے بعد کے تنقید نگار منزل منزل اس کا مطالعہ کرنے کے بجائے عموماً انہی جملوں کو دہراتے ہیں حالانکہ اس شروع کی غرابت کا اب شائبہ بھی باقی نہیں رہا۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ خالد سہل ممتنع کہنے لگے کیا غالب اور اقبال کا بہترین کلام سہل ممتنع کی تعریف میں آتا ہے۔ آیا فکری شاعری میں جس کے مضامین غیر روائتی ہوں اور نئے نئے اسالیب و علائم کے متقاضی ہوں۔ سہل ممتنع یا غزل اور دوہے کی سلاست ساتھ دے سکتی ہے۔ خالد کی نغز گوئی ایک طرف کلاسیکی عرب شاعری کی بے باکی لئے ہوئے ہے جو حسن کے مظاہر کی تعریف میں کبھی کبھی ہیجانی بھی ہو جاتی ہے اور شاید اس کی خون کا جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے مداوا بھی کر سکے؛ دوسری طرف سنجیدگی اور تفکر میں اس کے ڈانڈے غالب اور اقبال سے جا ملتے ہیں۔ ان کی شاعری سونگھنے اور وجد کرنے کی چیز نہیں۔ پڑھنے اور ذہناً لذت اندوز ہونے کی چیز ہے۔

اس باغ پر فضا کا غالب بھی نکتہ چیں ہے — بیدادِ فن ہے کتنی، ہنگر سخن کی لذت

اقبال کی نوا میں جو ذوقِ بندگی ہے — دیدہ ور دے وہ بھی فیضانِ طولِ صحبت

اشعار کی بضاعت لایا ہے کوئی خالد — آؤ کریں مشخص ہم اس کی قدر و قیمت!

نصیر انور

عبد العزیز خالد کا تازہ ترین مجموعہ کلام زنجیرِ رمِ آہو ان کی پہلی کتابوں زرداغِ دل، ماتم یک شہرِ آرزو وغیرہ کا مقابلتہً سب سے کم رو سب سے مختصر کتاب ہے لیکن عبد العزیز خالد کی افتادِ طبیعت، مزاج اور ذہنی پس منظر کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد یہی مجموعہ دیتا ہے اور یہی بات اس مجموعہ کی اہمیت کی ضامن ہے کیونکہ اس مختصر سے مجموعے کے صفحات خالد کے ذہن کی پرچھائیوں سے مزین ہیں اور اس مجموعہ کی تخلیقات میں خالد کے دل کی دھڑکنیں شعری سانچوں میں ڈھل گئی ہیں خالد نے منظوم ڈراموں افسانوی نظموں اور کلاسیکی ادب کے شہپاروں کو اردو ادب میں منتقل کر کے نئے اردو ادب میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی ہے۔ اور ان کا شمار جانے پہچانے شاعروں میں ہوتا ہے لیکن زیر نظر مجموعہ کلام

اور طویل ڈرامائی نظم سلومی جسے اس کی طوالت کے باوجود سیکڑوں لوگوں نے تحمل نہیں بلکہ دلچسپی سے سنا اور بے اختیار داد دی۔ عبدالعزیز خالد کے تازہ ترین رنگِ طبیعت اور رنگِ سخن کی نمائندہ ہیں ان میں سلومی تو اس ہیرودیاس کی بیٹی کا قصہ ہے جو یوحنا اصطباغی کی سر بریدگی پر ختم ہوتا ہے کہانی کا ڈھانچہ بھی قریب قریب وہی ہے جو آسکر وائلڈ نے مرقس کی انجیل کے باب ششم پر تعمیر کیا لیکن اصل خصوصیت عبدالعزیز خالد کی کاوش کی اس کا زورِ بیان، انتخاب الفاظ اور سخن ظاہری کا باطنی تسلسل ہے۔ یہ باطنی تسلسل ہر ڈرامے اور ڈرامائی نظم کی جان ہوتا ہے ورنہ خوبصورت اور بدصورت، زوردار اور ڈھیلے سخن پاروں کا شیرازہ کبھی وہ مجموعی تاثر پیدا نہیں کر سکتا جس کا تقاضا ڈرامے کے سامعین اور قارئین کو ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں خالد کی لفظیات پر قدرت اور شوکتِ بیان کا بہترین مصرف نظر آتا ہے ذیل کا ٹکڑا میرے اس دعوے کی کافی وافی دلیل ہونا چاہیئے۔

چاندنی ایسے تھرکتی ہے کہ پگھلی چاندی　　نیلے امبر پہ رواں، چاند کا سیمیں بجرہ
جیسے کھیتی ہیں جواں سانولی سندر پریاں　　چاند ہے پاک و خنک جیسے کوئی دوشیزہ
کوئی منہ بند کلی، کوئی اچھوتا موتی　　گو کلف چہرے پہ ہے جسم ہے لیکن بے داغ
باغیچہ اس کے بدن کا ہے مقفل اب تک　　کورے ہونٹوں کے دہانے کا ہے سوتا محفوظ!

چار لڑیوں میں پروئی ہوئی زنجیرِ گہر　　نقرئی کرنوں میں پابندِ سلاسل مہتاب
سینۂ عاج پہ پہنا اسے اک بانو نے　　نظر آئے مگر اس کو پہن کر تو مجھی
دو الماقست مرے پاس ہیں دو رنگوں کے　　مئے مشکیں کی طرح ایک تو ہے تیرہ و تار
دوسرا آتشی جیسے کہ شرابِ ممزوج　　زرد پکھراج ہر شبیر کی آنکھوں کی طرح
اور پکھراج گلابی نطِ چشمِ خمار　　سبز پکھراج کبھی دیدۂ گربہ کی طرح
دودھیا رنگ کے ہیں ایسے بھی کچھ سنگِ کریم　　برف گوں شعلے نکلتے ہیں ہمیشہ جن سے
دیکھتے ہی جنہیں افسردہ و غمگیں ہو مزاج　　آدمی زاد کی پرچھائیں جنہیں راس نہیں
وہ عقیقِ یمنی اور وہ جزعِ حبشی　　مردہ عورت کی نگاہوں کا حدق ہو جیسے
وام لیں رنگ جو مہتاب سے وہ سنگِ قمر　　بڑے بیضے کی طرح مثلِ گلِ نیلوفر
ہیں خزانے میں مرے نیلم و یاقوت و کبود　　اور یاقوت و بریل اصفر و رمانی بھے

کیوں نہ تڑپی ترے سینے میں تقاضا بن کر　　آرزوئے برہنہ و زبردست افشار!

زنجیرِ درِ آہو کی حیثیت سلومی سے مختلف ہے۔ یہ خالد کی تخلیقات کے تنوع کی نمائندگی کرتا ہے یہاں تک کہ اس میں خالد کی سات غزلیں تک شامل ہیں۔ اس کی پہلی نظم نوائے شوق خالد کے فلسفۂ فن کی نشان دہی کرتی ہے۔

اک ازلی التہاب، اک ابدی اضطراب　　مبدأ فیاض سے قسمتِ آزادگان
سختیٔ دشت و دیار، صدق طلب کا عیار　　راہِ تمنا میں ہے ہر قدم اک ہفتخوان
فطرتِ جولاں پہ ہے عرصۂ آفاق تنگ　　کیسے مقید رہے جذبِ دلِ بیکراں

شاعر کے ذہن اور مزاج کو اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ ان کی شعری تخلیقات کا پس منظر بھی واضح ہو جاتا ہے اور ان کی شاعری کا رُخ اور سمت بھی معین ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ میں چھوٹی بڑی بین نظمیں اور سات غزلیں شامل ہیں اور سبھی تخلیقات میں غم جاں غم جاناں اور غم دوراں کی آہیں اور کاوشیں سموئی گئی ہیں لیکن فنی آئینہ بندی کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ ان ادب پاروں میں زمانہ کی چھوٹ اور عکاسی نسبتاً زیادہ نمایاں ہے اور احساس یہ ہوتا ہے کہ دل کی دھڑکنیں گذرے ہوئے دور کی چاپ اور مستقبل کی آہٹ میں مدغم ہو گئی ہیں اس مجموعہ کو پڑھ کر مجموعی طور پر احساس ہوتا ہے کہ خالد نہ صرف ذہین اور حساس شاعر ہیں بلکہ پڑھے لکھے شاعر بھی ہیں اور انہیں کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں اسی وجہ سے تکنیک میں نیا پن اور الفاظ میں تازگی ہے۔ وہ اکثر الفاظ کو اُن کے لغوی معنی میں کچھ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ زبان کی نادرہ کاری کی وجہ سے بعض الفاظ کے مجازی معنی کو ٹھیس پہنچتی ہے اور کہیں کہیں شعریت مجروح ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جب ایک جیالا فن کار زلفِ جاناں کی مشاطگی چھوڑ کر ذہنی طور پر کاکل گیتی سنوارنے کے منصوبے باندھتا ہے تو شعر و فن کے سانچوں میں تازگی، امنگ، جرات اور توانائی رچ جاتی ہے۔

غلام احمد پرویز

یہ مجموعہ ہے محترم عبدالعزیز خالد کی غزلوں اور نظموں کا جسے خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے۔ جناب خالد انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسر ہیں جنہیں واسطہ پڑتا ہے (بالعموم) کاروباری لوگوں سے اور جن کی کام کاج کی زبان انگریزی ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہیں السنہ شرقیہ پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عربی اور فارسی کے نادر اور پرشکوہ الفاظ کا ایک سیلاب ہے جو امنڈے چلا آرہا ہے اور قدم قدم پر تنگ دامانی کا گلہ طراز ہے۔ ایسی تنگ دامانی میں کشادہ پیدا کرنے کے لئے خالد صاحب بڑی اچھوتی تراکیب وضع کرتے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لئے ہم نے اس کتاب کا تعارف ضروری سمجھا ہے۔ چند ایک الفاظ اور تراکیب ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں۔

(۱) صبحِ عشرت انتمار و شامِ نغمہ بار میں

(۲) برہنہ سرتو ہیں پر ہیں رقیبِ گردشِ دہر
یہ خاکسارِ جہان ۔ بے نوا۔ دریدہ قبا۔

(۳) سبزہ آوارہ ۔ صبا بیگانہ ۔ گلِ ناآشنا
برگ ہائے لالہ یا اوراقِ مرجاں لخت لخت
ارضِ پاکستان ہو آفاق میں والا گہر

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
غمزۂ غماز ہے یا سرمۂ دنبالہ دار
سلکِ مروارید گردوں اس کے طالع پہ نثار
فکرِ فردا ۔ حسرتِ دوشینہ ۔ تصدیعِ خمار

(۴) ارتفاعِ فن سے مٹ جاتا ہے محرومی کا درد
یا مثلاً :-

(۵) لفظ و معنی کے طلسمات شگرف آہنگ ہیں

(۶) جل اٹھیں فکر و نظر کے آبگوں نقش نگار
تودۂ عنبرائے غاسق ۔ کوکبِ دری بنے

(۷) بایہ الفاظ و تراکیب ۔

اک بیاباں لالہ کاری، اک نیستاں آرزو
شعلہ درکش ۔ مستانہ آوارہ ۔ تماشانا آشنا!

محشر آراستہ نشیں ۔ تہ دار ۔ شہر رنگ و بو
وقف اندوہِ تمنا ۔ رہنِ ذوقِ جستجو
برگ برگ اوراقِ محسوسات کا شیرازہ بند

(۸) صبح چہرے کے اجلے اجلے نقوش کا دلربا تقدس
سبو میں ڈھل کے رہینِ ناموسِ میکدہ ہے ۔

بایہ کم

(۹) تمہیں مبارک نشیدِ تلقین ۔ سرودِ انجم ۔ صفیرِ بلبل
جنونِ مشاطگیٔ کاکل ۔ نہ ہے تجرد ۔ نہ ہے تغافل

مجھے تمنائے سروری نے عطا کیا ہے
گدازِ الحانِ ساربانان
مذاقِ طوفِ دیارِ حرماں
سریرِ خاکستر و مغیلاں

(۱۰) حل ہو گئے شفق میں ناسفتگانِ گردوں

(۱۱) یہ دلِ آذر نفس، جس کو نشیمن قفس! ۔ خونِ رگِ صاعقات، خار و خسِ آشیاں

کتاب کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں اس قسم کے الفاظ اور تراکیب نہ ملتی ہوں ۔ اور خالد صاحب کی اسی انداز کی متعدد کتابیں اور بھی شائع ہو چکی ہیں (رزمِ دل ۔ ماتم یک شہر آرزو ۔ سرورِ رفتہ ۔ سلومی ۔ غزل الغزلات وغیرہ) اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ انہوں نے اردو لٹریچر میں کس قدر اضافہ کیا ہے ہمارے ہاں بڑا قحط الرجال ہے جس کی وجہ سے جس شخص کو جس مقام پر ہونا چاہیئے وہ وہاں نہیں ہوتا اس لئے ہماری بہت سی مساعی بارآور نہیں ہوتیں، بایں ہمہ قابلِ تحسین ہیں وہ لوگ جو جس مقام پر ہوں اپنے ذوق کی چنگاری بجھنے نہیں دیتے اور جو کچھ ان سے بن پڑتا ہے کرتے رہتے ہیں ۔

محمد احمد

زیرِ تبصرہ کتاب خالد کا چھٹا شعری مجموعہ ہے اس مجموعہ میں اس کی طبعزاد نظموں اور غزلوں کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے اس سے پہلے اس کے پانچوں مجموعے دنیا کے کلاسیکی ادب کے چنیدہ شہ پاروں سے مستفاد تھے اس طرح یہ مجموعہ اس کے تمام مجموعوں میں جو اب تک شائع ہوئے ہیں، ایک منفرد مقام رکھتا ہے وہ اب تک اردو کے دامن میں دنیا کے ادبِ عالیہ کے پھول ٹانکتا رہا ۔ وہ کبھی سیفو کے پھول لایا ۔ کبھی سلیمان کے نغمات کے ترجموں سے اردو کی تزئین کی کہ جنہوں نے پہلے عبرانی زبان میں جنم لیا ۔ اور پھر آہستہ آہستہ دنیا کی ہر زبان کے دل میں گھر کر گئے ۔ ـــــ لیکن یہ مجموعہ اس شاعرِ نغزگو اور خوش گفتار کے اپنے شگفتہ کلام سے مرتب ہے کہ جس میں اس نے اپنے دل کے جذبات، احساسات اور افکار کی ترجمانی

کی ہے۔ اس مجموعہ میں نظمیں بھی ہیں ـــــ نظموں میں نوائے شوق، مینارۂ نور، ذکر و فکر، حکایتِ نے، سالِ نو، راہ و رسم، منزلہا، اور اختر شناس کے علاوہ زیادہ تر مختصر نظمیں ہیں ـــــ مختصر نظم کی صنف اردو ادب میں عروس نو کی سی حقیقت رکھتی ہے۔ اس شاعر بے دار کو اس صنف پر کامل قدرت حاصل ہے۔ عبدالعزیز خالد کے اس مجموعے میں معنی آفرینی، فکری رسائی اور مٹھاس کے اعتبار سے اس کی مختصر نظمیں اس کے بقیہ کلام پر حاوی نظر آتی ہیں۔ طبورہ آلہ اور غبار خاطر کے عنوان سے اس کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ نظمیں بالکل سیفو کی پھولوں کی طرح ہیں۔ مختصر حسین اور جاذب نظر اس کی ایک مختصر نظم ملاحظہ ہو۔

بام و دُور کی غنودہ پلکوں پر
ابر جیاں کا رس ٹپکتا ہے
دُور جنگل میں اک حزیں طائر
فرقتِ غم میں سر پٹکتا ہے

رفتہ رفتہ بساطِ عالم پر
ظلمتوں کا نزول ہوتا ہے
میرا دل ہے وہ مرغ پر بستہ
جو سرِ شام اداس روتا ہے

اس کی نظمیں براہِ راست دل پر اثر کرتی ہیں اور یہ اثر ذہن پر محیط ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قاری کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ جیسے یہ اس کے دل کے سوتوں سے پھوٹ کر نکل رہے ہیں۔

یادوں کی چادر اوڑھ کر
خوابوں میں کھو جاتا ہوں میں
اکثر شب خاموش میں
کرنوں کی نرم آغوش میں
رس پی کے سو جاتا ہوں۔

روانی کا یہ عالم ہے کہ پڑھتے ہوئے ذہن اس کے تخیل کی لہروں کے ساتھ ان وسعتوں سے ہم کنار ہو جاتا ہے کہ جہاں میں اور تو کی تفریق باقی نہیں رہتی۔

خالد بنیادی طور پر ایک نظم گو شاعر ہے لیکن وہ غزل کے میدان میں بھی کچھ کم کامیاب نہیں۔ دراصل اس کو بات کہنی آتی ہے ـــــ اس کیلئے صنف کا کوئی قید نہیں۔ غزل ہو یا نظم وہ دونوں پر کامل قدرت رکھتا ہے۔

حسن مغرور بھی ہے مائل بھی
عشق سلطاں بھی ہے سائل بھی
یہی مشکل تو ہے محبت میں
کہ یہ آسان بھی ہے مشکل بھی
ہائے اس جلوے کی خود آرائی
کہ ہے مستور بھی مقابل بھی

دوسری غزل کا شعر ہے ؎

صحرائے آرزو میں جو بس ہے نہ سنگِ میل
دریائے خاک و خوں ہے تری رہگزر نہیں

اس کے اشعار میں سوز و ساز کی لذت انتظار کی آگ، نگاہِ ناز کے افسوں، لب و کنار کے راگ ـــــ غرض زندگی کی پوری نغمگی اور لطافت موجود ہے۔

عبیداللہ علیم

عبدالعزیز خالد ایک زمانے سے اردو شاعری کو خونِ جگر نذر کر رہے ہیں۔ وہ کئی مجموعوں کے شاعر ہیں جن میں ان کی طبع زاد تخلیقات بھی ہیں، اور ترجمے بھی، ان کا قلم ہر انداز اپنی جولانیاں دکھا رہا ہے۔ اور ان کی انفرادیت پر مہر ثبت کر رہا ہے مگر یہاں اس مختصر تبصرے میں بھی

ان کی ساری شاعری سے بحث نہیں۔ میرے سامنے فی الوقت ان کا طبع زاد مجموعہ کلام "زنجیرِ رمِ آہو" دوسرا ایڈیشن ہے۔ اور میں اسی کے تاثر اور پس منظر میں کچھ عرض کروں گا۔

جس طرح زندگی اپنے خارج و باطن میں گوناگوں ہے۔ مسلسل تغیر پذیر ہے اور نت نئے سانچوں میں ڈھل کر سامنے آ رہی ہے بالکل اسی طرح ادب بھی اپنے مزاج و رنگ رکھتا ہے اور زندگی کی مسلسل بنتی اور بگڑتی ہوئی تمام صورتوں اور ہیئتوں کا عکاس ہے۔ جس طرح کسی ایک پیمانے سے زندگی کی پیمائش ممکن نہیں بالکل اسی طرح تمام ادب ایک کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ بڑی اور زندہ آوازیں اپنا معیار آپ ہوتی ہیں نہ انہیں کسی مقابلے کی ضرورت ہوتی ہے نہ موازنے کی۔ یوں ان میں تہذیبی ورثے میں پائی ہوئی ہزار آوازیں ہوتی ہیں مگر وہ سب کو ایک ساتھ اپنا مار کر لگا لیتی ہیں۔ ان کے اپنے بنائے ہوئے معیار کے کسی اور معیار پر پرکھنے سے یہ ہوتا ہے کہ یا تو معیار پست ہو جاتا ہے اور آواز بڑی یا معیار بلند اور آواز پست۔ ایسا کچھ بھی ہوتا ہے مگر اس آواز کے حقیقی رنگ و روپ تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ مثلاً میر، غالب، نظیر، اکبر، اور اقبال ہمارے یہاں کے بڑے شاعروں میں ہیں۔ ان پانچوں کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زبان مختلف ہے۔ لب و لہجہ مختلف ہے اگر ایک کی شاعری کو پیمانہ محض قرار دے دیا جائے تو باقی ہیچ در ہیچ۔ مگر ادب میں ہم ہمیشہ ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر فنکار کو اسی کی سطح سے دیکھنے اور سوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہر بڑی اور عظیم آواز کے لئے ایک نیا سانچہ وضع کر لیتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے میر و غالب دونوں کا عہد دیکھا اور معتوب ادب رہے۔ مبتذل ہے بھکڑ ہے لغو ہے کے الزام ان کے سر لگتے رہے۔ مگر جیسے ہی ۔۔۔۔ انہیں کے مقام سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک دم بڑے نظر آنے لگے اور اب پڑھے لکھے لوگ ان پر یہ الزام نہیں لگاتے۔

عبدالعزیز خالد کی شاعری کے بارے میں پست و بلند کا فیصلہ تو جب ہوگا تب ہوگا مگر یہ بات تو فیصل ہے کہ ان کی شاعری کی پیمائش بھی کسی سابقہ پیمانے سے نہیں ہو سکے گی۔ ان کا اسٹائل، ان کی زبان، ان کا پھیلاؤ خالصتاً ان کا اپنا ہے۔ اگر کہیں کوئی شریک ہے تو صرف اقبال۔ ان کے لئے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زبان نامانوس ہے۔ دقیق ہے۔ عربی و فارسی زدہ ہے۔ یہ سب درست مگر قصور عبدالعزیز خالد کا نہیں بلکہ قاری کا ہے جسے یہ زبان نہیں آتی اور نہ وہ سیکھنا ہی چاہتا ہے۔ زبان کو وسعت دینا کوئی کفر نہیں۔ تجربہ کرنا کوئی گناہ نہیں اگر عبدالعزیز خالد اس کام میں آگے ہیں تو مبارکباد کے مستحق ہیں۔ قابلِ رشک ہیں۔ نہ یہ کہ ان کے عمل سے اپنے اندر چڑچڑاہٹ پیدا کر لی جائے۔ ایک طرف تو ہم اپنی زبان محدود ہونے کا رونا روتے ہیں۔ اور دوسری طرف ہم اتنے تنگ نظر ہیں۔ آخر سہل ممتنع کی گالیاں اردو شاعری کب تک برداشت کرتی رہے گی اور کب تک اپنی بڑھوت سے گریز کرے گی۔ تجربے، وسعت اور بڑھوت اپنا دھیان مادر پدر آزاد نظم کی طرف نہ لے جائے جو اب رسوم، معنی اور کیفیت سے بھی بے نیاز ہونا چاہتی ہے۔ نظم آزاد اور معرا نظم لکھنا جان جوکھم تھا تو کچھ تن آسان شعبدہ گر جاگ کھڑے ہوئے اور دوسرا کام دکھانے لگے۔ لعض مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کی شعبدہ گری کوئی ایک ہی شخص مختلف ناموں سے کر رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گونگے کی زبان گونگے کی ماں جانتی ہے اور ان گونگوں کی دو چار مائیں بھی ہیں جو کبھی کبھار اپنے بیٹوں کی حرکتیں سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ہاں تو عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ شخصیت بڑی ہمہ گیر پہلودار اور سیمابی ہے۔ اس کے تخلیقی عمل میں ایک ازلی التہاب اور ایک ابدی اضطراب شامل ہے۔ اس کے لئے ہر نظر ایک ابتلا ہے اور ہر نفس ایک امتحان۔ مگر اس کی شاعرانہ ذات کہیں بے اعتنائی برتتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ کبھی وہ قومی اور سماجی مسائل سے دوچار ہوتی ہے۔

کبھی ہنستی ہے اور کبھی طنز کرتی ہے کبھی جھلا جاتی ہے مگر مایوس نہیں ہوتی۔ رجائیت اس کا ایمان ہے۔ کبھی اس سے آگے نکلتی ہے اور آفاقی سطح پر اپنے اندر ہزار نسلیں آباد کر لیتی ہے۔ ان میں رچ بس جاتی ہے اور اس کی زبان بولنے لگتی ہے اور اپنی زبان انہیں سکھاتی ہے اور اس کا مذہب محبت ہی محبت ہے اور کبھی وہ فطری مناظر میں کھو جاتی ہے اور ان کے حسن سے مسحور ہو کر رقص کرتی ہے۔ کنارِ دریا پہنچتی ہے۔ لذت و مستی کے موتی چننے لگتی ہے۔ چاند کا افسوں، رات کا جادو گیلی ریت کی سوندھی سوندھی خوشبو، گھاس کے اودے اور ٹھنڈے سہانے سبزہ پر کہنیوں کے بل لیٹ کر

بادِ صبا کے آوارہ جھونکوں اور چاندکی مدھ ماتی کرنوں سے کھیلتی ہے۔ کنوارے کھیت، سہاگن فصلیں، چہلیں کرتے پکھیرو، رنگ افق سے عکسِ شفق سے پگھلی چاندنی بہتا سونا دیکھتی ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتی ہے یہ سب نظارے اپنے ہیں۔ اور پھر کبھی وہ خالصتاً رومانی ہوجاتی ہے۔ ہر جمیل چہرہ اسے HAUNT کرتا ہے وہ چہرہ اور جسموں کے رنگوں اور خوشبوؤں کے سیلاب میں بہنے لگتی ہے ؎

سجل سڈول بدن کام روپ من کے کٹھور

قدم قدم پہ مقابل سجیلے سینہ زور

شکم برنگِ صدف چھاتیاں نکیلی نکور

کتنی شکنتلائیں ہیریں اور قلوپطرائیں اس کے خون میں ناچنے لگتی ہیں مگر اس کی ذات کا عشق ہوس پرست نہیں وہ حسن کے گرم و آسودہ آغوش میں آفاتِ دنیائے دوں سے امان حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مگر اسے یہاں بھی اطمینان نہیں ملتا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتی ہے ؎

رفیقِ سفر زندگی مستقل کش مکش ہے

مرے لب پہ بانگِ رجز کانپتی ہے

نقیبِ بغاوت ہوں جو مرے ساتھ آئے

مسلح ہو تیغ و سناں سے

ہو آگاہ تاریخِ جرم و سزا سے

حکایاتِ عذر و وفا سے

تنِ محکم و قلبِ درد آشنا سے

مری عمر کا بی عبادت ہے صبر و عزیمت سے

پیہم "تگاپو سے" کرب و بلا سے

اور پھر کہیں خالدہ کے سینے میں ایک قافلہ سالارِ شوق کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کے لئے زندگی ایک نگارستانِ نغمہ اور ایک خیالستانِ حسن بن جاتی ہے اور پھر اسے اپنی جولانگاہِ فکر میں عرصۂ آفاق بھی تنگ ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور اپنی ہی لے میں الاپتا ہوا جانے کس منزل کی جانب نکل جاتا ہے۔

دل ہے پہلو میں مرے اک قافلہ سالارِ شوق

والہانہ نو خیال و تازہ کار

اک بیاباں لالہ کاری، اک نیستاں آرزو

شعلہ وش، مستانہ، آوارہ، تماشا آشنا

ایک قطرۂ خوں پر افشانی سے دریا آشنا

نامرادانہ، پریشاں، بےقرار

وقفِ اندوہِ تمنا، رہنِ ذوقِ جستجو!

برگ برگ اوراقِ محسوسات کا شیرازہ بند

عاشقِ حسنِ بیاں، سودائیِ فکرِ بلند!

انجم اعظمی

"زرِ داغِ دل" کے مصنف عبدالعزیز خالد کی تخلیقات کا مجموعہ "زنجیرِ رمِ آہو" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں خالد کا وہی جانا پہچانا لہجہ ہے جو ان کی دوسری کتابوں میں ملتا ہے۔ خالد کے متعلق لوگ یہ رائے قائم کر چکے تھے کہ وہ صرف طویل نظمیں ہی لکھا کریں گے لیکن یہ مجموعہ رنگا رنگ ہے اور ان کی شاعری کے تنوع کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مجموعے کی نظموں اور غزلوں میں نئے دور کی جمالیاتی قدریں وافر ہیں۔ ادب اور فن کے لوازمات کے ساتھ فکر کی لہریں بھی ملتی ہیں جو شعری حسن سے جلا پاکر نکھر گئی ہیں۔

وفا راشدی

عبدالعزیز خالد ہمارے جانے پہچانے، خوش فکر، خوش طبع اور خوش گفتار شاعر ہیں۔ تخلیقِ پاکستان کے بعد سے اب تک ان کے افکارِ لطیف و نغمات روح نواز فضائے شعر و نغمہ میں برابر گونج رہے ہیں۔ ان کی طویل نظمیں، منظوم تمثیلیں اور کلاسیکی تخلیقات اکثر معیاری رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہو کر پڑھے لکھے طبقے سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ گزشتہ چند سال میں خالد نے "ماتمِ یک شہرِ آرزو"، "زرِ داغِ دل"، "سرودِ رفتہ"، "سلومی" اور "غزل الغزلات" جیسی زندہ جاوید تصانیف پیش کر کے نہ صرف اردو زبان کی بے پناہ خدمت انجام دی ہے بلکہ اردو ادب کو کلاسیکی ڈراموں اور ادبِ عالیہ کے شہ پاروں سے بھی مالا مال کر دیا ہے۔ ان کی ہر ایک کتاب ایک نئے سج دھج، نئے علمی لہجہ، نئی آواز اور نئے فکری انداز کے ساتھ منظرِ عام پر آتی رہی اور اہلِ ذوق اربابِ فکر و ادب کو دعوتِ فکر و نظر دیتی رہی ہے۔ "زرِ داغِ دل" دس طویل ڈرامائی نظموں کا قابلِ قدر مجموعہ ہے "سرودِ رفتہ" میں زمانۂ قدیم کی سب سے بڑی یونانی شاعرہ سیفو کی لازوال رومانی اور بے پایاں محبت کے جذبات سے لبریز نظموں کو اردو شعروں کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ "سلومی" ایک انگریزی ڈرامہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ تمثیل شروع سے آخر تک خاص تاثر کی حامل ہے جو کرب انگیز بھی ہے اور ہمہ گیر بھی۔

"غزل الغزلات" عہد نامۂ عتیق کے عجیب و جلیل شاہکار "نشید الانشاد" کا منظوم ترجمہ ہے۔ خالد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کتابوں میں سے ہر ایک کتاب محض ترجمہ نہیں بلکہ تخلیقی کارنامہ ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ یہ پانچوں کتابیں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے حسن، ادب، آرٹ، زندگی کے تمام عناصر سے پوری رعنائی و دل پذیری کے ساتھ مزین ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوصف خالد کی طبع زاد نگارشات کی کمی محسوس کی جا رہی تھی یا دوسرے الفاظ میں یارانِ میکدہ میں یہ بات زیرِ بحث تھی کہ خالد کے ہاں جو کچھ ہے وہ غیر زبانوں سے مستفاد ہے ان کا دامن فکرِ طبع زاد پھولوں سے خالی ہے "زنجیرِ رمِ آہو" عبدالعزیز خالد کا چھٹا شعری مجموعہ ہے

اس کی اشاعت سے نہ صرف وہ کمی پوری ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شاعر اگر ذہین اور پڑھا لکھا ہو تو وہ کلاسیکی ادب کی بنیاد پر تخلیقاتی شان بھی پیدا کر سکتا ہے اور طبع زاد شاہکار کا موجد بھی بن سکتا ہے

قمر سلطانہ

زنجیرِ رمِ آہو عبدالعزیز خالد کا ساتواں مجموعہ ہے اس سے خالد کی شعری صلاحیتوں اور محنت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خالد اُن شاعروں میں سے ہیں جو کہنے کے علاوہ سوچنا بھی جانتے ہیں اور فن کو محنت اور ذمہ داری کا کام سمجھتے ہیں۔ اُن کے کلام میں وہ فکری عنصر ہے جو شاعری کا رتبہ پیغمبری تک پہنچاتا ہے۔ خالد کے ہاں تخلیق کی تڑپ فکری عنصر کے ساتھ گھل مل کر ایک نئے امکان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ زنجیرِ رمِ آہو اس اعتبار سے مختلف چیز ہے کہ اس مجموعہ میں خالد کے جذبات اور احساسات کی جلوہ گری ہوئی ہے۔ اس میں فکر سے زیادہ احساس کارفرما ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ اور نظموں میں عشقیہ جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔

اس اعتبار سے یہ مجموعہ خالد کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے اور ہم اس شاعر سے روشناس ہوتے ہیں جو ہر چیز کو حسی تجربہ بنا کر اپنی شاعری میں پیش کر رہا ہے۔

محمد اکبر الدین احمد

خالد صاحب اردو ادب میں اپنی جدت پسندی اور انوکھے انداز شعر کی بنا پر کافی متعارف ہیں۔ اس سے پہلے آپ کی کتابیں "زیر داغ دل"، "ماتم یک شہر آرزو" اور "سرود رفتہ" منظر عام پر آ کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ "زنجیر رم آہو" کچھ عجیب سا نام زیر نظر کتاب کا ہے اس میں سات غزلیں ہیں۔ چار ترکیب بند اور باقی نظمیں۔

خالد صاحب نے اپنے بلند اور ارفع و اعلیٰ ذوق کی ترجمانی کی ہے۔ اشعار میں روانی، ترنم اور سلاست بھی ہے۔ جہاں فارسی ترکیبیں اور الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں وہاں شگفتگی اور سلاست متاثر ہو گئی ہے لیکن روانی مجروح نہیں ہونے پائی۔ اقبال اور غالب سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں۔

اپنے ترکیب بند "نوائے شوق" میں وہ خدا سے ملتجی ہیں کہ

ایک نیستاں ہوں میں، کہ مری نے کو عطا
حدت مہر مبیں، خنکیٔ ماہ تمام

اپنی مادر علمی سے مخاطب ہو کر جو اشعار قلمبند کئے ہیں۔ نہایت پُرجوش، اثر انگیز اور حوصلہ افزا ہیں۔ کہتے ہیں

تجھ سے وعدہ کرتے ہیں اے علم و حکمت کے حصار
زندگی کی دوڑ میں بڑھ کے رہیں گے گرم کار

اس مقدس نام کو بخشیں گے ہم تابندگی
سربلندی، سرفرازی، شہرت و رخشندگی

ایک دن گونجے گی تیرے ذکر سے بزم وطن
داستاں در داستاں اور انجمن در انجمن

خالد صاحب نے زندگی کو مصائب و آلام کی آماج گاہ قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں مایوسی اور قنوطیت پیدا نہیں ہوئی، وہ زندگی کے شاعر ہیں اور اسی لئے کہتے ہیں۔

حریر و مخمل و دیبا کی آرزو ہی نہیں
ہمیں تو جینا ہے خاشاک و خس پہ جی لیں گے

چراغ راہ گذر بجھ چکا ہے بجھنے دو
دل و نظر کے چراغوں سے روشنی لیں گے

ہمارے جیب و گریباں ہیں چاک، چاک سہی
ہم اپنے جیب و گریباں کے چاک سی لیں گے

شفیع عقیل

گزشتہ دس بارہ برس کے عرصہ میں اردو شاعری میں جو چند نئی اور مؤثر آوازیں سنائی دی ہیں ان میں عبدالعزیز خالد کی آواز بھرپور بھی ہے اور ہمہ گیر بھی۔ انہیں جو چیز دوسرے شاعروں سے الگ کرتی ہے وہ ان کا اپنا انداز فکر اور منفرد طرز بیان ہے طویل نظم گوئی میں انہیں جو ملکہ ہے وہ ان کے ہمعصروں میں شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔ "زنجیر رم آہو" عبدالعزیز خالد کا پانچواں مجموعہ ہے اس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی لیکن خالد بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ غزل ان کا میدان نہیں۔ ان کے پاس سرمایۂ الفاظ بھی ہے اور سوچنے کا ایک خاص انداز بھی۔ ان کی نظموں میں ایک مخصوص ڈرامائی فضا قائم ہو جاتی ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں "طیور آوارہ" "دو آوازیں" "ستارہ شناس" اور "غبار خاطر" نظموں میں بھی فضا پوری طرح قائم ہے اور اس مجموعہ کی یہ کامیاب نظمیں ہیں۔

ابنِ فرید

عبدالعزیز خالد اردو ادب کے ان شاعروں میں سے ہیں جو اپنی معاملہ بندی، رعایتِ لفظی، ابہام گوئی یا مشاعرہ بازی کی وجہ سے زندہ نہیں رہیں گے بلکہ سرمایۂ ادب میں ایک گراں بہا اضافے کی بنا پر زندہ رہیں گے۔ اب تک یہ عام رجحان رہا ہے کہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صرف اپنی خیال آرائی تک محدود رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ رہی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے شعراء نے ژرف نگاہی کی طرف کم سے کم توجہ دی ہے۔ ژرف نگاہی کے لئے وسعتِ مطالعہ کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور بدقسمتی سے اردو شعراء کا یہ حال رہا ہے کہ

ع ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

شاعری تو ہوتی رہی لیکن سرمایۂ ادب میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ مغربی زبانوں کے ادب کے سرمایہ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں ترجمے کا فن کس قدر عروج پر ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں اعلیٰ ادبی تخلیقات کا انتقال بڑی سرعت کے ساتھ ہوتا رہتا ہے اور ترجمہ بھی اتنا ہی معیاری ہوتا ہے جتنی اصل تصنیف ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ مغربی زبانوں کا قاری یا ادیب وسعتِ مطالعہ کے سلسلے میں بے بس و مجبور نہیں ہوتا۔ اردو ادب میں یہ رجحان ابھی عام نہیں ہوا ہے لیکن اب اس طرف امید افزا حد تک توجہ ہونے لگی ہے۔

عبدالعزیز خالد ایسے ہی صاحبِ صلاحیت فنکاروں میں سے ایک ہیں۔ جنہوں نے دوسری زبانوں کے ادبی شاہکاروں کو اردو نظم کے قالب میں ڈھالنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔

"زنجیں رم آھو" عبدالعزیز خالد کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں چند نظمیں "مستفاد" ہیں۔ اگر خالد حوالہ دے دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس مجموعہ میں کل تخلیقات کی تعداد ۷۰ ہے۔ جن میں سات غزلیں بھی شامل ہیں ۔ خالد کی شاعری میں جذبات کا طوفان نہیں ہوتا ان کے یہاں تخیل اور فکر کی دھیمی دھیمی آنچ ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی مادرِ علمی اسلامیہ کالج لاہور پر جو نظم اسی عنوان سے لکھی ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ عالمِ جنوں میں بھی وہ ہوش و خرد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے

شعر کی ہیئت میں نئے تجربے کرنے کا شوق بھی خالد کے یہاں نمایاں ہے۔ رائج ہیئتوں سے وہ مطمئن نہیں ہیں اس لئے اظہارِ خیال کے لئے اپنے سانچے خود بناتے ہیں۔ اس کی ایک مثال نظم "بہار و خزاں" میں ملتی ہے

بہار آئی

سنہری کونپلیں پھوٹیں — در و دیوار پر ہے سبزۂ نورستہ کا جوبن
مہک اٹھے گل و گلشن — شبستاں ہو گئے روشن
کسانوں کی مشقت رنگ لے آئی — گھنی سرسبز فصلیں لہلہا اٹھیں
سرِ صحرا سمن زاروں کا منظر ہے۔

اس ہیئت میں تجربے کے ساتھ ساتھ ترنم بھی ہے۔ پوری نظم میں رومانی شاعری کا حسن جاری و ساری ہے۔ فکر و خیال کے لئے ہیئت کا انتخاب کرتے ہوئے خالد رومانی شاعری سے گریز کر کے ملٹن کا لہجہ اختیار کر لیتے ہیں

تم کاروانیوں کو بیکِ صبا مبارک — چلتے ہیں پا پیادہ ہم نقشبندِ حرماں
ہم کو نہیں ضرورت آرائشِ گلو کی — ہم خود بہار گر ہیں اے دستِ گل فروشاں
ہم کردگارِ نغمہ، ہم خالقِ معانی — سوزِ جگر سے کرتے ہیں دشت میں چراغاں

جوہر میر

غزل ہماری محبوب صنفِ سخن ہے۔ اردو شاعری کی بنیاد اسی پر قائم ہوئی اور اردو نے اسی سے نشو و نما پائی۔ مختلف ادوار سے گزر کر جو معراج غزل کو حاصل ہوئی ہے شاید ہی کسی اور صنفِ سخن کو نصیب ہو۔ اس صنف کے مقبول اور پسندیدہ ہونے کی یہی ایک دلیل ہے۔ غزل کے اس ارتقا سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اس دور میں غزل میں نسبتاً داخلی واردات کم ہوتی ہیں مگر اس بات کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے کہ غزل ہماری داخلی کیفیات کی ترجمان ہے۔ یہ ارتقاءِ ادب ہمارے سامنے مختصر نظموں کی صورت میں بھی جلوہ گر ہے۔ غزل کی ترقی اور اس مقام سے قطع نظر اس دور میں جو مقام اور رفعت نظم نے حاصل کی ہے وہ بھی کچھ قابلِ فخر نہیں۔ نظموں میں مختصر اور طویل دو بڑی قسمیں ہیں۔ تاثر اور مفہوم کی گرفت کے اعتبار سے مختصر نظم نے کافی شہرت پائی لیکن ان میں اعتدال سے زیادہ ابہام قاری کے نظم کی روح تک پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ قاری مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ نظم کے متعلق اپنی ہی کوئی رائے قائم کرے اور بس۔ طویل نظموں میں ابہام کی ایسی کوئی وجہ بظاہر دکھائی نہیں دیتی جو پڑھنے والے کو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے کو چھوڑ دے۔ عبدالعزیز خالد کے زیرِ نظر مجموعہ میں چند ایک غزلوں کے سوا سب طویل نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں شاعر کے ذاتی محسوسات کی آئینہ دار ہیں۔ طویل نظموں کا پھیلاؤ اگرچہ صبر آزما ہوتا ہے پھر بھی قاری پڑھنے کے بعد مایوسی یا کوفت محسوس نہیں کرتا۔ خالد کی ان نظموں میں شاعری زیادہ ہے اور ابہام کم۔ ان نظموں میں مختصر نظموں والا گورکھ دھندا نہیں۔ دوسری بات ان نظموں کا ڈرامائی اسلوب ہے جس سے کہانی کا ربط قائم نظر آتا ہے اور کسی جگہ بھی پڑھنے والا الابوریت کا شکار نہیں ہوتا۔ عبدالعزیز خالد کا یہ مجموعہ اردو ادب میں اچھے تجربات کا نچوڑ ہے۔ خالد نے اس صنف کو آگے بڑھانے کی جو مقدور بھر کوشش کی ہے وہ اطمینان بخش ہے۔

رخشندہ ... لاس

"زنجیرِ رم آہو" متعدد حیثیات سے ایک امتیازِ خاص کی حامل ہے۔ اس کتاب میں شاعر کا فن نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ خصوصیات جو متعدد مجموعوں میں جدا جدا ہیں، اس کتاب میں یکجا نظر آتی ہیں۔ عربی شاعری کی پیوند کاری، نئی ترکیبوں کی تخلیق، غیر زبانوں سے تراجم کا اس شان سے کہ اصل اور نقل میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے اور سب سے بڑھ کر وہ جذبۂ شوق جو اقبال کے طرزِ کلام سے مستعار ہے۔ لیکن اپنی انفرادیت پوری شان کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہے۔ ان صفات و خصوصیات سے بالاتر تغزل کا وہ رچا ہوا رنگ ہے جس میں پختگی بھی ہے، رعنائی بھی، اور دل میں کھب جانے والی ادا بھی۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ "زنجیرِ رم آہو" میں عبدالعزیز خالد کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ کتاب کا آغاز "نوائے شوق" سے ہوتا ہے۔ چار شعر ملاحظہ فرمائیے۔

روحِ سرودِ سخن، خوابِ خیال و فغاں — سینۂ صد چاک سے فیض کے سوتے رواں
جوہرِ تخلیق ہے بادۂ مینا گداز — ہر نظر اک ابتلا، ہر نفس اک امتحاں
اک ازلی التہاب، اک ابدی اضطراب — مبدءِ فیاض سے قسمتِ آزادگاں
سختیٔ دشت و دیار، صدقِ طلب کا عیار — راہِ تمنا میں ہے ہر قدم اک ہفت خواں

"نوائے شوق" کا جوش اور ولولہ پورے حسن و جمال کے ساتھ جاری رہا ہے۔

پائے خضر کے لئے راحتِ منزل نہیں — بالِ ہما کے لئے شاخِ نشیمن کہاں
حیلۂ الفاظ میں شاہدِ معنیٰ مقیم — غالیہ مُو، شعلہ رو، عربدہ جو بیقرار

ملاحظہ فرمائیے ہمارے شاعرِ اعظم فن کے متعلق کیا سخن سرائی کرتے ہیں۔

منزلِ فن دور ہے، عظمتِ فن دور تر — آہوئے دشتِ ہنر ہوتا ہے مشکل سے رام

"اے میرے ہمدم" میں شاید آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی

طوفاں کے تھپیڑوں میں رہا میں، زحمت کشِ انتظار تیرا!
تو میرے لئے کنارِ ساحل ٹھہرا تو بہ مشکل ایک لمحہ

"دورِ عنفوانِ جوانی" کے چند اشعار جو پورے ایک دیوان پہ بھاری ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

حسن پرکار تھا آخر متلون نکلا عشق سودائی تھا یک دانۂ دل ہار گیا
آج اس دل پہ ہے الزامِ فریبِ وحشت جو تیری جلوہ گہِ ناز سے خوں ہار گیا

"ذکر و فکر" کے عنوان سے ایک بڑی فکر آفریں نظم ملتی ہے۔

"سحرِ حلال" کے نام سے اس میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

شعلہ زن ہے رگِ الفاظ میں خونابِ جگر تجربہ گاہِ حوادث میں پلا ہے مرا فن

یقیناً اس کے بعد وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ

عرصۂ دہر میں نغموں کو پرافشاں کر دیں لیلیٰ شعر کی زلفوں کو پریشاں کر دیں

ذوقِ تخلیق سے کریں نئی دنیا تعمیر شوقِ تجدید سے صحرا کو گلستاں کر دیں

ایک نہایت مرصع غزل کا ایک شعر جو سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

پھر ترے آستاں پہ لے آئی کھینچ کر لذتِ جبیں سائی

"واسوخت" کا ایک فنکارانہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

سپردگی بھی، تلون بھی، برہمی بھی ہے ادا ادا میں نئی رمز ہے اشارہ ہے

"زندگی اے زندگی" میں حکمت بھی ہے اور فکرِ بلند بال بھی

زندگی اے زندگی ممکن نہیں تجھ سے مفر اور ہے تو موت کی آغوش قصہ مختصر
دامنِ فطرت ہے بیشک ایک بساطِ رنگ و بو اور گرماتے ہیں دل کو نو بنو جلوے مگر
ماحصل ان کا ہے کیا؟ بجز خوف و رنج و اضطراب آسیائے دہر میں دن رات پستا ہے بشر
حسرتیں آتی ہیں فوراً گوشمالی کے لئے اتفاقاً بھی ہو دل سے گر مسرت کا گزر

خالد نے غزلیں کم کہی ہیں لیکن جو کچھ کہی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو غزل کے بہترین شاعر ہو سکتے ہیں غزل جیسی مشکل صنفِ غزل کو جس کامیابی سے خالد نے "اسیرِ دام" کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کے تغزل میں زبان کی حلاوت بھی ہے، بیان کی چاشنی بھی، فلسفہ بھی اور حکمت بھی، سوز بھی اور ساز بھی، تبسم بھی اور گریۂ اختیار بھی فرماتے ہیں۔

کون ہے محرم یہاں رمزِ درۂ شوق کا زندگی محرومیاں، عاشقی رسوائیاں
یہ دلِ خوباں پرست، مستِ شرابِ الست خسروِ اقلیمِ شوق، خاکِ رہِ دوستاں

چنانچہ عبدالعزیز خالد جہاں دوسری اصنافِ سخن میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں وہاں وہ تاجدارِ غزل کہلانے کے بھی مستحق ہیں

ڈاکٹر وزیر آغا

میں نے ابھی ابھی جناب عبدالعزیز خالد کی شعری تصنیف "کفِ دریا" کا مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ تو کہوں گا کہ میں نے اس مجموعے کو ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالا۔ البتہ اس بات کے اظہار میں مجھے تامل نہیں ہے کہ میں نے اسے ایک ہی نشست میں پڑھا اور بہت سے پردے میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گئے۔ پردے میں نے اس لئے کہا کہ پرتیں فطرت کی دین ہیں۔ لیکن پردے انسان خود آویزاں کرتا ہے اور اپنی تخلیقات کے سلسلے میں تمام پردے عبدالعزیز خالد نے اپنے ہاتھوں سے بُن کر جگہ جگہ آویزاں کئے ہیں۔ ایک عام قاری ان میں شاید الجھ کر رہ جائے۔ شاید دل گرفتہ ہو کر کتاب کو ہی پرے پھینک دے شاید عربی فارسی کے حوالوں اور تلمیحات کی فراوانی کے پیش نظر ایک ناگوار سے ردِ عمل کا بھی مظاہرہ کرے۔ لیکن اس میں خطا سراسر اسکی اپنی ہوگی۔ میں نے خالد صاحب کے ان اشعار کو بوجھل پردوں سے الگ کر کے پڑھا ہے اور مجھے ان میں گرم، زندہ وتازہ، باطن کی حدت میں پگھلتے ہوئے افکار ملے ہیں اور جن اشعار نے ان کو سمیٹا ہے۔ ان میں مجھے بلا کی مٹھاس۔ تندی۔ روانی اور خلوص کا احساس ہوا ہے۔

• کفِ دریا کی تقریباً ہر شعری تخلیق کے دو واضح ٹکڑے ہیں۔ ایک وہ جو زمین سے متعلق ہے اور رگوں میں چھپکتے بولتے ہوئے لہو کی داستان سناتا ہے اور دوسرا وہ جو زمین سے کٹ کر تلمیحات، اشارات اور فکر کے تانے بانے کا منظر دکھاتا ہے۔ مؤخرالذکر ٹکڑے کی تقریباً ساری ڈور شاعر کے فکرِ رسا اور وسیع مطالعہ پر دال ہے اور مقدم الذکر ٹکڑے کے تمام کومل دھاگے اس کے تجربے اور باطنی احساس کے آئینہ دار ہیں اور اسی لئے اثر انگیز ہیں — یہی وہ حصہ ہے جس سے شاعر نے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دھرتی اور اس کی تاریخ کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہ چند نمونے دیکھئے۔

کالی ساری میں چمک پنڈے کی ۔۔۔ جیسے گھنگور گھٹا میں بجلی
نوش لب، عاج بر، صنوبر قد ۔۔۔ اسپرا دیو لوک کی جیسے
تر بتر تن بدن پسینے سے ۔۔۔ ڈریکتا ہے بحرِ محبوبی
سجن بدیس ہے کٹتی نہیں ہے برہن رات ۔۔۔ یہ شاہ زور جوانی یہ سیج برہا کی!
روح اک صحرائے بے آباد ہے ۔۔۔ جسم ہے بت کی طرح آراستہ
شرم سے جسم کسمساتا ہے ۔۔۔ یہ حیا ہے کہ شوق کی شدت
آگ بوسوں میں راگ لفظوں میں ۔۔۔ تجھ میں آئی کہاں سے یہ حدت

اس "تمدت" کی کفِ دریا کے ہر صفحے پر فراوانی ہے اور یہی شاعر کا اصل میدان بھی ہے۔ خود خالد بھی تو کہتا ہے ؎

آدمی کو پڑھ، گلی کوچوں میں پھر، جنگل میں گھوم!
منطق و علم و تفلسف کا نتیجہ دردِ سر!

"کفِ دریا" اُردو شاعری میں ایک اہم اضافہ ہے ——————————

ابنِ فرید

غزل میں استعارہ و تلمیح کا استعمال، غزل کی روایت میں رہا ہے۔ لیکن یہ استعمال بالالتزام ذرا کم ہی کیا گیا ہے۔ اگر کسی شعر میں انتہائی خوب صورتی کے ساتھ کوئی استعارہ یا تلمیح آ گئی ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ ورنہ زبردستی اس طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ صنائع و بدائع کا استعمال اس طرف صرف لکھنؤ اسکول نے کیا ہے۔ لیکن ان سے کوئی بڑا کام لینا لکھنؤ اسکول کے مشرب میں داخل نہیں تھا۔ ان کے نزدیک صرف کمالِ شعر گوئی کا مظاہرہ تھا۔ اقبال نے بالخصوص غالب کی پہنائی کلام اور رومی کے علوئے فکر سے متاثر ہو کر استعارہ و تلمیح سے اعلیٰ ترین علمی و فکری خدمات لیں۔ خالد اس سبک دورِ اُردو شاعری میں جو کلام کی ایک مخصوص سطح کے ساتھ بے پناہ گہرائی کے بھی قائل ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ جاہل و بے عقل ہے۔ بلکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ علم کے دروازے اس پر کھل گئے ہیں۔ اس دور میں اگر کسی شاعر کے یہاں یہ وصف ہو تو وہ قابلِ داد ہے کیونکہ وہ قاری کی تضحیک نہیں کرتا — بلکہ اسے بصیرت عطا کرتا ہے۔

سیدہ عابدہ عابد

خالد کی شعری کاوشوں پر کبھی مفصل بات کی جائے گی۔ بسردست اتنا لکھنا ضروری ہے کہ ان کی وسعتِ مطالعہ، ان کے تخیل کی رسائی اور گیرائی اور ان کے افکار کا تنوع ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ "کلکِ موج" میں ان کا جوہر زیادہ ابھرا ہے۔ اس تصنیف میں ان کی نازک خیالی اور عروض پر جوان کو حیرت انگیز عبور حاصل ہے۔ دونوں چیزوں نے مل کر ایک طلسمات کا سا سماں پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے متنوع افکار کو ہر طرح کے قالب میں ڈھالا ہے۔ غزل کا سانچہ بھی اختیار کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلسل غزل کے سے انداز میں ان کا کمالِ فن، پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔

ضیا جالندھری

آج کل کے شاعروں میں سب سے زیادہ پُرگو غالباً عبدالعزیز خالد ہیں۔ ان کے شعروں کے کئی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن میں تمثیلیں، طویل نغمے، مختصر نظمیں، ترجمے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ عبدالعزیز خالد کے کلام کو دیکھ کر فوری طور پر ذہن میں چند ایک چیزیں ابھرتی ہیں۔ پہلی بات جو متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے کلام میں جا بجا اُن شاعروں کے حوالے دیئے ہیں جن سے انہوں نے کوئی مصرعہ یا کوئی خیال قبول کیا ہے بلکہ مختلف زبانوں کے اُن شاعروں کے متعلقہ کلام کو اپنی اصل زبان میں بھی تحریر کر دیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خالد ان تمام زبانوں سے اچھی طرح آشنا ہیں اور ان کے ادب سے نہ صرف لطف اندوز ہو سکتے ہیں بلکہ اس کو اپنی زبان میں ڈھالنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔ دوسری بات جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے اُن کی ماضی سے دلچسپی۔ انہوں نے مختلف ملکوں کے اساطیر میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اور مختلف زبانوں کے ادب کے معروف نام ان کی شاعری میں یوں چلے آتے ہیں جیسے وہ صدیوں سے اردو میں ہی پروان پا رہے ہوں۔ اس سلسلے میں جن زبانوں سے وہ متاثر نظر آتے ہیں اُن میں عربی، انگریزی تو خیر بہت ہی زیادہ ہیں۔ ان کے علاوہ فرانسیسی، فارسی، سنسکرت، ہندی، اطالوی، یونانی وغیرہ شامل ہے۔

تیسری چیز جو ان کی شاعری میں بہت واضح نظر آتی ہے وہ ہے عجیب اور نامانوس الفاظ کا استعمال۔ اکثر و بیشتر انہوں نے عربی کے گراں الفاظ استعمال کئے ہیں۔ پھر اس کے بعد فارسی کے اور بعض اوقات خود ہندی اور سنسکرت کے۔ ان لفظوں کے استعمال سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کے پاس ذخیرۂ الفاظ غیر معمولی ہے اور اس سے ادق الفاظ کی تلاش میں بہت محنت کی ہے اور اکثر تراکیب طولانی اور جاری بھر کم استعمال کی ہیں۔

جمیل جالبی

خالد صاحب نہ صرف شاعر ہیں بلکہ علم و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ کئی زبانوں سے واقف ہیں اور دنیا کی بڑی شاعری سے متعارف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی شاعری میں عربی، فارسی، یونانی، فرانسیسی، ہندی اور انگریزی شاعری کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ خالد کی شاعری علم و خیال کی شاعری ہے۔ ہم نے اب تک شاعری کو صرف و محض احساس و جذبہ تک محدود رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ احساس و جذبہ کی شاعری کے شیدا جب ان کا کلام پڑھتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ دراصل خالد کی شاعری ایک نئے اندازِ نظر کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ اندازِ نظر جب تک پڑھنے والے کے پاس نہ ہو وہ ان کی شاعری کی خصوصیات اور انفرادیت کو پسند نہیں کر سکتا خالد کی شاعری پڑھنے والوں سے بھی علم کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب تک وہ علم جو خود شاعر کے پاس ہے پڑھنے والے کے پاس نہیں ہوگا وہ خالد کی شاعری کی گہرائی تک پہنچنے سے معذور رہے گا۔

اب ایسے میں اگر ہم ان اشعار کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے تو اس میں شاعر یا شاعری کا قصور کیا ہے۔ دراصل ہم اس بات کے عادی ہیں کہ ہر چیز بغیر محنت کئے اور دماغ پر زور ڈالے ہم تک پہنچ جائے۔ یہ مطالبہ ایک حد تک درست ضرور ہے لیکن یہ ہر صورت میں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے درست نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی طرح شاعری بھی ہمیشہ سیدھی سادی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس نقطۂ نظر سے اگر خالد کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں یقیناً مایوسی نہیں ہوگی۔ رہا یہ سوال کہ آخر علم کے لئے شاعری کا مطالعہ کیوں کیا جائے اور براہ راست خود علم ہی سے کیوں نہ رجوع کیا جائے۔ یہ ایک الگ بحث ہے جسے میں آئندہ کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

"کلکِ موج" میں ۲۲ غزل نما نظمیں ہیں۔ غزل نما نظمیں میں نے اس لئے کہا ہے کہ یہاں اشعار میں وہ ربط موجود ہے جو نظموں میں ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ مزاج بھی جو غزل میں نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ سارا مجموعہ نظم اور غزل کے سنگم اور نقطۂ اتصال کا ایک تجربہ ہے۔

علم و خیال کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ زندگی کی ابدی حقیقتیں سامنے آتی ہیں اور انداز ناصحانہ سا رہتا ہے یہی خصوصیت "کلکِ موج" میں نظر آتی ہے۔

بازارِ حیات دام گہ ہے	کھول آنکھ نہ مول لے خسارہ
کھونا بھی ہے اک طرح سے پانا	جو ہارے مآل کار جیتے
سست بنیاد عمر مستعجل	کام کر کام زندگی کم ہے

جب خالد کے ہاں یہ اندازِ بیان پیدا ہوتا ہے تو ان کے ہاں ایسے مصرعے اور شعر جنم لیتے ہیں جو ہماری روزمرہ کی بات چیت کا جزو بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کیا کرے آدمی کدھر جائے	ایک دل ہے ہزار ہا غم ہے
انسان خود ہے معمار اپنا	جس طرح ڈھالے ڈھل جائے قسمت
اس نمائش پسند دنیا میں	قدر ہے صرف کامیابی کی

محبت کا خاصہ ہے شانِ تلوّن　　　جھلکتی ہے آنکھوں سے بے اعتباری

۶　　بے اصولی آدمی طوائف ہے

ایسے بہت سے شعر اور مصرعے "کلکِ موج" میں ملتے ہیں۔

دیدہ زیب، پانی پتے

عبدالعزیز خالدؔ کی چونسٹھ طویل غزلوں کا مجموعہ جو دوسو تریسٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے "کلکِ موج" کے خوبصورت نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ مجلّد ہے اور دیدہ زیب ٹائپ میں ہے۔

جو لوگ روائتی غزل اور اس کے پیش پا افتادہ مضامین سے لذّت اندوزی کرنے کے عادی ہیں ان کے لئے خالدؔ کی غزلوں میں کوئی کشش نہیں۔ یہ غزلیں ایک نئے ذہن کی تخلیق ہیں ان سے متکیف ہونے کے لئے جدید بیدار ذہن کی ضرورت ہے۔

اپنے کلام کو اندھی تقلید اور بے روح روایت سے محفوظ رکھنے کے لئے "کلکِ موج" کے شاعر نے تین اہم امور کو پیش نظر رکھا ہے (۱) ایسے مضامین کو قطعی ناقابلِ اعتنا سمجھا ہے جن کو ہمارے اساتذہ اپنی مشق سخن گوئی کے سہارے ہزاروں طرح باندھ چکے تھے اور جن پر اب بھی ہمارے اکثر شعرا کرام قوتِ سخن گوئی صرف کرتے رہتے ہیں۔ اس مجموعہ میں بندھے ٹکے کتابی عشق کی خیالی پیچیدگیاں کہیں نہیں ملتیں۔ شاعر نے صرف ان احساسات و جذبات کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے جو اس پر گذرے ہیں یا جنہیں اس نے محسوس کیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں شروع سے آخر تک زندگی جاری و ساری محسوس ہوتی ہے اور قاری ایسی فضا میں پہنچ جاتا ہے جو مروجہ سکہ بند دواوین کی فضا سے قطعی مختلف ہے۔

(۲) وہ رواں دواں بحریں جو اردو شاعری کے آغاز سے اب تک اچھے اور برے تمام شعرا کے لئے چاند ماری کا تختہ بنی رہی ہیں کثرتِ استعمال سے اپنی دلکشی کھو چکی ہیں ان عام بحروں کے لئے مضامین انداز بیان اور لب و لہجہ وغیرہ متعین ہو کر رہ گئے ہیں عبدالعزیز خالدؔ نے اس دقّت کو محسوس کرتے ہوئے ایسی بحروں سے اجتناب کیا ہے انہوں نے اجنبی لیکن مترنم بحروں کو چنا ہے بحر کے مزاج کو سمجھ کر اس کا حق ادا کیا ہے۔ یہ بحریں عموماً عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ اردو والے ان کے ترنم اور روانی سے عام طور پر آشنا نہیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے شعرا اس جانب توجہ دیں تو اردو شاعری کے لئے ایک وسیع میدان مل سکتا ہے۔

(۳) شاعری کے لئے لہجہ اور لہجہ کے لئے انتخابِ الفاظ بڑی عرق ریزی کا کام ہے شاعر کی انفرادیت کا دار و مدار اس کے لہجہ پر ہے اور لہجہ مناسب الفاظ کے دروبست سے متعین ہوتا ہے۔ خالدؔ ایک مخصوص لہجہ کے مالک ہیں جو ان کا اپنا ہے ان کے مصرعوں میں دھیمی پرسکون اور بھانے والی موسیقی ہوتی ہے۔ بات ندرت سے کہتے ہیں۔ یہاں کے انتخابِ الفاظ کا مسئلہ اور یہی وہ چیز ہے جن پر قاری کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے۔ وہ بیشتر عربی کے اور کہیں کہیں ہندی کے ایسے ثقیل، غریب، اور کلاسیکی الفاظ استعمال کرتے ہیں جنہیں سمجھنے کے لئے عام اردو دانوں کو ڈکشنریوں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ یہ بات شعر کا لطف اٹھانے میں حارج تو ضرور ہوتی ہے لیکن خالدؔ کی غزلوں میں نئی فضا بیدار کرنے میں یہ الفاظ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ کسی شاعر سے ہم یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف کچھ خاص قسم کے الفاظ یا زبان استعمال کرے۔ الفاظ کے پیچھے تو اس کی پوری علمیت، ذوق، رجحان اور شخصیت چھپی ہوتی ہے۔

کلکِ موج کی غزلوں میں بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں خیال عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، یا فرانسیسی سے اخذ

کیا گیا ہے۔ یہ خالد صاحب کی ادبی دیانت کی دلیل ہے کہ جہاں کہیں ایسی صورت ہوئی ہے انہوں نے فٹ نوٹ میں اس کا اظہار کر دیا ہے اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے۔ انہوں نے مختلف زبانوں کے ادب کا کس عرق ریزی سے مطالعہ کیا ہے اور حاصلِ مطالعہ کو کس طرح اپنے ذہن میں محفوظ رکھا ہے۔ اس مصروف دور میں لوگ کہاں اس انہماک سے پڑھتے ہیں۔ ہم لوگ تو اسکولوں اور کالجوں کی درسی کتابیں اور پروفیسروں کے لکھے لکھائے ہوئے نوٹ رٹ کر ہی خود کو علامہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ دوسری زبانیں ایک طرف ہم تو سو ڈیڑھ سو سال کے اردو ادب کا مطالعہ بھی نہیں کر پاتے۔

جہاں تک عبدالعزیز خالد کی قادر الکلامی کا تعلق ہے وہ ان کی غزلوں کی غیر معمولی طوالت سے ظاہر ہے۔ آج کل فراق گورکھپوری سب سے لمبی غزل کہتے ہیں لیکن خالد نے اس سلسلے میں انہیں بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی بڑی غزلوں میں ان کا زورِ قلم کہیں کم نہیں ہوتا وہ اپنے مخصوص لہجے میں بے تکان شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔ اور ہر شعر پر کیف میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے کوئی شعر سطح سے گرا ہوا عجلت میں کہا ہوا یا دوسرے الفاظ میں بھرتی کا معلوم نہیں ہوتا۔ کسی شعر کا لب و لہجہ انداز بیان، بندش یا مضمون روائتی یا سپاٹ نہیں ہوتا۔ انہیں شعر کی زبان میں بات کرنے کا ڈھب آتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی بات کو کس طرح بیان کرنا چاہیئے انہیں اثر آفرینی کے گر معلوم ہیں۔ غرضیکہ وہ اپنے مافی الضمیر کو صحیح طور پر ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اردو کے اکثر اپنی شاعری کے لئے زندگی کا کوئی ایک پہلو مخصوص کر لیا کرتے ہیں اس طرح ان کی فکر و نظر محدود ہو کر رہ جاتی ہے وہ اپنی اس تنگنائے نگاہ سے ابھرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے زندگی بھر ایک ہی عینک لگائے رکھتے ہیں۔ خالد کے ہاں یہ بات نہیں ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر زندگی کو دیکھتے ہیں۔ اس عظیم کائنات کا کشادہ دلی سے وسیع النظری سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ہر معاملے میں سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتے۔ حالات اور اشیا کی گہرائی میں اتر کر مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک پھیلاؤ، وسعت اور ہمہ گیری کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک دھڑکتے ہوئے دل کی نرمی بھی ہے اور تفکر کی گہرائی بھی ان کے کلام میں نشاطیہ عنصر بھی ہے اور حزنیہ پہلو بھی۔ جس طرح زندگی متنوع، بے پایاں، پہلو دار اور گوناگوں ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری بھی مختلف رنگوں، خوشبوؤں، اور رسوں کا مرکب ہے۔

'کلکِ موج' اپنی بے شمار خوبیوں کے باعث اردو غزل میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ایک سنگ میل ہے جہاں سے ہمارا کاروانِ شعر ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

اردو کا جواں فکر شاعر عبدالعزیز خالد 'بنات البحر' کی تلاش میں نئی اور اچھوتی منزلوں سے گزر رہا ہے۔ اسے خضر خجستہ پے کی جستجو ہے تاکہ 'بنات البحر' کا مسکن معلوم ہو سکے ؎

خروشِ موجِ طوفاں دیکھتا ہوں — بحرِ دریائے ناپیدا کراں ہے
کنارے پر کھڑا چنتا ہوں گھونگھے — گہر اعماقِ قلزم میں نہاں ہے

ملیں خضر خجستہ پے تو پوچھوں!
بنات البحر کا مسکن کہاں ہے

'کلکِ موج' کے اسی ذہنی اور روحانی سفر کی منظوم داستان ہے۔ فنی اعتبار سے آپ کلکِ موج کو نظموں کا مجموعہ کہیں یا غزلوں

کا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ مجموعہ ایک ایسے ذہنی سفر کی داستان ہے جس سے فن کار کا تخلیقی عمل زندگی و پائندگی حاصل کرتا ہے اور ہنر کے دریائے ناپیدا کراں سے وہ گہر ہائے آبدار ڈھونڈ لاتا ہے جن کی چمک دمک لازوال ہوتی ہے۔

دنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ شاعر، ادیب، مصور، موسیقار دوسروں سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ تخلیقی عمل خلا میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس کا رشتہ ماضی سے بھی بہت گہرا ہے اور یہ حال کے اثرات سے بھی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ خالد نے اپنے اس ذہنی سفر میں ان گنت روشنی کے میناروں سے استفادہ کیا ہے۔ کبھی وہ سنائی، رومی، خیام حافظ، خسرو، نظیری، فردوسی، منوچہری اور فغانی کے مے خانے میں ساغر بکف نظر آتا ہے۔ کبھی وہ امرالقیس، ابو نواس، ابن خلدون، ابن درید، کعب بن زہیر، متنبی، جریر اور خلیل جبران کے ساتھ ریگ زاروں میں بادیہ پیمائی کرتا ہے۔ کبھی ہم اسے شیکسپیر، گوئٹے، دانتے، پیری لوئی، ریمباں، پال ورلین، ہاؤس مین اور ایلیٹ کی محفلوں میں بیٹھا دیکھتے ہیں۔ کبھی وہ کالی داس، کبیر، بلھے شاہ اور فرید کے نغموں کی لے میں ڈوبا ہوا ملتا ہے۔ کبھی وہ یونان قدیم کے شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کی صف میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ اور کبھی ہم اسے بارگاہ رحمۃ للعالمین میں دست بدعا پاتے ہیں۔ خالد کے ساز میں ان سب کے نغموں کی گونج ہے۔ لیکن اس کا نغمہ دوسرے نغموں کی صدائے بازگشت نہیں۔ اس کے نغمے میں آمیزش خون جگر بھی ہے۔ نے نواز کے دل کی دھڑکن بھی ہے اور اس کی منفرد آواز بھی۔ استفادے کا اعتراف عجز کی دلیل نہیں ہوتا۔ ذہنی ہم آہنگی کا اعتراف عجز کی دلیل نہیں بڑے پن کا ثبوت ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ اس سے گریز کرتے ہیں۔ اپنے فن کو اچھوتا اور منفرد ثابت کرنے کے لئے شاید یہ گریز ناگزیر سمجھا جاتا ہے لیکن خالد اس گریز کا قائل نہیں۔ اس نے تمتع ز ہر گوشہ یافتم کے اصول پر عمل کیا ہے لیکن دیانت دارانہ اعتراف کے ساتھ، اس اعتراف نے "فلکِ موج" کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ کر دیا ہے اور اسے وقعت کا حامل بنا دیا ہے۔

میں نے ابھی یہ کہا تھا کہ "فلکِ موج" خالد کے ذہنی سفر کی منظوم داستان ہے۔ یہ سفر اگرچہ بنات البحر کی تلاش میں ہے، لیکن اس سے خالد کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے۔ خالد صرف مشاہدے اور ذاتی تجربے کا قائل نہیں۔ وہ دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور تہذیب کے عالمی ورثہ کے حسن و رعنائی کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کا خواہش مند ہے۔ اس کے لئے وہ ہر طرف نگاہ دوڑاتا ہے۔ ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلتا ہے۔ اس کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لذت گفتار سے لطف اٹھاتا ہے اور دو چار پھول دامن میں لئے واپس چلا آتا ہے۔ اس تگ و دو نے خالد کے تبحر علمی میں بھی اضافہ کیا ہے۔ اور اردو شاعری کے دامن کو بھی وسیع کیا ہے۔ خالد نے اکابر شعرا کے کلام سے جس طرح چراغ شوق روشن کیا ہے۔ اس کی مثال کم ہی ملتی ہے اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ فارسی، عربی، انگریزی، ہندی، پنجابی، فرانسیسی، یونانی، جرمنی اور اطالوی ادبیات پر اس نے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے جس سے اس کی بصیرت اور ادبی ذوق دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ عالمی ادبیات کے گہرے مطالعے نے خالد کی نگاہ میں بصیرت تو مزید پیدا کی ہے لیکن وہ آئینہ خانہ تحیر میں ششدر اور حیران نہیں ہوا۔ نہ اس مطالعے نے اس کی انفرادیت کو مجروح کیا ہے۔ وہ دوسروں کی ذہنی سطح تک پہنچنے کے شوق میں اپنی ذہنی سطح کو نہیں بھولتا اور نہ مستی اندیشہ ہائے افلاکی کا شکار ہو کر سطح ارض کے انسانوں سے اپنا رشتہ توڑتا ہے۔ خالد نے اثر سب سے قبول کیا ہے لیکن اپنے فن کو مستعار خیالات کا مرقع نہیں بنایا۔ اس کی آواز انوکھی اور منفرد ہے۔ مگر اس آواز میں صدیوں اور قرنوں کے تہذیبی عمل کی گونج بھی شامل ہے۔ گونج شامل ہونا اور بات ہے اور کسی آواز کا گونج بن جانا بالکل دوسرا مسئلہ ہے۔

خالد کے اس ذہنی سفر کی منظوم روداد پڑھتے ہوئے مجھے تین نمایاں منزلوں کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی منزل عقیدت و شیفتگی، روحانی پاکیزگی اور بالیدگی، انسان دوستی اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی منزل ہے۔ اسی منزل میں خالد عشقِ رسولؐ میں سرشار، ماسوا سے بے نیاز، محبت کا سرمدی نغمہ الاپتا ہوا نظر آتا ہے ؎

یہ گرد و غبارِ گزرگاہِ یثرب یہ کحل جواہر ہے خاکِ شفا ہے

یہاں کا ہر اک ذرّہ ہے سنگِ پارس مہوس یہ مٹی نہیں کیمیا ہے

ہمارے بیشتر شاعروں نے بارگاہِ رسالتؐ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ جوشِ عقیدت نے رسولِ مقبولؐ کو محبوبِ مجازی کے پیکر میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن نعتیہ شاعری کا بڑا حصہ رسمی اور تقلیدی ہے۔ محسن کاکوروی اور امیر مینائی جیسے نعت گو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ خالد کے نعتیہ اشعار رسمی اور تقلیدی نہیں۔ ان میں نیا پن، تازگی اور تازہ خیالی ملتی ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم عام انسان بھی تھے اور عام انسانوں سے جدا بھی تھے۔ شانِ انسانیت اور شانِ رسالت دونوں کے حامل تھے، خالد اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

بشر کو ملا ہے رسالت کا عہدا وہ ہم میں بسے ہے ہم سے لیکن جُدا ہے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے موقع پر وہاں کی خواتین نے دف بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ خالد اس واقعہ کو بیان کرتا ہے۔ اس کی عقیدت مندی نے اس بیان کو کتنا پر زور اور خوبصورت بنا دیا ہے ؎

بجاتی ہیں دف زہرہ رخسار یثرب مدینے میں ماہِ تمام آ گیا ہے

خالد سرورِ کائنات کے آستانے پر صرف ایک ہی التجا پیش کرتا ہے۔ معصوم اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی التجا۔ متاعِ لوح و قلم سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی یہ التجا خالد کی ذہنی کیفیت کی صحیح ترجمان ہے ؎

اسے شوق ہے علمِ لوح و قلم کا سخن در ہے لوح و قلم مانگتا ہے

پرورشِ لوح و قلم کا یہ جذبہ خالد کی زندگی ہے۔ اسی جذبے نے اسے انسان دوستی کی راہ دکھلائی ہے۔ وہ صاحب دلوں کا حال دیکھتا ہے۔ اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے ؎

مطلق العنانی ہو یا نظامِ جمہوریت حالِ صاحبِ دل کا دردناک و اَبتر ہے

صاحبِ دل کا حال دردناک و ابتر ہونے میں اس کے حد سے بڑھے ہوئے احساس کو زیادہ دخل ہے۔ اُسے ہر لمحے یہی خیال رہتا ہے کہ ؎

عمر محدود شوق لامحدود کیا کریں زندگی میں کیا نہ کریں

اس ذہنی انتشار کے باوجود اس کے لب آشنائے شکوہ نہیں ہوتے بلکہ ؎

نکلتے ہیں نغمے ہونٹوں سے نغمے گلہ مندی نہیں کیشِ محبت

خالد فکر و عمل کا شاعر ہے وہ عمل کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن انجام سے بے نیاز رہنا، اس کی فطرت ہے، وہ قناعت کا دلدادہ ہے اور جو کچھ میسر آتا ہے اس پر شاکر رہتا ہے۔ یہی پیغام وہ دوسروں کو سناتا ہے ؎

تگ و دو میں کمی نہ کر لیکن جو میسّر ہے اس پہ شاکر رہ

اس کے ساتھ کچھ اور مشورے بھی ہیں ؎

راز دل کا کسی کسی سے کہہ مل ہر اک سے بخندہ پیشانی
دل پہ قابو رکھ اپنے آپ میں رہ تن پہ پشمینہ ہو کہ اطلس ہو

خالد کو انسان کے مستقبل سے مایوسی نہیں۔ فسادات جہاں سے نظم وضبط کو زیر و زبر دیکھنے کے باوجود اسے سحر کی امید ہے اور وُہ کہتا ہے ؎

دیا آس کا روشن ہے امید سحر ہے فسادات سے نظم جہاں زیر و زبر ہے

امید سحر کے ساتھ ساتھ اسے یہ شکوہ بھی ہے کہ مئے حب وطن کے ذوق شناس بروئے کار کیوں نہیں آتے، وہ جس طرف بھی نظر دوڑاتا ہے۔ کوئی صاحب دل نظر نہیں آتا اور اُسے کہنا پڑتا ہے ؎

جسے دیکھئے زناری منصب و زر ہے کوئی ذوق شناس مئے حب وطن ہو

خالد کے ذہنی ۱ کی یہ منزل وطن پرستی کے نغمات سحر سے بھی معمور ہے۔ خالد کا تصور حب وطن محدود نہیں تنگ نہیں، نہ اس کی بنیاد کسی عصبیت اور جذبۂ تفاخر پر ہے۔ یہ منزل بڑی کٹھن اور دشوار گذار ہے۔ کہیں کہیں اس پر افسردگی بھی غالب آجاتی ہے اور وہ رنگ زمانہ دیکھ کر یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے ؎

کوّے موتی چگیں یہ کلجگ ہے ہنس کو قوت لایموت نہ دیں!

—— اس منزل میں تفکّر اور گیان کے نشانات ملتے ہیں جن کی بنا پر خالد کے فن سے خوشگوار امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔
خالد کے سفر کی دوسری منزل جمالیاتی احساس کی منزل ہے جس نے اس کی شاعری میں بڑا رچاؤ پیدا کیا ہے۔ یہ اشعار توجہ طلب ہیں ؎

زلفیں جیسے فراق کی راتیں چہرہ جیسے نوید یوم وصال
تیرے گیسو ہوا میں لہرائیں آئیں جائیں طرح طرح کے خیال

خالد کے سفر کی دوسری منزل عشق کی تازہ کاری اور جمال دوست کی دلفریبی کا بے مثال مرقع ہے۔ کولرج نے اپنے زمانے کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا طرۂ امتیاز فنّی اور پُر کار تصویریں ہیں۔ خالد کی جمالیاتی شاعری کا طرہ امتیاز بھی فنّی اور پُرکار تصویریں ہیں۔ ان میں شفق کا رنگ، مے کی سرخی اور ستاروں کی چمک ہے۔ خالد نے اس سلسلے میں عالمی ادب کی تلمیحوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عالمی ادب کی ان علامتوں کا استعمال مشکل پسندی، غرابت اور تبحر علمی کی نمائش پر محمول کیا جائے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم اپنی زبان اور ادب کو وسعت دینا چاہتے ہیں تو ہمیں ان علامتوں کو قبول کرنا پڑے گا عالمی ادب کی تلمیحوں کو چھوڑیئے۔ خالد نے اردو ادب کی غواصی میں طلسم ہوشربا کے متعدد کرداروں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے ؎

کوکب و برّاں نے کس کا ساتھ دیا ہے حیرت وافراسیاب ششدر و حیران
یہ ہے نظر کردہ اس سے کون بچا ہے عمرو کی عیاریوں سے ہر کوئی عاجز

صرف کرداروں ہی نے جگہ نہیں پائی بلکہ پوری طلسم ہوشربا کی طلسم ایک نظم کا موضوع بن گئی ہے۔ اسی طرح "آرائش محفل" کے سلسلے سے دشت ہویدا اور ملک خزسی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اور یہ اس امر کا شاہد ہے کہ خالد کی نظر صرف دوسروں ہی کے سرمائے پر نہیں بلکہ اُس نے اپنے سرمائے کا بھی پوری طرح جائزہ لیا ہے اور ایسی چیزیں چھانٹ کر نکالی ہیں جنہیں دوسروں نے توجہ کا مستحق ہی نہیں سمجھا تھا۔ اور اگر اس کے باوجود خالد پر مشکل پسندی، غرابت اور تبحر علمی کی نمائش کا الزام عائد کیا جائے تو پھر کوئی جواب ممکن نہیں۔

نظم گو شاعر ہونے کے باوجود خالد کی طبیعت اور مزاج میں تغزل پوری طرح رچا ہوا ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری میں صرف دولت حسن کی مصوری ہی نہیں ہلکا سا سوز بھی ہے ؎

چاند گھٹتا ہے تو بڑھتی ہے اداسی دل کی — آہ برہم زنِ محفل ہے سحر کا تارا
ہم نے مقدور بھر تو کوشش کی — ناتمامی نصیبِ آدم ہے
میں بجھتی آگ ہوں مقسوم میرا — شرنگِ انتظار و زہرِ حسرت

یہ سوز رسمی اور تقلیدی نہیں۔ یہ خالد کی فطرت اور اس کا مزاج ہے۔ بظاہر وہ بتانِ سیم تن کی سینہ تنی کا نغمہ الاپتا ہوا نظر آتا ہے لیکن وہ ان ہی محو نہیں ہوا۔ نہ جسم کو اس نے آخری منزل سمجھا ہے۔ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ ؎

ہم بھی آتے ہیں آگ لینے کو — چمک اے شعلہ زارِ سینائی

نظم کا نظم ہی میں ترجمہ کرنا اور اس طرح کہ اصل کی لطافت برقرار رہے کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ مترجم اگر مزاجی اعتبار سے اصل شاعر سے ہم آہنگ نہیں تو یہ ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ خالد نے جا بجا ترجموں سے کام لیا ہے اور بودلیر کی ایک نظم کے ترجمے اس کے کمال کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں اختصار کے خیال سے صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ "کلکِ موج" میں اس قسم کے کامیاب ترجموں کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ خالد کی عشقیہ شاعری میں وہ جوش و خروش اور حرارت ہے جو ہمارے غزل گو شعرا کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس میں سرمستی اور رعنائی خیال ہے۔ وہ رعنائی خیال جو ایک پیکرِ حسین کے تصورات سے وجود میں آتی ہے۔ "کلکِ موج" کا یہ حصہ میری رائے میں اس کتاب کا سب سے اہم سرمایہ ہے۔

خالد کے سفر کی تیسری اور آخری منزل گمراہی اور بے یقینی کی منزل ہے۔ ہر راہرو کو اس منزل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ صرف خالد ہی کی کمزوری یا عجز نہیں۔ دوسری زبان کے شاعروں اور ادیبوں سے فیض اٹھانا بہت اچھی بات ہے۔ لیکن ان کا ہر خیال ترجمے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ خالد نے اکثر جگہ اس چیز کو نظر انداز کیا ہے، اور اس کی وجہ سے "کلکِ موج" کی رقم طرازی کہیں کہیں مبہم اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔ خالد ذہنی طور پر ہر راہرو کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہے۔ یہ آمادگی اچھی سہی لیکن افراط کا نتیجہ خوش آئند نہیں ہوتا۔ سعدی کا یہ فیض تو کسی حد تک بجا اور مناسب ہے جو اس غزل میں ملتا ہے ؎

دھیمی کر آوازِ حدی آہستہ چل اے ساربان — محمل میں محوِ استراحت ہے مرا آرامِ جاں

سعدی کی مشہور غزل سے "اے ساربان آہستہ راں آرامِ جانم می رود" کے پس منظر میں یہ غزل نامناسب نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن فیض پذیری کے یہ نمونے قابلِ غور ہیں ؎

خالد — فاصلے درد کے زیادہ نہ کم — مرحلے شوق کے نہ ہو سکیں طے
اقبال — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے
خالد — کیا اس نے صحرا نشینوں کو یکجا — نہالِ اخوت پھلوں سے لدا ہے
اقبال — کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں
خالد — تیرے دروازے سے خورشید ضیا لیتا ہے
رجب علی بیگ سرور — خورشید ہر صبح اس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے
خالد — ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا کوئی ظالم — وحشی بھی پریشاں ہے ایڈونس بھی پریشاں
سودا

دشتِ شام

افسر آذر

خالد کا نام اردو شاعری میں نیا نہیں۔ ان پر مشکل گوئی، اجنبی الفاظ، مشکل تراکیب اور اساطیری اور تاریخی تلمیحات نظم کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں جذبات و احساسات کے فقدان کا رونا رویا جاتا ہے۔

جہاں تک مشکل گوئی کا تعلق ہے تو یہ الزام لگانے والے خود ہی کیوں سوچتے ہیں کہ سہل گوئی ہی کسی شاعر کی عظمت کا معیار ہے۔ مشکل گوئی کوئی جرم نہیں البتہ سہل پسندی ضرور ایک جرم ہے۔

اب آیئے نامانوس الفاظ کیطرف، ہر لفظ اپنی ابتدائی حیثیت میں نامانوس ہی معلوم ہوتا ہے۔ اردو میں آج جو ہزاروں انگریزی کے الفاظ مستعمل ہیں اور ہر شخص ان کو استعمال کرتا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اپنی ابتدائی شکل میں لوگ ان الفاظ سے مانوس تھے۔ ان کے مستقل استعمال نے ان کو مانوس اور مستعمل بنا دیا ہے۔ گویا نامانوس الفاظ استعمال کرنا کوئی جرم نہیں۔ البتہ یہ جرم ضرور ہے کہ اگر لوگ ان نامانوس الفاظ میں یہ اہلیت پاتے ہوں کہ وہ اردو زبان میں کھپ کر اردو کا ایک حصہ بن سکتے ہیں تو ان کے استعمال کو پھیلانے اور وسعت دینے کی کوشش سے گریز کرنا البتہ پڑھے لکھے افراد کو مجرم بنا دیتا ہے۔

اردو کے متعلق آجتک اکثر پڑھے لکھے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اردو ایک کم مایہ زبان ہے۔ اس میں علمی وسعت نہیں۔ اس میں وسعت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب اس میں نئے الفاظ شامل کئے جائیں۔ اردو زبان کی کم مائیگی کا رونا رونے والے جب عبدالعزیز خالد کی شاعری میں نامانوس الفاظ دیکھتے ہیں تو اس کی بجائے کہ ان نامانوس الفاظ کے معنی کی تہ تک پہنچیں اور ان کے استعمال کو عام کریں۔ سہل پسندی کا شکار ہو کر ان الفاظ کو یونہی نظر انداز کر کے خود ایک جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کو عام طور پر "ادق شاعر" کہتے ہیں۔ لیکن بہر حال وہ تسلیم کرتے ہیں کہ عبدالعزیز خالد ایک شاعر ہے اور ایک شاعر کوئی بھی لفظ بلا ضرورت استعمال نہیں کرتا۔ وہ چن کر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس کے مافی الضمیر کو پوری طرح اجاگر کرے اور اس کے موضوع کو پوری طرح بیان کرے۔

عبدالعزیز خالد لفظوں کے متعلق بہت حساس ہے۔ وہ نامانوس الفاظ بلاوجہ استعمال نہیں کرتا۔ وہ جس لفظ کو اپنے مدعا کے اظہار کے لئے موزوں ترین سمجھتا ہے اسی کو استعمال کرتا ہے

عبدالعزیز خالد نے اپنی شاعری میں نامانوس الفاظ استعمال کر کے اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے اس نے بہت سے الفاظ اردو ادب کو دیئے ہیں اور اس روایت کی بنیاد ڈالی ہے جس کی اردو کی کم مائیگی کا گلہ کرنے والوں کو ابھی تک توفیق نہ ہوئی

اسی بنا پر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جب اردو بورڈ جو اردو لغت ترتیب دے رہا ہے۔ اس میں وہ خالد کی تمام شاعری کو

پیش نظر رکھے اور ان تمام الفاظ کو اردو لغت میں شامل کرے۔ جن کے تعارف کا سہرا یقیناً عبدالعزیز خالد کی شاعری کے سر ہے
جہاں تک عبدالعزیز خالد کی تاریخی اور اساطیری تلمیحات کا تعلق ہے اس کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اساطیر عالم، اور تاریخی پس منظر کی اہمیت سے کوئی ذی ہوش اور باشعور انسان انکار نہیں کر سکتا۔

شعور کی ایک رو ہے جو صدیوں سے چلی آرہی ہے اور عبدالعزیز خالد اس شعوری رو سے پوری طرح واقف ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اس شعوری رو کو نظم کرتے ہوئے تاریخی اور اساطیر کے واقعات نظم کرتے ہیں۔ محض واقعہ نگاری کے لئے نہیں بلکہ شعور اور وقت کے بدلتے ہوئے سانچوں میں ایسا انسان دیکھتے ہیں جو ماضی میں زندہ تھا حال میں زندہ ہے

حال میں زندہ ہے ماضی اسے مردہ نہ کہو — جو نیا ہے وہ پرانا جو پرانا وہ نیا

خالد کی شاعری میں جذبات و احساسات موجود ہیں البتہ ان کو مستعمل پیمانوں اور سانچوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اس کے لئے تنقید کو آگے بڑھ کر وہ صورت اختیار کرنی ہے جس سے قطرہ میں دجلہ اور جز میں کل نظر آئے۔

دشت شام عبدالعزیز خالد کی نظموں اور غزلوں کا طویل مجموعہ ہے اور یہ عبدالعزیز خالد کی قائم کردہ روایات پر پورا اترتا ہے۔ خالد کے چند شعر ان اصحاب کے لئے نقل کئے جاتے ہیں۔ جن کو خالد سے وہی شکایتیں ہیں جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

بندۂ فن، مرد مسلوب الحواس — لوگ فرزانے کو دیں مجنوں کا نام
جسکے دل میں شک کا گہرا زخم ہے — اس کو دینا اے صبا میرا اسلام

انور سدید

اُردو کے جن شعراء نے اردو شاعری کو کلاسیکی پرگوئی عطا کی ہے ان میں عبد العزیز خالد کا نام بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ خالد کے ہاں شعلۂ تخلیق لمحاتی نہیں کہ لپک جھپک میں ختم ہو جائے بلکہ یہ مسلسل اور دیرپا ہے اور اسکا ثبوت خالد کی وہ طویل نظمیں ہیں جو کسی محدود تنگنائے میں نہیں سماتیں اور ایک ہی قافیے کے مسلسل استعمال کے باوجود اسکا شعلۂ تخلیق زندگی کیطرح ہمہ وقت جوان رہتا ہے۔

"مزمورِ میرِ مغنی" جو عبد العزیز خالد کے ۱۳۶۰ اشعار کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ یہ سب اشعار ایک ہی قافیے میں کہے گئے ہیں اور خالد کی قادر الکلامی کا ادنیٰ ثبوت ہیں۔ خالد کی شاعری کی اساسی خوبی اس کا زبان و ادب کا وسیع مطالعہ ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی فارسی عربی۔ لاطینی۔ عبرانی۔ یونانی۔ ہندی اور دیومالائی ادب کے بیشتر مظاہر بڑی خوبی سے نظم بند نظر آتے ہیں اور "مقامات" کے عنوان سے ان سب کی وضاحت الگ کر دی گئی ہے۔

عبد العزیز خالد پر عموماً مشکل گوئی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ الزام درحقیقت ان لوگوں کی اختراع ہے جنکا مطالعہ محدود اور مبلغ علم ناقص ہے۔ دریں حالیکہ عظیم شاعری اپنے لئے لباس بھی ایسا ہی تلاش کرتی ہے جو نادر و بیکراں ہے۔ عبد العزیز خالد نے نسبتاً مشکل زبان استعمال کر کے دراصل قاری کو اسکی سہل انگاری کی طرف متوجہ کیا ہے اور کلاسیکی شاعری سے صحیح معنوں میں روشناس ہونے کے لئے اسے اپنے علم کو وسیع تر کرنے کی تحریک دی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ کی خصوصی خوبی یہ ہے کہ اس کے ہر شعر کا دوسرا مصرعہ عربی میں ہے اور جن لوگوں کو اس کتاب میں اجنبیت کا احساس ہوگا انہیں اپنی اس کوتاہی کا جائزہ بھی لینا ہوگا کہ وہ اپنی مذہبی زبان کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہیں۔

"مزمورِ میرِ مغنی" کے اندازِ اظہار میں زیرِ لبی گفتگو کی کیفیت ہے۔ اگرچہ یہ خطابیہ نظم نہیں تاہم مخاطب ایک ایسی قوم ہے جو دنیاوی لذتوں میں اپنا روحانی منصب کھو چکی ہے۔ خالد کے پیشِ نظر بنیادی مقصد کسی خارجی انقلاب کو برپا کرنا نہیں لیکن وہ اقدار کے احیاء اور ان کے فروغ میں پورا یقین رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے موجودہ زمانے کی منفی قدروں کی پامالی کا فریضہ بڑی خوبی سے سرانجام دیا ہے اور اس نے فرد کو اخلاص کی شمعیں روشن کرنے کی تلقین کی ہے۔

ہمیں فنِ خوشامد کا آتا نہیں — ہیں مخلص و نحن لہٗ مخلصون

زباں سے جو کہتے ہیں دل میں نہیں — ہے چہرے پہ مرقوم ما یکتمون

بغیظاں بر عہد و پیماں نہ جو — کہ کہنے پہ او لاد ھم یقتلون

کریں نفسِ امارہ کی پیروی — ہمیشہ وہ ملحق لا یعلمون

فرمانِ فتح یورپ

اُردو کے مایۂ ناز شاعر عبدالعزیز خالد کی طویل مثنوی ہے اور اردو شاعری کی تاریخ میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس کا مقصد انسانیت اور اس کی اعلیٰ اقدار کی ترویج ہے۔ ایسی اقدار جن کا تعلق اسلام اور قرآن کی ترجمانی سے ہے۔ عبدالعزیز خالد شاعر ہی نہیں بلکہ زبان اور ادب کے ایک ممتاز عالم بھی ہیں۔ صرف اردو نہیں بلکہ مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ وہ ان زبانوں کی ادبی روایات و تلمیحات سے خوب واقف ہیں۔ عربی اور اسلامی ادب سے تو ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ ہے، دنیا کی مختلف زبانوں کا کلاسیکی ادب بھی انکی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ان سب سے استفادہ کرتے ہیں لیکن یہ استفادہ کسی کی پیروی یا تقلید سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ان کی اختراع پسند طبیعت اپنی راہیں آپ نکالتی ہے اور اردو شاعری کو ایک پُرجلال عالمانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ و تراکیب اور امثال و تلمیحات کا بہت بڑا ذخیرہ بھی دے جاتی ہے۔ اس لحاظ سے عبدالعزیز خالد کا نام اُردو کے ان بڑے شاعروں کی فہرست میں آجاتا ہے جنہوں نے اپنی شاعری کے توسط سے اُردو زبان کا علمی وقار بھی برقرار رکھا ہے

عبدالعزیز خالد کے دوسرے مجموعہ ہائے شعری کی طرح مزمور میر مغنی کے دامن پر بھی ندرتِ فکر اور بدعتِ اسلوب کی گلکاری نظر آتی ہے۔ اس گل کاری کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ پوری کتاب میں قریب قریب ہر شعر کا دوسرا مصرعہ عربی زبان میں اور پہلا اُردو میں ہے۔ کہیں کہیں دوسرا مصرعہ اردو میں ہے پہلا عربی میں۔ بعض مقامات پر پورے پورے شعر عربی کے ہیں اور کہیں کہیں اُردو کے بھی — عربی کے مصرعے عموماً قرآن کی زبان میں ہیں۔ عربی اور اردو کی اس پیوند کاری سے عبدالعزیز خالد کی قادر الکلامی کا سکہ تو خیر قاری کے ذہن پر بیٹھ ہی جاتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ اس ذولسانی کی کوشش میں شعریت یا تخلیقی حُسن کہیں مجروح نہیں ہونے پاتا۔

مشتاقِ مغنی

زیرِ نظر کتاب بھی شاعر کی دوسری کتب کی طرح اس کے تبحرِ علمی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ مصنف الشعر آخر العلوم کے قول پر پورا اترتا ہے۔ کتاب میں تضمین و تلمیح کی روش اختیار کرتے ہوئے قریباً ہر شعر میں کہیں پورا اور کہیں نصف یا نصف کے قریب عربی مصرع لایا گیا ہے لیکن عربی حصّہ میں تکلف کا کہیں شائبہ نہیں بلکہ زرِ خالص میں میناکاری کا رنگ دے دیا ہے جیسے کہ

وہ اپنے کیے کی سزا پائیں گے   محقق ہے لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ

کتاب ایک طویل قصیدہ ہے جس میں اخلاق، مذہب اور سیاست کے تحت عبر اور نصائح بیان کی ہیں جیسے کہا ہے:

ہیں آنسو سکونِ دلِ مبتلا   رسولِ سلام و سفیرِ سکون

قصیدہ کو کماحقہٗ سمجھنے کے لئے اردو کے ساتھ عربی اور فارسی ذوق بھی ضروری ہے۔ اور چونکہ مصنف کی علمی وسعت ایک بحرِ ناپید اکنار کے مشابہ ہے مبتدی طلبہ کا اس سے کم استفادہ کرنے کا احتمال تھا جس کے لیے کتاب کے آخر میں تشریحی اشارات کا ضمیمہ دیا گیا ہے جو بجائے خود ایک پورے مکتب کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر قدم پر قاری کے دل پر اپنی عظمت کا سکہ نقش کرتا ہے۔

قصیدہ کے آخر میں غایتِ کتاب بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وسلت ربی قد ابلغتکم   الا تسمعون! الا تسمعون!

میرا فرض میں نے ادا کر دیا   فیا ایھا الناس ما قائلون

اس دورِ انحطاط میں جب قحط الرجال اپنی شدید ترین صورت اختیار کر گیا ہے مصنف اور اس کی تصانیف لق و دق صحرا میں آبِ شیریں کا ایک چشمہ ہیں اور ان کا وجود غنیمت سے کم نہیں۔

سرودِ رفتہ

جعفر طاہر

سیفو ایسی خوبصورت شاعرہ کا اتنا خوبصورت ترجمہ کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یار لوگ آسکر وائلڈ سے آگے نہیں بڑھے۔ گالز وردی یا جیمز کے تراجم ہوئے بھی تو ناولوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر۔ حالاں کہ یہ کام افادی ادب اور شعر و سخن کی ابدی اقدار پر ایمان رکھتے ہوئے ہونا چاہیئے تھا۔ خالد ہماری مبارک باد اور ارباب ذوق کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ق۔م کی اس دسویں میوز کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اگر شعرا کی روحیں مرتی نہیں تو میرا ایمان ہے کہ خود سیفو بھی اس عمدہ ترجمہ پر پھڑک اٹھی ہو گی۔ سیفو اُن ہستیوں میں سے ہے جن کی ذات ایک رجحان، ایک ادارہ اور ایک تہذیب کا مرکز ہوا کرتی ہے۔ اس کا جس قدر کلام ملتا ہے وہ اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خالد صاحب نے بڑے شگفتہ اور رواں دواں انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ بعض نظموں تک شاید ان کی رسائی نہیں ہو سکی لیکن حضرت مصنف پھر بھی داد کے مستحق ہیں۔

جمیل جالبی

عبدالعزیز خالد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی علمیت، فلسفے اور اساطیر سے ان کی دلچسپی اب کوئی ایسی بات نہیں رہی ہے جس پر کچھ کہا جائے۔ انہوں نے اردو شاعری میں متعدد طویل نظموں اور تمثیلوں کا اضافہ کیا ہے۔ طویل نظم لکھنا غزل لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کے لئے وسیع ذہنی تناظر، گہری فکر غیر معمولی قدرتِ اظہار کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں عبدالعزیز خالد کے پاس ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے یونان کی مشہور و معروف شاعرہ سیفو کی شاعری کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اچھا ترجمہ کرنا نثر میں خاصا مشکل کام ہے نظم میں تو یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر ترجموں میں مترجم نے سیفو کی شاعری کے مزاج، اس کی روح اور لطافتِ اظہار سے بہت قریب تر رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ سیفو چھٹی صدی قبل مسیح کی عظیم ترین یونانی شاعرہ ہے۔ افلاطون نے اسے 'دسویں میوز' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس عظیم شاعرہ کے حالاتِ زندگی بہت کم ملتے ہیں لیکن اس کے متعلق بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ ایک مشہور داستان تو یہ ہے کہ اس نے PHAON کے عشق میں گرفتار ہو کر LEUCADION ROCK سے کُود کر جان دے دی تھی۔ دوسرا قصہ یہ مشہور ہے کہ وہ اور ALCAEUS ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اور وہ رابرٹ براؤننگ اور مسز براؤننگ کی طرح ایک دوسرے پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قدما کے پاس اس کی نظموں کے سات یا نو مجموعے محفوظ تھے لیکن ان میں سے صرف چند حصے ہم تک پہونچے ہیں۔ ان میں سب سے طویل وہ ہے جو سات اسٹینزا پر مشتمل ہے اور APHRODITE کی تعریف و توصیف میں لکھا گیا ہے۔ سیفو AEOLIC DIALECT میں لکھتی تھی۔ اس نے اپنی شاعری میں بہت سی بحور استعمال کی ہیں اور خاص طور پر ایک بحر اس نے بہت کامیابی اور ندرت کے ساتھ استعمال کی ہے اور جو اس کے نام کی مناسبت سے SAPPHIC کہلاتی ہے۔ اس کی شاعری ابتدائے زمانہ کی خالص عشقیہ شاعری کی کلاسیک شکل ہے۔ جذبات کا جامع اظہار لفظوں کے برتنے کا سلیقہ اور انتخاب، بحور اور اوزان پر مکمل قدرت اور ساتھ ساتھ پُر کیف سادگی اس کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ اس کی شاعری نے بہت سے شعرا کو متاثر کیا جن میں CATULLUS، OVID اور سوئن برن کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان ترجموں کا کمال یہ ہے کہ مترجم نے سیفو کی ان بنیادی خصوصیات کو ترجمہ کرتے وقت خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ترجموں میں بھی ایک پُرکیف سادگی اور اثر آفرینی پیدا ہوگئی ہے۔ عبدالعزیز خالد کی یہ کوشش اور کاوش ایسی ہے کہ ہر اس شخص کو جو شاعری کا مذاق رکھتا ہے اسے ضرور پڑھنا چاہیئے۔

اختر انصاری اکبر آبادی

"سرودِ رفتہ" ایک طور پر دو آتشہ ہے۔ یونان کی شاعرہ سیفو کے نغمات خالد کے بیان کے ذریعہ اردو داں طبقہ کے لئے ایک تحفۂ لطیف سے کم نہیں۔ عبدالعزیز خالد صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک باخبر صاحب نظر بھی ہیں فارسی اور عربی کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کی صحیح لذت سے بھی آشنا ہیں۔ فن کار کی اپنی اہلیت فن کو جلا بخشتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تخلیقات کے ذریعہ خالق کے ذہن و فکر کی گہرائیوں کا جائزہ آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ لیکن خالد کے قد اور منصب کا اندازہ اگر تخلیقات پر رائے زنی سے پہلے ہی کر لیا جائے تو نقد میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ خالد کے تبحر علمی اور شخصیت کا اندازہ جن لوگوں کو ہے وہ ان کے منصب اور مسلک سے آگاہ ہیں۔ خالد بے نیازانہ طور پر اردو شاعری میں ایک تحریک کو رواج دے رہے ہیں۔ اس تحریک کا مطالعہ اور مشاہدہ سے گہرا تعلق ہے جس کا اندازہ خالد کے کلام سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، ہر چند کہ "سرودِ رفتہ" میں سیفو کی شاعری کے آبدار موتی پیش کئے گئے ہیں۔ مگر خالد کی علمی سطح یہاں بھی اپنا معترف بناتی ہے۔ اس پری وش کے ذکر کو خالد کے بیان نے ایک علمی لطافت عطا کر دی ہے سیفو قدیم یونان کی ایک رومان پسند مگر حقیقت نگار شاعرہ ہے ہر چند کہ سیفو کی شاعری عشق کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ مگر سیفو کا عشق، مشاہدہ اور تجربہ کا ایک عکس جمیل ہے بقول خالد "اس کی نظمیں مختصر ہیں مگر گلاب کے پھول"۔ گلاب کا پھول نازک ہوتا ہے، مگر اس کی خوشبو دل و دماغ کو تازگی بخشتی ہے۔ یہ مثال سیفو کی شاعری پر ایک گہرا تبصرہ ہے، گلاب کی نازگی تسلیم مگر صباحت کے باوصف لطافت کا سحر ایک ناقابلِ انکار حقیقت سے کم نہیں یہی وجہ ہے کہ یونانی سیفو کی شاعری کو 'تقدیس' کا درجہ دیتے ہیں۔ سرودِ رفتہ کے مطالعہ سے سیفو کی شاعری اور زندگی کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ خالد نے سیفو کی شاعری کو اردو میں، ڈھالنے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی ہمہ رنگی سے بھی آگاہ کیا ہے۔ یونان کی یہ منچلی مگر بیدار مغز شاعرہ عشق اور حسن کی صرف عکاس ہی نہیں تھی۔ بلکہ رقص و شعر کی مہارت کے ساتھ ساتھ موسیقی کے اتالیق کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ چنانچہ اس کا باقاعدہ ایک اسکول تھا۔ اس کے مقلدین اور شاگرد اس کی تربیت کے طفیل بڑی شہرت کے مالک ہوئے۔

سیفو طبیعت کے اعتبار سے جدت پسند تھی۔ اس نے اپنے دور میں شاعری، رقص، نغمہ کے لئے نئی راہیں وضع کیں۔ فکری ذہانت کے سبب اپنے ہر تجربہ میں کامیابی حاصل کی، وارداتِ دل ہو یا حادثۂ عشق ہر ایک کی مصوری ایسے دلنشیں انداز میں سیفو کے یہاں ملتی ہے کہ پڑھنے کے بعد پہروں کیف و کم کی ایک دنیا آباد رہتی ہے۔ سیفو کی شاعری کا حسن خالد کے ترجموں میں کچھ اس طور پر درخشاں ہے کہ اصل کا گماں ہوتا ہے۔ طبع زاد شاعری کی ساری خوبیاں ترجمے میں نمایاں ہیں مثلاً:

چاند کا زرد مرمریں بجرہ
قلزمِ نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلہ پر دیں کا بجھ کے راکھ ہوا
سیج سونی ہے خواب گہ تنہا
اے شب تار، اے دلِ رسوا

خالد صاحب نے فارسی انگریزی اور عربی شاعری کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا ہے۔ وہ ان زبانوں کے حسن و قبح اور شاعرانہ نزاکتوں

سے بہت ہی قریب سے واقف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سیفو کے کلام کو انتہائی بے تکلفی سے اُردو میں منتقل کرتے چلے گئے۔ اور اتنی رنگینی پیدا کر دی کہ اس پر سیفو کے بجائے ان کی اپنی شاعری کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ سیفو کے ترجمے کے ساتھ ساتھ یونانی دیومالا کی جو تفصیلات زیر بحث آئی ہیں۔ اس سے تحقیق میں اضافہ ہوتا ہے اور معلومات کا ذخیرہ میسر آتا ہے۔

محمود سعیدی

یہ زمانۂ قبل مسیح کی مشہور شاعرہ سیفو کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اردو دنیا کو جناب عبدالعزیز خالد کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ہمیں اس عظیم شاعرہ کے لطیف و نازک شاعرانہ احساسات اور الہامی فکر سے لطف اندوزی کا موقع بہم پہنچایا۔

سیفو کی شاعری کی اساس عشق و محبت کی واردات و کیفیات پر قائم ہے اور اس کا پورا کلام انہیں گوناگوں کیفیات و واردات کے بیان پر مشتمل ہے، اس کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تصورِ عشق بڑا پاکیزہ اور معصومانہ ہے اس پر قدیم یونانی مذہب کے اخلاقی تصورات کا نمایاں اثر ہے اور یہ مذہب کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی روح کو اپنے پیکر میں سموئے ہوئے ہیں، لیکن جیسا کہ خالد صاحب نے اپنے تعارفی نوٹ میں لکھا ہے اس کے کلام میں بعض ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اس کے زمانے میں کسی اور مفہوم میں استعمال ہوتے تھے، لیکن بعد کو انہوں نے ایک ایسا مفہوم اختیار کر لیا جس کے سبب اس کا کلام بعض لوگوں کے نزدیک اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ٹھہرا، مثال کے طور پر لفظ "ہیترائی" جو سیفو کے عہد میں انیس و جلیس کے معنوں میں مستعمل تھا بعد میں شاہد بازاری کے معنی دینے لگا۔ بدقسمتی سے سیفو کی ہم نام ایک طوائف بھی تھی جو سیفو کی طرح رقص و موسیقی میں مہارت کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھی۔ اس نے بھی سیفو کی شہرت کو ملوث کیا اور بہت سے بدنیت لوگوں نے اسی کو شاعرہ سیفو قرار دے کر اسے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اس غلط فہمی کا سب سے المناک پہلو ظاہر پرست عیسائی مبلغینِ اخلاق کے ہاتھوں سیفو کے بیش قیمت فکری اور محسوساتی اندوختے کا تباہ ہو جانا ہے۔

ہر زبان اپنا مخصوص غنائی مزاج رکھتی ہے، اسی لئے کسی ایک زبان کے فنی شہپاروں کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا بے حد دقت طلب اور بسا اوقات ناممکن ہوتا ہے۔ اس کام کی دقت طلبی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب نظم کو نظم میں منتقل کیا جائے۔ خالد صاحب نے یہی کیا ہے اور ان کے معاملے میں ایک صبر آزما دشواری یہ بھی تھی کہ سیفو قدم قدم پر دیومالائی تلمیحات سے اپنے کلام کو بلیغ بناتی ہے۔ ان تلمیحات کی معنویت کو سمجھنے اور اسے ایسا پیرایۂ اظہار دینے میں کہ وہ اُردو قارئین کے بخوبی ذہن نشین ہو سکے، خالد صاحب کو فکر و کاوش کا جو ہفت خواں طے کرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ "سرود رفتہ" کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔

جون ایلیا

یونان کی ایک پراسرار رات کا واقعہ ہے، آسمان کے چراغ بجھنے ہی والے تھے کہ ناگہاں زمین سے ایک غبار بلند ہوا ــــ سیفو کی خادمہ ــــ ہیراڈس ــــ اپنے عمل کی کامیابی پر خوشی سے چلا اٹھی۔ سیفو نے اپنی خوف زدہ نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ اس کے سامنے دو طویل القامت سائے کھڑے تھے۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک عجیب سا سکون پا رہی تھی۔ یہ غیبی روحیں کتنی حسین اور باوقار تھیں ان میں ایک نوجوان تھا یعنی بربط نواز ــــ ارفئس، اور دوسرا بزرگ ــــ یہ تھا دنیا کا عظیم الشان سخنور ــــ ہومر ــــ ان کے ہاتھوں میں بربط تھے جو اب نغمے برسا رہے تھے۔ پہلے ارفئس کی آواز بلند ہوئی۔

"سیفو! ہم ماضی میں ساتھ گایا کرتے تھے عالم فطرت اور دیوتاؤں کی بزرگی بیان کرتے تھے۔

گنگناؤ سیفو۔ اپنے شعر گنگناؤ — گاؤ!
نغمہ و شعر غذائے روح ہیں —
وہ نفوس انسانی کو عظیم عالم مثال۔ عظیم اور ابدی عالم مثال کے افق تک پہنچا دیتے ہیں
سیفو گاؤ، جس طرح ہم گاتے تھے۔ نغمۂ مسرت۔ نشید"
ہومر نے کہا
ہماری روحوں کی روح سیفو تم پر سلام
ہماری بیٹی پر سلام

ارفنس : سیفو! میں تمہیں اپنی فطانت اور عظمت عطا کرتا ہوں

ہومر : میں تمہیں اپنی شاعرانہ صلاحیتیں بخشتا ہوں"

یہ تھا ایڈورڈ روملے کی ایک افسانوی تصنیف "یونان کی دوشیزہ" کا ایک اقتباس جو اس نے سیفو پر لکھی ہے۔ سچ ہے سیفو ارفنس کی عظیم نغمایت اور ہومر کی حیرت انگیز شاعرانہ صلاحیتوں کی وارث تھی۔ عبدالعزیز خالد نے اس عظیم شاعرہ کے فنی شہپاروں کو اردو میں منتقل کرکے ہماری ادبی تاریخ میں ایک عظمت مآب عنوان کا اضافہ کر دیا ہے، وہ جس قادرالکلامی معجز نگاری اور فن کارانہ الوہیت کے ساتھ ترجمے کے فرض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ حیرت انگیز ہے۔ شاعری کے اعلیٰ شہ کاروں کا منظوم ترجمہ ترجمے کی نہیں بلکہ تخلیقِ ثانی کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ اس نوع کے ترجمے کا مطلب یہ ہے کہ کسی زبان کا فنی شہ پارہ اپنی تمام خوبیوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل ہو جائے۔ اردو میں اس قسم کی کوششیں زیادہ تر ناکام رہی ہیں۔ مثلاً خیام کی رباعیاں جو فارسی کے عظیم ادب کا حصہ ہیں اردو میں ان کے مختلف ترجمے کئے گئے لیکن کوئی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہے جسے اردو ادب میں دوسرے درجہ کی حیثیت بھی حاصل ہو لیکن خالد نے اپنے ترجمے کو بلاشبہ اردو میں قدر اوّل کی چیز بنا دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق و اختراعی شخصیت کے ساتھ ادبیاتِ عظمیٰ کے ایک متبحر عالم بھی ہیں وہ علمائے ادب کے اس حلقے میں شامل ہیں جو بدنصیبی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں اس عہد میں انگریزی ادب کی تحلیل و تشریح کا فرض انجام دینے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن ایسے افراد کو تو شاید انگلیوں پر بھی نہ گنا جا سکے جو فارسی، عربی، یونانی اور لاطینی ادبیات سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہوں۔ میں یہاں خالد کی عربی دانی کو خاص طور پر سراہوں گا جو مغربی ملاؤں کے لئے کتنی بھی دل آزار کیوں نہ ہو لیکن میری نظر میں ان کی فنی و فکری امتیاز کی سب سے بڑی ضمانت ہے اس کے سہارے انہوں نے اردو ادب کی محدود اور بے مایہ لغت میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ زبان کے رقبے کو بڑھایا ہے۔ ان کا دوسرا بڑا امتیاز یونانی فکر سے ان کی محرمانہ آگہی ہے جس کے بغیر رصانتِ نظر اور متانتِ فکر کا حصول میرے خیال میں بہت مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یونانی فکر نے ان کو مثالیت پسند بنانے میں ایک اہم کردار انجام دیا ہے۔ میں ان کے لئے عربی ادب کی ایک اصطلاح استعمال کروں گا یعنی نابغہ۔ وہ واقعی نابغہ ہیں۔

یہ محض اتفاق ہے کہ سیفو کو مترجم بھی ایسا ملا جسے ذہنی طور پر سیفو کا عاشق یا محبوب ہونا چاہیے۔ سیفو کی طبیعت میں طرح طرح کے انحرافات پائے جاتے ہیں اور تقریباً اسی قسم کے انحرافات خالد کی فطرت میں بھی موجود ہیں۔ بہرحال میں نے احتیاطاً یہ بات کہہ دی ہے ممکن ہے کہیں کام آ جائے۔ بہرحال وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی مشابہ ہیں۔ خالد بھی معنی کی طرح لفظ کو ایک نامیاتی وجود قرار دیتے ہیں۔ فن ان کے نزدیک ایک زندہ اور حساس قسم کی ہستی ہے۔ اسی لئے انہوں نے تخلیقِ فن اور تخلیقی کرب پر اَن گنت نظمیں لکھی ہیں۔ وہ فن کو تقریباً حیات کے معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔ فن کی یہ تعریف ان کا نظریہ فن بھی ہے اور فن بھی۔ سیفو ان کے نزدیک ایک شاعرہ

انداز نظر اپنی اصل اور اساس کے اعتبار سے دراصل یونانی ہے۔ قدیم یونانی ادبیات کے ہر شعبے کو کسی نہ کسی دیوی یا دیوتا سے منسوب کرتے تھے۔ ان کو تاریخ، ادبیات، حکمت، حسن عشق غرض ہر شئے میں ایک الوہی شعور کارفرما نظر آتا تھا۔ سیفو کے مترجم خالد لاشعوری اور شعوری طور پر اسی ہمہ گیر معنویت اور سریت سے متاثر ہیں اور اسی لئے وہ اس ترجمے کو تخلیقی شاہکار بنانے میں کامیاب ہو سکے۔
سرود رفتہ کا ہر مصرع سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

سیب کے بغیچے کی!
مست آبریزوں میں!
ہر طرف چھناکے ہیں
جلترنگ بجتے ہیں!
سرسراتے پتوں سے
نیند کی مدھر لہریں

دھیرے دھیرے چھن چھن کر
گر رہی ہیں پلکوں پر

مست آبریزوں کے چھناکے، سرسراتے پتے۔ نیند کی مدھر لہریں۔ لہروں کا دھیرے دھیرے چھننا اور پلکوں پر گرنا غرض ہر شے میں تنفس، آواز اور جنبش کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ساز و آواز کا یہ متموج ماحول، کچھ عجیب سا ماحول ــ ذہن کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جو مثالیت پسند ادب کے لئے ہمیشہ پرواز انگیز رہی ہے۔ کس کم بخت نے کہہ دیا ہے کہ یہ ترجمہ ہے!

چاند کا زرد مرمریں بجرہ
قلزم نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلہ پرویں کا بجھ کے خاک ہوا
رات بھیگی گریز پا لمحے
منزل نور کو روانہ ہوئے
سیج سونی ہے خواب گہ تنہا
اے شب تار اے دل رسوا

عظیم ادب کا یہی وہ پرسوز اور معنی خیز لہجہ ہے جو ساری کائنات میں جان ڈال دیتا ہے۔ سفینۂ وجود قلزم نیلگوں میں ڈوب رہا ہے۔ خلوت نیم شبی کے گریز پا لمحے روشن ابدیت میں غرق ہو رہے ہیں۔ چاند کا زرد مرمریں بجرہ فن کار کے ذہن کو دوام و ابد کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اس سفر میں فن کار کو ایک نظریاتی، کائناتی اور مثالی غم ملتا ہے اور پھر یہ غم خود ایک کائنات کی تکوین کا فرض انجام دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ میری اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ میں ادب کو انفرادی لذت اندوزی کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور ایسی باتیں کر رہا ہوں جن کا کوئی مطلب نہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ میرے اوپر ظلم ہوگا۔ میں تو دراصل ادب کی ذمہ داریاں بڑھا رہا ہوں۔ اس کے فرائض میں اضافہ کر رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ لامحدود آرزوؤں اور بیکراں تمناؤں کا ذریعۂ اظہار ہے۔ وہ زندگی کو توانائی اور رعنائی ہی نہیں بخشنا چاہتا بلکہ اس کے لئے اعلیٰ مثالیے بھی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس کا عمل جزئی ہی نہیں کلی

بھی ہے وہ زندگی سے خیر و جمال اور خیر و جمال سے تمامیت و کمال کو وابستہ دیکھنا چاہتا ہے، وہ نہایتوں کی طرف ہی نہیں لانہایتوں کی طرف بھی پرواز کرتا ہے۔ لانہایت پرواز!

اے دل آرام خانہ برانداز
کر رہی ہوں تری طرف پرواز

ممکن ہے کہ اس پرواز کے دوران نشاط بیکراں کا کوئی پروانہ مل جائے ۔۔۔۔ نہ ملے ۔۔۔۔ سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا فن کار کا ذہن اس ناقص کائنات کو جوں کا توں قبول کرلے۔ کیا وہ اس عظیم و پُرجلال جبریت کو اپنے وجود سے ہم آہنگ کرنے کی ذرا بھی کوشش نہ کرے اگر بقائے جاوداں کا پروانہ اس کے نصیب میں نہیں تو کیا اس کو جہانِ آرزو بھی نہیں تخلیق کرنا چاہیے۔ کیا زندگی اور ذہن کو آرزوؤں سے بھی محروم ہو جانا چاہیے۔ نشاط بیکراں کہاں ہے؟ واقعی کہیں نہیں۔ لیکن احساسِ نشاطِ بے کراں ۔۔۔؟ یہ احساس نشاطِ بے کراں ہی زندانیانِ وجود اور پاشکستگانِ نومیدی کو باز وکشادہ، آزاد اور عظیم مثالیوں کے شعور سے ہم کنار کرتا ہے اور اس شعور سے کوئی بھی صحت مند ذہن بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

اے سنہرے تاج والی
زہرہ دیوی! اب کے ٹاس
کاش کے میں جیت لوں!

ٹاس جیت لینے کی یہ خواہش ہی زندگی اور بھرپور زندگی کی خواہش ہے۔ اچھا اور بڑا ادب ہمارے ذہن میں بھرپور زندگی کی بھرپور خواہش پیدا کرتا ہے۔ وہ زندگی کے دیوتاؤں کا حوالہ دے کر موت کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔

موت اک زشت و داژگوں شے ہے
پوچھ لو چاہے دیوتاؤں سے
گر یہ ہوتی بہیج و خوش آنند!
زندہ رود آپ کیوں نہ مر جاتے

اس گفتگو کے ضمن میں ہم "سرودِ رفتہ" کے مختلف اشعار پڑھتے چلے جا رہے ہیں لیکن یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ تخلیقی شہ پارے نہیں بلکہ ترجمہ ہیں۔ اس منزل میں سیفو سے زیادہ عبدالعزیز خالد قابل داد ہیں۔ گویا ہم عملاً یونان کے عظیم ادب کو نہیں بلکہ اردو کے عظیم ادب کو پڑھ رہے ہیں۔ ایک عمل و رد عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ عظیم افکار و خیالات، عظیم زبان اور اسالیب کی تخلیق کر رہے ہیں اور اس طرح عظیم زبان اور اسالیب کے ذریعے عظیم ترین افکار و خیالات کی تشکیل ہو رہی ہے ایسے ادب کا حق ہے کہ وہ ادب کے لئے احکام نافذ کرے۔ اس کے لئے دستور العمل بنائے

تو کار گہ دہر سے جب کوچ کرے گی
تب ذکر بھی تیرا کسی محفل میں نہ ہوگا

ہاں گرچہ عروسانِ ادب جب بہ وخود کام
کرتا ہے انہیں رام ریاضِ اہل ہنر کا
سینچا نہ کبھی تو نے خیابانِ سخن کو

کی حسن کے در پر نہ کبھی ناصیہ سائی
ہے شہرت پائندہ صلہ سوزِ جگر کا

ہم ان اشعار کے لہجہ میں مترجم کے تخلیقی کرب، احساسِ حسن کاری، اجتہادِ نظر اور ریاض کو ایک عجیب انداز میں کار فرما پاتے ہیں اس لئے کہ جہاں تک فن کا تعلق ہے "سرودِ رفتہ" سیفو کا نہیں خالد کا شاہکار ہے۔ اس کا ہر مصرع ایک موج ہے، موسیقی، رنگ، حسن اور حیات کی موج۔ ہر دائرہ جنبش میں ہے۔ ہر خط حرکت کر رہا ہے۔

بدر ابھرا
کھڑی ہو گئیں
نوجوان لڑکیاں
باندھ کر
حلقہ
محراب ہیکل کے گرد

یہ تیرتی ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں اور روشنیاں سرودِ رفتہ کی پوری فضا پر چھائی ہوئی ہیں اور خاص طور پر موسیقی تو "سرودِ رفتہ" کا سب سے بڑا عنصر ہے۔

اگلے دقتوں سے قریلطی کنواریاں
لہلہاتی گھاس کو پیروں تلے
کیف میں ڈوبی مٹکتی روندتی
رقص کرتی آئی ہیں ہیکل کے گرد
ناز و نشہ سے تھرکتا انگ انگ
چلبلے الھڑ پنے کے رنگ ڈھنگ
پائلیں رن جھن جھنکتی پاؤں میں
بربط و مردنگ و طنبورہ کے سنگ
جیسے سونے پر سہاگہ جیسے میدے میں شہاب
یہ حسین شمشاد قد خورشید خد نسریں شباب
رقص کرتی آئی ہیں ہیکل کے گرد

خالد نے ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں میں قیامت خیز عشوہ طرازی اور حسن کاری سے کام لیا ہے جیسے سیفو کی دوشیزگی مسکرا رہی ہو خود سیفو گنگنا رہی ہو۔ اور ان دونوں ظالموں نے مل کر اس جہانِ ذرہ و در کو ایک جہانِ دگر بنا دیا ہے

بنا جس کی اٹھی ہے شاعری سے
رچا ہے نغمہ جس کے بام و در میں

اس مختصر سے مجموعے میں ہمیں ایک نادر و خوش آہنگ انداز ملتا ہے جو بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ یہ سب کچھ خالد کی اپنی ایجاد ہے:

اس انیلی نار کے گن گاؤ گانے والیو
سیم دست افشار کی مانند جس کا دودھیا
رسمساسینہ رسیلا ہے بنفشے کی طرح

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خالد صاحب کو بات کہنے کا بہانہ اچھا ہاتھ آیا۔ اب کہنے کو رہ بھی کیا گیا ہے۔ سب کچھ کہہ جانے کی ذمہ داری تو بے چاری سیفو پر ہے۔ خالد تو ازل کے معصوم ہیں۔ خیر تو ہم اسے سیفو ہی کا ایک نشہ آور پیام سمجھ لیتے ہیں "انگبیں آواز عذراؤں کے نام"۔ ہاں انہوں نے تعارف میں یہ جو لکھا ہے کہ سیفو کی دلبستگی اپنی سہیلیوں اور شاگردوں کے ساتھ بالکل معصوم اور یونانی مذہب کی روح کے عین مطابق تھی۔ میں اسے کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتا۔ سیفو واضح طور پر جنسی انحراف کا شکار تھی۔ اس کے یہاں ہم جنس پرستی کے رجحانات نمایاں ہیں اور یہ بات اس کی اعجوبہ آفریں طبیعت اور نادرہ پسند ذہانت کے پیش نظر کچھ ایسی عجیب نظر نہیں آتی معلوم نہیں کہ خالد اسے زاہدہ و پارسا ثابت کرنے پر اس قدر بضد کیوں ہیں؟ — شعر سنئے ؎

اس گل اندام ناز پرور نے
خوب اچھی طرح لپیٹ لیا
اپنے جسم لطیف و نازک کو —!!
اون کے نرم گرم جامے میں

بھلا سیفو کو کسی گل اندام ناز پرور کے سلسلے میں اپنے یہ لطیف مشاہدات بیان کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی اور اس قدر لذت کشانہ انداز میں "خوب اچھی طرح لپیٹ لیا"۔ وہ بھی اون کے ٹھنڈے اور کھردرے جامے میں نہیں بلکہ اس میں بھی سیفو کے ذوق جواں نے نرم گرم کی شرط لگائی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ لہجہ اور اسلوب سیفو کا نہیں لیکن رجحان تو سیفو ہی کا ہے۔

علاوہ ازیں اور بہت سے شعر ہیں جن میں لذت گفتار کے ذریعے جنسی ناآسودگی سے ہم کنارگی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال "سر و در رفتہ" ہر اعتبار سے ایک مسئلہ انگیز و خیال آفریں شاہکار ہے۔

وقار انبالوی

خالد کی رواں دواں اور ہمہ گیر اور ہمہ رس طبیعت ہمیشہ ایسے ادبی شہ پاروں کی جستجو میں رہتی ہے جنہیں وہ اپنے شاعرانہ کمال کی بدولت اردو میں منتقل کر سکیں ——— سیفو کی شاعری، یونانی زبان میں غنائی شاعری کی بہترین مثال سمجھی جاتی ہے اور غنائی شاعری کو بہ تمام و کمال تحت اللفظ شاعری میں منتقل کرنا اس لئے آسان نہیں ہے کہ اردو شاعری کا مزاج ابتدا ہی سے غنائی نہیں ہے ——— اس لئے خالد کا کام بڑا کٹھن تھا کہ انہیں موسیقی سے ہم آہنگ نغمات کو عروض کی قید کے ساتھ پیش کرنا تھا۔ ظاہر ہے عروض اور پنگل کا مزاج جدا جدا ہے۔ غنائی شاعری میں موسیقی کی طرح ماتروں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس کے اوزان حد و شمار سے باہر ہیں۔ عروض میں یہ بات نہیں ہے لیکن ہیئت کی اس مشکل کو خالد نے قافیہ کے مزاج کو سمجھ کر اور اس کے لئے مترنم الفاظ کا انتخاب کر کے بڑی حد تک حل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ اس معاملے میں اردو شاعری میں ان کا کوئی حریف تو درکنار سہیم و شریک بھی کوئی نہیں۔ تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

میرزا ادیب

آج سے کم و بیش ایک ہزار نو سو ستر سال پہلے فلسطین کے ایک گاؤں ناصرہ میں ایک ایسی شخصیت نے جنم لیا جس نے دنیائے مذہب اور دنیائے ادب —— دونوں پر نہایت گہرے اور کبھی نہ ختم ہونے والے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس شخصیت کو اس کے کروڑوں ماننے والے یسوع مسیح کہتے ہیں۔ میلادِ مسیح ہی کے زمانے میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہوا اور اس واقعے سے بھی عالمی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ واقع نہ ہوتا تو دنیا کئی ادبی شاہکاروں سے محروم رہ جاتی۔

اس واقع کی تفصیل یہ ہے کہ بابل کا حکمران ہیرودیس "سخت عیش پرست اور ظالم قسم کا انسان تھا۔ اخلاقی قیود و حدود اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے مذہبی قدروں کو پامال کرتے ہوئے اپنے بھائی کی بیوی سے بیاہ رچالیا اور بھائی کو زنجیروں میں جکڑ کر ایک غار میں سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس کی یہ حرکت واضح طور پر ایک ظالمانہ اقدام کے مترادف تھی۔ لوگوں کو اس کا یہ فعل پسند نہیں تھا مگر ظلم کے خلاف آواز اٹھانا بہت مشکل تھا کوئی بھی درباری عیاش حکمران کے خلاف لب شکایت وا کرنے کی جراٴت نہ کرتا۔

اتنے میں اللہ کے اس نیک بندے کو اس بے حیائی کی اطلاع ملی جسے یوحنا پیغمبر اور کتاب مقدس کے مطابق بپتسمہ دینے والا جان (JOHN THE BAPTIST) کہا جاتا ہے۔ یوحنا پیغمبر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ اس نے پوری قوت سے صدائے احتجاج بلند کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہیرودیس نے برافروختہ ہو کر اسے ایک کنوئیں میں بند کر دیا مگر اس کی زبان بند نہ ہو سکی۔ وہ برابر اپنے قید خانے سے صدائے حق بلند کرتا رہا اور اس ذلت انگیز فعل پر نفرین بھیجتا رہا۔

ہیرودیس نے اپنی سالگرہ کے موقع پر ایک بہت بڑی شاندار دعوت کا اہتمام کیا جس میں دور دور سے امراء نے آکر شرکت کی۔

ہیرودیس کی سوتیلی بیٹی سلومی کے حسن کی دور دور تک شہرت پہنچ چکی تھی۔ خود بادشاہ بھی اسے ایسی نظروں سے دیکھا کرتا تھا جو ایک باپ کیلئے کسی صورت بھی جائز نہیں سمجھی جا سکتیں۔ اس سالگرہ کی تقریب میں ہیرودیس نے سلومی سے رقص کرنے کو کہا اس کی ماں کو یہ بات بری لگی اور اس نے بیٹی کو ناچنے سے منع کر دیا۔ بادشاہ تو عیش پرستی کے عالم میں اندھا ہو چکا تھا۔ وہ کسی طرح بھی اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے کسی حکم کو بھی آج تک ٹالا نہیں گیا تھا۔ سلومی اس کی آرزو کو کیوں کر رد کر سکتی تھی۔ ہیرودیس نے ناچ پر بہت اصرار کیا تو سلومی رقص پر آمادہ ہو گئی مگر اس شرط پر کہ ناچنے کے بعد وہ بادشاہ سے جو کچھ مانگے گی وہ اسے مہیا کر دیا جائے گا۔ بادشاہ تو اسے اپنی خواہش کی تکمیل پر آدھی سلطنت تک دینے کو تیار تھا۔ وہ یہ شرط کیوں نہ مان لیتا۔ شرط مان لی گئی۔ بادشاہ کو اس امر کی قطعی خبر نہیں تھی کہ سلومی اور اس کی ماں کے درمیان ایک منصوبہ بھی بن چکا تھا جس کے نتیجے میں اس کی ساری عظمت، سارا جاہ و جلال دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل جائے گا۔

سلومی نے سات نقاب منگوائے۔ سات نقاب پہن کر اس نے رقص شروع کیا یکے بعد دیگرے نقاب اس کے بدن سے اترتے گئے۔ آخری نقاب

بھی اتر گیا۔ اب سلومی کو اپنی خواہش کی تکمیل کرنا تھی۔

"مانگو کیا مانگتی ہو۔" بادشاہ نے حکمرانوں کی سی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یوحنا کا سر چاہیئے" سلومی کے یہ الفاظ سنتے ہی سارے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ خود بادشاہ حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے لاکھ چاہا کہ رقاصہ اس کی قیمتی سے قیمتی شے طلب کر لے اور اس ضد سے باز آ جائے۔ اس نے بڑے سے بڑا لالچ دیا کہ کسی صورت سلومی اپنی ضد چھوڑ دے لیکن اسے تو اس کی ماں مسلسل شہ دے رہی تھی اس لئے وہ اپنے مطالبے سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوئی۔

بالآخر ہیرودلیس نے یوحنا کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ اور جب پیغمبر کا سر طشت میں دھرا ہوا اس کے سامنے آیا تو وہ وفورِ مسرت سے دیوانی ہو گئی۔ اس نے سر بریدہ کے ہونٹ عالمِ وارفتگی میں چوم لئے۔ بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ اس کے اس ظلم پر بہت بڑا قہر ٹوٹنے والا ہے۔ اس نے رقاصہ کے قتل کا حکم بھی دے دیا۔ اور یوں اس سحر آگیں حسن کا خاتمہ ہو گیا جس کو آنے والی صدیوں میں کئی تخلیقی ذہنوں پر اثر انداز ہونا تھا۔

سلومی، قلوپطرہ کی طرح ایک تاریخی کردار ہے۔ ایک ایسا کردار جو کبھی نہیں مرتا۔ بار بار ایک تحریک فن کی شکل میں منظرِ عام پر آتا ہے اور ہر عہد میں کسی نہ کسی فنکار کے مضرابِ دل کو اس انداز میں چھیڑتا ہے کہ فن کا ایک سرمدی نغمہ ادب و فن کی فضاؤں میں برس جاتا ہے۔ سلومی کو پیوندِ خاک ہوئے دو ہزار برس بیت گئے ہیں لیکن اس کی سحر طرازی کی کہانی آج بھی زندہ ہے اور آئندہ بھی لازماً ان شاہکاروں کے ذریعے زندہ رہے گی جن کے خالقوں نے اس کے معنوی وجود سے روشنی اور حرارت حاصل کی ہوگی۔

فرانس کے زندہ جاوید مصنف گستاؤ فلوبیئر نے ایک نہایت خوبصورت ناول لکھا جس کا نام ہیرودلیس رکھا ہے۔ اس ناول کا مرکزی خیال اسی واقعہ سے لیا گیا ہے۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی نے اس ناول کو اردو میں منتقل کیا تھا اور یہ تمام و کمال ماہنامہ ساقی میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

انگریزی ادب میں اس سلسلے کا غالباً کارنامہ عہدِ وکٹوریہ کے نامور مصنف آسکر وائلڈ کا وہ ڈراما ہے جس کا نام "سلومی" ہے۔ ہمارے کئی اہلِ قلم اس ڈرامے سے متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے اس کا مکمل طور پر یا جزواً ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر تاثیر نے اس ڈرامے کے ایک باب کا ترجمہ کیا تھا۔ غالباً وہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے۔ یہ باب دخترِ بابل کے عنوان سے "نیرنگِ خیال" میں چھپا تھا۔

محمود نظامی نے بھی اس کا ترجمہ کیا تھا اور آج ہمارے پیشِ نظر ہے جناب عبدالعزیز خالد کا شعری کارنامہ "سلومی" جسے حال ہی میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے بہت خوبصورت کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہ کتاب آج سے تیرہ برس قبل کراچی میں چھپی تھی۔ دو سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ گیا اور یہ ایڈیشن جو اس سال بازار میں آیا ہے، بارِ سوم کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے ہاں نثر کی نسبت نظم کی کتاب کم بکتی ہے۔ اور اگر کوئی نظم کی کتاب چند سال کی مدت میں "بارِ سوم" تک پہنچ جائے تو اسے اس کی غیر معمولی مقبولیت کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ عبدالعزیز خالد کا یہ ڈراما شاعری کی اس صنف سے تعلق رکھتا ہے جسے اردو ادب میں نظم معریٰ کہا جاتا ہے۔ ڈرامے کے لئے یہ صنف اکثر و بیشتر استعمال ہوتی رہی ہے۔ شیکسپیئر اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے کئی نہایت مقبول ڈرامے نظم معریٰ ہی میں ہیں۔ خالد صاحب نے ساطیری ادب کا مطالعہ بڑے غور و فکر سے کیا ہے۔ یونانی، مصری اور ہندوستانی صنمیاتی روایات سے ان کی واقفیت بڑی وسیع ہے۔ اس کتاب سے پیشتر وہ اپنے کئی تخلیقی کارناموں میں اس واقفیت کی وسعت کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا شاہکار غزل الغزلات خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

سلومی کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو شروع سے لے کر آخر تک یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے متعلقہ موضوع سے قریب ہونے اور اس کی

روح تک رسائی حاصل کرنے کی بڑی جد وجہد کی ہے ۔ اس جد وجہد میں انہوں نے ہر قابلِ حصول ذریعے سے کام کیا ہے ۔ ان کی معلومات کا وفور وغیرہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا سب کچھ انہوں نے کس طرح اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا ۔ اور اس سے پورا پورا کام بھی لیا ۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں خالد صاحب نے آسکر وائلڈ ہی کے ڈرامے کو اپنی بنیاد بنایا ہے ۔ میں صرف ایک مثال پیش کروں گا ۔ آسکر وائلڈ نے اپنے ڈرامے کی ابتدا یوں کی ہے ۔

THE YOUNG SYRIAN : HOW BEAUTIFUL IS THE PRINCESS SALOME TO-NIGHT.

THE PAGE OF HERODIUS : LOOK AT THE MOON! HOW STRANGE THE MOON SEEMS! SHE IS LIKE A WOMAN RISING FROM A TOMB. SHE IS LIKE A DEAD WOMAN. YOU WOULD FANCY SHE WAS LOOKING FOR DEAD THINGS

نوجوان شامی   آج شہزادی سلومی پہ ہے کیا روپ انوپ !

خدمت گار   چاند کا رنگ تو دیکھو یہ گماں ہوتا ہے   ہے کوئی قبر سے اٹھی ہوئی عورت گویا
یوں لگے چاند نہیں کوئی زنِ مردہ ہے   مردہ چیزوں کو جو کرتی ہے اندھیرے میں تلاش

خالد صاحب کے ہاں بھی وہی کردار ہے جو آسکر وائلڈ کے ڈرامے میں ہے ۔

کسی خاص مواد کو بنیاد بنانا کوئی حرج نہیں ہے اور اس نوعیت کے کاموں میں کسی کتاب کو بنیاد بنانا تو ہے بھی ضروری ۔ اس باب میں جو چیز بغورِ خاص توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ مصنف یہ مواد لے کر کہاں تک آگے بڑھا ہے اور اس میں اس کی اپنی ذہنی کد و کاوش کا کیا حصہ ہے ۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ خالد صاحب کو مختلف ملکوں کے اصنامی ادب پر پورا پورا عبور حاصل ہے ۔ وہ ان تمام کرداروں کے تاریخی کردار اور ان کے زمانی و مکانی حالات و کوائف سے واقف ہیں جن کے بارے میں لکھتے ہیں ۔ اس خلوص میں ان کی معلومات کا سرچشمہ صحفِ آسمانی کے علاوہ وہ کتابیں بھی ہیں جن میں ان کرداروں کا ذکر کسی نہ کسی انداز میں ملتا ہے ۔

صحیح معلومات کا حصول اساسی چیز ہے ۔ اس کے علاوہ زبان پر غیر معمولی قدرت بھی بہت ضروری ہے ۔ اور خالد صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ انہیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے ایک مسلمہ حقیقت کے سوا کچھ نہیں ۔

خالد صاحب حقیقی معنوں میں ایک قادر الکلام شاعر ہیں ۔ وہ انسانی نفسیات ، ڈرامائی کیفیات اور واقعاتی پیچ و خم کا اظہار بڑی خوش اسلوبی سے کر سکتے ہیں ۔ جذبہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو اس کے اظہار کے لئے انہیں کبھی الفاظ کی کمی محسوس نہیں ہوتی ۔ ضیاء الدین برنی نے "سلومی" پر اپنی رائے دیتے ہوئے بالکل درست فرمایا ہے کہ

"خالد صاحب کو زبان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس کا اظہار اس نظم سے پوری طرح ہو جاتا ہے ۔ یونانی مائتھالوجی (علم الاصنام) سے انہیں غیر معمولی شغف ہے اور ان کا قلم ان میدانوں میں خوب جولانیاں دکھاتا ہے ۔ اور کسی اور ادیب نے ان چیزوں کو اس طرح نہیں اپنایا جو حضرت خالد کا طرۂ امتیاز ہے ۔"

خالد صاحب کو یونانی ، عبرانی ، مصری اور ہندوستانی علم الاصنام سے غیر معمولی شغف ہے اور اس باب میں ان کی معلومات بہت وسیع ہیں مگر صرف معلومات کے وسیع ہونے سے کسی غیر ملکی ادبی شاہکار کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے لئے یہ بھی

ضروری ہے کہ جو شخص یہ ذمہ داری قبول کرے اسے اس زبان پر جس سے وہ کوئی ادب پارہ اپنی یا کسی اور زبان میں منتقل کر رہا ہے اور اس زبان پر جس میں وہ منتقل کر رہا ہو کامل طور پر عبور حاصل ہو۔ دونوں زبانوں پر پورا پورا عبور حاصل ہونا ایک ناگزیر امر ہے اور خالد صاحب ایک زبان نہیں کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں اس نوعیت کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

سلومی ان کی علمی فضیلت اور معلومات کی فراوانی کے علاوہ اس پہلو کی بھی نشان دہی کرتی ہے کہ انہیں نزاکتِ لب و لہجہ اور نزاکتِ خیال دونوں کا بڑا گہرا احساس ہے۔ سلومی سے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔

سلومی کے حسن کی کیفیت ایک شامی کی زبان سے ملاحظہ فرمایئے

واقعی آج تو بے ساختہ یوں لگتا ہے
رس بھری، نیند کی ماتی، پری تمثال کوئی
فرشِ نیلم پہ بھری بزم میں جیسے ناچے
تنِ بلور سے ملبوس سرکتا جائے
بے حجابی سے عرق ریز ہو پیراہن

یہی شامی جب سلومی کو غور سے دیکھتا ہے تو اپنے ردِ عمل کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے!

کس قدر زرد ہے شہزادی کی رنگت دیکھو
اس قدر زرد تو پہلے کبھی دیکھا نہ اُسے
کیفیت چہرے کی وہ، جیسے کلی سوسن کی
عکس انداز کسی نقرئی آئینے میں

سلومی منظر کی کیفیت بیان کرتی ہے!

کہکشاں چرخ پہ پھیلی ہے، زمیں پر مخمل
چاندنی ایسے چھلکتی ہے کہ پگھلی چاندی
اُجلی کرنیں ہیں کہ منقش کی جھلمل جھالر
نیلے امبر پہ رواں چاند کا سیمیں بجرہ
جیسے کشتی میں جواں سانولی، سندر پریاں
چاند ہے پاک و خنک، جیسے کوئی دوشیزہ
کوئی منہ بند کلی، کوئی اچھوتا موتی
گو کھلا چہرہ ہے، جسم ہے لیکن بے داغ
بانکپن اس کے بدن کا ہے مقفل اب تک
گورے ہونٹوں کے دہانے کا ہے سوتا محفوظ
دوسری دیویوں کی طرح اس ابلا نے کبھی
بسترِ عیش کی زینت نہ بنایا خود کو

کبھی آغوشِ گلوگیر میں تڑپی نہ بھنچی
اس نے دیکھا نہ کبھی پنجہ و بازو کا فشار

سلومی یوحنا کا سر مانگتی ہے تو اس کا باپ ہیرودیس اسے اس مطالبے سے منع کرتے ہوئے اپنے پوشیدہ نوادر کا حال یوں بتاتا ہے۔

ان محلوں میں جواہر کے دفینے ہیں بہت
جو کہ پوشیدہ ابھی تک ہیں تمہاری ماں سے
دیکھ لے ان کو اگر چشمِ فلک ششدر ہو
چار لڑیوں میں پروئی ہوئی زنجیرِ گہر
نقرئی کرنوں میں پابندِ سلاسل مہتاب
دامِ زریں میں گرفتار ہیں مہتاب پچاس
سینۂ عاج پہ پہنا اسے اک بانو نے
نظر اپنے ملکہ اس کو پہن کر تو بھی
دو داماتست مرے پاس ہیں دو رنگوں کے
مئے مشکیں کی طرح ایک تو ہے تیرہ و تار
دوسرا آتشی ہم رنگِ شرابِ ممزوج

خالد صاحب کے اس شاہکار میں اس قسم کے اعلیٰ نمونے جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سلومی میں خالد صاحب اپنے فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتے ہیں" اور ایک منظوم ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اس نے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

لمحوں کی آگ

حفیظ صدیقی

ورقِ ناخوانده

رفیقہ خاور

ہماری قوم کی شعری صلاحیتوں نے حصول آزادی کے بعد کتنی ہی سمتیں اختیار کی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک منظوم تمثیلیں بھی ہیں۔ شاید اس لئے کہ ہماری آزاد متحرک زندگی، ایک ڈرامائی مظہر چاہتی تھی۔ یہ مظہر صنف ہو یا فرد، بہرحال ورقِ ناخوانده ہیں۔ فرد کے تیور تو عنوان ہی سے ظاہر ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ عنوان غیر شعوری احساس کی بنا پر ہی اختیار کیا گیا ہو۔

تیس ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا

کیونکہ غالبؔ نے کسی شدید احساس کے تحت ہی کہا تھا کہ:

ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخوانده

اس لئے کہ حسنِ قبول کے سلسلے میں غالبؔ اور تربیلی تمثیلوں کے اس مجموعہ کے مصنف عبدالعزیز خالدؔ، دونوں کا تجربہ یکساں ہے۔ غالبؔ کے یہاں تو تھوڑا آگے چل کر یہی ورق "گردانده" ہو گیا تھا۔ کیا خالدؔ کے یہاں جو اپنے پیشرو کی طرح "تریاکی" قدیم ہے دودِ چراغ کا یہ قلب ماہیت یعنی ورق گردانندگی کچھ بعید ہے؟

منظوم تمثیلوں کا یہ تازہ ترین مجموعہ شاعر کی اولین پیشکش "زرداغ دل" کا بدلا یا نکھرا ہوا روپ ہے۔ (کہیں ایسا تو نہیں کہ "زرداغ دل" طبع ہونے کے باوجود شائع نہیں ہوئی، اس لئے اس کی تمثیلات ورقِ ناخوانده ہی رہیں؟) ایک کے بعد دوسری تصنیف میں یہ نکھار کتنی ہی منزلوں سے گزرنے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ جن کی نمائندگی متعدد غنائیہ و ڈرامائی مجموعے — سلومی، سرودِ رفتہ، غزل الغزلات گل نغمہ، زنجیرِ رم آہو، دکان شیشہ گر، برگ خزاں اور کلک موج کرتے ہیں۔ اس طویل طویل سلسلۂ تصانیف کے متعلق رائیں مختلف رہی ہیں اور رہیں گی، اور خود ہم بھی ان میں جائے تامل بلکہ غالبؔ اور خالدؔ دونوں کے انداز میں یک جہاں زانوئے تامل پاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم فی الحال صرف معاصر شاعر کی تازہ ترین پیشکش پر ہی نظر رکھیں اور یہ دیکھیں کہ اب اس کا اور اس کی شاعری کا رخ کیا ہے؟

حسب معمول عنوان کی شکایت تو اکثر کو ہو گی۔ علم و حکمت میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں لیکن حسن حسن ہے اور علم علم۔ جب کوئی بات زیادہ ہی علم و حکمت کی بات بن جائے یعنی ماورائے سخن، تو اس میں ذوق کم اور اس کی مخالف جنس "تعقل" زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہلکی پھلکی نفاست اور شگفتگی کی بجائے وہ چیز جسے کہنے والے "تکلف بارده" کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں نکھار پیدا کرنے والی حیثیت، تجرید سے دب جاتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں تجریدی فن سے کون گریز نہیں کرتا، خواہ وہ مصوری میں ہو یا انشا پردازی میں۔ اب سوائے اس کے کہ "ورق ناخوانده" ایک نادر یا شگفتہ (؟) ترکیب ہے جسے غالبؔ نے وضع کیا ہے، بظاہر اس کا کوئی محل نہیں اور نہ مجموعے کے کسی حصے میں سوائے پورے شعر کے اس کا کوئی اشارہ ہی ملتا ہے۔

شعر مرا بمدرسہ کہ برد کی نشتریت تسلیم، اور طنز کے دفاعی ہتھیار کی تیزی سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن شاعر کو اظہار علمد

فضل کی زیادہ سے زیادہ رعایت دیتے ہوئے مدرسہ جانے یا نے جانے والوں کو کم از کم یہ شرط پیش کرنے کی اجازت ضرور دینی چاہیے کہ ایک مناسب حدود میں رہے۔ ممکن ہے "زرداغ دل" "زنجیر رم آہو"، "گنج رنج رائیگاں"، "کلکِ موج" اور "ورقِ ناخواندہ" جیسی غریب ترکیبیں بار بار سامنے آنے پر مانوس ہو جائیں، لیکن یہ ضروری نہیں۔ پھر یہ کہ مناسبت کے ساتھ ساتھ وفورِ حسن بھی ہو۔ کلکِ موج جس مصرع میں ہے۔۔۔ "بہ پیشانی می نویسد کلکِ موج احوالِ دریا را" ۔۔۔ باعتبار مضمون برمحل ہے۔ مگر صرف اسی کی حد تک۔ اس کی تکرار لامحالہ وہی غیر جمالیاتی وضع پیدا کرے گی جو کلک جیسے خشک لفظ میں لازم ہے۔ اگر شاعر الفاظ کو برتا سکتا ہے۔ اور خالد یقیناً برتا سکتا ہے۔ تو وہ انہیں بجھائے یا گہنائے کیوں۔؟

اس مجموعہ کے عنوان سے قطع نظر شاعر کے وجدانی احساس، اس کے ذوقِ سلیم نے الفاظ کو زیادہ تر برتایا ہی ہے۔ جس کا ثبوت اس کی بھرپور، رچی ہوئی شعریت اس کے فن سے ملتا ہے۔ یہاں ڈرامائی تکنیک اور جذبات نگاری کے جھمیلے میں پھنسنے کی بجائے ہم صرف الفاظ کی فسوں کاری سے بحث کریں گے۔ تاکہ فن کے اس پہلو پر کسی قدر کھل کر بحث کی جا سکے گی۔

اس مجموعہ میں پانچ ترتیلی تمثیلیں ہیں۔ طلسمِ زندگی، چراغِ تر داماں، دفترِ تمنا، گلہائے رسوائی، گنج رنج شائیگاں۔ شاعر کی دوسری پیشکشوں کی طرح ان میں بھی "شاہدِ معنی" "مستعار" ہے اور اسے "حریرِ تازہ" پہنا کر "کہنگی پوشیدہ تشریف نوی" کا مصداق بنایا گیا ہے۔ ان میں ادبی یا فنی حیثیت سے کوئی اشکال نہیں۔ اشکال کی تعریف یہ کہ ہم اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں، یا بعض الفاظ سے نابلد ہیں۔ ادق، نامانوس الفاظ کے "گلہائے رسوائی"، ان تمثیلوں میں بہت کم ہیں۔ صرف آخری تمثیل "گنج رنج رائیگاں" میں ان کی کھپت کچھ زیادہ ہے۔ مگر اتنی بھی زیادہ نہیں کہ لطافت اور کثافت میں کوئی تناسب باقی نہ رہے۔

خالد میں حسن کا ایک رچا ہوا احساس ہے اور جب بھی وہ ظاہر ہوتا ہے تو مسلسل نمایاں ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ اتنے وسیع پیمانہ پر جس کی ہمارے یہاں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ شاعروں کا شاعر ہوتے ہوئے وہ علی الحساب شاعر بھی ہے۔ جس سے اس کی فطرت میں خود بخود غیر معمولی وسعت پیدا جاتی ہے۔ اس لئے اس نے ترتیلی تمثیلوں کا میدان چنا ہے۔ جس میں انسانی فطرت کے بوقلموں جلوے اس کو اظہارِ فن کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ جابجا نئے مقامات سے دوچار ہوتا ہے۔ جو غنائیہ شاعری کے محدود میدان میں ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ جتنے متنوع اور نادر مقامات ہوں گے اتنا ہی شاعر کو اپنی صلاحیتوں کی نمود کا موقع ملے گا۔ اس کی کامیابی بھی زیادہ ہو گی۔ اس وقت تک زیادہ مراثی ہی میں اس کا امکان ہوا ہے جن کی حدود معین ہیں۔ تمثیلوں میں انسانی فطرت اور قدرت دونوں کے حدود بے اندازہ ہیں۔ اس لئے شاعر کا ہر قدم ایسے مقام پر پڑتا ہے جو دوسروں سے بہت بلند بھی ہے اور مہتم بالشان بھی۔ اپنے اندر کتنی ہی وسعتیں لئے ہوئے پھر چونکہ شاعر مطالعہ کی وسیع پہنائیاں لے کر آگے چلتا ہے، اس لئے اس کی وسعت میں دوسرے شاعروں کی بے شمار وسعتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

ان مقامات میں ایک مقام تو ایسا ہے جسے خالد نے اپنی منزلِ خاص بنا لیا ہے۔ بلا شرکتِ غیرے تو نہیں کیونکہ اس میں جعفر طاہر اور راقم الحروف بھی شریک ہیں، لیکن جس انداز سے وہ اس جادۂ شوق پر گامزن ہوتا ہے۔ وہ اسی سے مخصوص ہے۔ آج کل کا کمسن اپنی کافرادا دلہن کو کس نظر سے دیکھتا ہے، یہ خالد کی نظر سے دیکھئے۔

اب دلہن بصد انداز و ادا آتی ہے	جوشِ مستی سے لچکتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی
تازہ پھولوں کے مہکتے ہوئے گجرے کی طرح	سرخ دوپٹے گلے، سر پر خمار اطلس
دھانی بانکیں، کڑے بلدار، جڑاؤ جھمکے	چہرے پر سوچ کے آثار ہویدا کم کم
زلف ہے یا کہ مسلسل خطِ تعلیق در تاج	اپنے ہی مشک سے مست آہوئے مشکیں کی طرح

اگر ایسے شہ پارے کے سلسلے میں مارکو یا شیکسپیر کا حوالہ دے دیا جائے تو وہ بے محل نہ ہوگا، اردو میں اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ یہ شاعر کے فن ہی نہیں شاعری کے اوج کی خبر بھی دیتا ہے۔ لطیف مشاہدہ، رچا ہوا ذوق، جھلکتی ہوئی، چھلکتی ہوئی ایسی خوبصورتی مسلسل مصرعوں کی تیز بُرش، ایک مصرع میں دو جگہ کاٹ۔ تیسرے میں تین جگہ توڑ۔ سجرے سجرے گجروں کی طرح تر و تازہ مہکتے ہوئے پھول، دیسی دہانیں، جڑاؤ جھمکے، کے ساتھ بدیسی (دیبا، خمارِ اطلس۔ خط تعلیق و رقاع) کا جوڑ اور علم بھی حسن کے روپ میں اس کو کتنا نفیس بنا دیتے ہیں۔ "خطِ تعلیق و رقاع کی داد کچھ وہی سکتے ہیں جو سفیرِ جمالِ فن — خطاطی۔ اور اس کے ساتھ علم کے ذوق سے آشنا ہوں۔ خمارِ اطلس بھی ایسے ہی علم کا جادو جگانے میں فرد ہے۔ زلف کی یہ بہار کہ — "اپنے ہی مشک سے مست ہوئے مشکیں کی طرح!" اور اگر زلف نہ ہو، یہی مصرع مشکیں ہو تو ؟

تمثیل "چراغ تہہ داماں" میں جب چراغِ حسن تہہ داماں نہیں رہتا تو پھر ایک ایسا ہی کوندا کس ادا سے لپک جاتا ہے۔

گل لالہ کو کہوں تیرا غلامِ داغی
تیری بھرپور جوانی ہے قرابہ مے کا

گرمیٔ حسن سے رنگت تیری سنولائی ہے
جذب کر لے مجھے خود میں ایدینت کی طرح

قد سفیدے کی طرح، سرو سا اونچا لمبا
سرخ یاقوت سے لب، دانت شفق میں تلے

نشے کے بار سے بوجھل ہیں گھنیری پلکیں
جسم کندن سا ترا رنگ پدم سا پارس

تصویر بڑی چھنی ہوئی بھی ہے اور شوخ بھی۔ شاعر کو لٹے ہتھے ہے۔ (بہت ہی ملائم ہاتھ۔ پنجابی) کہنے سے نہیں جھجکا۔ اور پھر رنگ چنار جس کی صوری و تشبیہی (وجہ شبہ: سرخی) مناسبت ظاہر ہے۔ سنولائی، سرخ یاقوت، شفق صبح کی لالی لال، روشنی۔ شام کندن۔ پدم۔ پارس۔ سب ایک ہی سنہری سلسلے کی یک رنگ کڑیاں ہیں۔ جن سے سر سے پاؤں تک ایک مسلسل وضع کا احساس ہوتا ہے۔ کیا ہم اسے رنگ کی ترصیع کہیں، اس تصویر میں صرف دو رنگ کا ٹواں ہیں:۔

— سفیدا اور قاقم و سیفور ..... — پہلا رنگ خود یوں کٹ جاتا ہے کہ وجہ شبہ لمبائی ہے، رنگ نہیں — ویسے سفیدے کی چھال بھی گلابی گلابی ہوتی ہے، سفید نہیں۔ قاقم، سیفور وغیرہ سرخ نہیں ہوتے۔

خود چیدہ الفاظ اور انگیز بیان میں یہ مصرعے مرموز ہوتے ہوئے مجلّی بھی ہیں۔ بیک وقت تشبیہہ بھی اور تنزیہہ بھی — ان البیان لسحرا۔ عربی فارسی، ہندی رس کا متوالا خالد "شعبدہ نیرنگ" کی حدیثوں، انو رنگ شعبدوں اور رنگ رنگ ہیروں کو سلک بیان میں پرونا خوب جانتا ہے۔ رنگینوں کی دھن میں گوندھی ہوئی لہر کبھی یوں بھی اٹھتی ہے:۔

مہک گلاب کی، بادِ بہار کی خوشبو
دمِ خرام لچکتے ہیں شاخِ گل کی طرح

تمام رامش و ریحان، تمام دستنبو
وہ سینے کا گھر میں محملیں بلورستاں

ہے جس میں نازکی پھولوں کی جوش موجوں کا
فروغِ رنگِ بدن سے لباس گلگوں ہو

رگوں میں خون جوانی کا کف کرے پیدا
رنگیلا ہاتھ ہے یا شاخ سرخ پھولوں کی

یہ سب کچھ کسی اعتبار سے بھی محض طومار الفاظ نہیں۔ یہاں بیان کی ہر ہر تہہ میں "چیدہ ام مینا نہ" سے سو سو رنگ ہیں۔ ان کی رنگینی کے ساتھ ساتھ تخیل کی براقی بھی ابھرتی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ایسا محل نظر آتا ہے شاعر کا ذخیرۂ سمٹتا نہیں بلکہ موج بر موج امڈتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اپنے ہمراہ ہزار ہا رنگا رنگ گھونگھے اور جھم جھم کرتی سیپیاں ہی سیپیاں

کپڑا جو عرب مرد اور شانوں پر ڈالتے ہیں۔

لاتا ہے۔

اک خلتن نافہ ناب، ایک چمن آرائش — رخ گلگوں، لب میگوں، قد دراز، زلفیں دراز

سرخ مونگے سا بدن، اس میں جھلک نیلم کی — قرمزی رنگ کی زرکار حریری پوشاک

مسکراہٹ ملکوتی لب عنابی پر

بعض اوقات بڑے نازک مقام بھی آتے ہیں مگر اس کا توسنِ خوش خرام ان سے کس طرح اٹھکھیلیاں کرتا ہوا گذر جاتا ہے

پہیلیوں میں وہ قصے شب عروسی کے — پھوار ابر بہاری کی رس بھری نمدار

لہو ترنگ سے منہ کھولتی ہے سیپی کا — علے الصباح بدلنا وہ ملگجی پوشاک

یہاں صرف شگفتگی و رنگینیٔ بیان ہی نہیں، ذوقِ لطیف کی بھی بھرپور چھوٹ ہے۔ اور جب وہ لولیانِ شوخ دشیریں کار و شہر آشوب کی تعریف کرتا ہے تو صنف نازک کے کم وکیف کے عالم کی طرح ان کے کم وکیف کا بھی معلوم،

یروشلم کی غوغائیانِ گندم گوں ! — وہ کوہ قاف کی شنگولیانِ جادوگر

غزال چشم و فسوں ماجرا و بوقلموں — تمام سازش ترغیب والتہاب جنوں

سمن اندام نگاروں کا خرام گلنار — آیۂ ثابت و سیارہ ہے جن کا دیدار

دخترانِ حوّا کی تعریف میں الفاظ کی یہ طلسم کاری ڈرامہ کے محل و مقام کا ذیلی عنوان ہے۔ شاعران الفاظ کے لئے اپنے مطالب ذوق اور سلیقۂ بیان کے سوا اور کسی چیز کا مرہون منت نہیں۔ اور پھر ان کا محلِ صَرف بھی ترمیلی تمثیلوں کے امکانات کی طرح بے کراں ہے۔ خالد کے یہاں فطرت کی رنگ آرائی بھی صنف نازک سے کچھ کم نہیں۔

پرنیاں پوشی پرندوں کے خوش الحان ارغن — آفرینش کی یہ مشاطگی گلشن گلشن

حسنِ فطرت کی یہ آشفتگی صحرا صحرا — کہ تیرگی میں اجالے کی دودھیا لہریں

کہاں، یہاں تو ستاروں کے جھاڑ روشن ہیں — فضا میں ایک چکا چوند ہے، چراغاں ہے

وہ دُور ایک بھڑکتا ہوا مدوّر کنڈ — کہیں وہی تو زمین کا نہیں منارۂ نور؟

یہ آگ کس نے لگائی ہے ابر پاروں میں — فضا میں کیف فراواں کی تھرتھراہٹ ہے

ہواؤں میں موجِ تجلّی کی سرسراہٹ ہے

آفرینش یعنی فطرت کے مناظر و مرایا کی مشاطگی صحرا صحرا بھی نگارانِ سیم وتن کی مشاطگی کی طرح تمثیلی نشیب وفراز کا ایک ذیلی معرکہ ہے، اصل مقصود نہیں۔ یہ مقصود گوناگوں عوالم، چند در چند کوائف کی جلوہ گری ہے۔ اس لحاظ سے شاعری کی بساطِ بیان، اور اس بساط پر جابجا بکدست شاطرانہ چالیں، اور بھی فراواں ہیں۔ صحرا صحرا کے مقابلے میں گلشن گلشن۔

سمسّون اور دلیلہ کی دلگداز کہانی ہم ملٹن جیسے قادر الکلام شاعر کی زبانی سن چکے ہیں۔ کیا اس کے بعد کسی کو یہ المیہ پیش کرنے کی ہمت تھی؟ خالد نے یہ جسارت کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ہم لوگ شاعری کے میدان میں اگلے وقتوں کے استادوں، بالخصوص اساتذۂ فرنگ سے کتنے ہی پیچھے سہی۔ ہمارا احساس کمتری ہمیں کچھ یہی تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مگر۔ میرا لہو بھی

"خوب ہے تیری حنا کے بعد! اور لہو آخر لہو ہے۔

ایسی تمثیل میں نئے نئے موقع ہی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر ان کا حق کیسے ادا کرتا ہے اور بنیادی حقیقتوں کو کیسے چھوتا ہے۔ عشق اور بوالہوسی، اعلیٰ و ادنیٰ کا پیچ کب نہیں پڑا۔ شاعر کی آنکھ اس بوالعجبی کو مشاہدہ کئے بغیر رہ نہیں سکی:

عشق معزول، ہوس صاحبِ ملک و منصب

زندگی کی بہار، اور ایسی بہار رفتہ جو کسی دلیلہ کے ساتھ گزرے، کسے نہیں ستائے گی اور وہ اس کے گذر جانے پر کیسے افسوس نہیں کرے گا۔

کس جگہ کھو گئے ماضی کے نگارینہ دیار؟

جہاں تک سمسون کا تعلق ہے اس کا چوٹ کھایا ہوا دل کیسے پکار اٹھتا ہے:۔

میرا سرمایہ ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں بجز اندوہِ وفا برگ و نوا کچھ بھی نہیں

وہ جانتا ہے کہ

میں کہ تھا منتخب دودۂ آذر نفساں حلقۂ آتشِ نمرود میں گلزار خلیل

جس سے وابستہ تھا احیائے بنی اسرائیل

اب وہ اس مقام بلند سے گرا ہے تو کیسے اور کس حضیض و نکبت میں:

طائر سدرہ نشیں زیر کمند آہی گیا

آج غازہ میں ہے مزدورِ طرب گاہِ رقیب

یہاں حقیقتۃً خالد کے بڑے سے بڑے معترضِ شعر[1] کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا وار بے پناہ ہے۔ اس نے غالب کے الفاظ بالکل چھین لئے ہیں اور ان کا ایسا برجستہ کیا ہے کہ انسان پھڑک اٹھے۔ گرسنہ یہاں ظاہر ہے مقدر ہے، مذکور نہیں۔ اگلے مصرع میں اس نے میرے ہی الفاظ اپنائے ہیں، گو وہ انہیں چھین نہیں سکا[2]:

وقفِ زنجیر و رسن عربدہ زار تضحیک

اس کے بعد ایک تیر پر دوسرا تیر: "راہ تکتی ہیں کنیزانِ شبستانِ شہی" یا پھر "بزمِ اغیار میں یوں نقش بدیوار ہوں میں"۔ سمسون کا زوال بھی اپنے جدِ امجد، آدم سے کم نہیں۔ اور اس کا نتیجہ:

رخصت آہ و فغاں، فرصت اندوہِ گراں عشرت سوزِ نہاں، دیدۂ خونابہ فشاں

ایک ہی لغزشِ مستانہ میں سب کچھ کھو بیٹھا آہ اک گھونٹ بھرا اور سبو خالی تھا

ایک بار پھر وہی بے پناہ لمحہ:۔

دام ہمرنگِ زمیں تھا، یہ نہ سوچا میں نے

---

[1]: غالب یا پھر راقم الحروف کی صدائے بازگشت۔ [2]: "منکرانِ شعر من" غالب

اس کے بعد ان مصرعوں کی خرادی تراش اور گمبھیرتا پر غور کیجئے۔

آہ اندوہِ نگاں غلط انداز بتاں کرے آفاق کو جو کارگہِ شیشہ گراں

فاؤسٹس کے احساس لغزش کے مقابلے میں سمسون کا یہ احساس دیکھیئے۔

عرصۂ زیست میں اب چارۂ غم کب ہوگا کون بہلائے گا ایام کی ویرانی کو؟

افراد ہوں یا قومیں جب بھی ان سے کوئی ایسی شدید خطا سرزد ہوتی ہے، تو وہ بعینہٖ اسی طرح سوچتی اور ہلکان ہوتی ہیں۔

چاند تارو! مری دنیا میں گھپ اندھیرا ہے زندگی میرے لئے موت سے سنگین تر ہے

ایک سنسان مسافت کہ نہ جادہ نہ جرس جس جگہ بالشں سبزہ بھی ہے دیوارِ قفس

مجمرِ سینہ میں اک شعلۂ پیچاں ہے نفس

آخری تین مصرعے تصور ہی نہیں بیان میں بھی کن حدوں کو نہیں چھوتے۔ یہ پھر بھی رعنائی الفاظ کا کرشمہ ہے۔ لیکن کبھی بات اعجازِ فن اور اپچ کی معراج تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

نفسِ امّارہ کے مشکینہ فسوں میں آکر

اظہار کے اس مشکینہ فسوں میں ایک دو شاعر ہی خالد کے شریک ہیں۔ وہ سمسون جو معرکہ آرا سمسون تھا، زوال کے بعد اس کی یک بیک کایا پلٹ ایک ڈرامائی افتاد ہے جو ایسا ہی ڈرامائی پیرایہ بھی چاہتی ہے۔

وہی سمسون ہے، سمسون کا دھندلا سایہ!

کتنی ہی بڑی بڑی حقیقتوں کے بعد ایک حقیقت کبریٰ:

زندگی نام ہے حالات سے سمجھوتے کا

نظم میں بے شمار ایسے صاف سلجھے ہوئے شعر ہیں جو سہل ممتنع کی حد تک پہنچ کر زبان زد خاص و عام بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

وہ شبیں گرد بنیں اور وہ دن راکھ ہوئے ہے سرِ ناز فروشی تو خریدار بہت

دل آوارہ ابھی بھٹکے گا منزل منزل زندگی جادۂ پُرخار ہے گُل پوش نہیں

اور پہلو میں دل ہی تو ہے، الماس نہیں دل جواں ہو تو جواں ہوتا ہے جولانِ نفس

تفو اے گردشِ نیرنگیٔ ایام تفو! تیر دلدوز بھی اک ترکشِ تقدیر میں تھا

لکھ گیا خون تمنا سے وفا کا مضمون

یہ سب ایک ہی تمثیل سے ہیں اور ہنوز ان کی فراہمی تشنۂ تکمیل۔ اب لب ساحل کوئی تاحد نظر پھیلے ہوئے ان گہر پاروں کو کب تک چنے۔ عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا۔ البتہ اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ یہ سیپ، یہ گھونگھے، محض گم سم یکسر گنگ سیپ اور گھونگھے ہی نہیں بلکہ ان میں سے کتنے ہی ناقوس بھی ہیں۔ رستخیز اندازہ۔ نرم دھیمی لے کا شاعر، بزمعمولی گھن گرج اور طمطراق کا شاعر بھی ہے۔

پنجۂ سحر شکن، آہن شکن البرز شکن غلغلہ جس کا حریفوں کے شبستانوں میں

تذکرہ جس کا فلسطین کے ایوانوں میں

اور خالد کے یہاں سُروں کا پورا سرگم بھی ہے۔ اونچے سے اونچے سر بھی اور دھیمے سے دھیمے بھی۔ ایک دم وہ الاپ سے ٹیپ تک پہنچ کر اسی طرح جھٹ ٹیپ سے الاپ تک آ جاتا ہے۔ اور وہ اس تمثیل کی تمام مرتب و مرصع نغمگی — ہارمنی کو شاید ہم یہی کہیں گے۔ آخر کار سُروں مرتبوں کے اس بھرپور آہنگ 'اس سمپورن' جیالے' پر امید' ولولہ انگیز' پر اعتماد راگ پر ختم ہوتی ہے۔

عزم زندہ ہے تو ویرانے گل افشاں ہونگے   ہر روش ایمن و ہر گام گلستاں ہونگے

ایک خطرناک کھیل، کیونکہ وہ اقبالؔ کی آواز سے آواز ملا کر آہنگ کو دو بالا کرتا ہے۔ جس میں یہ اندیشہ ہے کہ اس کی لے ذیلی اور کم آواز نہ ہو کر رہ جائے۔ مگر سوز دل پروانہ اس کی نوا کے ارجمند ہونے کا ضامن ہے۔

زیر خاکستر پروانہ جو پنہاں تھے شرار   طرفتہ العین میں وہ شمع شبستاں ہونگے

کیا اس کے بعد بھی یہ ورق ہنوز ناخواندہ ہے؟ شاید — ابھی بحث میں گنجائش رم باقی ہے۔ خاصان ادب کی رائے کچھ بھی ہو، تاہم:

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی   مباش منکر غالبؔ کہ در زمانۂ تست

ڈاکٹر شوکت سبزواری

یہ مشہور شاعر عبدالعزیز خالدؔ کی پانچ تمثیلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمثیلیں پڑھنے یا گنگنانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اس لیے خالد صاحب نے اپنے رسم و رہ عام سے کترا کر نکل جانے والے مزاج کے مطابق انہیں ترتیلی تمثیلوں کے نام سے یاد کیا ہے۔ ہمارے ادب میں ڈراما نایابی کی حد تک کمیاب ہے۔ اچھے معیاری پڑھے جانے والے ڈراموں کے نہ ہونے کی وجہ سے اُردو ادب میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ خالد کی مختصر تمثیلیں اس خلا کو پُر تو نہیں کرتیں لیکن پُر کرنے کا احساس ضرور دلاتی ہیں۔

یہ تمثیلیں نیم مذہبی اور نیم تاریخی ہیں جن کے کرداروں پر صدیوں کے اوہام کا کہر چھایا ہوا ہے۔ خالد کے اپنے اسلوب نے جو پوری طرح ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے ان کرداروں کے نقش و نگار چمکانے اور چہروں کی جھریاں نمایاں کرنے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

خالدؔ اُردو کے "تجربی" (EXPERIMENTALIST) شاعر ہیں۔ اس لیے جب ان کے اسلوب کو نامانوس اور اجنبی ٹھہرا کر خود انہیں دشوار پسند بنایا جاتا ہے تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ تجربہ کرنے والا شاعر روایت کی رسم و راہ سے ہٹ کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تو غالبؔ کی طرح چار و ناچار دشوار پسندی کا طعنہ اسے سننا ہی پڑے گا۔ خالدؔ کی دشوار پسندی غالب کی دشوار پسندی ہے۔ خالد نے غالب کی طرح نازک خیالی اور دقیق بینی سے کام لے کر حباب آسا ترکیبوں سے شاعرانہ تخیل میں رنگ بھرا ہے۔ آیئے میرے ساتھ چند مصرعے پڑھیے۔

شرح اسرارِ تمنا بے نوائے مہجور
شفق صبح کے لمحاتِ پریشاں کا فروغ
کہیں نہہ جرعہ کا سہ کہیں نسیان بہار
کہیں دل سوختہ خمیازہ کش رنج خمار

زندگی بوقلموں جلوہ بساطِ از رنگ
رگِ گلبرگ کہیں اور کہیں شعلۂ طور
کہیں مرغولہ نوا زخمہ در پردہ ساز
کہیں خونناب شرر تاب کہیں رشک ورنگ

لیکن اس شاہد طناز کی نیرنگی سے — آج تک مل نہ سکا زیست کے کاشانے میں
کسی آوارۂ وحشت کو قرارِ دل زار

یہ مصرعے سمیون کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ جب وہ پن چکی چلاتے چلاتے چند لمحوں کے لئے کھلی ہوا میں آ کر بیٹھتا ہے۔ ان مصرعوں میں بوقلموں جلوہ، لمحاتِ پریشاں، مرغولہ نواز، خمیازہ کش رنج خمار، خوں ناب شرر تاب ایسی نازک تخیلی ترکیبوں سے لطف اندوز نہ ہونا اور ان کی شعریت کی داد نہ دینا انتہائی بد مذاقی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ خالدؔ پڑھے لکھے شاعر ہیں۔ مشرق و مغرب کی متعدد کلاسیکی اور بولی جانے والی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان زبانوں کا منتخب ادب بھی پڑھا ہے اس لئے ان کے کلام میں عموماً اور زیر نظر تمثیلوں میں خصوصیت کے ساتھ ایسے الفاظ و مرکبات کا بیچ بیچ میں راہ پا جانا جو ایک عام قاری کو نامانوس اور کسی قدر ناگوار محسوس ہوں۔ بعید نہیں مثلاً ؎

نیلگوں معجر و جلباب سکاہن اوڑھے — میں رہی ماتمیٔ عہدِ بلا خیز شباب

"معجر" "جلباب" عربی اور "سکاہن" خالص فارسی ہے جو خاقانی کے قصائد میں استعمال ہوا ہے۔ یا ؎

سُرخ یاقوت لب دانت شفق میں تارے — چہرہ مرجاں کی طرح کوٹرے ہتھ برگ چنار

"کوٹرے ہتھ" خالص پنجابی ہے۔

لیکن جیسا میں نے عرض کیا خالدؔ "تجربی" شاعر ہیں۔ فکر، فن، موضوع، زبان، بیان ہر میدان میں انہوں نے تجربے کئے۔ جو شعر روایاتی انداز میں ہیں اُن میں بھی تجربے کی تازگی اور شادابی پائی جاتی ہے۔ صرف چند شعر سنیئے ؎

ہے ترے فیض سے لے شمع شبستانِ بہار — دل پروانہ چراغاں ہمہ بلبل گلزار
سبز نیاں پوش پرندوں کا خوش الحان ارغن — آفرینش کی یہ مشاطگی گلشن گلشن
حُسن فطرت کی یہ شگفتگی صحرا صحرا — — — — — — — — —

نازش حیدری

عبدالعزیز خالدؔ بڑے پرگو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ورقِ ناخواندہ ان کی تازہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے پانچ ترتیلی تمثیلیں شامل کی ہیں۔ اردو شاعری میں خالدؔ کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے مقدس کتابوں اور اساطیر سے دلچسپ اور اصلاحی قسم کے قصوں کو لے کر نظم کی صورت دی ہے۔ انہیں فارسی و عربی زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اس قسم کے پرانے قصوں کو نظم کرتے ہیں تو ان کے مطالب ہلکی پھلکی زبان میں ادا کرنے کی بجائے گھن گرج اور باوقار عربی اور فارسی الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

سجاد نقوی

جناب عبدالعزیز خالدؔ کا شمار ملک کے ان شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے واقعی اردو ادب کو کچھ دیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی فہرست میں پانچ ان درج ہیں۔ طلسمِ زندگی، چراغ تہِ داماں، دشتِ تمنا، گلہائے رسوائی اور گنجِ رائیگاں۔ جن میں سمسون، دلیلہ یہودی اور رئیس الشحنہ مشتمل قدیم تاریخ کو منظوم کر کے شاعر نے اُردو ادب کے دامن میں نئے پھولوں کا اضافہ کر دیا ہے۔

بنی اسرائیل کی گمراہی اور خدا کی طرف سے ان کی سرزنش کے واقعات خیالستان کی شہزادی زیتون، سیف الملوک اور ملکہ کی بنت عم لالہ رخ منظوم مکالمے، نازاد و نومرد کی گفتگو، شاہزادہ، نئی ملکہ شاہ نوا اور اتالیق نیز اس دور عذاب گیر کے منظوم حالات تلمبند کہ ناجناب خالدؔ ہی سے ہے جو طوفانِ نوح کا دور کہلاتا ہے۔ قرآنی واقعات کو بحسن و خوبی نظم کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ٹائپ میں چھپی ہوئی اس کتاب

ڈاکٹر وحید قریشی

"پروازِ عقاب" کا شاعر ان نظموں میں ہمارے سامنے ایک مترجم کی حیثیت سے آتا ہے، ترجمے کے سکہ بند اصولوں سے قطع نظر کہ نظمیں لفظی ترجمہ ہیں یا ان میں مفہوم کو لے کر باز آفرینی کا طریق کار اختیار کیا گیا ہے، ہمارے لئے ان نظموں کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ مترجم کے داخلی عمل سے ان نظموں کا کیا رشتہ ہے؟ کوئی سی شعری تخلیق بھی اسی لحاظ سے اہم ہو سکتی ہے کہ اس کا کوئی داخلی رشتہ شاعر کی ذات سے ہے یا نہیں، عبدالعزیز خالد نے ہوچی منہ کے زنداں نامے کو انگریزی ترجمے کے حوالے سے اردو کے روپ میں ڈھالا ہے، اس لحاظ سے حقائق کی باز آفرینی کا یہ عمل دو واسطوں سے ظہور پذیر ہوا ہے، انگریز مترجم نے اصل کی روح کو کس حد تک کامیابی سے خارجی پیکر عطا کیا اور خالد انگریز مترجم کی روح کو اور ہوچی منہ کی روح کو الگ الگ پہچاننے میں اور منتقل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ یہ مسئلہ ادب سے زیادہ ریاضی کا مسئلہ ہے، ہمارے نزدیک ان نظموں کی شعری اہمیت یہ ہے کہ ان میں کس حد تک ہوچی منہ اور عبدالعزیز خالد کی جذباتی اور عقلی مناسبتیں پائی جاتی ہیں اور کس حد تک نظموں کو کامیاب کرنے کا سبب ہوتی ہیں؟ بہ الفاظِ دیگر شاعر کے احساسات اور مترجم کے داخلی کوائف میں کیا باہمی رشتہ ہے؟ خالد کو ان کی دوسری نظموں کے حوالے سے دیکھا جائے، تو سیاسی، سماجی، اقتصادی عقائد میں ان میں اور ہوچی منہ میں کوئی قریبی مماثلت نہیں ہے۔

گویا ان کے لئے ان نظموں کا ترجمہ عقائد کی ہم آہنگی کے مقابلے میں کسی دوسری تحریک کا نتیجہ ہے، باطنی اور خارجی تضادات کے باوجود حقائق کی تشکیلِ نو کا یہ عمل مترجم کے داخلی اور خارجی تجربات سے ہم آہنگ ہے، ورنہ اس مجموعے میں تخلیقی سطح پر کامیاب نظمیں نہ ملتیں، عبدالعزیز خالد ان نظموں کو خارجی سطح پر پاکستان کے ان جوانوں سے منسلک کرتے ہیں جو بھارت کی قید میں ہیں، کتاب کے منظوم انتساب میں انہوں نے اس کی وضاحت کر دی ہے، لیکن یہ صرف حقائق کی خارجی توسیع ہے ان نظموں کا داخلی، جذباتی رشتہ اس بدیہی مقصد کے باوصف کئی دوسری سمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، نظموں میں آزادی کی لگن، مصائب جھیلنے کی طاقت اور غم و الم اور عسرت کے درمیان نئے نئے رشتوں کی تلاش اہمیت رکھتی ہے، حقائق کی یہ جذباتی توسیع مترجم کی ذات کے ساتھ کئی رشتوں سے منسلک ہے، ماحول کی کڑی گرفت کے خلاف یہ احتجاج خارجی زندگی کے کرخت خول کے خلاف شدید ردعمل بھی ہے اور شاعر کی ذات کے بعض پہلوؤں کی علامتی تصویر کشی بھی۔

عبدالعزیز خالد کی ذات کے رشتے ایک طرف تو بہادری، جد وجہد، حیات کی تشکیل اور کائنات سے لطف اندوزی کے سرچشموں کی نمائندگی کرتے ہیں اور دوسری طرف حزن و یاس کی، اداسی کی اور موت کی یاد بھی دلاتے ہیں، چنانچہ ان کے ہاں موت اور حیات بعد الموت کے تلازمے بکثرت موجود ہیں ان کے مذہبی عقائد انہیں تسلسلِ حیات کا درس دیتے ہیں یہ ان کی ذات کا بیرونی خول ہے جس میں افسردگی کی مہک، ذائقہ اداسی کا یا آخر شدہ صبح ٹوٹتا ہے ؎

بادکش کے قریب جا کر میں
دور ہی سے بلائیں لیتا ہوں!

چاند کے زرنگار چہرے کی
پاس آ کر اسی جھروکے سے

چاند شاعر پہ مسکراتا ہے (مژدہ صبح نو سناتا ہے)

عبدالعزیز خالد کے ہاں کرب سے لذت پذیری اور موت کی استعاراتی فضا اتنی شدید ہے کہ ان سے منسلک حیات بعد الموت، رات کی چاندنی اور سورج کا طلوع تخلیقی عمل کی وہ علامتیں ہیں جنہیں سرسری قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

اگرچہ باندھ رکھی ہیں مری ٹانگیں مری باہیں
انہوں نے پیچ کر لیکن فراز کوہ پر جا کر

مرے کانوں میں رس گھولیں پرندوں کی اپنی تانیں
فضا جنگل کی پرچھل ہے گل نورس کی خوشبو سے

ان ارضی نعمتوں سے حظ اٹھانے، لطف لینے سے
خداوند ان نعمت! کون مجھ کو روک سکتا ہے

یہ طولانی سفر کا کم کریں احساس تنہائی
ہے ان سے قائم و دائم ہم اہل دل کی دارائی

ہے قیام مرا اس کے قصر دالیوان میں !
محافظ اس کے بدل چوکیوں میں البتہ کمر

مرے جلو میں چلیں مرے بدرقہ بن کر ! !
میں اپنی مرضی سے جی بھر کے خود کو بہلاؤں

لگتا ہے جیسے کوئی بھی رہتا نہیں یہاں
ہم کو ہوائی حملے کے باعث بپاس جاں

باہر نکال لاتے ہیں پاتال جیل سے
ہم خوش ہیں باہر آنے کے حملے کے باوجود

ہر رنگ میں حسین ہے یہ دنیا ہست و بود

اقتباسات پر غور کیا جائے، تو کرب سے لذت کی طرف ایک مسلسل سفر کی نوید ملتی ہے، رات کے سورج کی روشنی سے منور ہو جانے کی تمثیل بھی ہے، انکی کھانوں اس کی جو تعبیریں بھی ہوں وہ اپنی جگہ پر اہم ہیں، لیکن شاعر کی ذات کے حوالے سے تاریک رات اور دوسرے تلازمات تخلیقی عمل کی ایسی علامتیں ہیں، جنہیں بلاشبہ جنسی علامتیں قرار دیا جا سکتا ہے، مندرجہ ذیل اقتباسات مذکورہ اقتباسات سے ملا کر دیکھیں، تو نظم کے شخصی گوشے زیادہ واضح ہو جاتے ہیں ۔

ابھی زمین اندھیرے میں لپٹی سوتی ہے
ہمیں ہوا ہے، مگر حکم چل پڑو فوراً

ہیں گرچہ نیند سے مخمور، کیا کریں مجبور
ہے رہگزار بھی پر پیچ، سخت، ناہموار

میں ٹھوکر کھا کے گیا، اک گڑھے میں جا کے پڑا
گڑھا بھی سخت خطرناک، دیکھتا کیا ہوں

دبے ہیں راہزن اندیشہ ہائے دور و دراز
قریب ہے کہ بنوں لقمۂ فنا لیکن !

بدستگیری بخت خجستہ و میمون
میں اپنے آپ کو باہر اچھال سکتا ہوں

نفوذ کرتی ہیں زنداں میں صبح کی کرنیں
جلاتی دھند کو، کرتی دھوئیں کی غارت ورد

دم حیات سے روشن رواں ہمہ عالم
اسیر تیرے تبسم سے جگمگاتے ہیں

نشاط خیز ہے کیا امتزاج آتش و نم

چوٹیوں سے ہم آغوش بادل ۔ ادھر
چوٹیاں بادلوں سے ہم آغوش ہیں
نیچے دریا چمکتا ہوا۔
مثل شیشے کے شفاف ہے ادھر

غرض کہستاں کی چوٹی پہ دل
کھسکتا ہے میرا
میں رہتا ہوں جو نہی
جنوبی فلک کی طرف رُخ کیے
خواب یارانِ دیرینہ کا دیکھتے؛

ان نظموں میں جنسی تلازمات دوہرا فریضہ ادا کر رہے ہیں، ایک طرف تو یہ عالمِ تخلیق کو نمایاں کرتے ہیں، دوسری طرف یہی الفاظ ایک سماجی فریضہ بھی ادا کر رہے ہیں، بے جرم قید و بند کی سختیاں شاعر کے داخلی عمل سے بھی مربوط ہیں اور ان کا تعلق سیاسی جد و جہد سے بھی ہے نظموں کا ایک دوسرا پہلو بعض دوسرے رشتوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، شعری عمل ایک کیمیاوی عمل بھی ہے، جس میں الفاظ کے تانے بانے شخصی فضا سے غیر شخصی فضا کی طرف جاتے ہیں، راستے میں روحانی فضا بھی آتی ہے، عبدالعزیز خالد روحانی نقطہ نظر سے مناظر کو دیکھتے ہیں اور احساسات کو ٹھوس مادی حقائق سے ہموار کرنے کی جد و جہد کرتے ہیں، کہیں کہیں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا اسلوب ان کا راستہ روکتا ہے، لیکن وہ اسی منزل پر نہیں ٹھہرتے بلکہ معاصر لہجے کو بھی اہمیت دیتے ہیں، تخلیقی تلازمے یہاں سیاسی استعارے بھی بن جاتے ہیں، خالد عزم اور حوصلے کے شاعر ہیں، ہوچی منہ کی نظموں میں بھی مصائب سے لڑ جانے اور حقائق سے سبق لینے کا طنطنہ موجود ہے، اس لئے یہاں دونوں شاعروں میں جذباتی ہم آہنگی کے ایک سے زیادہ پہلو ملتے ہیں۔

ہوچی منہ کا تصورِ حیات انہیں عزم و ہمت پر آمادہ کرتا ہے، ہمارے ہاں قدیم جیل نظمیں بھی موجود ہیں، جن میں قید و بند کی مشکلات کو جرأت سے پیش کیا گیا ہے، ظفر علی خاں کی نظمیں اس عام جذباتی رجحان سے ہٹی ہوئی ہیں، فیض کی نظمیں کسی قدر احساس تذبذب کا شکار ہیں، نظموں کے اس مجموعے میں مجبوری اور بے بسی کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ شاعر اپنی قید و بند کو بعض اوقات آزادی ہی کا ایک روپ قرار دیتا ہے ؎

لے چلو میں چلیں میرے بدرقہ بن کر
میں اپنی مرضی سے جی بھر کے خود کو بہلاؤں
بلندیِ فرحت و شوق اس کے کوہ و دریا سے

باہر نکال لائے ہیں پاتال جیل سے
ہر رنگ میں حسیں ہے یہ دنیائے رنگ و بو

بہ دستگیریِ بختِ نجستہ ... و میموں!
میں اپنے آپ کو باہر اچھال سکتا ہوں

یہ عزم اور حوصلہ خالد کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہے اور شاعری میں افادیت ڈھونڈنے والوں کو اس میں کئی سبق ملیں گے۔ لاکھوں سلام ہوں، اس چینی فلاسفر کو جس نے رزمیہ نظموں کو پڑھنا اس کے لئے جائز قرار دیا تھا کہ اس سے پرندوں کے نام یاد ہو جاتے ہیں، خالد کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی نظموں کا عزم و ہمت والا پہلو ملک کی موجودہ صورتِ حال میں بہت غنیمت ہے، عرب شاعروں کی طرح ٹیلے پر کھڑے ہو کر آنسو بہانے سے بہتر ہے کہ حالات کا مقابلہ کیا جائے اور سلامتی کا راستہ تلاش ہو، آزمائش کی گھڑی میں یہ لہجہ اور یہ طرزِ احساس اگر ہم میں ہمت اور حوصلہ پیدا کر دے، تو اس سے ملک و قوم کے لیے یقیناً بہتری کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، ہوچی منہ کی نظمیں اور خالد کے یہ ترجمے جوش اور ولولے کا وہ پیغام ہیں، جس سے آئندہ کی جد و جہد میں بڑی

مدد مل سکتی ہے، بشرطیکہ ہم انہیں پرندوں کے نام یاد کرنے تک محدود نہ کر دیں اور ان نظموں کی شعری حیثیت کو بھی پیش نظر رکھیں، انہیں شاعری کا بجائے سیاسی رہنما کی تقریر بیان نہ سمجھیں اور نظموں کو محض پیام تصور کرتے ہوئے سیاسی دستاویز بنانے کی کوشش نہ کریں، خالد نے اس بھرم کو قائم رکھا ہے، اور ان نظموں کو ان کے ادبی پہلوؤں کے حساب سے بھی یاد رکھنا چاہیئے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی

عبدالعزیز خالد اس وقت کے عظیم ترین شاعروں میں سے ہیں ان کی نادر الکلامی اور گوناگوں طرز میں کمال کی شاعری کرنا ہر شخص کو مرعوب کئے ہوئے ہیں، اپنی شاعری کے پہلے دور میں انہوں نے جدید ترین طرز کو اپنایا مگر ادھر انہوں نے عربی کی آمیزش سے ایک عظیم طرز میں شاعری کرنا شروع کی، جس پر بڑے بڑے عالموں نے تعریفیں کیں، عبدالعزیز خالد کی شاعری سیف اللہ ہے جو ہر میدان کو فتح کرتی چلی جاتی ہے، مگر زیر نظر مجموعے میں جو دیت نام کے ایک باغی شاعر کے کلام کا ترجمہ ہے وہ اپنے پرانے طرز پر واپس آگئے ہیں وہ ان خیالات کے لئے نہایت موزوں ہے، جو باغی شاعر ہوچی منہ نے ادا کئے ہیں، خالد صاحب آزاد آہنگ کے مالک اور مشاق ہیں اور ان کے ترجمہ کی ادبی اہمیت کسی بھی نظم سے مقرر ہو سکتی ہے۔

زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں عبدالعزیز خالد کا نام ہی اعلیٰ شاعری کی ضمانت ہے اور زیر نظر کتاب میں وہ ہوچی منہ کے دل کی دھڑکن کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں کمال کے ساتھ کامیاب نظر آتے ہیں۔

ظہیر کاشمیری

عبدالعزیز خالد ان سرکاری افسران میں سے ہیں جنہوں نے انگریز سی ایس پی افسروں کی طرح وارثی ادب میں اپنا نمایاں ترین مقام اپنی جہد مسلسل سے حاصل کیا ہے۔ چنانچہ دنیا بھر کی اہم کلاسیکی نظموں کے تراجم میں وہ اپنا مقام رکھتے ہیں، چنانچہ اس سے بیشتر وہ بائیبل کی حسین ترین نظم "غزل الغزلات" سے لے کر ٹیگور کی غیر فانی تخلیق گیتا نجلی تک کے تراجم پیش کر چکے ہیں۔

عبدالعزیز خالد بنیادی طور پر اکاؤنٹس کے آدمی ہیں مگر یہ ان کی غیر معمولی قابلیت ہے کہ وہ انکم ٹیکس کمشنر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ہی اردو ادب کے دامن کو بھی گرانمایہ تراجم سے بھرتے رہتے ہیں۔

ان کی پہلی بعض تخلیقات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ امام حسن لطیفی کی طرح یہ بھی بڑی ادق زبان استعمال کرتے ہیں، مگر زیر تبصرہ ترجمہ میں کم از کم اس بات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا شاید اس کا بنیادی سبب دنیائے انقلاب کے عظیم قائد جناب ہوچی منہ کا اپنا انداز ہے جو انتہائی سادہ اور سلیس ہے، عظیم ہوچی منہ نے اپنے زمانۂ جیل میں چھوٹی نظمیں لکھیں، جو اپنے اندر بہت گمبھیر معانی لیے ہوئے تھیں۔ یہ نظمیں پہلے ہانگ کانگ سے شائع ہوئیں اور پھر جنوری سے "جیل کی ڈائری" کے نام سے اسے شائع کیا گیا ہے اور زیر تبصرہ کتاب اسی ڈائری کا اردو منظوم ترجمہ ہے، جسے عبدالعزیز خالد پوری چابکدستی سے اردو کے شعری قالب میں ڈھالنے میں کما حقہٗ کامیاب رہے ہیں، جس پر انہیں مبارکباد کا مستحق سمجھنا چاہیئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتساب میں عبدالعزیز خالد نے فیض احمد فیض کا تتبع کیا ہے کیونکہ فیض نے بھی پہلی بار اس انداز میں اپنی کتاب کا انتساب لکھ کر اردو میں ایک نئی روایت قائم کی جسے عبدالعزیز خالد نے آگے لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جیل چین میں ہو یا پاکستان میں۔ ان میں ایک ہی قسم کا ماحول ہوتا ہے۔ مگر برِ ورمیں جب اہل دانش کو جیل یاترا کرائی گئی تو انہوں نے اپنی محسوسات کو صفحۂ قرطاس

پر پھیلا کو دعوتِ عبرت دی، زیر تبصرہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے، کہ یہ ہوچی منہ کی وہ نظمیں ہیں، جو انہوں نے جیل میں لکھیں، پہلی نظم یوں ہے۔

شعر خوانی کی مجھے عادت نہیں۔
گو رہا اکثر غمِ دل نکتہ چیں
لیکن اب زنداں میں ہوں اس کے علاوہ کیا کروں؛
بے قراری سے بھی ملتا ہے طبیعت کو سکوں،
باعثِ جمعیتِ خاطر ہے شورِ جنوں
دل نہ تڑپے تو رگوں میں منجمد ہو موجِ خوں
انشراحِ صدر ہے سرکوبیٔ سوزِ دروں
نظمیں لکھ کر سر کروں گا، اب یہ عرصہ قید کا
اور ان نظموں کو گاتے گنگناتے
اک طرح کار وانِ وقت خفتہ پا یہ شبخوں مار کر
بزمِ آزادی کو میں سے آؤں گا نزدیک تر

غالب احمد

"پرواز عقاب" ہوچی منہ کی ان نظموں کا ترجمہ ہے جو انہوں نے تقریباً تیرہ مہینے کے عرصہ قید میں چینی زبان میں چین کی مختلف جیلوں میں لکھی ہیں۔ ہوچی منہ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں وہ برِ اعظم ایشیا کے ان چیدہ رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے ملک میں جنگِ آزادی کی ابتدا کی اور ساری دنیا کی سامراجی اور یورپی امپیریلزم کی طاقتوں کے ساتھ نبرد آزما رہے اور اس جنگِ آزادی کو کامیابی سے روشناس کیا، ہوچی منہ کا ذہنی نقطۂ نظر، سیاسی لائحہ عمل اور معاشرتی سوجھ بوجھ کا لوہا تمام عالم مانتا ہے، لیکن وہ ایک ایسی شخصیت ہے جس نے دنیا میں نہایت خوفناک حقائق کا سامنا آہنی دیوار بن کر کیا اور اپنی قوم کے لئے ساری زندگی وقف کی، اس آہنی شخصیت کی کوئی ایسی مثال موجود نہیں، جس میں شاعری کی کچھ لطافتیں اور ادب کی کچھ نفاستیں موجزن ہوں عموماً اس شخصیت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کیونکہ زندگی کے ٹھوس حقائق سے دوچار رہے ہیں اس لئے ان کے شاعرانہ موشگافیوں سے روشناس ہونا کچھ مشکل امر ہے لیکن ہوچی منہ کی شخصیت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شاعری کوئی ایسا پیشہ نہیں جو کسی کی خصوصی ملکیت بن سکتا ہے، بلکہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو جب کبھی انسان کی شخصیت پر اپنا پرتو ڈالتا ہے، اسے شاعر بننے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس کی ساری شخصیت کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے زندگی دیتا ہے یہ شاعرانہ نقطۂ نظر صرف ایک سال کے عرصہ میں انہیں نصیب ہوا، جو انہوں نے چینی جیلوں میں گذارا، لیکن اس سے جو ادب پیدا ہوا اس کی عظمت نے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ جس طرح ہوچی منہ نے سیاست اور قومی قیادت کے لئے معیار متعین کئے، اسی طرح شاعری کے میدان میں بھی خوب صورتی، حقیقت پسندی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے جذبوں کا کچھ ایسا رنگ روپ پیدا کیا جس سے ان کی شاعری نہ تو محض "ترقی پسندانہ" رہی اور نہ محض "ادب برائے ادب" بلکہ اس میں اس پیچ زندگی کا عکس نظر آتا ہے جس سے ہوچی منہ اس دور سے گذر رہا تھا، ایک انقلابی انسان کے لئے اس کے اندر ایک ایسی روح ہونا لازمی ہے جو اس زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے ہیں کہ ان کی شاعری اور فلسفۂ حیات کا ہوچی منہ اور یہ صرف ہوچی منہ کی روح ہے جس نے ان تمام صعوبتوں کی موجودگی میں انسانی روح کے گیت گائے ہیں اور انسانی وجود کی آزادی اور بقا کے ترانے اپنی نظموں میں سموئے، ان نظموں

میں علاقائی تعصب یا عدو کے ساتھ نفرت کا جذبہ بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہوچی منہ ایک انسان دوست اور محب وطن انسان تھا۔ اور اس کی روح انسانی رفعتوں کی حامل تھی اور اس کی پستیوں کی طرف متوجہ نہ تھی، عبدالعزیز صاحب اردو کے ایک نامور
یوں محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۰۱ء سے لے
شاعر ہیں،
کر اب تک پاکستان جس دور سے گذر رہا ہے اس میں قید اور نظر بندوں کا جو مسئلہ ہمیں پاکستانی زبوں کی ہندوستان میں نظر بند ہونے کی صورت میں نظر آرہا ہے اس انسانی مسئلہ نے عبدالعزیز خالد کو ہوچی منہ کے زمانۂ قید کی شاعری کی طرف متوجہ کیا اس جذبہ کا اظہار ان کی اپنی تعارفی نظم میں بھی نظر آتا ہے، جو پرواز عقاب کی ابتدا میں شامل کتاب ہے، عموماً یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ عبدالعزیز خالد کی شاعری کی بیچ مشکل بندی کی طرف مائل تھی جس میں علم کا ایک خاص معیار ہے اور قاری کو علم کے ایک خاص درجے یا دروازے سے گذر کر ان کی شاعری پر کچھ عبور حاصل ہو سکتا ہے اس لئے خیال تھا کہ شاید اس ترجمے کا انداز بھی کچھ ان کی شاعری جیسا ہی ہوگا لیکن خالد صاحب نے کمال احتیاط اور اپنے نفس کی وابستگی سے آزادی کا اظہار کیا ہے۔

پرواز عقاب کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولین حصہ نفس مضمون کے اعتبار سے سارا ادق قسم کا ہے اس لئے اس کے الفاظ کا چناؤ اور ترجمہ کا انداز کچھ مختلف ہے، حصہ آخر میں ہوچی منہ کی عموماً وہ نظمیں ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی کے ان لطیف اور رومانی جذبات سے ہے جس کا اظہار سارے لفظوں کے لباس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس حصہ میں عبدالعزیز خالد نے ایک پُر وقار مترجم کی حیثیت سے نہایت خوش اسلوبی اور متانت کے ساتھ ہوچی منہ کی نظموں کا اردو زبان میں منظوم ترجمہ پیش کیا ہے ان کی یہ ادبی کاوش ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے، اس لئے بھی کہ جنوب وسطی ایشیا کے ملکوں کی ادبی تصانیف کے تراجم ہمارے ہاں بہت کم ہیں اور شاعری کے میدان میں شاید یہ پہلا مستند ترجمہ ہے جو خالد صاحب نے پیش کیا ہے ان نظموں کے پڑھنے سے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا ہر طرح بھلا ہوگا، کیونکہ عموماً ہمارے ادیب اور شاعر جب کبھی قومی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں وہ یا تو صحافتی روایتوں کو اختیار کر لیتے ہیں یا پھر ادبی نعرہ بازی کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہوچی منہ کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے، جس نے زندگی کے میدان میں سیاسی نعرہ بازی کی، جلوس بھی نکالے، بلوے بھی کئے اور جنگیں بھی لڑیں، لیکن جب اس کی روح نے اسے شعر کہنے پر مجبور کیا تو وہ اپنے سیاسی اور سماجی لبادوں کو اتار کر ایک حقیقی شاعر کا لباس پہن کر شاعری کے میدان میں اترا اور اپنی فطرت اور روح کو حقیقی شاعری میں ڈبو کر اپنے جذبات کو مختلف نظموں کی شکل میں ڈھالا۔ اس شاعری میں کہیں بھی کسی قسم کی ملمع سازی یا تصنع آمیزی کا رنگ نظر نہیں آتا۔ اگر یہ سبق اس ملک کے ادیب بھی سیکھ لیں اور اپنے فن کو اپنی مختلف اغراض کے پیش نظر بیچنے کی بجائے اپنی روح کی صلاحیتوں اور ادبی روایتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ملک و قوم کی زندگی کا عکس حال اور مستقبل کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کریں تو پھر اس ملک میں بھی حقیقی شاعری اور ادب کی زندگی کے آثار نظر آسکتے ہیں، ورنہ ہم نے جہاں اور بہت کچھ کھویا ہے وہاں شاعری اور ادب کی اقدار کو بھی اگر کھو دیں تو بظاہر کوئی خاص فرق نہیں پڑیگا۔

"پرواز عقاب"۔ عبدالعزیز خالد کی ایک ایسی ادبی کاوش ہے جو اپنے اندر ایک استعارے کی نوعیت رکھتی ہے اگر ہم نے اس استعارے کو صحیح رنگ میں سمجھ لیا تو اردو ادب میں نئی راہیں کھلنے کا امکان باقی رہے گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

ان دنوں ادبی حلقوں میں عبدالعزیز خالد کی تازہ ترین تخلیق "پرواز عقاب" کا بہت چرچا ہے، اصل میں یہ ہوچی منہ کے کلام کا

منظوم ترجمہ ہے۔ لیکن ہم اسے خالد کی تخلیق اس لئے کہتے ہیں کہ ترجمے کے عمل کے دوران میں مترجم کی شخصیت کا اثر یقیناً ہوتا ہے اور اس میں تو جا بجا عبدالعزیز خالد نے ہوچی منہ کے کلام کے تاثر کو دو آتشہ کرنے کے لئے اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں اور اس طرح شاعر کے کلام کو اردو شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا ہے کچھ لوگ اس پر معترض بھی ہیں کہ اصل میں ملاوٹ مناسب نہیں تھی، ہمارے نزدیک اس اعتراض میں کوئی جان نہیں ہے۔ کیونکہ تمام اضافے خطوطِ وحدانی کے اندر درج ہیں جو شخص ہوچی منہ کا خالص کلام پڑھنا چاہیں وہ اضافوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ہوچی منہ کی قومی زبان تو ویت نامی تھی، لیکن وہ چین میں قید تھا۔ اور اس نے یہ نظمیں چینی زبان میں لکھیں اور چینی شاعری کی روایت کے مطابق بے پناہ اختصار سے کام لیا، چینی زبان میں کسی کا بھی کلام ہو اس میں صرف چند مصرعے ہوتے ہیں اور کچھ باتیں قارئین کی سوجھ پر چھوڑ دی جاتی ہیں، چونکہ اردو زبان جاننے والے چینی معاشرے اور تہذیب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسی سوجھ کے قابل نہیں ہیں اس لئے عبدالعزیز خالد نے چینی کلام کو ایسے روپ میں پیش کیا کہ اس سے اردو داں طبقہ لطف اندوز ہو سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان کے جنگی قیدیوں کے نام انتساب کی طویل نظم لکھ کر ہوچی منہ کے زندانی احساسات کو مقامی رنگ بخش دیا۔

عبدالعزیز خالد ہمارے ان نئے شعراء میں شامل ہیں جو شعر و شاعری کو محض ایک مشغلہ نہیں، مشن قرار دیتے ہیں اور جو دنیاوی مصروفیات کے باوجود شعر و شاعری میں ریاض سے کام لیتے ہیں اور ایک اعتبار سے وہ سب نئے شعراء سے آگے ہیں کہ ان پر جذب و جنوں کی کیفیت طاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب تک ان کے کلام کے سترہ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں بہت سے ادیبوں نے ان کے کلام پر اظہار رائے کیا ہے۔ لیکن جو رائے مولانا عبدالماجد دریا بادی نے دی ہے اس کا جواب نہیں فرماتے ہیں، "عبدالعزیز خالد کا کلام اچھا اور بہت اچھا ہوتا ہے، اونچا اور بہت اونچا ہوتا ہے دل، دماغ اور روح تینوں کے لئے تسکین بخش ہے، زندگی اور تازگی رکھتا ہے، دل کشی، اخلاص، ادبیت و معنویت کا جامع ہے، بلیغ و لطیف و شریفانہ ہے زاہدانہ ہے، راہبانہ نہیں عاشقانہ ہے، فاسقانہ نہیں اردو کے لئے باعثِ افتخار، ملت کے لئے موجبِ نازش"۔

ہمارے نزدیک خالد کے موضوعات میں بلا کا تنوع موجود ہے وہ حضورِ سرورِ کائنات کی سیرت پر لکھتے ہیں تو حسن عقیدت کی تمام رعنائیوں کے ساتھ آسکر وائلڈ کی "سلومی" کو اردو میں منتقل کرتے ہیں تو موضوع کی تمام رنگینیوں کے ساتھ۔ ولیو مالا کی داستان کو اردو نظم کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو مطالعہ اور تحقیق کی تمام گہرائیوں کے ساتھ۔ اقبال کے بعد وہ اردو زبان کے پہلے محقق شاعر ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اقبال کا کلام عوام میں بھی مقبول ہے۔ لیکن خالد کا کلام اہل علم کے پڑھنے کی چیز ہے، کیونکہ وہی اس کی تلمیحات، اشارات، کنایات اور عربی زبان سے مستعار لئے ہوئے الفاظ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں بہر حال "پرواز عقاب" اس رجحان سے انحراف کی مظہر ہے، اس لئے اسے عام لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔

فتح محمد ملک

اپنی قومی بقا کی جنگ کے موجودہ مرحلے پر "پرواز عقاب" کی اشاعت ایک معنی خیز واقعہ ہے، یہ کتاب ہمیں اس نئے افریشیائی طرز احساس سے روشناس کراتی ہے جو مشکلات و مصائب سے پسپائی کا نہیں پنجہ آزمائی کا پیامبر ہے اب سے پانچ سات برس پہلے احمد ندیم قاسمی نے تہذیب فن کے سلسلہ مضامین میں پاکستانی ادیبوں کو اس نئے، توانا اور ترقی پسند سیاسی اور تہذیبی شعور سے اکتساب فیض کی دعوت دی تھی جو ایشیا اور افریقہ کے ہمعصر ادب و شعر میں برقی رو کی مانند جاری و ساری ہے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں محمد کاظم نے آج کے عربی ادب کے حریت پسندانہ رجحانات سے اردو دنیا کو روشناس کرانے کی مہم شروع کی تھی۔ افریشیائی ادب پر مضامین کے ساتھ ساتھ افریشیائی ادب کے تراجم نے ہماری تخلیقی شخصیت کو نئی

آن بان دی ہے، جب سے لے کر اب تک تعارف و ترجمے کا یہ سلسلہ جاری ہے اور نیا افریشیائی طرزِ احساس ادبی حلقوں تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ بڑھ اور پھیل کر ہماری درس گاہوں میں زیرِ تربیت نئی نسل کے دل و دماغ پر بھی دستک دے رہا ہے۔ "تہذیب و فن" کے مضامین اور تراجم سے لے کر گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی گزٹ کے "ویت نام نمبر" تک اس طرزِ احساس کو زندہ اور متحرک صورت میں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ محمود درویش کی نظم "فلسطین" میں یہ نیا طرزِ احساس خوب صورتی کے ساتھ جلوہ گر ہے

مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کہ جو زنجیرِ فلسطین کے محمود درویش کو عقاب کی خونخواری اور ایک رجائی کی نرمی بخشتی ہے، اسی کے دوسرے سرے پر "پروازِ عقاب" کا شاعر دست و پابستہ پڑا ہے مگر اس کے لب آزاد ہیں اور وہ مزاحمت اور حریت کے آتشیں نغمے تخلیق کر رہا ہے۔

"پروازِ عقاب" ان مختصر چینی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ ہے جو ہوچی منہ نے اب سے تیس برس پہلے چیانگ کائی شیک کے چین کی اٹھارہ مختلف جیلوں میں وقتاً فوقتاً کہی تھیں، ان نظموں میں عہدِ حاضر کے اس عظیم مجاہدِ آزادی کے ایامِ اسیری کے تاثرات و تجربات جلوہ گر ہیں جن کی شخصیت مایوسی اور بربادی کے اس لمحۂ گذراں میں ہمارے لئے مینارۂ نور ثابت ہو سکتی ہے۔

عبدالعزیز خالد نے حبسیہ شاعری کے اس منفرد مجموعے کو پاکستانی جنگی تبدیلیوں سے منسوب کیا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کتاب کا مترجم شکست اور پسپائی کی اس گھڑی میں ہمیں نئے ایشیا کے اس انقلابی رہنما کے فکر و عمل سے ہمرشتہ ہونے کا درس دے رہا ہے۔ ہوچی منہ نے اشتراکیت کے اصولوں کو تقلیدی کی بجائے تخلیقی انداز اور ایشیائی سیاق و سباق میں اپنی زرعی اور نوآبادیاتی قوم کی سنگین ضروریات کے مطابق ڈھالا ہے۔ وہ ویتنامی قومیت کے راستے سے ہو کر پرولتاری بین الاقوامیت کی شاہراہ پر پہنچے ہیں انہوں نے ویت نامی قومیت کے اثبات سے قومی اشتراکیت کا ایک زندہ اور ترقی پسند تصور تخلیق کیا ہے اور اسے مسلسل شاداب اور مستحکم بنانے پر پوری توجہ دی ہے۔ ان کے نقادوں نے ان پر طرح طرح کے الزامات عاید کئے، کبھی ان کی اشتراکیت کو سطحی قرار دیا گیا تو کبھی انہیں ایک ایسا قوم پرست ہونے کا طعنہ دیا گیا، جس نے فقط سرخ لباس زیب تن کر رکھا ہے مگر وہ قومی اشتراکیت کی راہ پر گامزن رہے اور نہایت استقلال کے ساتھ پرولتاری بین الاقوامیت اور ویتنامی قومیت کے امتزاج سے ایشیا کے لئے عملاً ایک نئی اشتراکی حکمتِ عملی تخلیق کرنے میں مشغول رہے۔ یہ انکی حکمتِ عملی کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے چین اور روس کی نظریاتی جنگ میں ترمیم پسندی اور قدامت پسندی کے جھگڑے چکانے میں وقت برباد نہیں کیا، بلکہ ان نحوی موشگافیوں سے قطع نظر کر کے اپنی قومی جد و جہد کے عملی پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھی۔

ہوچی منہ کے کردار میں ہماری سیاست اور فن — ہر دو کے لئے بصیرت کے بہت سے رموز پوشیدہ ہیں، سیاست ہو یا فن — ہم بڑے کام کے نہیں بڑے بول کے خوگر ہیں۔ اسی لئے ہم نے اب تک اس بندۂ عمل مست سے اکتسابِ فیض نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ ہماری حبسیہ شاعری میں کردار کے غازیوں کا انحصار نہیں بلکہ گفتار کے غازیوں کا شہادت کا کمپلیکس ہے۔ ہماری سیاست کا کھوکھلا پن بھی کھلتا جاتا ہے مگر آزمائش کی گھڑی آنے پر اس کی تانِ باطل سے مفاہمت پر آ کے ٹوٹتی ہے ایسے میں ایک ایسے حریت پسند کے ایامِ اسیری کی روداد کی اشاعت مجھے بے حد معنی خیز نظر آتی ہے جس نے ۱۹۵۱ء میں فرانسیسیوں کے خلاف جنگ کے دوران کہا تھا:

"آج صورت یہ ہے کہ ٹڈا ہاتھی سے نبرد آزما ہے، لیکن کل ہاتھی کی انتڑیاں معدے سے باہر پڑی ہوں گی۔"

صورت یہ ہے کہ ایک پاگل ہاتھی کے قدموں کی دھمک ہمیں بھی سنائی دے رہی ہے۔ مگر ہمارا ٹڈا سا اجتماعی وجود ہاتھی سے نبرد آزما ہونے کی بجائے فقط امنِ عالم کی دہائی دے رہا ہے اور اپنے اسیروں کی یاد میں نوحہ گر ہے۔

اظہر جاوید

——— مَیں نہ اقبال نہ بلند اقبال مگر بقولِ کشور ناھید اظہر جاوید ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔ اس دن بھی عبدالعزیز خالد کی تقریب میں مَیں دیر سے پہنچا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب تک بالائی اتر چکی ہوتی ہے مگر میرے خیال میں کھرچن اصل چیز ہوتی ہے اور پھر دیگچی چاٹنے کا مزہ تو سوا ہوتا ہے۔

پاکستان سنٹر کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور "زرگل" کی تقریب کی کسر بھی پوری کر دی گئی تھی۔ نمایاں جگہوں پر "پرواز عقاب" کی نمائش کی گئی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہال کے سناٹے میں مضمون نگاروں کے خوبصورت جملے عقابوں کی طرح پرواز کر رہے ہیں۔ عقاب۔ جو اقبال کے ہاں مردِ مومن کی علامت ہے۔ جو آشیاں بندی نہیں کرتا۔ جس کے پروں کو تھکن سے تعلق نہیں۔ جو فطرت کا رازدار ہے۔ جو آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ جو بہادر جری اور نڈر ہے۔

پرواز عقاب ایشیا کے عظیم مفکر اور بطلِ حریت ہوچی منہ کی نظموں کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ نظریاتی اعتبار سے عبدالعزیز خالد اور ہوچی منہ میں کوئی مطابقت نہیں۔ ہوچی منہ سچے کھرے سوشلسٹ ہیں اور خالد سیدھے سادے مسلمان مگر ان دونوں میں ایک قدر مشترک ضرور ہے اور وہ دردِ ملی اور حب الوطنی کا جذبہ ہے اور پھر دونوں سادہ منش، بے غرض، بے لوث اور بے لوث ہیں۔ ہوچی منہ کی تمام زندگی بھی لگن، جذبے اور ایک مشن سے وابستگی پر منحصر ہے۔ اور یہی سب کچھ عبدالعزیز خالد کی زندگی میں جھلکتا نظر آتا ہے ——— جس طرح ہوچی منہ پہلے ویت نامی تھا اور پھر کچھ اور ——— اس طرح خالد بھی پہلے پاکستانی ہیں اور پھر کچھ اور ——— مولانا مودودی نے ان کے بارے میں بالکل سچ فرمایا ہے کہ وہ اس دور کے حسان بن ثابت ہیں ——— ابن انشا نے بھی ان کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے کہ ان کی شعر گوئی ایک طرف کلاسیکی عربی شاعری کی بے باکی لئے ہوئے ہے۔ دوسری طرف سنجیدگی اور تفکر میں اس کے ڈانڈے غالب اور اقبال کے شعر سے جا ملتے ہیں۔

اس بات کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے ذرا مختلف انداز میں کہا ہے :-

ایک لحاظ سے یہ تو ظفر علی خان اور اقبال کی شعری فضا کی تجدید مع اضافہ ہے۔ اس تقریب میں غالب احمد، ڈاکٹر وحید قریشی، شہزاد احمد، فتح محمد ملک اور ضمیر جعفری نے مضامین پڑھے۔ صدارت جناب فیض نے کی تھی ———

ان سب صاحبان میں سے فتح محمد ملک نے ہی مذکورہ بالا ہوچی منہ اور خالد کی وطن پرستی اور ملت کے درد کے احساس کی ہم آہنگی کی بڑی واضح نشاندہی کی۔ شہزاد نے حسبِ معمول نفسیاتی تجزیہ کیا اور غالب احمد نے تجریدیت کے انداز میں بات کی۔ وحید قریشی کا مضمون بہت محققانہ تھا اور آخر میں ضمیر جعفری نے اپنے مخصوص طنز و مزاح کے رنگ میں خالد کا خاکہ پیش کیا۔ (یہ غنیمت رہا کہ خاکہ اڑایا نہیں)

فیض صاحب نے ہوچی منہ کو نذرانۂ عقیدت اور خالد کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ یہ دو عظیم انسانوں کا بہت خوبصورت کارنامہ ہے۔ فیض صاحب نے کہا کہ اسیری اور عاشقی کا تجربہ مشترک ہے۔ عاشقی میں دنیاداری اور منافقت کے پردے اتر جاتے ہیں اور بے غرضی اور ایثار کا جذبہ بروئے کار آتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال جیل خانے میں ہوتا ہے ———

عبدالعزیز میمن بہت فاضل اور عالم ہیں۔ اور پاکستان ہی نہیں دنیائے عرب میں بھی
وہ عربی زبان میں سند مانے جاتے ہیں۔ اردو پر بھی انہیں مکمل عبور ہے۔ خالد کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ کریں :-
میں یہ نہیں کہوں گا کہ خالد اس دور کے ممتاز و بے مثال اسلامی شاعر ہیں بلکہ پوری اردو شاعری کی تاریخ میں مجھے
کوئی اسلامیات اور عربی کا اتنا ماہر اور باخبر شاعروادیب معلوم نہیں۔
پرواز عقاب میں ہوچی منہ کی نظموں کے ترجمے سے زیادہ وقیع چیز اس کتاب کا انتساب ہے۔ یہ ایک نظم
ہی پاکستان کی عظمتِ رفتہ اور لٹنے پٹنے کی مکمل تاریخ ہے۔
اس کا ایک بند ملاحظہ کریں :-

ان نظر بندوں کی آبادی کے نام
ان ظفر مندوں کی بربادی کے نام

کچھ شعروں کے بعد بند آگے چلتا ہے۔

وہ مرقعے عشق و فرض وآن کے
جن کو اب لالے پڑے ہیں جان کے
وہ جری جرّار پاکستان کے
جو لڑے بڑھ بڑھ کے سینے تان کے
پر یگانوں نے جنہیں دھوکا دیا
مَے سے خونِ ناب کا سودا کیا

اور اس انتساب کے آخری تین مصرعے ملاحظہ کریں :-

جاں نثار صاحب اُمُّ الکتاب
نذر ہے ان کی یہ پروازِ عقاب
گر قبول افتد زہے عزّ و ثواب

عبدالعزیز خالد بھی غالب کی طرح مشکل گو اور مشکل پسند ہیں۔
لفظوں اور زبانوں کا شکوہ ان کی شاعری میں موجزن ہوتا ہے مگر ان نظموں میں وہ اپنی روایت سے ہٹے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شعری عظمت اور آہنگ پوری طرح جلوہ فرما ہے۔

ذوالفقار تابش سے

سوال :- فرض کیجیے کہ آپ ایک جہاز پر سفر کر رہے ہیں. کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ آپ کے ہمراہ ہے۔ ایک روز اچانک جہاز کا خطرے کا سائرن چیخ اٹھتا ہے۔ افراتفری مچ جاتی ہے۔ جہاز کا عملہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے۔ آپ کو ایک لائف بوٹ دیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے قریبی جزیرے میں چلے جائیے۔ اس ہماہمی کے عالم میں بھی آپ کو اپنی عزیز ترین متاع، کتابیں یاد ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ تمام تر کتابیں آپ اپنے ہمراہ لے جا نہیں سکتے کیونکہ لائف بوٹ میں اتنی گنجائش ہی نہیں۔ آپ کو اپنی کتب میں سے صرف تین کتابیں منتخب کرنی ہیں — انتخاب کے اس سنگین مرحلے پر آپ کون سی تین کتابیں منتخب کریں گے اور کیوں؟

جواب :- تابش صاحب! آپ کا سوال بہت دل ہلا دینے والا ہے۔ خدا ایسا بیغبری وقت کسی پر نہ لائے۔ ایسی قیامتِ صغریٰ میں آدمی کے ہوش و حواس کہاں بجا رہتے ہیں؟ ایسے آشوب میں صبر و قرار تو پہلے ہی رخصت ہو جاتے ہیں، کتب خانہ اس وقت کہاں ہوگا؟ اور اگر ہو بھی اور اس تک رسائی ممکن بھی ہو تو وہ فرصتِ کاروبارِ شوق کہاں سے آئے گی کہ آدمی اطمینان سے حسبِ دلخواہ اپنی مرضی کی کتابوں کا انتخاب کر سکے۔ اس وقت تو کیفیت اس حاطبُ اللیل کی سی ہوگی جو اندھیرے میں بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا ہے اور رسّی سمجھ کر سانپ کو مٹھی میں پکڑ لیتا ہے۔

لیکن چونکہ معاملہ صرف فرض کرنے کا ہے، اس لئے سب محالات کو ممکن سمجھتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ میں علاجِ غمِ تنہائی کے لئے

ان تین کتابوں کا انتخاب کروں گا :

کلیاتِ اقبال
طلسم ہوشرُبا
کتاب الاغانی

آپ لازماً سوال کریں گے کہ نگارخانۂ اوراق و مصاحف میں نگہ انتخاب صرف ان تینوں کتابوں پر کیوں پڑی ؟ تو مختصراً اپنی پسند پر اونچی آواز میں غور کرتا ہوں اور اس میں آپ کو بھی شریک کرتا ہوں ۔

پہلی بات تو یہ ہے ۔ اس عالم ویرانی میں جہاں آدم نہ آدم زاد ۔ جہاں رات افعی بن کر ڈرائے ۔ جہاں دن وحشت کو بڑھائے ؛ کتابیں ایسی ہونی چاہئیں ، جو واقعی انیس و جلیس کا کام دے سکیں ۔ جو تہ دار بھی ہوں طرحدار بھی ۔ جو ہمکلام ہوتی ہوئی محسوس ہوں اور جو تکرار کے باوجود اپنی تازگی ، جاذبیت اور رنگارنگی برقرار رکھ سکیں ۔ یعنی ؏

ہر لحظہ نئی آن ہو ہر آن نئی شان

اقبال ایک ایسا شاعر ہے جو مجھے شروع ہی سے متاثر کرتا ہے ۔ اس کا آہنگ ، اس کا لہجہ فوری طور پر دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ۔ اسے معنی آفرینی بھی آتی ہے ۔ سخن آرائی بھی ۔ صاحب مقامات بھی ہے اور حُسن شناس بھی ۔ وہ حرف و صوت کا جادوگر ہے ۔ وہ اعیان و امثال کا شاعر ہے ۔ اس کے کلام میں جلال و جمال کا بڑا نادر امتزاج ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لئے ، سوزِ نفس کے اس نسخۂ کیمیا کو پانے کے لئے کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے کیونکہ :۔

؏ ۔ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

اقبال کے کلام میں بڑی شادابی ، بالیدگی ، دلآویزی اور توانائی ہے ۔ اس کے لحن و لفظ کی گویائی و انجمن آرائی میں اس کے بقول ؛

؏ ۔ دل سوزی و خاموشی ، سرمستی و رعنائی ۔

کی عجیب آمیزش ہے ۔ ایسا ساحرِ سخن ، ایسا رمّازِ فن ، ایسا بدیع الاسلوب شاعر کسی بھی زبان کے لئے سرمایۂ افتخار ہے ۔

یہ ذہن میں رہے کہ کلیات سے میری مراد اس کے مکمل اردو اور فارسی کلام سے ہے ۔ آپ اقبال کے کلام سے میرے شغف و شوق کا اندازہ اس سے لگایئے کہ کالج کے زمانے میں ؛ میں نے اظہارِ عقیدت و محبت کے طور پر زبورِ عجم کی غزلوں اور پیامِ مشرق کے قطعات کو انگریزی نظم کا جامہ پہنایا ۔ یہ ایک معصومانہ کوشش تھی ۔ ؏

کس درد دنِ من نجُست اسرار من

کے جوابِ شکوہ کی ۔

میں نے بہت دن ہوئے ، ازراہِ تفنن و تعلی اپنا اور اس کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا ۔ ؏

وہ خودی کا شاعر تھا میں خدا کا شاعر ہوں ، وہ شاعرِ خودی تھا میں شاعرِ خدا ہوں

اقبال کی شاعری کا کنویس ، بہت وسیع ہے ۔ اس میں کہیں ہمالیہ کی اونچائیاں ہیں کہیں شام کے صحرا کی پہنائیاں ــــــــ خم و ساغر کا خروش نوائے سروش سے ہم آغوش یہ شاعری نغمۂ جبرئیل ہی نہیں صورِ اسرافیل بھی ہے ۔ د

دوسری کتاب جس کا میں بچپن سے اسیر ہوں ۔ وہ طلسم ہوشرُبا ہے ۔ یہ عجب قصۂ عجائب ہے بلکہ مجموعۂ قصص ہے ۔ محیر العقول باتیں ۔ حیران و ششدر کرنے والے واقعات کہیں چشمۂ کوہسار کی طرح تند و تیز ، کہیں میدانی ندی کی طرح سُست خرام اندازِ بیان ۔ دل کو مسحور کرنے والا ۔ ذہن کو مرعوب کرنے والا ۔ تخیل کو اڑانیں عطا کرنے والا اور جذبۂ تحیر کو آسودگی بخشنے والا ۔

عمرو بن امیہ ضمری کی عیاریوں میں تسخیرِ ارض و سما کی رمز (سمبل) پنہاں ہے ۔ انسان اپنے ادراک "اپنی عقلِ حیلہ جو" اپنے جنونِ ہزار شیوہ کی مدد سے تنگنائے ذات کی زنجیروں کو کاٹ کر انہیں پر پرواز بنا سکتا ہے ۔ اس کی زنبیل ، اس کی گلیم ، منڈھی دانیال اور جال الیاسی کیا کیا دل گرماتے اور ملبلاتے ہیں ۔ یہ سامان جس کے پاس ہو ، وہ بادشاہ نہیں خداوند ہے ۔ نازنینانِ پری تمثال اور مہوشانِ حور خصال کے جھگڑے ، حسینانِ مہ جبیں کے جھگڑے ، بہار و نسرینِ عذار کی دلربائی ، برآن شمشیر زن ، مخمور سرخ چشم کی رعنائی ، حیرت و مہر نگار کی زیبائی کس کس طرح مضطرب و شاد کام کرتی ہے ۔ ؏

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

یہ سحر و ساحری کے مقدمے ، یہ رُوپ بہروپ کے کرشمے ، یہ بیر ، یہ پتلیاں ، یہ عیار یہ عیار بچیاں ، یہ کتاب ساحری ، یہ اوراق جمشیدی ، یہ پل پریزادان ، یہ پردۂ ظلمات ، یہ طلسم ظاہر و باطن ، یہ شاہزادگان والا تبار ، اور یہ خوبانِ طناز و طرار ۔ متخیلہ کو کیسے کیسے شاداب و سیراب کرتے ہیں ۔ جہاں کوئی دشواری ، کوئی مشکل پیش آئی وہیں (DEUSEX MACHINA) حاضر ۔ یعنی

؏ ۔ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

یہ طلسم امکانات ہے ۔ ایک جہان بے حدود و ثغور ۔ جو ہمیں دعوتِ مبارزت دیتا ہے ، کہ اٹھو بڑھو اور علم اسما کے زور سے ۔ اسم اعظم کی برکت سے ، اس لوح کون و مکاں کو پڑھو ۔ اس طلسم کن فکاں کو تسخیر کرو ۔ ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہ دنیا دنیائے عمل ہے ۔ اس کی ہر نفی کو اثبات میں بدلو ۔ اس کی سختیوں کو نرمیوں میں ڈھالو ۔ اس کے کانٹوں کو پھول بناؤ ، اور

؏ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

لوگ اس داستان کو اودھ کی تہذیب کا ارژنگ کہتے ہیں ۔ مرثیہ کی طرح اس میں بھی لکھنوی معاشرت کی جھلکیاں ہیں ۔ یہ ایک بہت بڑا مرقع ہے ۔ معاشرتی ، ثقافتی اور تہذیبی ۔ ہمارے ماضی کا بالاحصار ۔ ہماری پرانی تہذیب کا لال قلعہ ۔

تیسری کتاب الاغانی ، عربی ادب ، عربی حضارت و ثقافت کا طلسم ہوشربا ہے ۔ یہ ابو الفرج اصبہانی کی پچاس سالہ محنت کا ثمر ہے ۔ اس کی جامعیت کا اندازہ ابنِ خلکان کی اس روایت سے لگایئے ۔ کہ آلِ بویہ کا علم دوست اور معارف پرور وزیر صاحب ابن عباد جب عازمِ سفر ہوتا تو دورانِ سفر اپنے مطالعے کے لئے ضروری کتابیں تیس اونٹوں پر لاد کر ہمراہ لے جایا کرتا تھا ۔ لیکن الاغانی دستیاب ہوتے ہی وہ اس سارے ذخیرے سے بے نیاز ہو گیا ۔

اس کتاب کو دیوان العرب کہنا چاہیئے ۔ جس میں موسیقی کی اصوات و الحان کے حوالے سے مغنیوں اور شاعروں کے لطائف و ظرائف حکایت و روایت اور اخبار و محاضرات خوب مزے لے لے کر بیان کئے گئے ہیں ۔ اگرچہ ؏

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے

مجھے عربی دانی کا دعویٰ نہیں۔ معمولی شد بد ہے۔ البتہ یہ ہے کہ اٹکل سے مطلب سمجھ لیتا ہوں اور بقدرِ ضروریات اسے اپنے تصرف میں بھی لا سکتا ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ محرمی، حسن نہ سہی

رخصت نظارۂ حسن تو ہے۔

ع تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

بقول شاعر ع

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک

اس کے علاوہ ع

عاشق دل سوختہ کو اور کیا درکار ہے :

نالبش صاحب! آپ کو اپنے سوال کا جواب کسی حد تک مل گیا ہوگا۔ باقی یار زندہ صحبت باقی۔ آپ نے بڑے سکون اور تحمل سے میری باتوں کو سنا۔ میں اس تحریر کا شکر گزار ہوں۔ اور "کتاب" کے قارئین کا بھی پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس سلسلہ جنبانیٔ شوق کا اصل باعث وہی فرخندہ نفس ہیں!

اے غایب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل می بینمت عیان و دعا می فرستمت

اکرام رانا

آخر یہ معجزہ کیا ہے کہ عبدالعزیز خالد کی تعریف میں ملک بھر کے علما، حکما، دانشور، ادیب اور شاعر سب ہی رطب اللسان ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر غلام احمد پرویز تک، عبدالعزیز میمن سے لے کر چوہدری محمد علی تک، جوش سے لے فیض تک سب اپنے نظری اور فکری اختلافات کے باوجود اس شخص سے متاثر ہیں۔ تھوڑا بہت متاثر تو میں بھی تھا۔ میں نے آٹھ دس سال قبل ان کی چند نظمیں اتفاقاً دیکھی تھیں۔ ان کے کلام میں فکر کی گہرائی، تخیل کی بلندی اور اسلام سے بھرپور عقیدت کا اظہار دیکھ کر مجھے اس ان دیکھی شخصیت سے یگانگت سی محسوس ہوتی تھی اور اس سے ملاقات کی آرزو بھی رہی۔

لیکن حیرت اور تذبذب کا عالم زیادہ دیر نہ رہا۔ ایسے ہی ایک دوست کی زبانی سنا کہ عبدالعزیز خالد لاہور آگئے ہیں۔ ارادی طور پر میں پوچھ بیٹھا "وہ کس بزرگ کے یہاں مقیم ہیں؟" "بزرگ؟" دوست نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دہرایا۔ "بزرگ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" میں نے نہایت سادگی سے کہا۔ "بھئی ایسا ہی کوئی معمر بزرگ جیسے وہ خود ہیں کہ ساری عمر تحصیلِ علم میں گزار دی۔" میرا دوست میری غلط فہمی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بولا۔ "بھئی خالد صاحب تو جوان آدمی ہیں۔ وہ معمر کہاں سے ہو گئے ابھی! رہی ان کی علمی فضیلت، اس کے بڑے بڑے قائل ہیں۔ یوں وہ انکم ٹیکس کمشنر ہیں!"

میرا ذہن پھر قلابازیاں کھانے لگا۔ نوجوانی میں اونچا عہدہ۔ شہرت اور اہلِ کمال حضرات کی تعریف نے ضرور اس شخص کو مغرور بنا دیا ہوگا۔! میں اپنے خیالات کو چھپا لینے پر قادر نہیں ہوں، اس لئے میں نے اپنا یہ خدشہ اپنے دوست پر ظاہر کر دیا۔ وہ ایک طنزیہ تبسم کے ساتھ کہنے لگا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ان سے مل کر دیکھ لو۔ اور ہو سکے تو کچھ ان

کے بارے میں لکھنا بھی ضروری"۔ میں نے کہا۔ "لکھوں گا لیکن ایک شرط پر کہ جیسا دیکھوں گا بعینہٖ ویسا ہی لکھوں گا کہ یہی میرا وطیرہ ہے"۔ وہ بڑے اعتماد سے گویا ہوا۔ "بالکل — تم اپنا وطیرہ نہ بدلنا — !"

میں نے جی میں سوچا جس شخص کو محض تعریفیں کر کر کے لوگوں نے سر پر چڑھایا ہوا ہے اُس کی خامیوں کی بھی خبر لوں گا تاکہ اُسے اندازہ ہو جائے کہ ؏

سر پہ اُٹھائے پھرتے ہیں شور و فغاں مجھے!

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک شخص محض اچھائیوں کا مرقع ہے اس میں تلاش بسیار کے باوجود کوئی بُرائی نہیں ملتی —

خالد صاحب سے ملاقات ہوئی اور بڑی طویل ملاقات — اور بے حد مایوس کن —! مایوس کن اس لئے کہ جس طمطراق والے نوجوان خالد سے مل کر اس کے بخیے ادھیڑنے میں گیا تھا وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ جس مغرور شخصیت کی جستجو کشاں کشاں مجھے کھینچ لے گئی تھی وہ سرے سے وہاں موجود نہ تھا۔ جس خالد سے میں ملا وہ تو "افسریت" نام کی شے سے واقف ہی نہ تھا۔ اتنی اپنائیت یگانگت اور خاکساری — اس شخص میں جو زبانوں کی ہفت منزلیں طے کر کے — یعنی سات زبانوں پر عبور حاصل کر کے محنت و ریاضت کی سنگلاخ چٹانوں کو طے کر کے علم و ادب کی رفعتوں کو چھو رہا تھا، مجھ پر حیرت کے تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی۔

خالد کی گفتگو میں اس کی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کی بے تکلفی، اردو کی نزاکت، فارسی کی شیرینی، عربی کی وسعت، ہندی کی مٹھاس، انگریزی کی حقیقت پسندی، جرمنی کی بلندی اور یونانی مفکروں کی سوچ موجود تھی۔ اس کی ذات مجھے ایسا سنگم نظر آئی جہاں مختلف ازمنہ، تہذیب و تمدن اور گوناگوں زبانوں کے ڈانڈے ملتے ہوں اور اس کی انفرادیت پھر بھی نمایاں تھی۔

میں نے خالد کے حال سے مایوس ہو کر ماضی کی طرف رجوع کیا اور ابتدائی حالات کے بارے میں جاننے کی خواہش کا اظہار کیا اور مختلف سوالات کے جواب میں جو مجھے معلوم ہوا اُس کا لب لباب تھا کہ جالندھر کے ایک گاؤں کے متوسط الحال ارائیں خاندان کا یہ چشم و چراغ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کر کے میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے کرنے تک ہر امتحان میں اعزازی حیثیت کا حامل رہا ہے۔

اب میں نے ایک اور حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے زمانۂ طالب علمی میں آپ کے اساتذہ آپ کی مشکل پسندی اور ذہانت کے قائل تھے۔ اب آپ قارئین کو اس مشکل پسندی میں اُلجھا رہے ہیں۔ آخر آپ اس قدر مشکل پسند کیوں ہیں"؟ کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ "اس کا شعوری تجزیہ تو میں نے کبھی نہیں کیا"۔ میں نے پھر سوال کیا۔ "آپ فکر اور مقصد دونوں پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اس کا تقاضہ ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ اذہان تک پہنچیں۔ یہ اُس صورت میں ممکن ہے کہ زبان عام فہم اور مفہوم گہرا ہو — جوشؔ کے الفاظ کا شکوہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ فکر اور پیغام سے عاری ہے لیکن آپ کی مشکل پسندی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کو اپنا مرشد کہتے ہیں لیکن اُن کی تو فارسی بھی اتنی سہل ہے کہ اس پر اردو کا گمان ہوتا ہے — آپ کی اردو پر عربی شریف کا گمان ہوتا ہے"۔

بے ساختہ ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ "مقصد اور پختگی نے اب تو مجھے سہل پسندی کی طرف مائل کر دیا ہے لیکن اتنا تو آپ بھی کہیں گے کہ فکر کی بلندی الفاظ کی پستی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تو دنیا کے بڑے مفکر اقبالؒ سمیت مضمون کی نوعیت کے پیشِ نظر مشکل زبان اختیار کرنے پر مجبور ہوئے"۔

میں نے ایک اور پینترا بدلا ——

"آپ خود کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ایک کمیونسٹ ہوچی منہ کی نظمیں بڑے طمطراق سے ترجمہ کرنے کو ہی ادب کی خدمت سمجھ بیٹھے ہیں۔ آپ نے آخر اس کمیونسٹ کی نظمیں ہی کیوں منتخب کیں؟" خالد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"اسلام سے زیادہ ترقی پسند اور جدوجہد پر ابھارنے والا کوئی دین، کوئی نظریہ، کوئی سکیم نہیں۔ علامہ اقبالؒ کی فکر کا سرچشمہ اوّل تا آخر قرآنِ حکیم ہے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے جہاں بھی قوت اور حرکت دیکھی اور جن افراد کو ان کی تلقین کرتے پایا۔ اُن کی تعریف کی۔ نطشے، گوئٹے، مارکس، برگساں تو ایک طرف رہے انہوں نے تو ابلیس کی بھی فعّالی قوتوں کو پیش کیا ہے۔ دراصل وہ افراد نہیں ان افکار کی تعریف کرتے ہیں جو خدا تعالےٰ کے نزدیک مستحسن ہیں۔ خدا نے لم یزل عمل، حرکت اور جدوجہد کی تلقین کرتا ہے۔ میں بھی جدوجہد کا قائل ہوں۔ اگر مجھے یہ جدوجہد ہوچی منہ کے فکر و نظر میں محسوس ہوئی تو میں اس کا بائیکاٹ کیوں کروں۔ میں اس کا نظریہ جدوجہد بھی عام اذہان تک پہنچانے میں اسلام کو خطرے میں نہیں دیکھتا بلکہ اسلام کی تعلیمات کی تائید کر رہا ہوں۔ اگر خوشحال خان خٹک جدوجہد اپناتا ہے خواہ وہ اورنگ زیب جیسے نیک بادشاہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو مجھے پسند ہے۔ میں شخصیات کی نہیں جدوجہد کی پسندیدگی کا اظہار برملا کرتا ہوں۔ جدوجہد اور حرکت مسلمان کا گمشدہ ورثہ ہے اسے اپنا کر ہی مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔"

"آپ اتنی مصروفیات کے باوجود علوم کے مطالعے اور غور و فکر کے لئے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟"

خالد نے بڑی خود اعتمادی سے کہا۔

"انسان کچھ کرنا چاہے تو وقت بہت ہوتا ہے اور نہ کرنا چاہے تو عدیم الفرصتی کا رونا تمام عمر روتا رہے —— لیکن یہ سب کم ہمتی کی باتیں ہیں۔۔۔۔"

قطع کلام کرتے ہوئے میں نے پرزور انداز میں کہا۔

"لیکن آپ کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کام بالکل نہیں کرتے۔۔۔؟" اس کی نگاہوں میں استغنا رہا گر میں کہتا چلا گیا۔

"میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ آپ دوستوں کے کام بالکل نہیں کرتے حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اس دور میں جائز کام کے لئے بھی ناجائز طریقے استعمال کرنے پڑتے ہیں مثلاً سفارش۔۔۔"

بڑے تحمّل سے خالد نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اس کا قائل نہیں۔ کام اگر جائز ہے تو اُس کے لئے سفارش کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ میرے خیال میں سفارش کرنے والا میری توہین کا موجب ہوتا ہے کہ وہ میری دیانت اور انصاف کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"

میں نے آخری سوال کیا۔

"آپ نے اپنے ماتحتوں کو خود سے بڑا دور رکھا ہوا ہے وہ آپ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔" وہ کچھ تامل سے گویا ہوا "لیکن میں تو اُن سے کبھی سختی سے کیا اونچی آواز سے بھی بات نہیں کرتا۔ میرے نزدیک عجز، انکساری، شفقت و محبت ہی علم کی خصوصیات ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل آپ سے قبل میں نے آپ کی کمزوریوں اور خامیوں کی تحقیق آپ کی معاون بیگم آغا افضال سے کی۔ وہ آپ کی مدّاحی کے سوا کچھ نہ بولیں۔ آپ کے چپراسی سے بھی آپ کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس نے بھی سوائے خوبیاں گنوانے کے ایک حرف آپ کے خلاف نہ کہا۔ میں نے سوچا آپ سے سبھی خائف ہیں لیکن چھوٹے

اب اجازت چاہوں گا۔"

میں چلا آیا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ خالد شاعر بڑا ہے یا ادیب، عالم بڑا ہے یا مفکر، خوش انتظام زیادہ ہے یا خوش خلق، علم زیادہ رکھتا ہے یا حلم، انسان اچھا ہے یا مسلمان۔ مجھے تو وہ ہر حال میں ہر لحاظ سے عظیم نظر آیا۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اقبال کی فکر اور سوچ نے قوم کو پاکستان دیا۔ خدا کرے اقبالِ ثانی کی سوچ اور فکر اس ملک کی بقا اور ترقی کا ذریعہ بن سکے آخر پیغمبروں کے بعد شاعروں نے ہی قوموں کو زندگی بخشی ہے۔

کامل القادری

سوال: آپ کس کے لئے شعر کہتے ہیں؟

جواب: ہر اہلِ دل، سخن شناس کے لئے۔

سوال: آپ بالتسان یہ کہتے ہیں کہ شعر و سخن ایک ذریعہ ہے اصلاحِ حال کا۔ آپ COMMITTAL ہیں، NON COMMITTAL نہیں۔ یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے جو اب ناپید ہوتی جا رہی ہے، لیکن کیا آپ کو یہ احساس نہیں کہ پاکستان کے باشندوں کا معیارِ تعلیم کیا ہے اور وہ آپ کی زبان کو کس قدر سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کے عربی آمیز کلام، یا ایک مصرع اردو اور دوسرا عربی یا آدھا اردو کی جانب میرا اشارہ نہیں۔ قدما کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن بہت کم، محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے۔ لیکن آپ کی تخلیقات کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو نہ صرف اردو داں کے پلے پڑ سکتا ہے اور نہ صرف عربی داں کے — اور ایسے کتنے افراد ہیں جو دونوں زبانوں سے معمولی شناسائی بھی رکھتے ہیں؟

جواب: میں میر درد کے قول کو دہراتا ہوں:

شعر میرا ہے گو خواص پسند گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

سوال: کیا آپ تخلیقی عمل، یعنی کسی فن پارہ کی تخلیق سے پہلے اور تخلیق کے دوران کیفیات، احساسات، جذبات اور صورت پذیری کے بارے میں اپنے تجربات کے حوالے سے کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب: میں نے اپنے کلام مسودۂ "زیرِ داغِ دل" کے دیباچے میں کچھ باتیں کہی ہیں، شاید آپ کے حافظے میں محفوظ ہوں۔ تخلیقی عمل میں فیضان و عرفان برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ایک وہبی ہے، دوسرا اکتسابی، بلکہ اکتسابی کی حیثیت ایک لحاظ سے شریکِ غالب کی ہے۔ فیضان بالقوہ ہوتا ہے، کسب ریاض کی حیثیت فعالی، خلاقانہ اور متصرفانہ ہوتی ہے۔ زبان و بیان پر قدرت حاصل کرنے، اسلوب و اظہار کی نزاکتوں، بلاغتوں اور عظمتوں کو مسخر کرنے، محاکات و رمزیات کے جادو جگانے، ایہام و توضیح، تمثیل و تلمیح اور استعارہ و تشبیہ کے کرشموں سے باخبر ہونے کے لئے مسلسل مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، اپنی آواز کو پالینا آسان نہیں۔ اسلوب کی درایت کوہ پیمائی اور بادیہ گردی ہے۔ زبان کے لغوی و نحوی مفاہیم تو بآسانی زیرِ دام آجاتے ہیں، لیکن اس کے مجازی حکم تک رسائی صرف مزاج شناسانِ سخن ہی کی ہوتی ہے۔ طائفہ آزادگان جن کی تمام عمر وہ اس بت مشکل پسند کی دلجوئی و دلداری کے لئے وقف ہوتی ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

آیات و نغمات ہوا کی طرح لطیف اور اسی کی طرح آزاد و بے قید ہیں۔ افکار کے سرکش جنوں کو کوئی سلیمانی انگوٹھی ہی مطیع کر سکتی ہے۔ خیال کی مثال ایک غزالِ آوارہ کی ہے۔ اسے گرفتار کرنے کے لئے ایک تیز بیں، سبک گام اور چابک دست صیاد کی ضرورت ہے۔ شکار کی فطری صلاحیت بیشک عطیۂ ربانی ہوتی ہے، لیکن اسے بیدار، پختہ، چالاک اور صیقل کرنے کے لئے برسوں تپتیا کرنا پڑتی ہے۔ ویرانوں کے طول و عرض کو ناپنا پڑتا ہے۔ اکرام علی

کو خیر باد کہہ کر جسم و جاں کو آلام و شدائد، مراصد و مکائد کا خوگر بنانا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر یہ مرغِ صحرا زادِ صید ہوتا ہے۔

سوال: درست، لیکن یہ "کلامِ منسوخ" کا کیا پس منظر ہے؟ یہ نسخ و ناسخ و منسوخ کیوں کر ہوا؟

جواب: میں نے اس میں ایک عروضی تجربہ کیا تھا۔ تسکینِ اوسط کے زحاف کے استعمال کا۔ اہلِ ذوق نے بھی اسے پسند نہیں کیا اور بعد میں مجھے بھی گراں گزرا، زبان و بیان بھی بہت ناہموار سی تھی۔ اس لئے میں نے حکّ و اضافہ کے بعد چند چیزوں کو تو دوسری کتابوں میں شامل کر لیا اور باقی کو مسترد کر دیا۔

سوال: آپ کا مبداءِ علم اور ماخذ کی وسعت و بوقلمونی نے کیا آپ کو گلیپس کی سطح پر لا کھڑا نہیں کیا ہے؟ اُن نظموں اور کتابوں سے قطع نظر جو آپ نے ترجمہ کی ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دوسری زبانوں کے بہترین شعری ادب کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کیا آپ کے کلام میں ادبیاتِ عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت، انگریزی، یونانی، بنگالی، پنجابی وغیرہ کا بہترین سرمایہ در نہیں آیا؟

جواب: اس کی جانب میں نے کہیں اشارہ کیا ہے، "چراغ سے چراغ جلتا ہے"۔ مختلف شاعروں کے کلام میں ظاہری مماثلت، ذہنی مماثلت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی ذہنی اور نفسی مماثلت دراصل اخذ و اثر اور جذب و قبول کا مبداء اور سرچشمہ ہے۔ ایک شاعر جب دوسرے شاعر کے کلام سے اثر قبول کرتا ہے تو اس کی بازآفرینی میں علاوہ اس خاص تاثر کے جو اسے دوسروں سے حاصل ہوا ہو بے شمار شخصی رنگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جس کی بنا پر نئی تخلیق بلحاظ اسلوب اور بلحاظ مضمون کے سراسر نئی تخلیق بن جاتی ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اصل تاثر یا بنیادی ماخذ کے نقوش اس میں ضرور موجود ہوتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے شعراء کی تخلیق ہزاروں اثرات کے باوجود منفرد تخلیقات اسی معنی میں ہیں کہ وہ شعراء خارجی اثرات کو اپنے تاثر میں اتنی خوبی اور خوش اسلوبی سے جذب کر سکے کہ ان کے ادب پارے اظہار و بیان اور طرحِ مضمون کے اعتبار سے اخذ و استفادہ کے باوجود جدّت اور ندرت کی نئی شان سے نمودار ہوئے، مگر اس میں شک نہیں کہ اس جدّت و ندرت اور شان میں ان خارجی اثرات کا بڑا حصہ تھا، جن کی روح کے جذب و انجذاب سے فنکار کی فطرتِ تخلیق کا ایک بدیع الاسلوب نمونہ تیار کرنے میں کامیاب ہو سکی اور پھر اس کائنات میں کون سی چیز بالکل نئی ہے؟ وہی آتش بے دود، وہی عصارۂ تاک ہے، ظروف البتہ بدلتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی حلق، لب، رنگ اور بو بھی۔ شاہدِ معنی کو زیور و زینت کا شوق ہے۔ آرائش کا خبط ہے، خوش نمائی کا جنون ہے، اس کے نت نئے تقاضوں کی تکمیل دیوزادوں کی سی وسعتِ خیال اور جوہریوں کی سی مینا کاری کا مطالبہ کرتی ہے جو مرصع ساز، جو حلاج و صناع اس کے بار کا کفیل ہو سکے، اس کا رفیق و زمیل ہو سکے، یہ عروسِ ہزار داماد اسی سے اپنا ناطہ جوڑ لیتی ہے۔ یوں بھی متاعِ خیال کے کہنہ و نو ہونے کے متعلق دو مختلف دبستان پائے جاتے ہیں۔ ایک کا دعویٰ ہے کہ ہم کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتے۔ جو ریانِ تصور کے بارے میں اثبات و انکار کی بحث بیکار ہے۔ ہم یا تو جگالی کرتے ہیں یا مانگے تانگے کی باتیں کہتے ہیں مثلاً عنترہ

هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ؟

اور زہیر کہتا ہے:

مَا أَرَانَا نَقُولُ إِلَّا مُعَارًا — أَوْ مُعَادًا مِنْ لَفْظِنَا مَكْرُورًا

جامی:

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند — تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

اس کے برعکس دوسرے فریق کا کہنا ہے:

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں — تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

(ولی)

اور معرّی کا کہنا ہے :

وَاِنِّی وَاِنْ کُنْتُ الْاَخِیْرَ زَمَانُہٗ لَاٰتٍ بِمَا لَمْ تَسْتَطِعْہُ الْاَوَائِلُ

راقم الحروف کا عقیدہ ہے کہ خودی زندہ و بیدار ہو، شخصیت بخود گزیدہ و محکم ہو تو اثر پذیری جستہ خیال انگیز، اور خاطر افروزی کا باعث ہوتی ہے، تخلیق کیلئے، یہی تاثر و تاثیر، اختلاط و احتراز، داد و ستد کا عمل ہی تو ہے۔

سوال : خوب ! درست ہے۔ آپ نے ابھی ابھی فرمایا ہے کہ "خودی زندہ و بیدار ہو" خودی سے آپکی کیا مراد ہے۔ کیا علامہ اقبالؒ کے نظریہ خودی کی جانب اشارہ ہے؟ جس پہ آپ نے یوں "مصرعِ چست" کیا ہے :

وہ شاعر خودی تھا، میں شاعر خدا ہوں

جواب : آپ نے درست فرمایا۔ اس سے مراد وہی احساسِ ذات، تحفظِ شخصی، شعورِ انفرادیت اور نشو و نما کے جوہر ہے۔

سوال : خالدؔ صاحب ! اصل معاملہ ہے فکری جہت کا ! آپ مجتہد ہیں، زبان، طرزِ ادا، فکر و نظر میں اجتہادی کوششوں کی ایک ضو اور رو کا احساس گزرتا ہے، لیکن اس کی جہت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظم (جن میں ڈرامے اور مترجمہ نظمیں شامل نہیں) میں بھی ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے، مثلاً نہایت قوی اور تناور درخت سینۂ ارض کو چیرتا ہوا، کونپل۔ زرد مخملیں کونپل کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور نشو و نما پا کر شاخ در شاخ ہو جاتا ہے، اس کی ہر شاخ پہ پھول اور پھل کی رنگت دل کو بھاتی اور اپنی جانب متوجہ کرتی ہے، لیکن . . . میرا خیال ہے کہ یہ مثال صحیح نہیں، مجھے آپ کی نظموں میں اکائی اور وحدت کا فقدان نظر آتا ہے۔ آپ کی نظم بتدریج بڑھتی ہوئی کسی نقطۂ عروج پر پہنچ کر ختم نہیں ہوتی بلکہ آگے بڑھتے بڑھتے وہ چھتنار درخت کی مانند پھیل جاتی ہے ــ شاید میں اپنا مافی الضمیر ادا کر سکا ہوں، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب : خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی۔

سوال : آپ کا نظریۂ فن کیا ہے؟

جواب : کیا میرے کلام سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا؟

سوال : یقیناً بہت کچھ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کسی مکتبِ ادب کے مقلد نہیں، غیر مقلد ہیں، بہ امعانِ نظر آپ کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی آپ کی فکری جہت کی نشان دہی کرنے سے میں قاصر ہوں، ماسوا :

نظر کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

جواب : میری شاعری کا موضوع نوعِ انسان اور اس کی جملہ سرگرمیاں ہیں۔ میں انسان کو خلوت و جلوت میں سرگرم پاتا ہوں اور حاصل مشاہدہ کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہوں۔ میری نگاہوں کے سامنے انسان کے فطرت کی جملہ خوبیاں بے حجاب ہو جاتی ہیں اور اس کی بشری کمزوریاں بھی۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ اگر راز و نیازِ خلوتیاں کے نقش ہائے جمیل بھی میرے گوشۂ معنی سے حرف و معنی کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں ــ کیوں نہیں ہیں؟

سوال : یقیناً ہیں، لیکن بقول ایک خاتون کے آپ بہت گندی گندی باتیں لکھتے ہیں۔ اگر معاملہ بندی تندرے پُر حجاب ہو تو کیا مضائقہ ہے؟

جواب : میں سائیکی اور سوما دونوں کی باتیں کرتا ہوں۔ یعنی جسم کا بھی روح کا بھی ہے

ستایہ فیاضیٔ وجوب و امکاں

آشفتہ بہ حُسنِ دلفریبِ خوباں

رمز و ایما میں بڑی دلکشی ہے لیکن بعض اوقات برہنہ گوئی کو بھی جی چاہتا ہے۔ اس عالم میں سلیقۂ شمشیر سے دمِ شمشیر باہر آ جائے تو کوئی عجب نہیں؟

اگرچہ:

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

سوال: آپ کے یہاں معتد بہ مقدار میں ایسے اشعار ہیں، جن میں جسمانی حسن اور اس سے اکتسابِ لذت کی سطح جمالیاتی لطف سے آگے بڑھ کر ہوسناکی اور فاحشی کے دامن کو ہوا دینے لگتی ہے۔

جواب: ہو سکتا ہے لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کو آپ بوالہوسی میں شمار کرتے ہوں۔ ان اشعار کو ان کے سیاق و سباق میں پڑھا جائے تو غالباً یہ تاثر پیدا نہ ہو یا اس انداز میں اور اس حد تک نہ ہو۔

سوال: خیر ــ آپ کے کلام کے روپ اور سروپ پر تو میرے بعد آنے والے لوگ ہی گفتگو کریں گے۔ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ کیا یوں بیان کیا جا سکتا ہے؟

ا: آپ مسلمان ہیں اور اپنی شاعرانہ کاوشیں اسلامی اقدارِ حیات کی توسیع کے لئے وقف کر چکے ہیں۔

ب: آپ مسلمانوں کے موجودہ احوال و اعمال اور اخلاقِ حسنہ سے مطمئن نہیں اور اجتہاد کے خواہاں ہیں۔ فکر و نظر کے ایک ایسے انقلاب کا خواب دیکھتے ہیں جو دنیا کے ہر شخص کو ان اسلامی اقدارِ حیات کا خوگر بنا دے جن کا مکمل نمونہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود پیش کر چکے ہیں۔

ج: آپ کی شاعری کا محور اسلام ہے اور جہت بھی اسلام ہے۔

د: آپ ادب کو ترجمان و عکاسِ حیات کے ساتھ ہی ساتھ نقادِ حیات بھی سمجھتے ہیں، اور ادب برائے اصلاحِ حال کے قائل ہیں۔

ذ: طباعی و صناعی کو بھی آپ کم اہمیت نہیں دیتے۔ ایک اچھے فن پارے کے لئے جوہری کی سی مرصع نگاری بھی ضروری ہے۔ گویا ہیئت و مواد دونوں کو آپ یکساں اہمیت دیتے ہیں۔

جواب: گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل۔

سوال: میرا خیال ہے کہ آپ کی شاعری اور فکرِ شعر کے اہم گوشوں کی نشاندہی ہم کر سکتے ہیں ــ کیا اور بھی کوئی گوشہ ہے، ممکن ہے میری کوتاہ نظر اس طرف نہ گئی ہو۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

جواب: رباعیات، مزمورِ میر مغنی اور اس کے بعد کی ہلّو یاہ اور خروشِ خم کی شاعری بھی ہے۔

سوال: اب میں آخری سوال کیا چاہتا ہوں، مختصر سوانح۔

جواب: میں چودہ جنوری (اسناد میں ۱۵ر جنوری درج ہے) ۱۹۲۷ء کو جمعہ کی رات، پچھلے پہر پرجیاں کلاں تحصیل نکودر، ضلع جالندھر میں پیدا ہوا۔ پرائمری تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پانچویں جماعت میں اسلامیہ ہائی اسکول تشنگل انبیار میں داخل ہو گیا جو ہمارے گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ زمانہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک کا ہے۔ اسکول کی پہلی یاد جس کا اثر اب تک بدستور ہے، یہ ہے کہ داخلے کے چند ہی دن بعد ہم صبح کی دعا کے لئے گراؤنڈ میں جمع ہوئے تو ہمارے ادب دوست استاد چوہدری رحمت علی نازش نے جذبات سے بوجھل، آنسوؤں میں ڈوبی بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا کہ آج میرے اور ہم سب کے استاد ڈاکٹر اقبالؒ کا لاہور میں انتقال ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی متاعِ عزیز لٹ گئی۔ پوری قوم ان کا سوگ منا رہی ہے اس لئے آج اسکول نہیں لگے گا۔

اس دن اقبالؒ سے میری تاحیات الفت و آشنائی کا آغاز ہوا۔ شاید ہم اپنے پیاروں کو کھو کر ہی پاتے ہیں۔

صبا بہ مسجد شاہی سلام ما برساں!

۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ اسلامیہ کالج لاہور میں بسر ہوا۔ کالج میں میرے مضامین: ریاضیات، معاشیات، اسلامیات، فارسی، انگریزی اور اردو تھے۔ فارسی میں آنرز کیا۔ ایم اے میں مضمون معاشیات تھا۔ دسمبر ۱۹۵۰ء سے موجودہ سرکاری ملازمت کا دور شروع ہوتا ہے۔ میں ۱۹۵۰ء سے کراچی میں ہوں، بہ استثناء دو سال قیام حیدرآباد کے۔ میری شادی بھی اپریل ۱۹۵۲ء میں کراچی میں ہوئی۔

مجھ سے چھوٹے دو بھائی (عبدالحمید، عبدالمجید شاہد) دو بہنیں (حمیدہ شہناز، زاہدہ پروین) ہیں۔ بچے تین ہیں۔ فاروق عمران، لبنیٰ، طیبہ۔ اُن کی امی کا نام خالدہ ہے۔

سوال: بہت خوب، کچھ خاندانی پس منظر کے بارے میں بھی ارشاد ہو؟

جواب: میں ایک معمولی، غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہمارا گاؤں اپنے علاقے میں، جسے دریائے ستلج کی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے بیٹ کہتے تھے، مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ راضی برضا، متقی، سادہ لوح، خوش عقیدہ، زراعت پیشہ لوگوں کی آبادی تھی۔ مکان دو چار نسبتاً آسودہ حال گھرانوں کو چھوڑ کر سب کچے تھے جن کی سال بسال برسات سے پہلے کہگل سے لپائی ہوتی تھی۔ ہم بھی اس کام میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کیا زمانہ تھا! اشبیلیہ کے شاعر بادشاہ معتمد کی خوش جمال و خوش مذاق ملکہ رمیکیہ یاد آتی ہے!

سوال: کیا آپ کی والدۂ محترمہ اخلاق و کردار اور خارجی شخصیت کے لحاظ سے ملکہ رمیکیہ سے مشابہ تھیں؟

جواب: جی نہیں! یہ اشارہ ہے اس قصے کی طرف جسے میں نے دشتِ شام میں نقل کیا ہے۔ رمیکیہ، شعر و نغمہ کی رسیا ایک شوخ و طرحدار کنیز تھی جسے خریداری و آزادی کے بعد معتمد نے اپنی ملکہ بنا لیا۔ وہ ہمیشہ اپج کی لیتی تھی۔ اسے آپ اندلس کی نورجہاں سمجھ لیجئے۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ چند مزدور عورتیں پاؤں سے مٹی گوندھ رہی ہیں۔ یہ دیکھتے ہی فوراً اس کے شاہانہ پاؤں میں بھی گدگدی ہونے لگی۔ تریا ہٹ کے آگے راج ہٹ کہاں تک ٹھہرتی! معتمد کے حکم سے خدم و حشم نے محل کے صحن میں کافور و شکر و مشک و عنبر کا ڈھیر لگا کر اسے عرقِ گلاب سے آمیختہ کر کے نرم گیلی مٹی بنایا۔ یہ ہو چکا تو ملکۂ عالم سے کہا گیا "پائے نازک سے پامال کرنے کے لئے مٹی تیار ہے، قدم رنجہ فرمائیے اور مشقِ ناز کیجیے"۔ ملکہ رمیکیہ اپنی حسین و جوان خواصوں کے جھرمٹ میں بالاخانے سے نیچے اتری۔ سب پریزادیں چہل کرتی، قہقہے لگاتی، ناچتی گاتی، ننگے پاؤں ہو کر مشک و عنبر کے کیچڑ کو روندنے لگیں۔ع

"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

سوال: اچھا، تو پھر؟

جواب: ہاں، ہمارا فارغ وقت زیادہ تر مسجد میں گذرتا تھا، جو خانۂ خدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے لئے تکیہ اور درس گاہ کا کام بھی دیتی تھی۔ ابتدائی شعر بھی میں نے اس کی منقش محراب کے نیچے، طاق میں ٹمٹماتے دیئے کی لو میں لکھے۔ع

دلِ زندہ کو اب تک وہ شبستاں یاد آتے ہیں

سوال: آپ کا پسندیدہ کھیل؟

جواب: مجھے کھیل کود سے بہت کم دلچسپی رہی۔ کتابوں کے سوا کسی چیز میں دل ہی نہ لگتا تھا۔ گھر والے زیادہ پڑھنے سے منع کرتے تو میں آنکھ بچا کر کتابوں رسالوں کو تہبند کی ڈب میں اڑس کر باہر نکل جاتا۔ رات کو سونے کا نام نہ لیتا تو والدہ اُٹھ کر زبردستی لالٹین بجھا دیتیں۔ اب البتہ جوگنگ اور یوگا سے دلچسپی ہے۔

سوال: آپ پاکستان کب آئے؟

جواب: پاکستان قائم ہوا تو میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گاؤں آیا ہوا تھا۔ قیامت کا سامنا تھا۔ کسی طرح باور نہ آتا تھا کہ ہم اس سرزمین کو ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہیں لیکن گرتے پڑتے، مرتے کھپتے، بچتے بچاتے، اپنا تھوڑا بہت اثاثہ اپنے سروں پر اٹھائے، کیمپوں میں بستے اجڑتے، دو مہینے کے بعد پاکستان میں داخل ہوئے۔ ہیر کے حسن کی کشش تھی، رانجھا کے عشق کا اعجاز تھا، وارث شاہ کے شعر کا جادو تھا، سلطان باہو کے ابیات کا تصرف تھا یا چناب کے پانیوں کی بوئے محبت تھی کہ گاڑی بغیر رکے سیدھی جھنگ لے آئی۔ میرے والدین (چوہدری شاہ محمد و غلام فاطمہ) کی رہائش نیا شہر جھنگ ہی میں ہے۔

سوال: شعر گوئی تو خیر آپ نے بچپن ہی سے کہنا شروع کر دیا تھا اور اکتسابِ فنِ شاعری اور عروض کا جنون بھی پرانا ہے۔ لیکن باقاعدہ شاعری کا آغاز کب ہوا، اور کیا اس کا کوئی خاص پس منظر بھی ہے؟

جواب: میری شاعری کا باقاعدہ آغاز سالنامہ "ساقی" کراچی ۱۹۵۲ء میں رسم و راہِ منزل ہا کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ یہ شاعری منظرِ عام پہ آتے ہی مخالفت، تضحیک اور استہزا کا ہدف بن گئی، لیکن علی الرغم رقیباں اس ہا دہو نے سمندِ شوق کو مہمیز کا کام دیا۔ میں مخالف رائے کو بہت غور سے سنتا اور پڑھتا ہوں۔ صائب ہو تو مان لیتا ہوں، وگرنہ نظر انداز کر دیتا ہوں۔ مخالفوں کے بارے میں میرے دل میں کبھی ایک وقتی کیفیت کے سوا کہ مقتضائے بشری ہے، معاندانہ یا منتقمانہ جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ "للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست" کہ سادہ دل و راست گفتارم آفریدہ اند۔ کئی اصحاب نے میرے روبرو میرا اور میری شاعری کا مذاق اڑایا ہے۔ سنجیدگی سے بھی اور تفریح و تفنن کے طور پر بھی، میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے اوپر ہنسنے اور اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہ سے دیکھنے کا نادر اور فرح بخش موقع فراہم کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص تنقید سے گھبراتا ہے اور مخالفت سے بددل ہوتا ہے ؎

ہنوز محرمِ حسن کو ترستا ہے

سرد و گرمِ زمانہ چکھ کر ہی فن و فکر میں صلابت، توازن، استقامت پیدا ہوتی ہے۔ احترامِ آدمی میں احترامِ رائے بھی شامل ہے بلکہ یہی اس کا جزوِ اعظم ہے۔

نذیر ناجی

سوال: آپ نے ادب سے کیا حاصل کیا؟ شہرت، دولت یا دوست؟ آپ کے بہترین دوست شاعر ہیں یا غیر شاعر؟

جواب: شہرت کو تو میں کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ اسے حاصل کرنے کے اتنے ذرائع ہیں کہ ایک شاعر سے یہ پوچھنا مناسب ہی نہیں کیوں کہ شہرت کے معاملے میں شاعری غالباً سب سے کٹھن راستہ ہے جس کا مقصد صرف شہرت ہو تو وہ شاعری کی طرف نہیں آتا، آتا بھی ہے تو جب اسے شہرت حاصل کرنے کے دوسرے موثر ذرائع مل جاتے ہیں تو شاعری کو چھوڑ کر ان راستوں پہ چل نکلتا ہے۔ آج بھی ایسے بہت سے لوگ آپ کو مل جائیں گے، جو آئے تو شاعری کی طرف سے تھے مگر جب شہرت حاصل کرنے کے دوسرے طریقے مل گئے تو چلتے بنے۔ میں تو شاعری کو عبادت کی طرح کرتا ہوں اور یہ وہ چیز ہے جس میں آدمی شہرت جیسے معاملات کو تو خاطر میں نہیں لاتا۔ رہا دولت کا معاملہ تو میں تہی دست آدمی بھلا دولت کیا حاصل کروں گا۔ یوں بھی دولت کا اپنا اپنا تصور ہے۔ اگر آپ کی مراد بنک بیلنس ہے تو خدا کا شکر ہے کہ یہ دولت مجھے حاصل نہیں۔ دوستوں میں شاعر بھی ہیں اور غیر شاعر بھی ہیں۔ شعرا میں باقر مہدی میرا بہترین دوست ہے، ابن انشا بھی میرے عزیز دوست ہیں اور غیر شاعر دوستوں کا نام کیا لوں، آپ انہیں جانتے ہی نہیں ہوں گے۔

سوال: کیا آپ کی گھریلو زندگی تخلیقی زندگی سے متصادم ہے یا ہم آہنگ؟ آپ کے معمولات کیا ہیں؟

جواب: نہ متصادم ہے اور نہ ہم آہنگ! میں ہمیشہ اپنے گھر میں مطالعے کا کمرہ علیحدہ رکھتا ہوں۔ تن تنہا کام کرنے کی عادت ہے۔ میری بیوی نے کبھی

میری تنہائی پر اعتراض نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ دل میں اسے پسند نہ کرتی ہو، مگر اس کا اظہار کبھی ان کے رویے یا بات سے نہیں ہو پایا۔ یہ بات البتہ ضرور ہے کہ میرا گھر بھی اس معاشرے کا ایک حصہ ہے اور تخلیقی کام اس معاشرے میں مجموعی طور پر بہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہاں اصل قدر روپیہ ہے۔ جس کام میں روپیہ نہ ہو، اسے بھلا کون پسند کرے گا۔ میرے معمولات بڑے سادہ ہیں۔ صبح دفتر سب سے پہلے جاتا ہوں کام ختم کرنے کے بعد سوائے پڑھنے اور لکھنے کے کوئی دوسرا مشغلہ ہی نہیں۔ جن دنوں لکھتا نہیں ہوں ان دنوں لکھنے کی تیاری کرتا ہوں۔ ان دنوں مجھے اپنی جہالت کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں لکھنے کے اہل نہیں ہوں۔ اب میری دلچسپی لوگوں میں بڑھ رہی ہے۔ مجھے سب لوگ اچھے لگنے لگے ہیں، وہ اپنے ماحول اور معاشرے میں یوں رچے بسے ہیں کہ مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ پھر میں اپنی ذات کی طرف دیکھتا ہوں کہ مجھ میں کچھ کرنے، کچھ تخلیق کرنے کا بھرپور جذبہ موجود ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ ابھی تک بروئے کار نہیں آیا۔

ال : آپ کی پیشہ ورانہ زندگی اور تخلیقی زندگی میں تصادم ہے یا توافق؟

ب : دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ "چاند تارے اپنے اپنے دائرے میں تیرتے ہیں"۔ میری زندگی بھی ایسی ہے۔ ہر ذمہ داری اپنے اپنے دائرے میں تیرتی ہے اور تخلیق یا پیشہ ورانہ زندگی ایک دوسرے کے موافق اس لئے نہیں ہو سکتے کہ مروجہ معیار اقدار میرے نزدیک غلط ہے۔ میں تخلیق کو بلند درجہ دیتا ہوں اور معاشرہ سماجی مناسب یا غیر تخلیقی افعال کو، لہٰذا توافق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ لوگوں کو یہ خبر تو ہوتی ہے کہ فلاں عہدے دار کے رشتے دار کہاں کہاں ہیں مگر یہ علم نہیں کہ فلاں شاعر نے کتنی کتابیں لکھی ہیں۔ مجھے لاہور میں کئی پڑھے لکھے افراد ایسے ملے ہیں جنہوں نے متعارف ہو کر پوچھا ہے کہ "کیا آپ کا کوئی مجموعہ بھی شائع ہوا؟" اب آپ خود ہی سوچئے ایسے معاشرے میں تخلیقی زندگی معاشرتی زندگی سے ہم آہنگ کیا ہوگی؟ لوگوں میں پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت ہی نہیں۔ اچھی کتابیں اوّل تو شائع ہی نہیں ہوتیں اور ہوتی ہیں تو ان کے خریدار نہیں ملتے!

ل : اپنی تخلیقات پر معاصرین یا ناقدین کی تنقید پڑھ کر آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

ب : بے حد خوش ہوتا ہوں۔ اپنے خلاف تنقید پڑھ کر لطف کر یہ میسر آتا ہے۔ خود احتسابی کا موقع ملتا ہے۔ اپنے آپ کو صحیح طور پر دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ع

یکدم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

یعنی اپنی گھات میں بیٹھ کر اپنا شکار خود کرو۔ تنقید وہ کمین گاہ فراہم کرتی ہے جہاں سے ہم اپنی گھات میں بیٹھ کر اپنا شکار کرنے کا موقع حاصل کرتے ہیں۔ میں "تنقید کو پسند کرتا ہوں۔ اس کے بغیر دوسروں کی نظر سے خود کو دیکھنے کا عمل مکمل نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ ایک رسالے نے پر ایک خصوصی نمبر مرتب کیا۔ اس میں چند اہل قلم نے میرے خلاف مضامین لکھے۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا ان مضامین کو اس نمبر میں شامل کیا جائے میں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ ان مضامین کو بھی لازماً شاملِ اشاعت کیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری یہ فرمائش مان لی گئی۔ ان میں سے ایک مضمون میں ظیر صدیقی نے لکھا تھا :

"میں نے آج تک خالد صاحب کی جو نظم یا غزل پڑھی یا جو کتاب دیکھی مجھے وہ کلام موزوں سے زیادہ محسوس نہ ہو سکی۔ مجھے ان کی شاعری میں اوسط درجے کا لطف بھی نہ مل سکا۔ البتہ ان کی شاعری جس قسم کے کلام موزوں سے عبارت ہے اس کی انفرادیت اور ندرت سے مجھے انکار نہیں"۔ اس قسم کی تنقید پڑھ کر میں لطف اندوز ہوتا ہوں کیونکہ جب ایک طرف جوش ایسا قادر الکلام شاعر میرے بارے میں یہ لکھ رہا ہو کہ "ان کے ذہن کی بلندی، عجب وشتر کی پستی میں گرفتار نہیں ہو سکی"۔ اور سید محمد تقی ایسا فلاسفر یہ رائے دے رہا ہو کہ "وہ گہرا کلاسیکی ذوق رکھتے ہیں اور اس میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں ان کی پختہ کلاسیکی لیاقت ہیئت کے نئے تجربوں سے مل کر ایک نیا روپ دھار لیتی ہے

جو معاصرین میں نظر آتی ہے، نہ سلف میں موجود تھی۔" تو پھر میں سوچتا ہوں کہ نظیر صدیقی کی وہ رائے بھی مجھے ضرور پڑھنی چاہیئے۔ اسی طرح ایک پرچے نے لکھا تھا کہ "خالد کو اگر زیادہ زبانیں آتی ہیں تو جو زبان وہ جانتے ہیں اس میں لکھیں اور اگر اردو میں لکھیں تو پھر وہ اردو ہی میں ہو۔" یہ باتیں پڑھ کر میں وہ حدیث پاک یاد کرتا ہوں جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو۔" میرا اس تفصیل میں جانے کا مطلب یہ ہے کہ تنقید ہر فن کار کو بڑے شوق سے پڑھنی چاہیئے۔ بعض اوقات سچائی مخالفانہ زاویے سے دیکھ کر بھی ملتی ہے۔

میں آزادیٔ رائے کا قائل ہوں۔ شاعر تو مانگتا ہے آزادی، بانٹتا ہے آزادی۔ میں تو مخالفوں کو بھی اتنی ہی محبت سے ملتا ہوں۔ مگر مخالفت بغض و عناد پر مبنی نہ ہو۔ انسان کا احترام بنیادی شرط ہے آپ بات مانیں یا نہ مانیں مگر انسانیت کی تذلیل نہ کریں۔ انہیں اپنے وجود میں مثبت جذبوں کو فروغ دینا چاہیئے۔ برداشت، رواداری، فراخ دلی، دوستی اور محبت مثبت جذبے ہیں۔ اس کے برعکس منفی جذبوں میں اپنا نقصان زیادہ ہے، دوسروں کا کم۔

ضیا شاہد

سوال: کیا آپ بتا سکتے ہیں، موجودہ دور میں معاشرتی برائیاں اس قدر زیادہ کیوں ہیں؟

جواب: میری رائے میں جھوٹ اس کا سب سے بڑی وجہ ہے۔ ظاہر اور باطن میں جھوٹ، قول و عمل کا تضاد، نفاق، خود فریبی۔ ایک معاشرے میں جتنی زیادہ ہوگی، اسی قدر معاشرتی برائیوں کی کثرت ہوگی۔ اپنے گرد و پیش نظر ڈالیے۔ اخبار، رسالے اور کتابیں اچھی باتوں سے بھری ہوتی ہیں، قدم قدم پر واعظ ملتے ہیں اور زبانی دعوے کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود ہے لیکن برائیاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایک فعل کو زبان سے ہم برا کہتے ہیں، لیکن اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک چیز کو ظاہر میں ناپسند کرتے ہیں، مگر باطن میں اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔ جب تک انفرادی اور اجتماعی طور پر جھوٹ کا قلع قمع نہ کیا جائے ممکن نہیں کہ معاشرتی برائیاں کم ہوں۔

سوال: کیا ایک شخص اپنی انفرادی کوشش سے ماحول کی خرابیوں کو دور کر سکتا ہے؟

جواب: یقیناً کر سکتا ہے، مگر سب سے پہلے اسے اپنے آپ کو درست کرنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ دوسروں کے لئے ایک نمونہ بنے گا۔ ہم کانوں سنی کی بجائے آنکھوں دیکھی پر ہمیشہ زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اجتماعی کوشش انفرادی کوشش سے جنم لیتی ہے۔ اگر آپ انفرادی کوشش کا آغاز نہیں کریں گے تو اجتماعی کوشش کہاں سے آئے گی۔ اگر فرد کی ذات اس قدر باعثِ تقلید بن جائے تو ایک شخص بھی سارے معاشرے کو سدھار سکتا ہے۔ پیغمبروں کی مثالیں دیکھیے، پیغمبر تو من جانب اللہ ہوتے ہیں۔ تاریخ ایسے مصلحین کے تذکروں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اپنے ذاتی کردار سے لوگوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگے اور قوموں کی تاریخیں بدل گئیں۔ یہ سوچ کر بیٹھ رہنا کہ میں اکیلا اس برائی کے خلاف کیا کر سکتا ہوں اور اس کے لئے تو اجتماعی مہم کی ضرورت ہے، صورت حال سے ایک طرح کا فرار ہے۔ آپ کی استقامت، جد و جہد اور مقصد سے لگن کو دیکھ کر دوسرے لوگوں میں خیر و فلاح کی قدروں کے لئے زندہ رہنے کا جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ اس طرح معاشرے میں ایک نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔

سوال: کوئی شخص یا کردار آپ کی نظر سے ایسا گزرا جسے دیکھ کر دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی ہو کہ آپ بھی اس جیسے ہوتے؟

جواب: ہر شخص میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔ خوش اخلاقی، خوش ذوقی، خوش پوشی، خلوص، بے غرضی، غرض بے شمار خوبیاں ایسی ہیں جو ہمیں مختلف لوگوں میں نظر آتی ہیں۔ ایک شخص دوسروں کی اچھی عادتیں جمع کرتا ہے یا بری، یہ اس کے اپنے ذوق پر منحصر ہے۔ بعض مکھیاں پھولوں پر بیٹھتی ہیں اور شہد جمع کرتی ہیں، بعض زخموں پہ بیٹھتی ہیں اور خون اور پیپ جمع کرتی ہیں۔ دوسروں کی ذات سے آپ کیا اخذ کرنا چاہتے ہیں،

اس کا انحصار آپ کی اپنی ذات پر ہے۔ آپ چاہیں تو ہر شخص میں خوبیاں مل سکتی ہیں۔

سوال: اختلاف رائے اور دشمنی میں کیا فرق ہے؟ کیا موجودہ معاشرے کی اکثر برائیوں کی وجہ یہ نہیں کہ ہم نے ان کو گڈمڈ کر دیا ہے؟

جواب: اختلاف رائے میں دوسرے شخص کی رائے اور اس کی ذات کا احترام شامل ہوتا ہے، جب کہ دشمنی میں نہ تو رائے کا احترام ہوتا ہے اور نہ ذات کا۔ عقلمندوں کا کہنا ہے کہ جو شخص اپنی عزت نہیں کر سکتا، وہ دوسروں کی عزت بھی نہیں کر سکتا۔ اختلاف رائے رکھنے کے لئے شخصیت بہت پختہ ہونا چاہیئے۔ ذہنی اور روحانی بلوغ کم ہو تو ناپختہ شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور نتیجے میں جہاں رائے کا اختلاف ہو، وہاں دشمنی ہو جاتی ہے۔ جذبات پر قابو پانا بہت ضروری ہے کیونکہ جذبہ گرفت سے نکل جائے تو بدامنی کا باعث بنتا ہے اور گرفت میں رہے تو تعمیر اور خیر کا روپ اختیار کرتا ہے۔ میں آپ کے سوال کے دوسرے حصے سے متفق ہوں، اکثر برائیاں، اختلاف رائے اور دشمنی کو آپس میں گڈمڈ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

سوال: گذشتہ ایک صدی سے مغرب میں کچھ ایسے نظریات سامنے آئے ہیں کہ انسان کو اس کی فطرت پر چھوڑ دینا چاہیئے اور بنیادی انسانی جبلتوں کو پورا پورا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق انسان سے کام کروائیں۔ مختصر الفاظ میں اس فلسفے کو ہم "جو چاہو کرو" کا نام دے سکتے ہیں۔ کیا اس انداز کی آزادی معاشرے میں بہتری پیدا کر سکتی ہے؟

جواب: یہ صرف میری رائے نہیں، خود مغرب میں تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے اندر چھپے ہوئے جذبوں کے بے محابا اظہار سے ہم صرف تماشہ کو تو آج تک کر سکتے ہیں، درست نہیں کر سکتے۔ جبلتیں ایسے خونخوار جذبے ہیں کہ انہیں مقید اور محدود کئے بغیر اصلاح احوال ناممکن ہے۔ جذبات کبھی سیر نہیں ہوتے۔ خون جوں جوں منہ کو لگتا ہے، ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انہی خونخوار جذبوں پر کنٹرول کرنے کے لئے مذہب کی ضرورت پڑی اور اگر ان پر کنٹرول نہ کیا جاتا، یا ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایسا نظام یا عقیدہ ان پر قابو پانے کا نہ ہوتا تو دنیا میں کشت و خون اور فساد اس قدر بڑھتا کہ آخر انسانی آبادی ہی کا خاتمہ ہو جاتا۔ خونخوار جذبوں کا ذکر چلا ہے تو میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان ہمارے اندر خون کی طرح رواں دواں ہے۔ ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ کیا آپ کے اندر بھی شیطان ہے؟ آپ نے جواب دیا ہاں، مگر میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ سرور کائنات کا اشارہ انہی خونخوار جذبوں کی طرف تھا جن کے بے محابا اظہار کو مغرب نے اپنایا اور اپنے اس فیصلے کا نتیجہ بھگت رہا ہے۔

کردار کی عظمت یہی ہے کہ ایک شئے کو جی چاہے مگر آپ خود پر ضبط کریں اور نفس کے سرکش گھوڑے کو لگام دیں۔ اسے عملی کردار کو حاصل کرنے کے بعد روح کی بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشوں کو کھل کھیلنے کا موقع دیا جائے تو زمین پر ایسا بگاڑ پیدا ہوتا ہے کہ صورت حال قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔ خونخوار جذبوں پر قابو پانے میں مذہب بہت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

سوال: ہمارے ہاں مذہب کا چرچا تو بہت ہے، مگر مذہب کو جس شکل میں ہم مانتے ہیں اس شکل میں وہ معاشرتی برائیوں کو ختم نہیں کرتا۔ اس کی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

جواب: اس کی وجہ بھی ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔ بظاہر ہم توحید کے ماننے والے ہیں، لیکن حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو ہم نے شرک کو اپنا رکھا ہے۔ توحید کا مطلب ہے دوئی کو مٹانا، باہر بھی اور اندر بھی اور اکائی پیدا کرنا ہے۔ ہمارے ہاں مذہب کا تذکرہ بہت ہے اور اس کے مظاہر مسجدوں اور مزاروں پر بہت ملتے ہیں، لیکن مذہب کے بارے میں ہم نے اپنے ذہن کو مختلف خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ہم مسجد میں نماز پڑھتے ہیں اور دفتر میں رشوت لیتے ہیں۔ مزار پر قرآن حکیم کی تلاوت اور بازار میں خراب مال بیچتے ہیں۔ جب تک ہم ان خانوں کو ختم کر کے اکائی پیدا نہیں کریں گے مذہب ہماری زندگیوں پر اثر انداز نہیں ہو گا۔ زبان سے اقرار کرنا اور دل سے انکار کرنا ایمان کی نشانی نہیں۔ کفار عرب خدا کے وجود کے ہرگز منکر نہ تھے۔ زبان سے وہ بھی مانتے تھے کہ خدا ایک ہے، لیکن وہ اسے قادر مطلق نہیں مانتے تھے اور یہ تسلیم نہ کرتے تھے کہ وہ

ہڈیوں میں جان ڈال کر دوبارہ زندہ کر دے گا اور حساب لے گا۔ اور ان کے اندر بھی دوئی تھی اور باہر بھی دوئی۔ جیسے خدا کو مانتے تھے، بتوں کو پوجتے تھے۔ ہمارا عام رویہ بھی ان سے زیادہ مختلف نہیں۔ ایک ڈاکو چوری کرنے سے پہلے مزار پہ حاضری دیتا ہے، ایک حلوائی روزانہ دھندا شروع کرنے سے پہلے قبر پہ دیا جلانے جاتی ہے، ایک رشوت خور میلاد شریف پہ ہزاروں خرچ کرتا ہے، ہم بالعموم ایسے خدا کو مانتے ہیں جو ہماری زندگیوں میں دخیل نہ ہو۔ ہم خدا کو بھی خوش کرنا چاہتے ہیں اور شیطان کو بھی جو ہمارے اندر چھپا ہوا ہے۔ اس طرح وہ زندہ اور طاقت ور خدا جو قادرِ مطلق ہے، ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے، مگر کیا واقعی ہم کسی ایسی جگہ جہاں ملکی قانون کی عملداری نہ ہو یا اس پہ عملدرآمد کرانے والے لوگ موجود نہ ہوں یا ہمیں دیکھنے والی انسانی آنکھیں پاس نہ ہوں، کوئی ایسا فعل نہیں کرتے جو خدا کی نظر میں ناپسندیدہ ہے اور اگر کرتے ہیں تو کیا ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں؟

سوال: ایک شخص مجرم کیسے بنتا ہے، آپ اسے جرم سے کیسے روک سکتے ہیں؟

جواب: صحت مند زندگی بسر کرنے کے مواقع نہ ملیں تو معاشرے میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی شخص کو کھیت میں سے گزرنے کا از خود راستہ نہ دیں تو وہ لازماً فصل کو خراب کرتا ہوا گزرے گا۔ ہر شخص کے اندر کام کرنے کی ایک قوت موجود ہے۔ اس قوت کو استعمال کرنے کے لئے راستے ہونے چاہئیں۔ راستے نہ ملیں تو منفیت پیدا ہوتی ہے اور وہی طاقت جو تعمیری ہو سکتی ہے، تخریبی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آپ نے وہ روایتیں سنی ہوں گی کہ فلاں شخص نے جن کو قابو میں کرنے کے لئے چلہ کشی کی۔ چلہ پورا کر لیتا تو جن قابو میں آ جاتا، مگر چلہ ٹوٹ گیا اور وہ شخص پاگل ہو گیا۔ زندگی ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے لہٰذا زندگی بسر کرنے کا پورا موقع دیجئے اور طاقت کے استعمال کے لئے راستے مہیا کیجئے، جرم بہت کم ہو جائیں گے۔

سوال: کیا کسی ملک کا قانون، لوگوں کے عادات و اخلاق سنوار سکتا ہے؟

جواب: ایک خاص حد تک۔ اس کا انحصار اس بات پہ ہے کہ قانون کو چلانے والے لوگ کون ہیں۔ الفاظ جو محض لکھ دیئے جائیں ان کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔ قانون بھی اچھے ہوتے ہیں مگر خالی الفاظ معاشرے سے برائی کو ختم نہیں کر سکتے۔ لفظوں کو توڑ مروڑ کر ان سے نئے معانی پیدا کرنا اور نئے رنگ دینا اچھے سے اچھے الفاظ کو بیکار کر سکتا ہے۔

سوال: کیا سزا یا جیل جانے کے خوف سے معاشرتی برائیاں دور ہو سکتی ہیں؟

جواب: بہت کم۔ ان برائیوں کے مؤثر خاتمے کے لئے ضروری ہے کہ ہر شخص کو صحت مند، خوشگوار اور باعزت زندگی گزارنے کے مواقع دیئے جائیں اور سارے معاشرے کو بچہ کر جیل خانے میں بند کرنے کا طریقہ ختم کیا جائے۔ سزا اور قید کا اثر مجرم کے ذہن پر اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ خود کو حق بجانب سمجھتا ہے، ظلم و زیادتی اور ناانصافی کے خلاف وہ اپنے آپ کو ہیرو تصور کرتا ہے۔ ایک چور اپنے خیال میں اس لئے چوری کرتا ہے کہ دنیا سے امیر و غریب کا فرق کم کر سکے۔ ایک قاتل اپنے تئیں کسی برائی کا انتقام لے رہا ہوتا ہے، اس لئے جب تک معاشرے سے مجموعی طور پہ بے انصافیوں کو ختم نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو یقین دلانا مشکل ہے کہ تم غلطی پہ ہو اور جب تک ایک شخص فعل کو از خود غلط نہیں سمجھتا اس وقت تک وہ سدھرتا نہیں اور جب کبھی اسے موقع ملتا ہے وہ دوبارہ اسی حرکت کا ارتکاب کرتا ہے۔ جیل خانے بھرے رہتے ہیں اور نئے مجرم پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جب تک جیل خانوں سے باہر ان فیکٹریوں کو ختم نہیں کیا جاتا جو مجرم تیار کرتی ہیں اور ان محرکات کو بے اثر نہیں کیا جاتا جو ایک سیدھے سادے انسان کو منفی طرزِ عمل اختیار کرنے پہ مجبور کرتے ہیں جیل خانے بھرتے رہیں گے اور مستقبل میں ایک وقت آئے گا کہ جیل خانوں میں جگہ نہیں رہے گی اور سب آبادیوں کے گرد جنگلے بنا کر انہیں جیل خانوں کی شکل دینا پڑے گی۔

سوال: نفرت جس تیزی سے پھیل رہی ہے اسے کیونکر ختم کیا جا سکتا ہے؟

جواب: نفرت کا جواب محبت سے دیجئے۔ شروع میں محسوس ہوگا آپ پسپا ہو رہے ہیں، مگر یہ فوری پسپائی ایسی ہوگی جو ایک جنگ میں ضرور ہوتی ہے اور اس کے نتائج اچھے برآمد ہوں گے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ جب آپ کی بیوی، آپ کے عزیز، آپ کے ملنے والے آپ کو بزدل سمجھیں تو برداشت کی طاقت نہیں رہتی، مگر نفرت کے خاتمے کے لئے یہ بزدلی ضروری ہے۔ استقلال اور پامردی سے نفرت کا جواب محبت سے دیجئے۔ آپ کی محبت ایک روز اپنے جواب میں ضرور محبت لائے گی۔

سوال: کہا جاتا ہے، زر، زن، زمین اس دنیا میں ہمیشہ سے موجب فساد رہے۔ برائی کے ان محرکات کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے؟

جواب: عقبیٰ کا تصور مٹا دیا جائے تو یہ چیزیں واقعی بہت اہمیت رکھتی ہیں اور اگر آپ زبان سے نہیں دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آئے گی جو مستقل ہوگی اور جس میں موجودہ زندگی میں آپ کے اعمال کا حساب لیا جائے گا تو زر، زن، زمین بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس آخرت پر ایمان مکمل نہ ہو تو انسان ایسی چیزوں کی طرف لپکتا ہے جو اس دنیا میں آرام دے سکیں اور نفس کی خواہشات کو پورا کر سکیں۔ جزا و سزا کے فلسفے پر دل سے ایمان لائیں تو زر، زن، زمین تینوں چیزیں آپ کے لئے کشش کھو دیں گی اور آپ آخرت کے سفر کے لئے ایسی متاع کی تلاش میں نکلیں گے جو وہاں چل کر آپ کے کام آسکے اور یہ متاع اچھے اعمال اور اچھے اخلاق ہیں۔

سوال: کیا آپ بتا سکتے ہیں ہمارے ہاں منفی اندازِ فکر کیوں عام ہو رہا ہے؟

جواب: روبہ زوال معاشرے میں ہمیشہ منفی اندازِ فکر کی حکمرانی ہوتی ہے اور چونکہ ہمارا معاشرہ بھی روبہ زوال ہے اس لئے مثبت اندازِ فکر پٹ گیا ہے۔ گھٹن اور انتشار ہو یا اظہار کے راستوں مثلاً ذہن اور زبان پر پہرہ لگ جائے تو منفیت پیدا ہونا لازمی ہے۔

سوال: جنسی جذبات کا اشتعال بھی ایک حد تک برائیوں کا ذمہ دار ہے۔ آپ کے خیال میں اس اشتعال پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے؟

جواب: جب تک ہیجانات موجود ہیں اور راستے بند ہیں، جنسی گھٹن موجود رہے گی۔ اس کے دو ہی طریقے ہیں، محرکات یا ہیجانات ختم کئے جائیں یا راستے کھولے جائیں۔ مغرب نے راستے کھول کر دیکھا، مگر جنسی جبلت کی پیاس ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اسلام نے ان ہیجانات کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے جو اس جذبے کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ کامیاب ثابت ہوا اور وہی قوت جو کبھی گناہ کے راستوں پر استعمال ہوتی تھی، اچھے مقاصد کے لئے صرف ہونے لگی۔ بدکاری کو مشکل بلکہ ناممکن اور شادی کو آسان بنا دیجئے، محرکات و ہیجانات کو ختم کیجئے اور جنسی جذبات کے نکاس کے لئے جائز راستے دیجئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اندر کے جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی عادت ڈالئے۔

سوال: کیا ابلاغ کے موجودہ ذرائع، اخبار، رسالے، فلم، ٹیلی ویژن وغیرہ معاشرتی برائیوں کو دور کرنے میں اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں؟

جواب: دعویٰ تو سبھی یہ کرتے ہیں، ننگی تصویریں چھاپنے والے سمجھتے ہیں وہ معاشرے کی عکاسی کر رہے ہیں، فحش کہانیاں چھاپنے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ معاشرے کے ناسور اجاگر کر رہے ہیں۔ اچھی چیزیں بھی چھپتی ہیں، بری بھی۔ ان کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت صاف اور غیر جانبدار ذہن کی ضرورت ہے۔ اس امر میں البتہ کوئی شک نہیں کہ چاہیں تو یہ ذرائع بہت بڑا رول ادا کر سکتے ہیں۔

سوال: موجودہ سیاست میں آپ کو سب سے بڑی برائی کیا نظر آئی؟

جواب: منافقت۔ جو ہم کہتے ہیں کرتے نہیں۔ ورنہ سب جماعتیں اچھے پروگرام رکھتی ہیں، سب لوگ اچھی باتیں کہتے ہیں۔

سوال: کچھ پریشانیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان اپنی ذاتی کوششوں سے دور نہیں کر سکتا۔ اس ناکامی کے نتیجے میں جو مایوسی پیدا ہوتی ہے اس پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے؟

جواب: مایوسی شیطان کا ایک بہکاوا ہے جو وہ انسانوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس دنیا کی مثال کھیل کے ایک میدان کی سی ہے۔ ہر کھلاڑی کے بارے میں یہ دیکھا جاتا ہے اس نے کیسے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اگر صرف ہار جیت سے اچھے کھیل کا پتہ

چل سکے تو ہارنے والے کھلاڑی کو دوبارہ میدان میں آنے کا موقع نہ دیا جائے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خواہ ایک ٹیم ہار جائے، مگر اس کے کھلاڑیوں میں سے کسی نے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا تو اسے خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ یہی عالم دنیا میں ہمارے کردار کا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں مگر ہمیں مستقل کام کرتے رہنا چاہیے۔ سمندر کو دیکھئے وہ زمین اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے مگر انسان پھر اسے واپس لینے کی کوشش کرتا ہے۔ ہالینڈ میں کئی مقامات پر انسان نے دیواریں کھڑی کر کے سمندر سے زمین چھین لی ہے۔ چاند پر پرواز کرنے والوں کو دیکھئے شروع میں انسان کو کس قدر ناکامی ہوئی مگر آخر وہ کامیاب ہو گیا۔ سمندروں میں لوگ ڈوبتے رہے مگر جہاز بنتے رہے اور ہر جہاز پہلے جہاز کی نسبت زیادہ مضبوط اور محفوظ ہوتا تھا۔ انسان کی انفرادی زندگی فانی ہے مگر انسان خود جاوداں ہے۔ ہمت و عزیمت کی مشعل بھی اولمپک شمع کی طرح ہے جسے ایک شخص لے کر چلتا ہے، پھر دوسرا لیتا ہے اور آخر یہ منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ آپ جہاں تک کام کر سکتے ہیں کریں، پھر اس کام کو دوسرا کرے گا، پھر تیسرا اور بالآخر نیکی اور خیر کا ایک سلسلہ بن جائے گا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ آپ اگر ایک چھوٹا سا کام کرتے ہیں اور اس کے فوری نتائج نظر نہیں آتے تو پروا نہیں کرنی چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے ندی نالے مل کر ایک دریا بنتے ہیں۔ نیکی اور بھلائی کے لئے جنگ جاری رہنی چاہیے اور بظاہر ناکامی سے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ظاہری ناکامی سے مایوس ہو جاتے تو سب پیغمبر خدا سے درخواست کرتے کہ اپنی رسالت واپس لے لے کیونکہ ہمیں کامیابی نہیں ہوئی مگر وہ مستقل مزاجی سے اپنے مشن پر ڈٹے رہے اور بالآخر انہیں کامیابی ہوئی۔ میرا ذاتی نظریہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ پوری کوشش سے اچھائی کا نفاذ کرنا چاہیے۔ حوصلے اور مستقل مزاجی سے کام لینا چاہیے اور دوسروں کے لئے نمونہ بننا چاہیے۔ دوسروں کو برا بھلا کہہ کر یا کسی کو الزام دے کر اپنے لئے غلط کام کا جواز حاصل کرنا منافقت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ دوسرے برے ہیں تو آپ اچھے کیوں نہ بنیں؟ دوسروں کی برائی آپ کے لئے برائی کا نہیں اچھائی کا سبب بننی چاہیے، کیونکہ شر ہمیشہ خیر کا محرک رہا ہے۔ اگر آپ کو بھلائی کا کوئی کام بہت وسیع و عریض نظر آتا ہے تو اپنا ٹارگٹ مقرر کر لیجئے اور باقی حصوں کو چھوڑ کر اپنا حصہ مکمل کیجئے۔ دوسرے حصے دوسرے لوگوں کے ذمے ہیں، یہ ان کا فرض ہے کہ وہ انہیں پورا کریں۔ آپ اپنا فرض پورا کریں کیونکہ آپ کو اپنا حساب دینا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

ہارون الرشید

سوال: کیا آپ اپنے خاندانی ماحول اور تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔ آپ کی شخصیت تعمیر کرنے میں خاندانی اور تعلیمی اثرات کا کس قدر حصہ ہے؟

جواب: میں ایک غریب ارائیں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا تعلق جالندھر کے دیہاتی علاقے سے ہے۔ گاؤں کا نام پرجیاں کلاں تھا۔ ہائی سکول تک وہیں قریب کے قصبے ننگل انبیا میں حاصل کی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان پیدا ہوئے۔ ننگل انبیا ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں لاہور آ گیا اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۰ء میں معاشیات میں ایم اے کیا۔

میرے والد سکول میں ٹیچر تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں وہ کچھ عرصہ کے لئے فوج میں بھی بھرتی ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ جھنگ کے قصبہ شاہ کوٹ شاکر میں منتقل ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں سکول ٹیچری سے ریٹائرڈ ہو کر انہوں نے نیا جھنگ شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کا انتقال اسی ماہ (جون) کی ۳ تاریخ کو ہوا۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ خاندانی ماحول نے میری شخصیت پر کیا اثرات مرتب کئے۔ ہمارے خاندان کا ماحول البتہ مذہبی تھا جیسا کہ عام نچلے متوسط طبقے کا اس زمانے میں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس ماحول نے غیر محسوس طور پر بتدریج میری طبیعت میں مذہبی میلان کو فروغ دینے، قوی تر اور مستحکم کرنے میں حصہ لیا ہو۔ اور تعلیم تو ظاہر ہے کہ ہمارے تفکر و تخیل کا نشوونما کرتی ہے۔ جو ہم پڑھتے ہیں وہ ہماری ذہنی غذا بنتا ہے۔ ہم اس سے محسوس اور غیر محسوس طور پر اثر پذیر ہوتے ہیں اگرچہ ان اثرات کو متشخص کرنا اکثر دشوار ہوتا ہے۔

سوال: آپ زندگی میں

۱۔ کن اساتذہ سے (جو آپ کو پڑھاتے رہے)

۲۔ کن علمی و ادبی شخصیتوں سے متاثر ہوئے اور کن کن کتابوں نے آپ کی شخصیت بنانے میں حصہ لیا۔ سرفہرست پانچ علمی و ادبی شخصیتوں کے نام۔

جواب: میں اپنے کسی استاد سے زیادہ متاثر تو نہیں ہوا

نہیں قلادۂ تقلید میری گردن میں

نیاز مند ہوں لیکن بشان استغنا

رفیق خاور صاحب سے البتہ شروع ہی سے میرے قریبی اور دوستانہ روابط تھے جو اب تک قائم ہیں۔ خاور صاحب ہمیں ایف اے سال اوّل میں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں زیادہ تر فارسی میں اقبال کے رنگ میں شعر کہا کرتا تھا۔

خاور صاحب نے مجھے سمجھایا کہ

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش

انہوں نے بڑے شغف و شوق سے مجھے شعر آزاد، غیر مقفیٰ شعر اور ایکانکی ڈراموں کی طرف متوجہ کیا وہ اکثر مجھے بلینک ورس (بے قافیہ نظم) کی تکنیک سمجھانے کے لئے لائبریری میں لے جاتے اور وہاں شیکسپیئر کے ڈراموں کے کچھ حصے یا میتھیو آرنلڈ کی رزمیہ نظم "رستم و سہراب" کے شعر پڑھ کر سناتے اور ان کے حسن و قبح پر نقد و تبصرہ کرتے۔ دوسرے اساتذہ میں پروفیسر حمید احمد خاں، مولانا علم الدین سالک، مولانا عبدالستار خاں نیازی، علامہ علاؤ الدین صدیقی، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر لال محمد چاولہ، عبدالبشیر آذری، مرزا عبدالحمید، خواجہ محمد اسلم، عزیز اصغر، مرغوب صدیقی، یوسف جمال انصاری، محمد عثمان، ڈاکٹر آفتاب احمد چودھری علی محمد، چودھری رحمت علی نازش، قاضی خوشی محمد، چودھری غلام غوث، چودھری غلام علی، اور آغا صادق حسین صادق قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک ڈاکٹر تاثیر سے پہلے ہمارے پرنسپل تھے اور ڈاکٹر اقبال ہوسٹل کے نگران، ان کی شفقتیں بھی شامل حال رہیں۔

★ علمی و ادبی شخصیتوں میں سے میں صرف اقبال سے متاثر ہوا اور اس کے بھی شخصی پہلو سے نہیں بلکہ فکر و نگاہ و لہجہ سے اگرچہ

تمتع ز ہر گوشہ یافتم

ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

★ وہ کتابیں جنہوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہیں۔

۱۔ قرآن حکیم ۲۔ اقوال رسولؐ و حدیث ۳۔ سبع معلقات ۴۔ عہد نامہ عتیق و جدید

۵۔ الف لیلیٰ ۶۔ ڈیوائن کامیڈی ادب [illegible]

★ وہ کتابیں جنہیں پڑھ کر پہلے پہل سرشاری کی کیفیت محسوس ہوتی بقول راشد وہ کیفیت کہ

سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے

اوّلیں بادہ گساری میں مئے تازہ و ناب

۱۔ PROPHET OF THE DESERT ۲۔ شرلک ہومز ۳۔ قصہ حاتم طائی ۴۔ گل بکاؤلی

۵۔ فسانۂ آزاد ۶۔ طلسم ہوشربا ۷۔ درس حیات ۸۔ مسدس حالی ۹۔ انارکلی ۱۰۔ روپ متی

۱۱۔ مقدمہ ابن خلدون ۱۲۔ نہج البلاغہ ۱۳۔ افادات مہدی ۱۴۔ قصہ چہار درویش ۱۵۔ قصہ شہزادہ مختار

۱۶۔ شر[illegible] ادب [illegible] ۱۷۔ راشد الخیری کے ناول ۱۸۔ تذکرہ ابوالکلام آزاد کا آخری حصہ ۱۹۔ محمد علی کی ڈائری ۲۰۔ مکالمات افلاطون

۲۱۔ یونانی ڈرامہ ۲۲۔ پیراڈائیز لاسٹ ۲۳۔ ڈیوائن کامیڈی ۲۴۔ تذکرہ غوثیہ ۲۵۔ رامائن مہابھارت
۲۶۔ نگار خانہ ۲۷۔ خلیل جبران ۲۸۔ کالی داس اور ۲۹۔ ٹیگور کی کتابیں ۳۰۔ جذبات بھرتری ہری ۳۱۔ حکایات لقمان
۳۲۔ قصص ہند ۳۳۔ پریم چند ۳۴۔ کرشن چندر ۳۵۔ علی عباس حسینی اور ۳۶۔ تسنیم نسیم چھتاری کے افسانے و ناول
۳۷۔ LESMISERABLES ۳۸۔ تھری مسکیٹیرز ۳۹۔ محمد بن قاسم (ناول) ۴۰۔ حافظ اللہ ۴۱۔ غبارِ خاطر
۴۲۔ خیابستان ۴۳۔ ریگستان ۴۴۔ شاہنامہ ۴۵۔ بھگوت گیتا ۴۶۔ گیتا گوبند ۴۷۔ کام سوتر
۴۸۔ METAMORPHOSES ۴۹۔ آبگینے ۵۰۔ بزمِ عجم ۵۱۔ رشحہ ساز روپ ۵۲۔ ماورا ۵۳۔ میں ساز ڈھونڈتی رہی
۵۴۔ اختر شیرانی کی نظمیں ۵۵۔ پطرس کے مضامین ۵۶۔ انطونی کلوپطرہ ۵۷۔ تاثیں

سوال: آپ کی شاعری کا آغاز کب ہوا، اس کی عمر کتنی ہے، آپ نے آج تک کتنی کتابیں لکھیں ان کی بنیادی فکر BASIC THOUGHT کیا ہے؟

جواب: میری شاعری کا آغاز اکتیس برس پہلے ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ اب تک ۲۰ کتابیں لکھ چکا ہوں جن میں سے ۱۶ شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی بنیادی فکر میرے خیال میں تہذیب نفس ہے:

سُناتا ہوں پیغامِ دینِ محمد
مَعَ ذٰلِكَ اَغْزَلُ النَّاسِ شِعْرًا
ہوں میں اک مردِ عاصی پرمعاصی
سَبِیْلِیْ ہٰذِہٖ اَدْعُوْ اِلَی اللّٰہِ

⁂

ہر صورتِ زیبا سے محبت ہے مجھے
ہر جلوہ پہ پیمانۂ لذت ہے مجھے
اسلام نہیں عشق مرا مذہب ہے
شاعر ہوں مبالغے کی عادت ہے مجھے

⁂

ہر مظہرِ زندگی سے الفت ہے مجھے
افسانہ بمنزلہ حقیقت ہے مجھے
حکمت کا حصول ہے مرا نصب العین
ہر نکتۂ فکر سے نسبت ہے مجھے

سوال: آپ پر شعر کہتے وقت کیا کیفیت طاری ہوتی ہے؟

جواب: ایک مبہم، بے نام، شیریں اضطراب۔

سوال: آپ عموماً کب شعر کہتے ہیں اور شعر کہنے کی رفتار کیا ہوتی ہے؟ مثلاً آپ شعر کہتے ہیں یا شعر آپ پر وارد ہوتا ہے؟ آپ کی شاعری میں آمد اور آورد کا تناسب کیا ہے؟

جواب: طبیعت کے موزوں ہونے کا معاملہ یہ ہے کہ

اکساتی ہے نغموں پہ مجھے بادِ نسیم
دیتا ہے پیام مے کشی ماہِ تمام

شعر عموماً رات کے وقت کہتا ہوں ۔ کبھی فرصت ہو تو دن کو بھی لیکن صرف طلوعِ صبح سے دوپہر تک اور رات کے اوّل شب سے آخر شب تک کبھی سست کبھی تیز اور کبھی بہت تیز ۔ "سرودِ رفتہ" پوری کتاب دو راتوں میں لکھی گئی ۔ "گلِ نغمہ" ایک ماہ میں ۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ شعر مجھ پہ وارد ہوتا ہے ۔ ایک اضطراری سی کیفیت مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے یہ وہی کوہ ندا کی آواز ہے جو پکارتی ہے

بیا در ہر چہ اندر سینہ داری

سرودے نالۂ آہے ، فغانے

جہاں تک آمد اور آورد کے تناسب کا تعلق ہے اپنی شاعری کے بارے میں ایسی کوئی رائے دینا میرے لئے مشکل ہے ۔ یہ فیصلہ پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں ۔ شعر کہنے کی ابتدائی کیفیت تو ہمیشہ اضطراری ہوتی ہے ۔ بعد میں خیال کی ترتیب و تنظیم ، تنقیح اور اس کے لئے موزوں تر لفظ تلاش کرنے کے لئے شاعر کو تگ و دو تو کرنا ہی پڑتی ہے ۔ شعر میں فیض اور اکتساب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ان کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ۔ ان کا گھٹنا بڑھنا شعری کیفیت کی شدت جذبے کے وفور اور احساس کی گہرائی و درازی پہ منحصر ہے ۔

سوال : دراصل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جس وقت آپ پہ شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس وقت الفاظ کے بغیر کوئی جذبہ آپ پہ طاری ہوتا ہے یا بجائے خود الفاظ آپ پر وارد ہوتے ہیں ۔ الفاظ اور تخیل میں کس قدر رشتہ ہے ، تخیل پہلے آتا ہے یا الفاظ ۔

جواب : جذبہ کچھ دیر تو ہیولائی ہوتا ہے لیکن پھر وہ الفاظ ہی میں مجسم و متشکل ہوتا ہے ۔ تخیل اپنے الفاظ خود تلاش کرتا ہے ۔

سوال : الفاظ کے بغیر بھی تخیل کی کوئی شکل ہوتی ہے ؟

جواب : ہاں ہو سکتی ہے ۔ اگرچہ اس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے کہ :

سرحدِ لفظ سے آگے ہے دیارِ نغمہ

نغمہ آواز ہے احساس نہیں

اہلِ دل کرتے ہیں گونگی باتیں

غالب نے غالباً اس کیفیت سے دوچار ہو کر کہا تھا ؏

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

میرا ایک مصرعہ ہے ؏

میں حرف خوانِ ورق ہائے نانوشتہ ہوں

اقبالؔ نے گو کسی اور سیاق میں کہا تھا لیکن مفہوم اس کا بھی ایک پہلو سے یہی ہے ؏

عشق کار ایست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

سوال : آپ کی شاعری میں بلاشبہ غزلوں کے رچاؤ کا شکوہ اور بانکپن ہے لیکن آپ میں کہاں تک صداقت ہے کہ آپ کی مشکل گوئی عوام الناس پہ اتنا اثر پیدا نہیں کر سکی جتنا تاثر خود آپ کے شعر میں موجود ہے ؟

جواب : ہو سکتا ہے یہ صحیح ہو بہت سے ناقدوں نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوست بھی اکثر یہی مشورہ دیتے رہتے ہیں ۔ ابلاغ کا تقاضا بھی غالباً یہی ہے ہمارے رسول کی حدیث ہے ۔

کلّموا النّاس علیٰ قدرِ عقولہم

مجھے بھی احساس ہے کہ

گو میں ظاہر، باطن، اوّل، آخر
شاعر ہوں سب اصناف سخن پر قادر
ہے بیشتر اشعار کا مضمون مگر
مصداق: وَمَا ہُوَ بِقَولِ شاعر

اور:

ہے گرچہ ترے زیرِ نگیں لُوالحکمی
پھر بھی ہے تری لے میں کسی شے کی کمی
اے شاعرِ خوشنوائے اردو ـــ خالدؔ
ہے تیری زباں تو عربی، دل عجمی

اصل میں اسلوب کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے اور صحیح اسلوب تک پہنچنے میں ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں۔ میں بھی کوشاں ہوں دیکھیں سوادِ منزل کب نظر آتا ہے ؎

اے حاتم طائی سخن سہل نہیں
تسخیرِ طلسمِ بادِ گردِ الفاظ

سوال: آپ نے نعت گوئی کس عمر میں شروع کی اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ آپ نے اس میں کیا کیا رنگ، جذبہ، شعور، ادراک اور تخیل محسوس کیا؟

جواب: شعر کی ابتدا ہی نعت گوئی سے ہوئی تھی۔ اس زمانے کے دو ایک مصرعے ہیں ؏

زیرِ گردوں تو نے حق کا بول بالا کر دیا

سوئے مدینہ چوں بگذری اے صبائے گلفشاں
روح بہ پیمبرؐ را سلام من بپیام من رساں

اب تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ

متاعِ آدم و انجم، متاعِ لوح و قلم
محمدِ اُمّی محبوبِ کبریا صلعم

سوال: آپ کے نزدیک اچھے نعت گو شاعر کا معیار کیا ہے اور اردو میں آپ کے نزدیک معیاری نعت گو کون کون سے ہیں؟

جواب: یہ مقامِ عشق ہے اور "اَلْعِشْقُ جُنُوْنٌ وَ هُوَ اَنْوَاعٌ" ــ ہے عشق جنوں اور جنوں بوقلموں۔ اور شاعری میں کم و بیش ہر شاعر نے نعت کہی ہے۔ بڑی عقیدت اور بڑے جذبے کے ساتھ۔ آج کل بھی بہت خوبصورت نعتیں کہی جا رہی ہیں۔ یوسف ظفر، سراج الدین ظفر، حفیظ تائب، عارف عبدالمتین، عاصی کرنالی کی نعتوں میں بڑا کیف ہے۔ ہندو شعراء نے بھی بارگاہِ رسالت میں والہانہ خراج پیش کیا ہے۔ ان میں پنڈت ہری چند اختر، محروم، آزاد، عرش، سحر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے سوال کے دوسرے حصے کے جواب میں یہ چند نام میرے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ حالی، اقبال، محسن کاکوروی، امیر مینائی، ظفر علی خاں

احسان دانش، حافظ مظہر الدین، حافظ لدھیانوی، اقبال سہیل، محشر رسول نگری، نعیم صدیقی، پسند کلام کہنے والوں میں حفیظ اور ماہر القادری۔

سوال: آپ انجمن اور تنہائی میں کسے ترجیح دیتے ہیں؟

جواب: میرا معاملہ یہ ہے:

محروم مذاق انجمن آرائی
میں ہوں ولی ولایت تنہائی
رہتا ہوں سراپردہ فن میں مستور
صرف اپنی رفاقت مجھے راس آئی

تاہم میں خلوت و جلوت دونوں کو ضروری سمجھتا ہوں اگرچہ اقبال نے دونوں میں یوں تفریق کی ہے۔

صاحب تخلیق را خلوت عزیز
صاحب تحقیق را جلوت عزیز

فنکار کو دونوں کا ذائقہ شناس ہونا چاہیے۔ مقام بدر سے پہلے غار حرا آتا ہے اور فنکار کو عرفان نفس کے لئے اپنے آپ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے پھر اپنے آپ کو وسیع کرنے کے لئے لوگوں سے خلا ملا رکھنا پڑتا ہے۔ فن کا موضوع زندگی اس کے گوناگوں مظاہر انسان اور اس کے انفس و آفاق ہیں اس لئے فنکار گوشہ نشین ہوتے ہوئے بھی زمانے اور زمانے کے تقاضوں سے بے خبر نہیں ہو سکتا چونکہ زبان حواس کا ذریعہ اظہار ہے وہ ایک معاشرتی عمل ہے اس میں تب و تاب، صلابت، حرارت، توانائی، قوت نمو اور جگرداری پیدا کرنے اور قائم رکھنے کے لئے اسے زندگی کی کشمکش میں بھرپور حصہ لینا چاہیے ؎

الفاظ مختصر یہ معانی ہوں تہ بہ تہ
تخلیق فن میں حسن بھی ہو روح عصر بھی

سوال: فنون لطیفہ کے متعلق آپ کا اجتماعی تاثر کیا ہے، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور شاعری میں سے آپ کسے فوقیت دیتے ہیں اور ان چہار عناصر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہیں؟

جواب: فنون لطیفہ دراصل وسیلہ ہیں روح کی بالیدگی کا وہ ہماری شخصیت کے علوی عناصر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میری تگ و تاز صرف شاعری تک محدود ہے کہ:

تنگ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً میں کہاں
ہے شاعری معراج کمال انسان

اعلان براءت امرءُ القیس سے ہے
مطلوب ہیں بوصیری و کعب و حسّان

باقی ثلاثہ غسالہ ہے (ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود) یونہی سی شناسائی ہے ؏
محفل غیر میں گاہے، سرراہے گاہے

سوال: آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

جواب: متفرق چیزیں ؏

عمرو عیار کی زنبیل ہے دلِ شاعر کا

سوال: آپ نے زبان پر اتنا عبور کیسے حاصل کیا؟

جواب: یہ آپ کا حسنِ ظن ہے میں اپنے آپ کو بالکل ہیچ بیاں سمجھتا ہوں۔

سوال: آپ کے سامنے اپنی شاعری کو عوامی لے دینے کا کوئی خیال ہے؟

جواب: آج کل دوستوں کے پیہم اصرار سے میں ایسی چیزیں لکھ رہا ہوں جن میں عربی الفاظ اور ترکیبیں کم سے کم ہوں۔

سوال: نئی ادبی نسل کے نام کوئی پیغام؟

جواب:

ہاتھ میں ہوش کے دستانے پہن کر پکڑو
عشق کے شعلہ جوالہ کو اے نشکارو
طنز و تعریض و ملامت سے نہ زنہار ڈرو
زندگانی بہوائے ہمہ کس نتواں کرد
جو کرے سعی اسی سے غلطی سرزد ہو
آدمی جو بھی ہے بالفعل ہے بالقوہ نہیں
عشق کا زہر پیالہ بھی سقراط صفت
سامنے دشت ابد پھیلا ہے تا حدِ نظر
کون ہے شمعِ صداقت کا جو پروانہ بنے
نارِ غم میں جلے گرد رہِ جانانہ بنے
دل پہ جو گزرے کہے کافر دیوانہ بنے
زندگی نذرِ حقیقت کرے افسانہ بنے

حفیظ صدیقی

سوال: اپنے بچپن اور زمانہ طالب علمی کے چند قابلِ ذکر حالات و واقعات پر روشنی ڈالیے۔

جواب: پیدائش جنوری ۲۷، ۱۹۲۷ء کی ہے۔ ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کا موضع پرجیاں کلاں مولد و منشا ہے۔ چار کوس کے فاصلے پر اسلامیہ ہائی سکول شنکر اپنا تھا۔ وہاں سے ۱۹۴۴ء میں میٹرک کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ اسلامیہ کالج لاہور میں بسر ہوا۔ بچپن اور زمانہ طالب علمی میں کھیل کود اور سیر و تفریح سے دلچسپی بہت کم رہی۔ طبیعت تنہائی کی خوگر اور خلوت کی جویا تھی۔ بے تکلف احباب میں تو زبان گل افشانی گفتار کے انداز دکھاتی لیکن مجمع میں مہر بہ لب ہو جاتی اور یہ وضع کم و بیش آج تک قائم ہے۔ شروع سالوں میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں قومی نظمیں سنا کر اقبال گولڈ میڈل حاصل کیا جس کو کافی عرصہ تک میں واقعی سونے کا تمغہ سمجھتا رہا۔ آخر سنار کو دکھایا تو معلوم ہوا ع

ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں

باقی زندگی اسی کشمکش میں گزرتی رہی جس میں دیہات کے غریب، درد آشنا، آرزو پرست اور خونِ دل جلانے والے نوجوان گزرتے ہیں اس کے علاوہ ع اک حدیثِ صحبتِ خوباں ہے سو ناگفتہ بہ!

سوال: آپ کو لکھنے کی تحریک کب اور کیونکر ہوئی ؟

جواب: اوّل اوّل ۱۹۴۰ء میں   میں لذّتِ خامہ فرسائی سے آشنا ہوا
أتاني هواها قبل أن أعرف الهوى   فصادف قلباً فارغاً فتمكّنا

۱۹۴۲ء میں محترم آغا صادق صاحب سے عروض میں شُد بُد حاصل کی۔ آغا صاحب اس زمانے میں میٹرک کو فارسی پڑھانے کے ساتھ ساتھ فارسی ایم اے کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ عروض ان دنوں بڑا عجب اسرارِ طلسماتی سا علم معلوم ہوتا تھا۔ شعر گوئی کی خارجی تحریک تو باہر کوئی نظر نہیں آتی۔ ایک اندرونی جوش تھا، ایک باطنی اضطراب تھا، ع

بہ اعماقِ خوں شورِ طغیانِ حرف

كنتُ كنزاً مخفياً فأحببتُ أن أُعرَفَ فخلقتُ الخلقَ کا انسانی سطح پر ظہور، یہی ہے پیکر تراشی، نغمہ سنجی، حسن آفرینی۔

سوال: آپ نے اپنے ادبی ذوق کی نشوونما کے لیے کن کن شخصیتوں سے استفادہ کیا؟ کس شخصیت نے آپ پر گہرا اثر مرتب کیا ؟

جواب: میں نے براہِ راست استفادہ اشخاص سے کم کیا ہے، بالواسطہ فیض البتہ اٹھایا ہے ع

کتابیں ہیں میری سمیر و ندیم

کالج کے ابتدائی دنوں میں جناب رشیق خاور سے ربط رہا۔ انہوں نے میرے اندر کے شاعر کو "طرحِ نو" پر اُکسایا۔ عنفوانِ شباب کا عالم تھا۔ اختر شیرانی کے نغمے فضا میں رَس گھول رہے تھے۔ راشد، ایشیا کے دُور افتادہ شبستانوں میں اپنے خوابوں کے رومان تلاش کر رہا تھا۔ اس جذبۂ جستجو کے زمانے میں، میں اقبال کے دشتِ جنوں میں سرگرداں تھا۔

دسویں جماعت میں میں بایزید تخلص کرتا تھا۔ ان دنوں جناب یوسف ظفر رسالہ ہمایوں کے ایڈیٹر تھے۔ میں نے اقبال رنگ و آہنگ میں انہیں دو تین چیزیں بھیجیں تو انہوں نے مولانائے محترم عبدالعزیز بایزید کو السنۂ شرقیہ کا کوئی فاضل سمجھتے ہوئے یہ کہہ کر لوٹا دیں کہ آج کل ہمارا مقابلہ ہندوؤں سے ہے۔ اس مفرّس و معرّب اُردو کا پاکستان بن جانے کے بعد تو غالباً کوئی مستقبل ہو سکتا ہے فی الحال نہیں۔ اس وقت تو برادرانِ وطن کو رام کرنے کے لیے سہل و سادہ زبان اور سلیس و سبک طرزِ بیان کی ضرورت ہے۔ آپ خالص اُردو میں کوئی چیز لکھیں تو رسالہ اسے بخوشی شائع کرے گا۔

لاہور آکر پہلے پہل میں حلقہ اربابِ ذوق میں آزاد نظم پڑھی تو اندرونِ حلقہ جناب یوسف ظفر اور قیوم نظر نے وہ کھینچا تانی کی کہ الامان و الحفیظ۔ باہر نکل کر البتہ بیٹھے بٹھوں نے اور ندرتِ اظہار کی داد دی۔

سوال: زندگی میں آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا رہی ہے ؟

جواب: ع   کالبدِ حرف میں روحِ ابد پھونک دوں
اُڑتے ہوئے لمحات کو زنجیر کروں   فانی ہوں امر ہونے کی تقدیر کروں
اسکندرِ اعظم کی طرح روزِ نے   قلعے لوح و قلم کے تسخیر کروں

فکر و فن، تہذیب و تمدن، مدنیت و محبت، فرہنگ و فرزانگی اور آہنگ و آگہی کے قافلہ سالاروں میں یہ کمین بندۂ بندگانِ خدا بھی شریک بلکہ شریکِ غالب ہو۔ آمین!

سوال: کیا آپ اپنی موجودہ معاشرتی حیثیت سے مطمئن ہیں ؟

جواب: نہیں اپنی حالت سے میں مطمئن   ہے مدِّ نظر الحسن ما گویم

بطور فنکار کے میری کوئی معاشرتی حیثیت نہیں۔ اس دکھاوے، دوغلا پن اور مادہ پرستی کے ماحول میں ؎
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
اک سرکاری ملازمت ہے جس سے عزتِ سادات محفوظ ہے۔

سوال: کیا ہمارے ہاں لکھنے والوں میں گروہ بندیاں موجود ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہمارے ادب پر ان گروہ بندیوں کے کس قسم کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

جواب: یقیناً اور اس کے لئے کسی مردم شماری کی ضرورت نہیں، ہر لکھنے والا، جو اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اس کی گواہی دے گا۔ اس جنبہ داری سے تخلیق فن کا بحرِ بیکراں گھٹ کر اک جوئے کم آب رہ جاتا ہے۔ اسی لئے تو میرِ عرب نے کہا تھا اِنَّمَا ہَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ اَنَّہُمْ کَانُوْا یُقِیْمُوْنَ الْحَدَّ عَلَی الْوَضِیْعِ وَ یَتْرُکُوْنَ الشَّرِیْفَ۔

؎ سفارش سے بڑھ کر نہیں کوئی فتنہ
تباہ اس سے ہوں امتیں رفتہ رفتہ

گروہی تعصبات سے سنگدلی، تنگ نظری، بے توفیقی اور عصبیتِ جاہلی پیدا ہوتی ہے جو ایک فنکار کے لئے زہرِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ تو روشن خیال، ذکی الحس، وسیع القلب، فراخ مشرب اور کشادہ نظر ہوتا ہے۔ زندہ، ستم زدہ، مقہور و مجبور، باغی انقلابی روحِ انسانی کا ترجمان، کرب، خواہش اور پیاس کو آواز عطا کرنے والا۔ وہ تو آبِ رواں کی طرح پاک و شفاف ہوتا ہے جو دلوں کے میل کچیل کو صاف کرتا اور گناہ آلودگی کو خیر و بشارت میں تبدیل کرتا ہے، جو مسافرانِ شب کو طلوعِ صبحِ فردا کا مژدۂ جانفزا سناتا ہے۔

حلقۂ ستائشِ باہمی میں اسیر ہو کر لکھنے والا جلد ہی اپنے نتائجِ فکر سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ حسنِ خیال، سیلِ بے پناہ تو کیا موجِ گرداب بن کر اس کے لئے زنجیرِ پا ہو جاتا ہے۔ خوشامد و خودستائی ؎
اک شکل ہے قتل بالعمد کی یہ بھی

صلابت و استحکام اور قرأت و کلام کے لئے خلوو انقطاع اور تفرید و تبتّل کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ۔ وہی باہمہ و بے ہمہ ہونے کی حالت و کیفیت جو ہمارے اندر کی خوابیدہ صلاحیتوں کے لئے قُمْ قُمْ یا حبیبی! کی نوائے دلکشا کا درجہ رکھتی ہے۔

لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُ فِیْہِ مَلَکٌ مُّقَرَّبٌ اَوْ نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ

اِلَّا اللّٰہ سے پہلے لَا اِلٰہَ کی منزل آتی ہے۔ انکار کی زمین ہی سے اقرار کا بیج پھوٹتا ہے۔ تصدیقِ حق کے لئے تکذیبِ باطل لابد ہے۔

سوال: کیا ہمارے نقاد اپنا فریضہ دیانتداری سے ادا کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے نقاد بھی نرے غالب کے طرف دار ہیں۔ حریف بدلۂ کم شرکیے و شنام زیادہ
؏ تنقیحِ معانی ہے نہ اتقانِ بیان

سوال: کیا آپ ادب کی موجودہ رفتار سے مطمئن ہیں؟

جواب: ہوں بھی اور نہیں بھی ؏
نہ شرر ستارہ جویم نہ ستارہ آفتابے (اقبالؔ)

سوال: اپنی تخلیقات کے بارے میں آپکی کیا رائے ہے؟ آپ اپنی کس فکری کاوش کو اپنی نمائندہ تخلیق سمجھتے ہیں؟

جواب:
خالد کہ ہے بر غو و غلط اک اہلِ قلم
نامحرمِ اسرارِ حکایات و حکم
بنتا ہے کلیمِ طورِ سینائے سخن
اِنْ ہُمْ یَّبْتَدِ ہُوْ جُنُوْنُہٗ مُسْتَحْکَمْ

سوال: زندگی کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے ؟

جواب: اثباتی، رجائی، پیشقدمانہ، ترقی پسندانہ، آرزو مندانہ، حقیقت کا استقبال کرتا ہوں۔ خوابوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ عزائم کا قائل ساعی کا گھائل ہوں۔ زندگی ایک انمول شے ہے۔ یہ خدا کا عطیہ ہے اور اُسے اُسی کی عبادت یعنی اس کے بندوں کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے۔ صلہ وستائش سے بے پرواہ، نفع ونقصان سے بے نیاز ہو کر۔ کام کا مزہ نشہ کام کرم ہی میں ہے۔

مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ   اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہ

سوال: کیا آپ موجودہ دور کے ادیب اور قاری کے باہمی رشتے سے مطمئن ہیں ؟

جواب: باہمی رشتہ ؟ — ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

سوال: نئی نسل کے لئے آپ کے پاس کیا پیغام ہے ؟

جواب:

بازی تن من کی لگاؤ زندگی کی دوڑ میں   زندگی اک کھیل ہے کھیلو اسے مردانہ وار
موت سے پہلے کشاکش سے ملا کس کو نجات؟   یہ تماشاگاہِ عالم ہے مضیقِ گیرودار

کھٹکھٹاؤ تو کھلے گا در تمہارے واسطے   زندگی، ایمان وعزم و آرزو و انتظار
ثروتِ جاہل ہے دولت، ثروتِ عاقل ہے علم   کون دونوں میں ہے مفلس؟ کس کا ناداروں میں شمار؟
ذوالفقارِ دل کو ذکر و فکر سے صیقل کرو   چادر اوڑھو حلم کی، پہنو لباسِ انکسار
عدل و آزادی، مساوات ومسرّت کے لئے   دو، اگر دینا پڑے خونِ دلِ تمثال دار

سلطان شاہد

اُردو شاعری کے مزاج اور اس کی روح میں اسلامی اقدار وعلامات کی مہک رچی بسی ہے اور اسے اگر اظہار خیال کی آسانی کے لئے "اُردو شاعری کی اسلامی روایت" سے موسوم کر لیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔!

اُردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک داستان بھی ہے بعد المشرقین رکھنے والے رنگا رنگ جغرافیائی خطوں کے مسلمانوں میں اتحاد واشتراک اور محبت ویگانگت کی داستان ۔!

برصغیر پاک وہند کے اس لسانی ذریعۂ اظہار سے واضح ہوتا ہے، کہ مسلمان خواہ وہ افغان ہو یا ترک، ایرانی ہو یا عرب، تتاری ہوں یا مغل، سب ایک ہیں۔ یہ محبت کی اکائی ہے اور محبت اپنی زبان خود ایجاد کر لیتی ہے۔ یہی اردو کی کہانی اور اس کا پس منظر ہے۔ اس زبان کی تشکیل وتکمیل کی بنیاد۔!!

اردو شاعری کا خمیر اسلامی تہذیب وتمدّن سے اٹھا ہے اور اسلامیانِ عالم کے عقائد اور ان کا طرزِ حیات، رمز وکنایہ بن کر، اردو شاعری کے حسن کو نکھارتا سنوارتا اور اس میں ایک نئی روح پھونکتا ہے۔ یوں ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ امر پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ اس زبان کی شاعری پر اسلام اور اسلامی روایات کے اثرات کتنے گہرے، کتنے دور رس اور کتنے وسیع ہیں۔!

اردو شاعری کی علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں پر جتنی گہری چھاپ اس آفاق گیر نظریہ، اسلام، کی ہے اتنی اس سرزمین کی بھی نہیں جہاں اس نے جنم لیا۔ پروان چڑھی اور پھلی پھولی۔

دلی دکنی سے لے کر میر و غالب تک، اردو شاعری کی یہ اسلامی روایت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ نہایت واضح اور انتہائی فراواں ملتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ غالب کے ہاں یہ روایت "شراب آلود" ہو جاتی ہے۔ ؎

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

اور فیض کے ہاں "گناہ آلود"۔

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن — دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

بہر حال یہ روایت مختلف ادوار میں، مختلف رنگ روپ لئے اردو شاعری میں نمودار ہوتی رہی ہے۔ اس کی آنچ کہیں مدھم ہے تو کہیں تیز۔ اقبال و خالد تک پہنچتے پہنچتے اس روایت کے صد ہزار پہلو سامنے آتے ہیں۔ شاید کوئی بھی اردو شاعر ایسا نہیں خواہ وہ آنند نرائن ملا ہو یا تلوک چند محروم۔ جو اس روایت سے دامن چھڑا سکا ہو۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ بعض شاعروں کے ہاں یہ روایت زیادہ نکھری، ستھری اور دلکش نظر آتی ہے اور بعض کے ہاں صرف بناوٹ اور تصنع کا انداز لئے ہوئے یا پھر مسخ شدہ صورت میں۔ حالی نے اس روایت کو براہِ راست اپنی شاعری میں سمویا بلکہ یوں کہیئے کہ اسے اپنی شاعری کا محور بنایا جب کہ اقبال نے اسے ایک تحریک، ایک پیغام بنا دیا!

ہمارے دور میں عبد العزیز خالد کے ہاں یہ روایت اپنی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگی ہے اور اس میں ایک ایسی نئی توانائی پیدا ہوئی ہے جو پورے آسمان پر محیط ہو جانے والے بادلوں کی گھن گرج سے مماثلت رکھتی ہے۔ لیکن خالد کے ہاں یہ گھن گرج صرف لہجہ کی نہیں محض انداز بیان کی نہیں (اگرچہ یہ بھی ان کی شاعری کے بنیادی عناصر میں شامل ہیں)، بلکہ فکر و فلسفہ کی ہے، اسلام سے خلوص اور لگن کی ہے اور رسول عربیؐ سے والہانہ عشق کی ہے۔!!

اردو شاعری کی اسلامی روایت کا تدریجی ارتقاء "شاعر فارقلیط" میں سمٹ کر اپنی انتہاؤں کو چھوتا اور نئی رفعتوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ یہ روایت، جو ابتدا سے اردو شاعری کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، خالد کے ہاں آکر پُر شباب ہو جاتی ہے۔ عبد العزیز خالد اس روایت کا صرف احیاء ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نصف النہار تک پہنچا دیتے ہیں۔

عبد العزیز خالد کے بارے میں عالموں، فلسفیوں، مفکروں، دانش وروں، شاعروں نے اتنا کچھ کہا اور لکھا ہے کہ اس پر مزید کسی اضافے کی گنجائش نہیں رہتی۔ کچھ لوگ انہیں مستقبل کا ولی کہتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ قرآن اگر نظم میں نازل ہوتا تو وہ خالد کی نظم ہوتی اور کئی ایسے ہیں جنہیں ان کی "مشکل پسندی" سے شکایت ہے۔ بہر حال وہ معانی و مفاہیم کا ایسا سمندر ہیں جو کسی ایک مضمون کے کوزے میں بند نہیں ہو سکتا۔ ان کی شاعری کے صد ہزار پہلو ہیں اور ہر پہلو رنگا رنگ۔ وہ تاجدار الفاظ و اصطلاحات کہے جاتے ہیں اور زبان و بیان کے شہسوار بھی۔ یقیناً ان کے دعووں میں کسی قسم کی کوئی مبالغہ آرائی نہیں پائی جاتی۔ مگر سچ یہ ہے کہ ان کی شاعری، مذکورہ بالا تمام عناصر کی موجودگی کے باوجود واضح اور قطعی طور پر اسلام کی نمائندہ شاعری ہے۔ ان کے پیش نظر اسلامی قدروں، اصولوں اور رجحانات کا فروغ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سرورِ کائناتؐ سے بے پایاں عقیدت و محبت کی مظہر شاعری ہے۔ ان کے تین عظیم مجموعہ ہائے کلام "فارقلیط"، "منحمنا"، "حمطایا" رسول پاکؐ کے عبرانی و سریانی اسمائے گرامی سے معنون ہیں۔

؎ نامِ ختم رسلؐ انجیل میں ہے فارقلیط — یا — ہے یہ منجملۂ اسمائے رسول مقبولؐ

مجموعی طور پر ان کے بیس سے زائد مجموعہ ہائے کلام اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان کے عنوانات خاصے ڈرامائی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسا صوتی آہنگ رکھتے ہیں جو خالد صاحب کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و فلسفہ کی ترجمانی کرتا اور ایک مخصوص غنائیت کا حامل ہے مثلاً "دوکانِ شیشہ گر"، "زنجیرِ رم آہو"، "ماتم یک شہر آرزو"، یا پھر وہ ہمیں ماضی کی پُر اسرار دھندلاہٹوں اور

جھلملاہٹوں کے ماحول میں لے جاتے ہیں۔
مثلاً مرود رفتہ۔ یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے "غزل الغزلات"۔ عہد نامہ عتیق کا نغمہ سلیمان "گل نغمہ"۔ ٹیگور کی گیتانجلی۔ وغیرہ وغیرہ

وہ تاریخ، مذہب، فلسفہ اور علم و ادب کے تمام موضوعات کو چھوتے اور انہیں اشعار کے قالب میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں لیکن ان تمام مراحل میں جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ڈرامہ کے تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور ان کے منظوم ڈراموں میں شاعری کے لوازمات کی کوئی کمی نہیں، وہ ڈرامہ میں شاعری کرتے ہیں اور شاعری میں ڈرامہ !!
بہت سے لوگوں کو ان کی مشکل پسندی یا مشکل گوئی سے شکایت رہتی ہے اپنے زمانہ میں غالب کو بھی بالکل اسی شکایت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جھلا کر یہاں تک کہہ دینا پڑا تھا کہ

گر نہیں میرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ہمارا زمانہ، شاعری کی زبان میں، سہل ممتنع کا دور ہے۔ آسودگی و سہل انگاری اس کی خصوصیت ہے۔ ایسے میں خالد کے پُرشکوہ فکر و فلسفہ و فن و شعور سے شکایت نہ ہوتی تو تعجب ہوتا۔ پھر یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ جس شاعر کا مطالعہ کر رہے ہیں وہ انتہائی بلند و عمیق علمی پس منظر رکھتا ہے۔ تاریخ و مذہب سے لیکر فکر و منطق تک اس کا علمی و تحقیقی کینوس بہت وسیع ہے۔ اسے دنیا کی نو بڑی زبانوں (عربی، فارسی، عبرانی، سریانی، سنسکرت، یونانی، ہندی، انگریزی اور اردو) پر عبور حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ادبی و لسانی وسعت کے اثرات ان کی شاعری میں در آتے ہیں تو یہ ایک قطعی فطری امر ہے جسے کسی خارجی جبر سے نہیں روکا جا سکتا اور وہ چاہیں بھی تو اپنی شعوری کوششوں سے اس وسیع افق سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ درست ہے

کہ ان کے کلام کی تفسیریں بہت ہوں اور تشریحیں عام کی جائیں۔ بقول خالد

کوزے میں نہ بند ہو سمندر　　سر پٹکے، بپھر بپھر کے سمٹے

• عبدالعزیز خالد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا گویا علم و فن و معانی کے سمندروں سے گزر رہا ہوں اور عظمت و رفعت کی بلند چوٹیوں کو چھو رہا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کی شاعری میں جہاں فنی شان و شکوہ اور شوکت الفاظ و معانی نہایت بھرپور انداز میں موجود ہیں وہیں ان کی نجی زندگی انتہائی شریفانہ انکسار، حلیمی، نرمی اور بردباری سے عبارت ہے۔ ان کے دل میں اتر جانے والی سیدھی سادی، کھری سچی باتیں سن کر انسان محسوس کرتا ہے۔

• "وہ ایک بڑے افسر ہیں۔ بنگلہ میں رہنے والے اور کار میں چلنے پھرنے والے مگر انسان کے دکھ درد سے آشنا اور اس میں شریک۔ وہ نمازی اور پرہیزگار ہیں مگر کٹ مُلّا ہرگز نہیں۔
جتنے بڑے وہ شاعر ہیں اتنے ہی بڑے صاحب کردار بھی حالانکہ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ "کردار" شاعروں کے مقدر میں کم ہی ہوتا ہے۔

• افسری و شاعری کے باوجود ان کی ذاتی زندگی بے عیب بلکہ صاف و شفاف آئینہ ہے اور یہ بھی تو عجوبہ ہے کہ وہ معاشیات کے ایم اے ہیں اور شاعری کے رسیا۔
یہ تاثر عام ہے کہ ریاضی اور شاعری بیک وقت کسی ایک شخصیت میں نہیں پائی جا سکتیں۔ اعداد و شمار بہت خشک ہوتے ہیں اور فنکار کی لطافتِ احساس سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا یہ سچ بھی ہے دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں۔ کوئی تشبیہ، کوئی استعارہ اور کوئی رمز کنایہ "دو اور دو چار" کے کلیہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہی عالم معاشیات کا ہے جہاں "طلب و رسد

،قیمت و اجرت، کے لگے بندھے فارمولے چلتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد صاحب دن بھر روپے پیسے کے ہندسوں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ معاشیات کے "ماسٹر" ہیں۔ پھر یہ شاعری اور شاعرانہ مزاج انہیں کہاں سے مل گیا اور وہ اسے کس طرح سلامت رکھے ہوئے ہیں؟ یہ جاننے کے لئے ان سے براہِ راست رجوع کیا تو خالد صاحب نے جواب دیا۔

"شعر کا ذوق مجھے بچپن سے ہے صرف دس بارہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگا تھا۔ البتہ میری شاعری معاشی ضرورتوں کے تابع کبھی نہیں رہی۔ ریاضی اور رومانس میں بڑے فاصلے سہی مگر مجھے رومانس کی پراسرار بھول بھلیوں کے ساتھ ساتھ ریاضی کے کھرے کھرے حقائق سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ زندگی کے بے شمار رخ ہیں۔ رنگا رنگ پہلو ہیں۔ زندگی کسی ایک ہی خانہ میں سمیٹ کر نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ بیک وقت زمین پر موجود اور آسمان پر محو پرواز ہوتی ہے بقول اقبال ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے

زندگی کی کیفیات، اس کے رنگ ڈھنگ اور اس کے محسوسات کسی ایک "خانہ" کی قید میں کبھی نہیں آتے وہ کسی ایک کونے میں سمٹ بھی نہیں سکتے۔ یہی عالم ریاضی و رومانس یا میری کنتری و شاعری کا ہے۔ میں اپنے آپ کو ان میں سے کسی ایک خانہ میں بند نہیں کر سکتا۔ آئن سٹائن کے نظریات زندگی کی اس رنگا رنگی کو ثابت کرتے ہیں اور اس سے قطع نظر خود حقائق کا مشاہدہ اور فطرت کا مطالعہ اسی خیال کی تصدیق و توثیق کرتا ہے۔!"

خالد صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، "شعر کہنے کا خیال بنایا نہیں جاتا۔ اس کے لئے، کم سے کم میں اپنے آپ پر کوئی مصنوعی کیفیت طاری نہیں کرتا بلکہ شعر خود بخود آتا ہے اور میری زبان میں اپنے آپ کو "کہلوا" لیتا ہے۔ شاعری بلاشبہ

ایک خداداد صلاحیت ہے۔ البتہ ریاض اور محنت سے اسے جلا بخشی جا سکتی ہے۔ بچپن کے رجحانات، ہر انسان کے لئے، قدرت کی طرف سے عطیہ ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی زبردستی پیدا نہیں کر سکتا اور نہ بچوں کو جبراً کوئی مخصوص رجحانات اپنانے پر مائل کیا جا سکتا ہے۔ میری شعر گوئی بچپن سے چلی آتی ہے اور میں آج بھی ایک جذبۂ بے اختیار اور ایک والہانہ سرور کے ساتھ شعر کہتا ہوں۔"

"تو کیا آپ کو شعر گوئی کے لئے محنت کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔؟"

"محنت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا میری شاعری میں فنی ریاض اور محنت کے تمام عناصر موجود ہیں۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ یہی وہ عناصر ہیں جو شعر میں مٹھاس یا تلخی کا موجب ہوتے ہیں لیکن محنت صرف جسمانی نہیں ہوتی۔ محنت کی اپنی بے شمار اقسام ہیں۔ ذہنی کام کرنے والے بھی ایک قسم کے مزدور ہیں۔ محنت کے ضمن میں ہر شخص کا اپنا میدان کار ہوتا ہے جس میں سرگرم عمل ہوتا اور اس ذریعہ سے اپنے جوہر آشکار کر سکتا ہے۔ البتہ شاعری صرف محنت سے ممکن نہیں یہ والہانہ پن کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔"

باتوں ہی باتوں میں وہ سوال زیر بحث آگیا جو عبدالعزیز خالد کی شاعری کے مجموعی تاثر (اسلامی روایت) کے پیش نظر ان کے ہر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ہوچی منہ کے زنداں نامہ کا "پرواز عقاب" کے نام سے ترجمہ۔ شاعر رحمۃ للعلمین کو ایک کمیونسٹ سربراہ کے خیالات پر ریاضت کرنے اور ان کا ترجمہ کرنے کا خیال کیسے سوجھا اور انہوں نے یہ زحمت کیونکر گوارا کر لی؟

اس کے جواب میں خالد صاحب کا لہجہ خاصا پرجوش ہو گیا انہوں نے کہا "ہوچی منہ ایک بے لوث و بے غرض نفیس انسان کی حیثیت سے مجھے متاثر کرتا ہے اس نے اپنی ہر چیز اپنی قوم پر قربان کر ڈالی اور اس قوم کی آزادی و خود مختاری کے لئے پوری زندگی جدوجہد کرتا رہا اس نے ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں، کڑے مرحلے جھیلے جنگلوں پہاڑوں میں مارا مارا پھرا اور جیل خانے کی کال کوٹھریوں سے بھی اپنی قوم کو پکارتا رہا۔

ہمیں تعصب کی تنگنائے میں سمٹ کر نہیں رہنا چاہیے کنوئیں کے مینڈک بن جانا کوئی قابل فخر بات نہیں اس خول کو

توڑ کر باہر آجانا چاہیئے۔

اپنی ذات سے باہر نکلو دل میں اگر ایمان کو جگہ دی ہے تو ہوس کو اس سے نکال دو کہ ایمان اور ہوس کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ہوچی منہ ہوس سے بلند و برتر شخصیت تھی جس نے اپنا سب کچھ اپنی قوم کے لیئے تج دیا۔ مجھے اس کے ذاتی نظریات و خیالات سے قطعاً کوئی علاقہ نہیں، لیکن وہ مظلوموں کا ساتھی تھا اور ان کے لیئے جہد مسلسل میں مصروف رہا وہ جیل گیا تو اس نظام کے قیدی کی حیثیت سے جو انسان دشمن نظام ہے، اپنے گیتوں سے اس نے اس نظام کے تحت گھٹی ہوئی دبی ہوئی اور سسکتی ہوئی مخلوق کی آہوں اور کراہوں کو چیخوں میں بدل دیا۔ اس نے مظلوم کی زبان کو آواز بخش دی، دکھی دلوں کی آزادی کی امنگ سے گرمایا اور انہیں اس نظامِ آتش و آہن کے خلاف سرگرم عمل کر دیا۔

مجھے اس شخص کے عقائد سے بحث نہیں، مجھے اس کے فکر و فلسفہ سے غرض نہیں لیکن اس کا جو عمل و کردار ہے اس نے مجھے متاثر کیا اور میں نے اس کے "زنداں نامہ" کا ترجمہ کر دیا۔"

تھوڑی دیر رک کر، کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے پھر کہا،

"یہ ترجمہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات بھی موجود تھی کہ اچھائی مومن کی گم شدہ میراث ہے۔ وہ جہاں بھی ملے اُسے اپنا لینا چاہیئے ہمیں کسی بھلائی کو، کسی نیکی کو اور کسی اچھائی کو مسترد نہیں کرنا چاہیئے۔ اچھی اور سچی اقدار جہاں بھی ہوں وہ ہماری ہیں، ازل سے پیغمبر اسلام کا یہی دستور چلا آتا ہے، جہاں بھی صحیح قدریں ہیں۔ جہاں بھی کوئی چشمۂ صافی ہے، جہاں بھی خیر کا آب رواں ہے وہ اسلام ہے ہمارا گم گشتہ ورثہ۔

اپنی ذات سے باہر نکلے بغیر، تعصب کے خول کو توڑے بغیر ہم حقیقتوں اور سچائیوں کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے، اسلام کو ایک عالم گیر نظریہ ہے ہمیں احترام آدمیت سکھاتا ہے آدمیت کا ترجمان ہو تو وہ قابلِ احترام ہے اس کے برعکس کوئی اللہ و انسانیت کی توہین کا مرتکب ہو تو لائق مذمت ہے۔

• مذہبی نفرت و عصبیت ایک بے کار شے ہے اور اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، اسلام دینِ فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اسلام کے لیئے معرض وجود میں لایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان ان اشیاء مختلف النوع کے دوسرے استعمال ڈھونڈ نکالیں، بہر حال جو چیز بنی نوع انسان کے لیئے مفید ہے وہ عین اسلام ہے اس کائنات میں نافع، کو دوام اور بقا حاصل ہے بلکہ سچائی کا معیار یہی ہے کہ وہ انسانیت کے لیئے نافع ہو، انسان اس میں توسیع کر سکتا ہے اسے نئی وسعتوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ لیکن جتنا وہ اپنے آپ کو اپنی ذات میں گم کرے اتنی ہی اس کے لیئے موت ہے ذات کے حصار میں گم ہونا اپنی موت کو آواز دینا ہے۔

خدا بہت وسیع و اکبر ہے، وہ ہر جگہ پایا جاتا ہے اور پروردگارِ عالم کی یہ صفت بندۂ مومن پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو وسیع کرے، اپنے ذہن کو وسعت بخشے، سچ پوچھئے تو نروان یا نجات اسی طرز عمل میں ہے اور اگر ہم اپنے آپ کو محدود کرتے ہیں تو نہ اس سے تسکین اللہ ہوتی ہے اور نہ دنیا میں کوئی آسودگی ملتی ہے۔ ہمیں ہر چیز سے مستفید ہونا چاہیئے۔ اس سے تمتع اٹھانا چاہیئے۔ دنیا اور دنیا کی آسائشیں بذاتِ خود بہت حقیر ہیں۔ انہی کو منتہائے مقصود ٹھہرا لینا مشیتِ ایزدی کے خلاف ہے!"

گفتگو بہت فلسفیانہ ہوتی جا رہی تھی اور خالد صاحب بدستور رواں دواں تھے، توحید کو تلاش کیجئے اور اسے اپنے عمل میں بسا لیجئے بصورت دیگر انار کی پھیلے گی، اور انتشار بڑھے گا، توحید کا یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ وہ اندر بھی ہے اور باہر بھی، اس کا وجود مرئی ہے اور غیر مرئی بھی، وہ داخلی بھی ہے اور خارجی بھی، بیرونی دنیا میں جو اشیاء ہیں وہ برائے تمتع ہیں ہمارے استفادہ کے لیئے ہیں۔

سچے ایمان کی بنیاد پر ہوس کی عمارت نہیں اٹھ سکتی اس کے تحت کوئی ظلم کبھی روا نہیں ہو سکتا، یہ ہمارے لئے خاکساری اور انسانیت کا درس ہے ہمیں اپنا نقطہ نگاہ ٹھیک کرنا چاہیے اگر ایسا نہیں ہوگا تو پھر ہر چیز غلط اور الٹی نظر آئے گی اپنا زاویہ نگاہ درست کیجئے ترجیحات کا تعین کیجئے اولاً خدا سے رشتہ درست ہو اور ثانیاً خلقِ خدا سے رشتہ جوڑا جائے۔ ہمیں جان لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز انسانوں کے لئے پیدا کی ہے۔ یہ انسانیت کے لئے ایثار و قربانی کا بلیغ اشارہ رکھتی ہے مثلاً زکوٰۃ کو لیجیے دوسروں کے لئے خرچ کرنے میں خود اپنے ضمیر کو تسکین حاصل ہوتی ہے انسانیت کی فلاح کے لئے کسی قربانی میں خود اپنے آپ کو سکون و آسودگی حاصل ہوتی ہے لیکن کسی عمل کا اجر طلب کرنا مزدوری ہے صرف مزدوری پیغمبر کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔" اور صحیح انسان کی شناخت یہی ہے کہ اس کا کام بغیر کسی اجر کے ہو، قطعی رضاکارانہ، صلہ و معاوضہ و ستائش کی تمنا کے بغیر خود خدا نے بنی نوع انسان کو ہر چیز مفت دی ہے۔ کوئی اجرت یا قیمت نہیں مانگی۔

ہم ایک سے الفاظ و اصطلاحات استعمال کر سکتے ہیں، اسلام و ایمان کی ایک جیسی باتیں کر سکتے ہیں لیکن الفاظ اور باتوں سے انسان کی حقیقی شناخت نہیں ہوتی۔ انسان صرف عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ الفاظ و اصطلاحات بے جان ہیں اگر ان خونِ جگر کے معانی و مفہوم کے رنگ نہ ابھریں۔

کسی شخص کی باتوں میں جتنی بناوٹ و ملاوٹ ہوگی اتنا ہی "وہ بے معنی انسان" ہوگا۔

اسی پس منظر میں اب ہو جو منہ کی طرف آئیے وہ ظلم کے خلاف بر سر پیکار ہوتا ہے انسانوں کے لئے صعوبتیں برداشت کرتا ہے اور پورے عزم سے حق کے مقام پر ڈٹا رہتا ہے۔ یہی عظمتِ انسانی ہے۔

کرامت سے بڑھ کر ہے استقامت۔ انسان کی شناخت کے لئے محض باتیں بنانا ایک فن ہے اور اس میں کوئی بھی شخص طاق ہو سکتا ہے مگر یہ کوئی بڑائی کی دلیل نہیں۔

یہ ہیں عبدالعزیز خالد کے افکار و خیالات جن کے آئینہ میں ان کی شخصیت اور شاعری پوری طرح جھلکتی ہے اور ایک انسان کی اپنی بات اور اپنا نقطہ نظر ہے کہ (بقول خالد)

جس کو اپنا لو وہ خوباں　　　　جس کو پوجو وہ خدا

"ہم نہاں خانہ دل میں تمناؤں کے تاج محل تعمیر کرتے ہیں۔ ان میں امیدوں کے قمقمے و شمعیں جلاتے ہیں لیکن زمانہ ایک ہی ضرب سے اس آئینہ خانے کو مسمار، ان اصنام خیالی کو سنگسار کر دیتا ہے۔ ہم اپنے مصلوب جگر گوشوں کو اپنے کلیجوں سے لگائے پھرتے ہیں، اپنی الفتوں کی لاشوں کو اپنے دامن میں چھپائے پھرتے ہیں۔ ہمارا دل زندہ بھی ہے مرحوم بھی۔ آرزوؤں کا منصہ بھی ہے مزار بھی" (ص ۲۱۳ دکان شیشہ گر)

خالد کے ہاں دنیا ایک بہت بڑا فریب سہی، دار المحن یا دار الآفات سہی، لیکن اس کے پاس زندگی گزارنے کا ایک حل ضرور ہے جذبہ۔ شوق۔ امید اور سعی پیہم ایسے عمل ہیں جن کے باعث مایوس و غمزدہ انسان کی مسلسل ڈھارس بندھی رہتی ہے۔ طلوعِ صبح فردا کی خوشنما امید اس کے لئے زندگی کو ناقابل برداشت بوجھ بننے نہیں دیتی (دیکھئے دکان شیشہ گر ص ۱۳) خالد یہاں شوپنہار سے علیحدہ راستہ اختیار کر لیتا ہے، شوپنہار کے نزدیک تو امید کی گنجائش سرے سے ہی نہیں، وہ تو کہتا ہے کہ روایتی رجائیت پسندی محض ایک فیشن ہے اس لئے کہ کوئی بھی شخص بظاہر قنوطیت پسند کہلوانے کو تیار نہیں ہوتا لہٰذا وہ اپنے دل کو بلا دلیل اس طرح مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

عبدالعزیز خالد کی تصانیف

۱۔ زردِ داغِ دل	اکتوبر ۱۹۵۶ء	یہ دونوں منسوخ مجموعے ہیں۔ البتہ انہی ناموں کی دو یکسر نئی کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔
۲۔ ماتمِ یک شہرِ آرزو	فروری ۱۹۵۷ء	
۳۔ سرودِ رفتہ / یونانی شاعرہ سیفو کے نغمے	دوسرا ایڈیشن	جولائی ۱۹۷۵ء
۴۔ لحنِ صریر / رباعیات	دوسرا ایڈیشن	نومبر ۱۹۷۴ء
۵۔ پروازِ عقاب / ہوچی منہ کی نظمیں	پہلا ایڈیشن	مئی ۱۹۷۳ء

ناشر: آئینۂ ادب، چوک انارکلی، لاہور

۶۔ غزل الغزلات / عہد نامۂ عتیق کا نغمہ	دوسرا ایڈیشن	جنوری ۱۹۷۴ء
۷۔ زنجیرِ رمِ آہو / ابتدائی نظمیں، غزلیں	تیسرا ایڈیشن	مارچ ۱۹۷۴ء
۸۔ سلومی / منظوم تمثیل	تیسرا ایڈیشن	جولائی ۱۹۷۳ء
۹۔ دکانِ شیشہ گر / منظوم تمثیلیں	تیسرا ایڈیشن	نومبر ۱۹۷۴ء
۱۰۔ برگِ خزاں / منظوم تمثیلیں	تیسرا ایڈیشن	اکتوبر ۱۹۷۴ء

۱۱۔ ورقِ ناخواندہ — منظوم تمثیلیں — دوسرا ایڈیشن — جنوری سنہ ۱۹۷۴ء

۱۲۔ گلِ نغمہ — رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی (اُردو نظم میں) — مئی سنہ ۱۹۶۲ء

۱۳۔ فلکِ موج — نظمیں، غزلیں — دوسرا ایڈیشن — نومبر سنہ ۱۹۷۴ء

۱۴۔ فارقلیط — نعت و نام رسولِ تہامی — تیسرا ایڈیشن — اگست سنہ ۱۹۷۴ء

۱۵۔ منحمنّا — ذکر و فکرِ پیغمبرؐ — اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء

۱۶۔ کفِ دریا — غزلیں — دوسرا ایڈیشن — اپریل سنہ ۱۹۷۲ء

ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور

۱۷۔ دشتِ شام — نظمیں، غزلیں — جولائی سنہ ۱۹۶۵ء

۱۸۔ مزمورِ میرِ مغنی — طویل نوحہ نظم — جولائی سنہ ۱۹۶۹ء

ناشر: آئینۂ ادب چوک انارکلی لاہور

۱۹۔ حدیثِ خواب — رومانی نظمیں، غزلیں — اکتوبر سنہ ۱۹۷۴ء

ناشر: ماورا پبلشرز کالج روڈ راولپنڈی

دوسرا ایڈیشن (زیرِ طبع)

ناشر: شباب پبلیکیشنز، پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

احسان دانش

میں "تحریر" برابر پڑھتا ہوں اور آپ کی محنت کو سراہتا ہوں۔ اب جو آپ عبدالعزیز خالد نمبر شائع کر رہے ہیں اس اپج کی بھی داد دیتا ہوں۔ کوشش کیجیے کہ اس میں خالد صاحب کے علمی ادبی مضامین زیادہ ہوں، کیونکہ شاعروں میں ایک یہی انسان ایسا ہے جو علمی معلومات سے لبریز ہے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ اُن سے الفاظ و معنی کی ایک طویل فہرست مرتب کرائیں جو ان کی نظم و نثر میں استعمال ہوئے ہیں۔ ہو گیا تو یہ بڑا ہی مفید کام ہو گا۔

اُن کے سوا دوسرا شخص اس کام کو کر بھی نہیں سکتا۔ یہ کام بطریق خوبی انجام پا گیا تو پھر اسے ایک کتابی صورت دیدیں تاکہ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ کے کام آسکے۔ اگر اس رخ پر کام چل نکلا تو پھر جناب جوش، جناب فیض، ڈاکٹر سید عبداللہ، حفیظ جالندھری، شورش کاشمیری اور رئیس امروہوی کے علاوہ کئی اساتذہ ایسے ہیں جن کی تحریروں سے کارآمد لغت مرتب ہو سکتے ہیں۔

- اس قسم کا لغت طالب علموں کے لئے بیحد مفید ہو گا اور دوسرے لوگوں کو بھی ایک کارآمد ذخیرہ الفاظ دستیاب ہو سکے گا۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین

"صحت الفاظ"، پر معنی تحریر اور قدرت بیان نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ عربی زبان پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے الفاظ کے معانی پوچھنے پڑے۔ لیکن جن صاحب سے معانی دریافت کئے۔ وہ آپ کے نادیدہ مداح ہو گئے ــــــــــ آپ کی وسعت تخیل، قدرت بیان تنظیم و تہذیب فکر، سلیقہ ترتیب و طباعت سب کا میں ستائش گر ہوں۔
آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے ہماری زبان کے وسیع امکانات کا پتہ دیا ہے۔ خدا آپ کو اس سے بھی زیادہ توفیق دے۔ آمین

علامہ عبدالعزیز میمن

عزیز العزیز حضرت خالد سے میری ملاقات حیدرآباد سندھ میں تقسیم کے بعد ۴۸ء میں ہوئی تھی۔ پھر آپ نے اپنا ایک عربی قطعہ غالباً بہاریہ مجھے شاید علی گڑھ بھیجا تھا، جس سے آپ کے عربی ذوق، سلاست، اور روانی کا اندازہ ہوا کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ پھر ۵۵ء کے بعد سے کراچی کی فضا آپ کے کلام سے گونج رہی ہے۔ اس ۱۲ سال کی مدت میں اکثر

ملاقاتیں رہیں، میری رائے آپ کے کلام کے متعلق مختصراً یہ ہے:۔

۱۔ کہ یہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ایک صدی گذرنے کے بعد عربی سے اس کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا، اگر واقعہ تو یہ ہے کہ قدیم شعرا بھی اس رنگ سے عاری تھے۔

۲۔ اسلامی روایات اور تاریخی واقعات کو بڑی فراخی اور وسعتِ مطالعہ سے اپنے کلام میں کھپایا اور ملک و قوم کو اس سے روشناس کیا۔

۳۔ اگر مولانا ابوالکلام اردو کی ایک خاص قسم کی نثر کے موجد تھے، تو بلا ریب عبدالعزیز خالد اس قسم کی نظم کے مخترع ہیں جو نثر سے بہرحال مشکل تر ہی ہے۔

۴۔ دس بارہ زبانیں جاننے کے باعث آپ کی تلمیحات کا دائرہ اور وسیع ہو گیا اور ملّت کے دسترخوان پر آپ نے وہ وہ رنگین اور لذیذ الوانِ نعمت چُنے جن کا سان گمان بھی نہ تھا۔

۵۔ قوم پہلی مرتبہ عربی کے غرائبِ لغات اور نوادرِ استعارات سے روشناس کی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ وہ بھی عربی اور اسلامیات سے اپنا ناطہ پھر سے جوڑے، تاکہ اس صنفِ کلام سے کچھ تو حظ اندوز ہو سکے۔

آخر میں میں اپنے عزیز ذہین طباع اور فاضل دوست سے درخواست کروں گا کہ ہر غریب لغت جو ان کی نظر سے گذرے جوں کا توں لے کر اُردو میں جڑ نہیں دیا جا سکتا، کہ وہ اہل زبان کی فہم و فراست سے ماوراء ہے، نیز یہ کہ آپ کی ہر نظم اسی قدر توضیحی حواشی کے بغیر پوری افادیت حاصل نہ کر سکے گی ؎ این قولی هذا کثیبٌ قدیمٌ = ومقالی عقنقلٌ قدموسٌ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

میں اربابِ علم کے خطوط محفوظ کر لیتا ہوں۔ یہ خط میرے خزائن مخطوطات میں ایک عمدہ اضافہ ہے —— آپ کے اشعار، حواشی اشعار اور خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو عربی ادب اور خصوصاً شعر جاہلیت پر پورا عبور حاصل ہے۔ یہ عبور اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک جیّد علماء سے درس نظامی کی تکمیل نہ کی ہو۔ یا ۶-۷ برس مصر و شام کی درس گاہوں میں نہ گزارے ہوں۔ آپ نے کون سا راستہ اختیار کیا تھا؟ اس لحاظ سے آپ کی ہستی شعرائے عصرِ رواں میں منفرد ہے۔

لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ کہ شراب، شباب اور آگ کو چھپانا بہت مشکل ہے۔ شعر کیا ہے؟ ایک شعلہ جو روح سے لپک کر لبوں تک پہنچ جائے۔ تو شعر بن جاتا ہے۔

آیات، احادیث اور عربی امثال کو لباس شعر میں ڈھالنا آپ ہی کا کام ہے اور یہ کہ اصل قول کی روانی و سلاست میں کوئی فرق نہیں آتا۔

رشید احمد صدیقی

"منحمنا" موصول ہوئی۔ اس خوبصورت اور گراں قدر تحفہ کا شکر گزار ہوں۔ آپ کا اندازِ کلام اردو شاعری میں ایک منفرد اضافہ اور کتاب کا گٹ اپ آراستگی اور خوبصورتی و خوش ذوقی کا پاکیزہ نمونہ ہے۔ آپ کے کلام میں جو صوت، سہولت اور صلابت ملتی ہے اور اس کے ساتھ غرابت بھی، اسے عام اردو دان طبقے کی تائید اور تحسین کس حد تک حاصل ہوگی۔ اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ فنکار اس طرح کے اندیشوں سے ...

اور رکھتے ہیں جتنے مزے کی معلوم ہوتی ہے۔ اُتنی دراصل ہے نہیں۔ فن کار کو بالآخر اپنے فن کے (VERDIC T) کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ بچہ روئے نہیں تو ماں کی چھاتی میں دودھ نہیں اترتا۔

اس سلسلے میں بہت سی باتیں کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کو لکھے کون۔ آپ قریب ہوتے تو گفتگو کرتا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایسے ہی اعلیٰ موضوعات پر آپ اپنے گراں قدر خیالات ۸-۱۰ مصرعوں میں اقبال کے hemistiche میں ادا کرتے اس کے بعد ان خیالات کو FINALE کر دیتے اس پہ نصف مصرعوں میں اپنے مخصوص hemistiche کو کام میں لاتے۔ اس طرح مکمل نظم کا زیروبم [illegible] ہو جاتا۔ اس نظم کا آہنگ کچھ اس طرح کا ہوتا جیسے خطرہ یا جنگ کے موقع پر وحشی قبائل پہاڑیوں پر اپنی ڈھل کو طرح طرح سے بجا کر دور دور واقع چوکیوں سے alarm کرتے ہیں اس طرح سے پورے قبیلے کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ خطرہ کیا ہے اور اس سے نپٹنے کی ٹیکنیک کیا ہے۔ اس ٹیکنیک سے آپکا کلام بڑا مقبول و موثر ہوتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ ٹیکنگ آسان نہیں ہے۔ لیکن تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔؟

علی عباس حسینی

اب اس بوڑھے ضعیف کی بھی ایک بات دھیان میں رکھئے۔ صاف گوئی معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی وسعت مطالعہ قدرت شعر گوئی، جودت طبع، تلاش نادرات اور قوت حافظہ کا قائل ہوں۔ آپ میں وہ تمام صلاحیتیں اور اہلیتیں موجود ہیں جو آپ کو اردو کے عظیم ترین شعراء کی محفل میں کرسٹی زرنگار پہ بیٹھنے کا مستحق بنا ہیں۔ لیکن خدارا اپنی عربی دانی کا مظاہرہ کم کیجئے۔ لوگ آپ کی اکثر کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ اور انہیں بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے آپ کی اکثر چیزیں لغت کو بغل میں رکھ کر پڑھی ہیں۔ اس لئے ہم جیسے کم سوادوں پر رحم کر کے اردو لکھئے۔ انشاءاللہ آپ کو وہی مرتبہ حاصل ہو گا۔ جو آج اقبال کو حاصل ہے۔

آپ کی غزلوں پہ ایک علیحدہ مضمون لکھنے کو جی چاہتا ہے۔

علامہ سید اختر علی تلہری (وزیر گنج لکھنؤ) بھی آپ پہ ایک مضمون لکھنے کو تیار ہیں۔

قتیل شفائی

آپ نے جناب عبدالعزیز خالد کے بارے میں کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ کاش میں نقاد ہوتا اور خالد صاحب کے فن کا احاطہ فراخ دلی سے کرتا۔ لیکن میں تو نثر کے معاملے میں قلاش ہوں۔ نظم میں خالد صاحب کو خراج تحسین پیش کروں تو قصیدے کا الزام آنے کا احتمال ہے حالانکہ خالد صاحب کی ذات میں جو صفات میں نے دیکھی ہیں ان کا تقاضا ہے کہ انہیں اچھے لفظوں سے یاد کیا جائے۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ میرے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور میں طویل مدت کے لئے صاحب فراش ہو گیا۔ اس عرصے میں خالد صاحب نے کئی بار فون سے میری خیریت دریافت کی اور دو مرتبہ بنفس نفیس میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ ان کی اس مروت نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا کہ یہ وصف کسی کسی میں ہوتا ہے۔

ہم نے بیماری کے دوران بہت سے تجربے حاصل کیے۔ کئی باتونی دوستوں کی زبان گنگ ہوتے دیکھی، کئی تیز گام احباب کو اپاہج ہوتے دیکھا، کئی باخبر یاروں کو اپنی بیماری سے بے خبر پایا لیکن کچھ عبدالعزیز خالد بھی دریافت ہوئے جن کے خلوص نے مجھے توانائی بخشی اور انسان دوستی پر سے میرا اعتماد اٹھنے نہ دیا۔

اگر خالد صاحب بڑے شاعر نہ بھی ہوتے تو میں اُن کے اسی ایک وصف کو سامنے رکھ کر ہزار صفحے بھی سیاہ کر دیتا تو حق ادا نہ ہوتا۔

میری دعا ہے کہ خالد صاحب ہمیشہ نئے نئے ادبی افق چھوتے رہیں اور ان کی ذات اور فن پر ایسے ایسے کئی نمبر شائع ہوتے رہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

میرا بہت جی چاہتا ہے کہ آپ کے قلم سے ایک نوائے مترنم اور شعریت سے بھرپور شاہکار جنم پائے۔ میں اس دن کا منتظر ہوں۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

آپ اپنے فن کے لیے بجو ریاضت کر رہے ہیں۔ وہ ہر طرح قابلِ داد ہے۔ ہمارے شاعروں اور شعر کے قارئین میں سہل انگاری کی روایت عام رہی ہے۔ اس لیے آپ کے شعری اکتسابات اگر فوری مقبولیت حاصل نہ کریں تو آپ پروا نہ کیجیے۔ اس طرح کے کارناموں کی قدر و قیمت کے پرکھنے میں عموماً دیر لگتی ہے۔ مجھے آپ کے کلام سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اور میں بہت توقعات آپ سے وابستہ کیے ہوئے ہوں۔

مولانا اسعد القادری

ہاں شاعرِ اعظم ہیں جنابِ خالدؔ
اعجازِ ادب ہے انتخابِ خالدؔ
پیہم اُفقِ شعر سے آتی ہے صدا
ہوگا نہ غروبِ آفتابِ خالدؔ

مجتبیٰ حسین

بزمِ ادب سراج الدولہ کالج کراچی کی افتتاحی تقریب میں پروفیسر مجتبیٰ حسین نے عبدالعزیز خالد (میرِ مجلس) کی شاعری میں اسلامی تصورات کے آفاقی اور انسانی پہلوؤں کی تصویر کشی کی۔ کہا کہ حبِ رسول سے ان کے کلام کے اکثر گوشے روشن ہیں اور ان کی شاعری قومی و ملی ہوتے ہوئے تنگ نظری سے بالاتر ہے۔

دم سیتاپوری

"لحنِ صریر" دیکھ رہا ہوں۔ خالص قرآنی فلسفہ ہے ——— آپ کی فکر ——— سطحی یا محض شعری نہیں ہے۔ اتنے دور جا سکے گا کہ اقبال کی سرزمین نے کوئی ایسا خلا نہیں چھوڑا ہے۔ جسے پُر نہ کیا گیا ہو۔

از ندرت

آپ کی پوری شاعری کا احاطہ کرنا میرے بے بضاعت قلم سے ممکن نہ ہوگا ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

میں آپ کے شعر کے کسی ایک پہلو پر لکھوں گا۔ سردست CONCENTRATE کر رہا ہوں۔

علی محسن صدیقی

مجلہ "المعارف" لاہور کے شمارہ نو میں آپ کے مجموعۂ کلام ——— "پر تبصرہ شرف بخش نظر ہوا۔ اپنی کم سوادی کے صعف مجھے شعراء اردو کی علمی بے بضاعتی کا ہمیشہ شکوہ رہا ہے۔ آپ کے اشعار کے اقتباسات پڑھ کر مسرت ہوئی کہ صنف شعراء کم از کم ایک ایسا عالم بے بدل اور شاعر بحر پر موجود ہے۔ جس کی عبقریت نہ صرف شعرائے اردو میں بلکہ شعرائے عربی و فارسی منفرد اور بے بدل نظر آتی ہے۔ شعرائے عرب میں علقمۃ الفحل بڑا تھا۔ اس کے اشعار اس کے علمی تجربہ پر عادل ہیں۔ کم و بیش یہی کیفیت فارسی گو شعراء میں بدر چاچ اور اس سے بھی زیادہ قاآنی کی ہے۔ مگر آپ الفاظ رہ معانی اور تراکیب مبتکرہ میں ان شعراء سلف سے بھی قصب السبق لے گئے۔ اور آپ جس کا روانِ شعر و سخن قافلہ سالار ہیں اس کی گرد کو بھی یہ لوگ نہیں پہنچے"۔

میں آپ کے اشعار پڑھ کر نفس گرفتہ رہ گیا کہ قریحہ شاعر کتنا متنوع اور ذہن سخن ور کس قدر خزینہ دار الفاظ و معانی ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج عربی فارسی اور اردو میں کوئی ایسا شاعر نہیں ہے۔ جو علمیت اور عبقریت میں آپ کی ہم عنانی تو در کنار تقلید کا بھی دعوےٰ کر سکے۔

آپ کا کلام آیات جمال بھی ہے اور اعلام کمال بھی اور یہ شرف کم ہی کسی کو حاصل ہوگا۔ میری جانب سے آپ کو ہدیۂ تبریک پیش کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف اور دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کرنے کے مصداق ہے۔ مگر بہ برد استحسان کے جذبات سے مجبور ہو کر آپ کو آپ کے اشعار غرا پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اکثر مہدی

میرا خیال ہے کہ آج آپ سے (یہ دوستی کی وجہ سے نہیں کہہ رہا بلکہ حقیقت ہے یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگ اس کو دوستی پر محمول کریں گے) بہتر منظوم ترجمہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ضیا حسن احمد

مجھے آپ کی تخلیقات سے استفادے کا موقع مل رہا ہے۔ آپ کی ان تھک کوششیں، اتھاہ گہرا شغف، اصول فن سے واقفیت اور زبان پر عبور، منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں یہ نظمیں یقیناً ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور بعض نئی منزلوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

محمد کاظم

میں آپ کی شاعری سے پہلے بھی متعارف تھا۔ لیکن صرف ادبی رسالہ کے صفحات پر! اور اس کی داد میں نے ندیم صاحب کو ان الفاظ میں دی تھی۔

"بعض اوقات میرا شیطان میرے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ پاکستان میں عربی زبان کا جتنا دانائے راز میں ہوں اتنا کون ہوگا۔ لیکن۔ عبدالعزیز خالد کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ میں عربی زبان نہیں جانتا۔" (او کما قلت)

اب ان خوبصورت کتابوں کی ورق گردانی کی۔ تو ایک دفعہ پھر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس ویرانے میں تو بڑے بڑے دیو پیکر مجنوں پھرتے ہیں۔ آپ کے مطالعے کی وسعت، ہمہ گیری اور تنوع شک و شبہ سے بالا ہے۔ جس شخص کی میز پہ بیک وقت قرآن، انجیل، حماسہ اور کتاب الاغانی کے اوراق ہوں۔ اسے اس دنیا میں اور کیا چاہیئے۔

آفاق صدیقی

ایک دُورافتادہ کی حیثیت سے مجھے آپ کی گرانقدر ادبی شخصیت اور عدیم المثال شعری تخلیقات سے دلی عقیدت رہی ہے۔ مجھے اپنی اس کوتاہی کا احساس ہے۔ کہ عربی زبان و ادب کو سمجھے بغیر آپ کی نگارشات سے لطف اندوز ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ جلد از جلد عربی میں اتنی سوجھ بوجھ تو حاصل کر ہی لوں جو کسی حد تک آپ کی تخلیقات سے بہرہ ور ہونے کے لئے کافی ہو۔

غلام ربانی عزیز

اردو شاعری جس ارتقائی دور سے گزر رہی ہے۔ اسے ایک قاآنی کی ضرورت تھی۔ جو بحمد اللہ آپ کی ذات میں مل گیا ——— آپ کے زورِ بیان اور شوکت الفاظ نے خاقانی کی یاد تازہ کر دی۔

زبیر رضوی

کیا یہ اچھا ہوگا کہ "شنگیں" نام سے کوئی ادبی رسالہ شائع ہو۔ اور اس میں عبدالعزیز خالد کی گراں قدر تخلیقات شامل نہ ہوں؟ لوگ مجھے اور آپ کو معاف نہیں کریں گے۔

عبدالسلام خورشید

عبدالعزیز خالد ——— وہ ایک طرف تو یونانی دیومالا اور دنیا کے بہترین کلاسیکی ادب سے روشنی اخذ کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف آسمانی صحیفوں کی ضیا کرنوں سے بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ السنۂ شرقیہ میں انہیں گہرا درک حاصل ہے بالخصوص عربی زبان میں۔ اپنے کلام میں عربی کے الفاظ کو اس چابکدستی سے سموتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور موضوع کا تقاضا ہو تو عربی کے الفاظ بھی اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے والے عش عش کر اٹھتے ہیں۔

عنوان چشتی

اس دور میں ایک تیسری آواز بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ عبدالعزیز خالد کی آواز ہے۔ خالد نے اردو رباعی کو جذباتی سطح سے بلند کر کے علمی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ شکسپیئر اور ایلیٹ کی طرح ان کی رباعیوں میں عالمی تہذیب و تاریخ کے حوالے ملتے ہیں۔ لیکن ان حوالوں میں عربی تہذیب و تاریخ اور اسلامی افکار و روایات کو افضلیت حاصل ہے۔ کہیں کہیں ہندوستان کی جلوہ گری بھی ہے ——— خالد نے اردو رباعی میں تکنیک کے نئے تجربے بھی کئے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی رباعیوں کی فضا گھمبیر اور واضح ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع بھی ہے۔

———— ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ خالد کی رباعیاں جنہیں فنِ رباعی میں ایک تجربہ کر سکتے ہیں۔ کیا مرتبہ حاصل کرتی ہیں۔ لیکن متذکرہ بالا جائزہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ رباعی سنجیدہ اور زندگی کے اسرار و رموز کے بیان کے لئے ہی مخصوص نہیں۔ بلکہ اس کے موضوعات زندگی کی رنگارنگی کی طرح متنوع ہیں۔

فروغ احمد

خالد کی انفرادیت اس قدر نمایاں ہے کہ اقبال کے تحت الشعوری تتبع کا کھوج لگانا آسان نہیں۔ لیکن اگر کوئی ان سے پوچھے کہ فکرِ اقبال میں کوئی چیز کسی بھلے آدمی کو متاثر کرنے والی ہے یا نہیں تو مجھے یقین ہے۔ کہ ان کا جواب نفی میں نہیں اثبات میں ہوگا لہجہ اور اسلوب خالد کا بلا شبہ اپنا ہے۔ اسا طیری کینوس بھی اقبال کے مقابلے میں بظاہر بہت زیادہ پھیلا ہوا اور بہت زیادہ متنوع ہے۔ لیکن ذرا "جاوید نامہ" کو اٹھا کر دیکھئے اور "پیامِ مشرق" کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ "سیرِ وادی الارض" کی تعمیل میں خالد نے یہ اہتمام کیا ہے۔ کہ جہاں جہاں اقبال نہیں پہنچے۔ یا صرف آس پاس میں ہو کر چلے آئے۔ ذرا وہاں کی بھی تفصیلی سیر کر لی جائے۔

ذوقِ جمال خالد کے یہاں ایک مخصوص سج دھج رکھتا ہے۔ حسن کو انہوں نے کئی زاویوں سے دیکھا بلکہ محسوس ایسا ہوتا ہے۔ کہ برتا بھی ہے۔ اس سے ان کے شاعرانہ خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

خالد کی مذہبیت کے بارے میں میرا تصور یہ ہے۔ کہ وہ غالب کی صلح کل خانقاہی اباحت کی رنگارنگی اور علی گڑھ اسکول کی آزاد حشری کا ایک نادر امتزاج پیش کرتے ہیں۔

خالد کے علوئے فکر اور تعمقِ نظر کو ہم اکتسابی تو کہہ سکتے ہیں لیکن نقلی ہرگز نہیں۔ جب وہ نامحسوس کو محسوس و متشکل کر دینے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ "ستاروں کی ضو" کو کفِ دست میں لے کر نچوڑنے کی بات کرتے ہیں۔ تو روا روی میں یہ بدگمان ہو سکتا ہے کہ وہ جوش کے بڑے بول کا جواب دے رہے ہیں۔ حالانکہ جوش کم از کم خالد جیسے وسیع المطالعہ اور وسیع المشرب شاعر و مفکر کے بارے میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ "جاہل کے یقین سے بے یقینی بہتر" میں سمجھتا ہوں۔ کہ خالد کے ٹھوس مثبت اور یقین بر واقعیت دعوؤں نے جوش کے بلند آہنگ لیکن متشککانہ دعوؤں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ اور خالد کے فکر و فن کے ہر لحظہ فروزاں چراغوں کے آگے جوش کے "نجوم و جواہر" کی تجلیاں دم توڑتی ہوئی شمع کے شعلے کی آخری لپک معلوم ہوتی ہیں۔

بلاشبہ وہ ماضی سے نور و حرارت اخذ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کلاسیکی ہیں۔ لیکن اپنی "یادوں" "امیدوں" "آرزوؤں" امنگوں اور اپنے سوز و گداز اور جذبۂ والہانہ کی بدولت اپنی ہیئتی کلاسیکیت میں جس جذباتی اٹھان اور فکری تحریک کے وہ حامل ہیں۔ اس سے ان کی رومانیت کے مستقل بالذات ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔

میرا خیال ہے سلیم احمد بھی غالباً اس کی شہادت دیں گے کہ ایک جمال پرست رومانی ہونے کے باوجود خالد صاحب اختر شیرانی وغیرہ کی قماش کے "آدھے آدمی" نہیں بلکہ ماشاءاللہ "پورے آدمی" ہیں۔ اور یہ ان کی کرداری صالحیت اور ذہنی صحت کی ایک روشن دلیل ہے۔ خالد کے فکر و فن کے ابعاد

طول ———— طولِ کلام اور شرح و ابلاغ

عرض ———— موضوعات کا پھیلاؤ اور معنوی وسعت

عمق ———— جذبہ و فکر کی گہرائی اور شدت

بالائے سطح بلندی ——— تخیل کی اٹھان اور پرواز ۔ آفاقیت ——— زمان و مکان کی قیود سے ماوراء حقائق زندگی کا ہمہ گیر ادراک اور تصور ۔

یہ پنج ابعادی کائنات اصغر آئن سٹائن کی چار ابعادی کائنات سے زیادہ مکمل معلوم ہوتی ہے ۔

اختر حسین رائے پوری

عبدالعزیز خالد کی کچھ چیزیں میں نے دیکھی ہیں ۔ اس میں بڑی تخلیقی صلاحیت ہے ۔ اور اس کے استعاروں کا میدان بڑا وسیع ہے ۔

سید حرمت الاکرام

آپ کی شاعری کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ آسان نہیں ۔ اس کے لئے علم فکر کے ساتھ ساتھ کاوش جذبہ اور وقت کی بھی ضرورت ہے ۔

نظیر صدیقی

ممکن ہے آپ کو یقین نہ آئے ۔ لیکن اب کے بار آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ۔ اس سے پہلے آپ سے ملاقات ہوئی بھی کہاں تھی ۔ میں نے آپ کی ذات میں ایک نہایت کشادہ دل وسیع الاخلاق اور ہمدرد انسان پایا ۔

آپ کے شعروں سے متعلق اپنی بعض الجھنوں کا اظہار کبھی آئندہ خط میں کروں گا ۔ سردست ذہنی سکون کی بڑی کمی ہے

سلمان الارشد

اس دن کی ملاقات میرے لئے ناقابل فراموش ہے ۔ کیوں کہ اس دن میں نے شاعر کے بجائے ایک مخلص انسان کو دریافت کر لیا ۔ آپ کی شرافت نفس ، پاکیزہ روشی ، بلند خیالی اور اخلاص نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ہے ۔ ——— بہر نوع اگر زندہ رہا تو اخلاص و محبت کی چھٹکی ہوئی چاندنی میں پھر کر وقت گزارنے کا موقع ملے گا ۔

محمد باقر شمس

میرے خیال میں عبدالعزیز خالد صاحب ایک ایسے منفرد شاعر ہیں ، جنہوں نے آداب نعت کو جتنا ملحوظ رکھا ہے ۔ وہ اپنی مثال آپ ہے اس میں شک نہیں کہ خالد صاحب اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اردو میں ایک انفرادی رنگ کے مالک ہیں ۔ نعت گوئی ان کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے ۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین

خالد نے بہت کچھ کہا ہے ۔ اور ابھی انہیں بہت کچھ کہنا باقی ہے ۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

خالد احمد

اردو شاعری میں ——— روایت نعت کو آگے بڑھانے والوں میں عبدالعزیز خالد ، حافظ مظہر الدین اور حفیظ تائب کے نام نمایاں ہیں ۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

خالد اردو شاعری میں اس دور کے غالب ہیں ۔ اور وقت جتنا آگے بڑھتا جائے گا ۔ خالد کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اتنا ہی زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا ۔

رشید امجد

عبدالعزیز خالد کی نظموں سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی پر بھی مکمل عبور کی ضرورت ہے۔

راحت افزا بخاری

موجودہ دور کی شاعری نے مجھے بہت مایوس کیا تھا۔ زندگی کا صرف ایک رخ "ایک پہلو" چاہے آفاق و کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمو لے لیکن رہتا تو ایک ہی پہلو ہے، میر، غالب اور اقبال کے بعد ہمیں یعنی اردو ادب کو وہ شاعر ملا جس پر ہم پھر اپنا سر فخر سے بلند کر سکتے ہیں۔ خدا کرے آپ بہت کچھ لکھیں۔

مظفر شکوہ

پہلے میں اپنا تعارف کراؤں، میں یہاں نیویارک یونیورسٹی میں اردو زبان اور لٹریچر کا معلم ہوں۔ آج ن م راشد صاحب کی موجودگی میں جمیل الدین صاحب عالی نے آپ کے کلام کی بے انتہا تعریف کی۔ عالی صاحب نے آپ کی عظمت کا ایسا نقش جمایا کہ میں یہ خط آپ کو لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ آپ کے کلام کا بے حد مشتاق ہوں۔

ڈاکٹر وارث کرمانی

عبدالعزیز خالد نے اپنی دنیا الگ بسائی ہے ۔۔۔ جس میں امرؤ القیس کا رومان انگیز تفکر سموئے ہوئے ہے۔ ــــــ وہ شاعر جن کی فارسی ادب کے کلاسیکی خزانے تک رسائی ہے۔ آج بھی اظہار و ابلاغ کا حق ادا کر رہے ہیں ــــــ آپ ۔۔۔ عبدالعزیز خالد کو دیکھئے۔ فارسی طرز بیان اور عجمی لہجہ ان کے یہاں کتنا اچھا پرشکوہ انداز اختیار کرتا ہے۔

بشیر نیاز

عبدالعزیز خالد میں کمال یہ ہے۔ کہ مجلسی زندگی یا یہ اس کے پاسنگ بھی اذیت کوش ہیں۔ جس قدر یہ اپنی نظموں میں بن جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ (کیونکہ یہ آدمی نہایت پیارا ہے) کہ یہ شخص ادب کا سائیکلوپس تو نہیں۔ پھر الفاظ کی چٹانیں کیوں لڑھکائے جاتا ہے۔

فائزہ صدیقی

میری سب سے اچھی پسند عبدالعزیز خالد ہیں۔ میرے خیال میں ان کا علم بے پایاں ہے۔ ان کی زبان اور الفاظ کا مقابلہ نہیں

اقبال ساجد

عبدالعزیز خالد کے لئے ایک نظم

اہلِ نظر کے واسطے، علم کا باب ہو گیا
تُو نے لکھا جو ایک حرف، ایک کتاب ہو گیا

مُنہ سے نکل گئی جو بات، ایک حدیث ہو گئی
جس کو ادب کے ضِمن میں پڑھا ثواب ہو گیا

غارِ ادب میں تجھ پہ جب اُتری ہے شعر کی جو وحی
قلب میں نُور بھر گیا، ذہن گلاب ہو گیا

حفیظ صدیقی

عبدالعزیز خالد ۔ کچھ شخصی تاثرات

اگر میں یہ کہوں کہ میں عبدالعزیز خالد کو ربع صدی سے جانتا ہوں تو اس میں بہت بڑا مغالطہ ہوگا لیکن اگر میں کہوں کہ میں عبدالعزیز خالد کو یوں جانتا ہوں جیسے انہیں صدیوں سے جانتا ہوں تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کیونکہ مسلسل ظاہری اور قلبی تعلق کے سبب میں انہیں اتنے قریب سے جانتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں ان کی شخصیت کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو میرے مطالعہ و مشاہدہ کی حدود سے باہر ہو ۔۔۔۔ تاہم میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی مضمون میں ان کی شخصیت کے تمام تر گوشوں کو بے نقاب کر سکوں کہ یہ کام بذاتہ ایک مفصل کتاب کا متقاضی ہے۔

عبدالعزیز خالد کی ذات میں ایک خاص نوع کی کشش اور اپنائیت ہے جس کے سبب ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں جب وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ والہانہ طریقے سے اپنے کسی ملنے والے کو خوش آمدید کہتے ہیں تو وہ ان کا سدا کے لئے گرویدہ بن جاتا ہے بشرطیکہ اس کے ذہن میں خاص قسم کے تعصبات پہلے سے موجود نہ ہوں اور وہ ان تعصبات کو گلے لگائے رکھنے پر مُصر نہ ہو۔ خود میں نے کئی سال قبل جب ان سے پہلی ملاقات کی تھی تو قلبی طور پر ان کے اتنا ہی قریب ہوگیا تھا جتنا آج ہوں اور یہ بات کسی کسی کے ہاں ملتی ہے ورنہ ہم بالعموم آہستہ آہستہ دوسروں کے قریب ہوتے ہیں اور ذہنی رشتے بہت دیر سے استوار ہوتے ہیں۔ یہی تجربہ مجھے کئی دوسرے دوستوں کو خالد سے ملا کر بھی ہوا ہے اور انہوں نے بھی ایک بار مل کر ہمیشہ کے لئے انہیں سمجھ لیا ہے اور ایک گہرے ذہنی رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں ۔۔۔۔ یہ صفت خاص خدا تعالےٰ کی دین ہے اور بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔

خالد سے مل کے جہاں وہ قدرتی حظ حاصل ہوتا ہے جو سچے اور مخلص لوگوں سے مل کے ہوتا ہے، وہاں ان کی صحبت میں انسان کا دائرہ علم بھی وسیع ہوتا ہے۔ لاتعداد ملاقاتوں کے دوران میں نے ہر بار ان سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے چاہے اس کا تعلق علم، زبان، ادب، فلسفے، مذہب، تاریخ یا سیاست سے ہو یا روزمرہ زندگی اور اس کے معمولات سے ہو ۔۔۔۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ ان سے ملیں اور کچھ حاصل کئے بغیر ہی چلے آئیں، سوائے ایسی صورتوں کے، کہ بوجوہ کوئی شخص سیکھنے کی احتیاج ہی نہ رکھتا ہو ۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے کچھ وقت تک ان سے نہ مل سکنے کے بعد ان کے مخلص ملنے والے بجا طور پر ایک طرح کا خلا سا بھی محسوس کرنے لگتے ہیں اور یہ خلا کشاں کشاں ان سے ملاقات کے لئے لے جاتا ہے۔

خالد بہت سچے اور صاف دل کے مالک ہیں اور دورانِ گفتگو کھل کر بات کرنے کے قائل ہیں۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کے بالکل قائل نہیں تاہم خلاف طبع بات سن کر بھی وہ درشت لہجہ اختیار نہیں کریں گے جو ان کی دلآویز اور پرکشش شخصیت سے ویسے بھی متصادم ہے وہ دوسروں کی بات سے اختلاف کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں اور مخاطب کی پسند آنے والی بات کا کھل کر اعتراف کرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ کسی ایسی بات میں اپنی ہاں نہیں ملائیں گے جو انہیں گوارا نہ ہو اور کسی ایسی بات پر چپ نہیں سادھیں گے جو انہیں پسند نہ ہو بلکہ دو میں بچے تلے الفاظ میں اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار ضرور کریں گے اور یہ ان کی صاف گوئی کی روشن دلیل ہے۔ وہ اپنا نقطۂ نظر دوسرے پر مسلط

کرنے کی کبھی کوشش نہیں کریں گے شواہد اور دلائل کے ساتھ بات کریں گے تاکہ سننے والا از خود اس کی صحت کا قائل ہو، نہ کہ کسی جبر یا روایتی احترام کے جذبے سے مجبور ہو کر — دوسرے کی بات اگر بحث کے بعد وزنی ثابت ہو تو وہ اس کی کھل کر ہم نوائی کریں گے اور اپنی بات پر اصرار نہیں کریں گے — اور — اس ہم نوائی کے دوران کوئی احساسِ کمتری محسوس نہیں کریں گے، بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے کو اپنا ہم نوا بنا کر وہ کوئی احساسِ برتری محسوس نہیں کرتے۔

ان کے چہرے پر مخصوص قسم کی دلآویز مسکراہٹ تو ہر آن دیکھی جا سکتی ہے مگر وہ کھوکھلے قہقہے ان کی صحبت میں سننے میں نہیں آسکتے جو کھوکھلی شخصیتوں ہی کا خاصا ہیں اور کھوکھلے افسروں اور نو دولتیوں نے جسے فراوانی کے ساتھ ہمارے معاشرے میں عام کیا ہے — ان کی باتیں اتنی امید افزا ہوتی ہیں کہ سننے والے کے دل کا غبار اُتر جاتا ہے اور طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے۔ میں خود کئی بار جب کسی سبب سے بھی پریشان ہوتا ہوں تو سو کام چھوڑ کر خالد کے ہاں چلا جاتا ہوں اور جب ان سے کھل کر باتیں ہوتی ہیں تو طبیعت ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے اور دل پر سے ایک بوجھ اترتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ایک بڑا تحفظ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ کی کسی بات کو کسی دوسری جگہ بیان نہیں کریں گے تاوقتیکہ آپ نے وہی بات کسی دوسری جگہ کرنے کے لئے خود سے نہ کہا ہو۔ ایسی صورت میں بھی وہ صرف اتنی ہی بات کریں گے جتنی ضروری ہوگی اور اس میں ان کا بنیادی لہجہ آپ کے ساتھ ہمدردانہ ہوگا جو کسی بھی مخلص اور رازدار دوست کے لئے ضروری ہے۔

دورانِ گفتگو آپ محسوس کریں گے کہ وہ بلاوجہ بدیشی حوالے نہیں دیں گے اور دوسری زبانوں پر عبور کے باوجود کسی دوسری زبان میں بات نہیں کریں گے۔ بسا اوقات کچھ ملنے والے انگریزی یا انگریزی آمیز اردو یا پنجابی میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو تھوڑی ہی دیر بعد انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ یہ شخص نہ تو ان لہجوں سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں پسند کرتا ہے چنانچہ لوگ از خود صحیح اندازِ بیان پر اُتر آتے ہیں۔

ان کے ساتھ ملاقاتوں کے بعد آپ ان کی گفتگو کے بارے میں ایک اور بات بھی محسوس کریں گے کہ وہ چھوٹے چھوٹے غیر اہم موضوعات پر بات نہیں کرتے اور ان چھوٹے چھوٹے غیر اہم موضوعات میں محکمانہ ترقیاں، باہمی رنجشیں، مخالفتیں، حاسدانہ باتیں سب شامل ہیں، حالانکہ آج کی بے تکلف صحبتوں میں زیادہ تر یہی باتیں موضوعِ سخن ہوتی ہیں۔

خالد ایک حساس اور دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں اور اپنے ملنے والوں کے دکھوں کو ذاتی سمجھ کر ان کے بارے میں سوچتے اور امکانی حد تک ان کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں — اور — یہی بات جو ان کا بہت بڑا ذاتی وصف ہے بسا اوقات دوسروں کو بدگمان بھی کرتا ہے مگر وہ لوگ جو ان کے مزاج کو سمجھتے ہیں، وہ ان کے بارے میں کبھی بدگمان نہیں ہو سکتے۔ میں نے جہاں انہیں اپنے دوستوں اور ملنے والوں کے بارے میں متفکرانہ لہجے میں باتیں کرتے اور ان کے لئے سوچتے دیکھا ہے، وہاں بے شمار دوستوں کو ان کے رویّے سے غیر مطمئن بھی پایا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ — ہوتا یوں ہے کہ وہ جس اہم حیثیت کے مالک ہیں اس کی موجودگی میں لوگوں کی توقعات بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور وہ ان کی Limitations اور اپنے کچھ اصولوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ خالد کسی کے لئے جو کچھ ان کے دائرہ اختیار اور احاطۂ اخلاق میں رہتے ہوئے ممکن ہو، وہ تو ضرور کریں گے اور بسا اوقات بغیر احساس دلائے ہی کر دیں گے مگر جہاں بات ان کے دائرۂ اختیار سے یا ان کے احاطۂ اخلاق سے باہر نکلتی ہو، وہاں وہ خود کو روک لیں گے اور آگے نہیں بڑھیں گے — اور — یہ حدِ فاصل جسے وہ Line of Honour سمجھتے ہیں بعض ایسے دوستوں کو ان سے بدگمان کر دیتی ہے جو دراصل ان کے مزاج سے واقف نہیں ہوتے اور ان سے بعض حدود سے زیادہ تعاون کے طلب گار ہوتے ہیں

میں یہاں بے شمار مثالیں دے سکتا ہوں، مگر پھر بات خالد سے گزر کے دوسرے لوگوں تک پہنچ جاتی ہے اور کئی ناگفتنی باتیں درمیان میں آ جانے کا اندیشہ ہے۔

خالد کے مزاج میں خاص طرح کے رکھ رکھاؤ کی خوشگوار کیفیات ملتی ہیں اور یہ رکھ رکھاؤ کمال کی بے تکلفی کے باوجود مناسب حد تک قائم رہتا ہے اور ان کی گفتگو اور حرکات و سکنات میں ان کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ آداب زندگی سے بہت واقف اور عملی زندگی میں بڑے محتاط انسان ہیں اور اس احتیاط پسندی نے، کہ ان جیسے بلند آدرش رکھنے والے لوگوں کے لئے اور بھی ضروری ہے، ان کی شخصیت کے وقار کو اور بھی بلند کر رکھا ہے مگر اس بلندیٔ وقار کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بڑی دلپسند طرز کی انکساری بھی ملتی ہے۔ یہ انکساری علم کے معاملے میں بھی ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ بے کراں ہے مگر اس کے باوجود ایک عالمانہ منکسر مزاجی سے کام لیتے ہیں اور اپنے علم پر نہ تو اتراتے ہیں اور نہ ہی بے سبب حوالے دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اسی انکساری نے انہیں ایسے عہد میں ایک قدآور عالم بنا دیا ہے جب تعلیم عام ہونے کے باوجود پڑھے لکھے لوگوں کا شدید ترین قحط ہے اور ایک ایسے زمانے میں ایک قدآور انسان بنا دیا ہے جب ہر طرف سخت ترین قحط الرجال ہے۔

خالد بہت مردم شناس آدمی ہیں اور بخوبی سمجھتے ہیں کہ کوئی انہیں کیا سمجھتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کون ان کا کتنا احترام کرتا ہے اور کون ان سے کتنی محبت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ بھی مشفقانہ ہے جو ان کے سامنے قصیدے پڑھتے اور بعد میں ان کی ذات اور فن کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں۔ وہ ان کی شخصیتوں کے اس پہلو سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود ان سے اچھی طرح ملیں گے اور بوقتِ ضرورت ان کے لئے جو ممکن ہو گا کر بھی دیں گے — کہ ان کا ظرف انہیں یہی سکھاتا ہے۔

ایک مضمون میں خالد کی شخصیت کے سبھی گوشے بے نقاب کرنا ممکن ہی نہیں۔ میں ذاتی طور پر باوقار، پرکشش اور متوازن طبیعت کے عبدالعزیز خالد کو جو بے اصولی اور قول و فعل کے تضادات کے اس مادی دور میں منفرد راہ پر گامزن ہے، اس عہد کا عظیم انسان سمجھتا ہوں اور اسے امید اور روشنی کا ایک بلند مینار سمجھتا ہوں جس کے سائے میں دلوں کی سیاہی ڈھلتی ہے اور مایوسی سے پیدا ہونے والا اضمحلال امید کی توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے ؎

مقبولِ جہانگیر

ایک کریم انسان، ایک عظیم شاعر

اب قطعی یاد نہیں آتا کہ پہلے عبدالعزیز خالد کا نام کہاں سُنا اور اُن کا کلام کس جگہ دیکھا تھا لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ ایک عجیب سرور انگیز تحیّر نے اُس وقت احاطہ کر لیا تھا جیسے خلافِ توقع کوئی نئی چیز، جو انوکھی بھی ہو اور حسین بھی ہو اور پُر اسرار بھی، اچانک سامنے آ جاتی ہے۔ خالد کا کلام دیکھ کر دل و دماغ پر سخت ہیبت طاری ہوئی اور پہلی بات جو ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ نہایت عالم اور فاضل شاعر ہے یہ۔ کوئی طویل نظم تھی اُن کی جس میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، سریانی، کلدانی، عبرانی اور معلوم کون کون سی زبانوں کے الفاظ نگینوں کی طرح جڑے گئے تھے۔ ایسے الفاظ جو پہلے کسی انسان کے کلام میں دیکھے نہ سنے اور نہ لغت و انشار کی کتابوں میں نظر آئے۔ حتیٰ کہ انیس، اقبال اور جوش کے کلام میں بھی ایسے الفاظ تھے۔ نہ ایسی تراکیب۔ پھر جا بجا قرآنی آیات، انجیل، تورات اور زبور کی روایات اور قدیم یونان، چین، مصر، شام، عراق اور ہند کی اَن گنت تلمیحات ایک بے علم و بے ہنر بلکہ بے زبان شخص کو بہبوت و ساکت کر دینے کے لئے خالد صاحب کا کلام طلسم کا کام کرتا ہے۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے ہماری گفتگو کا ڈھب جُدا ہے

یُوں بھی اپنا مبلغ علم اُس وقت قابلِ اعتماد تھا نہ اب ہے تاہم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عبدالعزیز خالد کی نظم اور اس کا شان و شکوہ دیکھ کر اپنا جہل، اپنے علم کے مقابلے میں بہت بلند و بالا محسوس ہونے لگا۔ سرور انگیز تحیّر دراصل وہ احساسِ شکست تھا جس سے کم از کم اپنا وجدان کبھی آشنا ہی نہ ہوا تھا۔ چنانچہ گربہ کشتن روزِ اوّل کے مصداق عبدالعزیز خالد کے علم و فضل کا رعب پہلے ہی دن بیٹھا اور آج تک بیٹھا ہوا ہے۔ اِس حادثہ جانکاہ کے بعد آہستہ آہستہ اُن کا کلام مختلف جریدوں اور اخباروں میں نظر سے گزرتا رہا۔ پھر اُن کے مجموعہ ہائے کلام کی چند دلفریب جلدیں بھی لائبریری میں نظر نواز ہوئیں۔ نہایت ادب و احترام سے، ہجے کر کر کے ان کا کلام پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی، کہیں علم نے ساتھ دیا، کہیں وہ بھی ہانپ گیا۔ کہیں بات سمجھ میں آئی تو جی خوش ہو گیا۔ نہ سمجھ میں آئی تو اپنی جہالت پر تاؤ آیا اور کبھی کبھی خالد صاحب پر بھی کہ یہ ایسی اَدق زبان، بلکہ زبانوں میں شعر کیوں کہتے ہیں۔ بار بار اسی تاؤ کے عالم میں جی چاہتا ہے کہ مختلف زبانوں کی لغات خرید کر قریب رکھی جائیں تاکہ کچھ تو پلے پڑے۔ اسی شوق میں اکثر و بیشتر، لغات کی ورق گردانی بھی کی، مگر بے سود۔ اسکول کے زمانے میں پڑھی ہوئی عربی فارسی بھلا کیا کام آتی۔

پھر معلوم ہوا کہ خالد صاحب بڑے سرکاری افسر بھی ہیں۔ لیجئے یک نہ شد دو شد۔ شاعری کی ہیبت ہی کیا کم تھی کہ رہی سہی کسر اِس افسری نے پوری کر دی۔ اس مملکت خداداد میں سرکاری افسروں اور وہ بھی بڑے افسروں کی رعونت اور فرعونی کا جو حال ہے، وہ سب پر روشن ہے۔ اگرچہ اس میدان میں شرافت اور انسانیت کے نمونے بھی ہیں، مگر خال خال۔ خالد کی شخصیت اور شاعری پر مشاہیر علم و فن کی آرا اور مضامین بھی پہنچنے لگے تو ہیبت پر ہیبت کی تہ چڑھتی چلی گئی۔ ناگہاں شاہد احمد دہلوی کا مضمون پڑھنے میں آیا۔ مرحوم ایسے نرے کھرے اور ایسے غیرے

برتلم اٹھاتے، انہیں اپنے برابر والوں یا بڑوں سے بحث اور زچ کرنے میں مزا آتا تھا۔ کوئی تو بات ہوگی خالد میں کہ شاہد جیسا بد دماغ ادیب بھی خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہوا۔ اب ہیبت کے ساتھ ساتھ خالد کی عظمت بھی دل میں اترنے لگی۔ ہیبت کا تعلق دماغ سے تھا، عظمت کا دل سے ــــــــــــ

سنہ ۶۷ء میں شاہد صاحب عالم جاودانی کی طرف منتقل ہوئے۔ مرحوم کے کام اور نام کا نقش مدتوں سے دل پر بیٹھا ہوا تھا اور عجب اتفاق کہ زندگی میں ان سے بالمشافہ ملاقات کی نوبت ایک مرتبہ بھی آنے نہ پائی۔ مراسلت بارہا رہی کئی مرتبہ مرحوم لاہور آئے۔ ہمیشہ اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید اشرف صبوحی دہلوی کے مکان پر قیام کرتے۔ ایسا بھی ہوا کہ ادھر وہ مجھ سے ملنے کے لئے نکلتے ادھر میں ان کی تلاش میں گھر سے نکلتا لیکن آمنا سامنا نہ ہوتا۔ قدرت کو منظور نہ تھا کہ ملاقات ہو۔ انتقال سے چند روز پہلے میں نے انہیں کراچی ٹیلی فون کیا۔ ان دنوں وہ علیل تھے لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رخصت ہونے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ میں نے انہیں غالب کا شعر سنایا:۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

مرحوم ہنس پڑے اور فرمایا بھائی، میں تو بستر مرگ پر پڑا ہوں، اب شاید لاہور جانا ممکن نہ ہو۔ نہ جانے کس وقت اللہ میاں کے یہاں سے بلاوا آجائے۔ بہت جی چاہتا ہے کہ مروں تو لاہور کی مٹی نصیب ہو، لیکن قدرت کو منظور نہیں ہے۔ آپ سے ملاقات کو جی چاہتا ہے، ہو سکے تو کراچی آیئے۔ میں نے وعدہ کر لیا، مگر تیسرے چوتھے دن ہی ان کی سنا؟نی آگئی۔ رہے نام اللہ کا، اب خدا نے چاہا تو قیامت میں ملیں گے۔

شاہد صاحب کی وفات کے بعد خیال آیا کہ اور کچھ نہ سہی، ایک کتاب ہی ان کی یاد میں مرتب کر لی جائے جس میں ان کی من موہنی شخصیت بھی سمٹ آئے اور چالیس برس تک اردو زبان و ادب کی خدمت کا جو بھاڑ انہوں نے جھونکا، اس کا ذکر بھی ہو جائے۔ فوراً اس خیال کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ سبھی اپنوں پرایوں نے تعاون کا یقین دلایا اور مضامین میں کوتاہی نہ کی۔ قبلہ حضرت ملا واحدی نے بھی شدید علالت کے باوجود مضمون بھیجا۔ جمیل جالبی صاحب کو میں نے لکھا کہ عبدالعزیز خالد کا پتہ بھجوایئے، ارادہ ہے ان سے ایک مضمون لکھوانے کا شاہد صاحب پر ــ جالبی صاحب نے ازراہ کرم خالد صاحب کا پتہ بھیجا، میں نے ڈرتے ڈرتے خط لکھا، جواب نہ آیا، دوسرا خط بھیجا، اس کا جواب بھی ندارد۔ یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ خالد صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے سرکاری افسر بھی تو ہیں۔ "یاد شاہد" چھپی تو میں نے ایک جلد خالد صاحب کے پتے پر کراچی بھجوائی۔ اس کی بھی رسید ندارد۔ اب اپنے آپ پر طیش آیا اور ان تمام لوگوں پر بھی جنہوں نے عبدالعزیز خالد کی شرافت، انسانیت اور اخلاص کے گن گائے تھے۔ دل و دماغ ان کی عظمت و ہیبت دونوں سے خالی ہو گئے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ سنہ ۶۹ء میں صدیقی العزیز حضرت نعیم صدیقی نے اپنے پرچے ماہنامہ "سیارہ" کا عبدالعزیز خالد نمبر تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ اس نمبر کو دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ یا اللہ، یہ عبدالعزیز خالد آدمی ہے یا جن۔ اس کرۂ ارضی کا باسی تو معلوم نہیں ہوتا، یا شاید گوئٹے کا مافوق الفطرت انسان ہے۔ اس خام عمر میں حد درجہ پختہ کلام کے سولہ سترہ مجموعے اور ہر مجموعہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر، تاریخی معلومات کے اعتبار سے گویا ایک بحر بیکراں، یورپ اور ایشیا کی زندہ و مردہ زبانوں کا عالم، یونانی مصری و ہندی صنمیات کا ماہر، قرآن اور حدیث اور دوسرے صحائف آسمانی۔ گہری نظر، طرز بیان، بے پناہ، بندش مضامین، واہ واہ مضمون آوری

مرحبا، صورت کشی، صد مرحبا، سیرت نگاری، سبحان اللہ۔ الفاظ و اصطلاحات کا ایک لشکرِ عظیم اس کے جلو میں۔ بے اختیار دبیر کا مصرعہ یاد آیا ع آتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج

پاک و ہند کے تقریباً سبھی نامور اہلِ قلم خالد کی خدمت میں خراج کا ہدیہ لیے حاضر ہیں۔ وہ بھی ہیں، جو کبھی خالد سے نہیں ملے اور وہ بھی ہیں، جو خالد سے بار بار ملے۔ ابوالاعلیٰ مودودی بھی ہیں اور جوش ملیح آبادی بھی۔ عبدالماجد دریا آبادی بھی ہیں اور غلام احمد پرویز بھی۔ احتشام الحق تھانوی بھی ہیں اور فیض احمد فیض بھی۔ عبدالرحمٰن چغتائی بھی ہیں اور حکیم محمد سعید معید دہلوی بھی۔ غلام رسول مہر بھی ہیں اور مفتی پاکستان محمد شفیع بھی۔ یہ سب یہاں شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ خالد کی شخصیت اور فن نے اس قدر متضاد و مخالف فن کاروں اور علمائے دین کو کیوں کر اپنی گرفت میں لیا ہوگا۔ یہاں ایک دلچسپ لطیفہ عرض کرتا چلوں۔

آٹھ دس مہینے ہوئے حضرت جوش ملیح آبادی اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے تھے۔ چمبہ ہاؤس میں قیام فرمایا۔ میں حاضر ہوا، جوش صاحب گفتار کے غازی ہیں۔ ذکر چھڑ گیا کچھ لوگوں کا۔ جوش صاحب اگرچہ انانیت کے نشے میں چور رہتے ہیں، تاہم اپنے معاصرین اور احباب میں سے اکثر کا دل سے احترام کرتے ہیں مثلاً سید ابوالخیر مودودی اور حضرت احسان دانش کا۔ میں نے پوچھا عبدالعزیز خالد کی شاعری کے بارے میں کیا ارشاد ہے! ہنس کر اپنے مخصوص انداز میں بولے: ہاں ہاں اچھے آدمی ہیں، اچھے آدمی ہیں۔ میں نے کہا جوش صاحب، اچھے تو وہ بلاشبہ ہیں، مگر ان کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے پھر وہی جواب دیا: ہاں صاحب ہاں، وہ بہت اچھے انسان ہیں، وہ بہت شریف آدمی ہیں۔

اب جو خالد میرا اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اس میں بھی جوش صاحب کی رائے خالد صاحب کے بارے میں یہی نکلی کہ ان کی ذات میں شاخِ گل کی لچک اور ان کے چہرے پر نجم سحر کی دمک پائی جاتی ہے۔ بڑے افسر ہونے کے باوجود ایک اچھے انسان ہیں، ایسے اچھے انسان کہ ان سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہی چیز ان کی غیر معمولی شرافت کی سب سے قوی برہان ہے ؎

مومن آیا ہے بزم میں تیری
صحبتِ آدمی مبارک ہو

جوش صاحب نے عبدالعزیز خالد کو اچھا اور شریف انسان مان لیا یہی کیا کم ہے، ورنہ شاعر تو جوش صاحب سمیت بڑے سے بڑا ہمارے معاشرے میں بھرا پڑا ہے، مگر انسان اور انسانیت عنقا۔ جگر مرحوم کس وقت یاد آ گئے ؎

ہر چند اس نظامِ دو عالم میں اے جگر!
انسان ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں

۱۹۶۰ء کے نصف میں اس راقم عاجز کو ایک ڈائجسٹ پرچے کی ادارت کا شرف حاصل ہوا۔ حالات سخت ابتر تھے، پرچے پر نزع کا عالم تھا اور اسے زندگی بخشنے کی ذمہ داری مجھ نااہل کو سونپی گئی۔ چنانچہ اپنی سی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ عملہ نہ ہونے کے برابر اور کام کا ایک کوہِ گراں۔ کبھی کبھی جی میں آتا کہ سب چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی راہ لوں۔ شب و روز سخت بے کیفی کے عالم میں گزر رہے تھے کہ یکایک ایک روز ارشاد احمد حقانی دفتر میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور تھے۔ سادہ کرتے پاجامے میں۔ لیکن اس سادگی میں بھی پرکاری نمایاں تھی۔ میں قیافہ شناسی کا مدعی تو نہیں، لیکن نگاہ پڑتے ہی دل نے کہا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے۔ کتابی چہرے پر صباحت، آنکھوں میں ذہانت کے علاوہ وہ چیز بھی جس کا ذکر سادجی ایرانی نے بڑے حسن سے کیا ہے ؎

زہر چشمے چوں بکارے دل نگارِ خود کند

بر ندارد چشم از تا زہر کارِ خود کند

کشادہ اور روشن پیشانی پر وہی نجم سحر کی سی دمک، ریش و بروت سے چہرہ بے نیاز، بینی اور لب و رخسار میں حسین و جمیل توازن بحیثیت مجموعی کچھ ایسا سراپا ۔ ابرو میں خم ہے، ترچھی نظر، زلف میں ہے بل

کیا کج ادائیاں ہیں مرے کج کلاہ میں

جناب ارشاد احمد حقانی علم و فضل اور سنجیدگی و شرافت کا ایک دلآویز مرقع ہیں۔ موصوف آج کل گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہیں۔ ایک زمانے میں جماعت اسلامی کے مرحوم و مغفور روزنامے "تسنیم" کے ایڈیٹر تھے۔ اس عاجز کو اسی زمانے میں ان سے نیاز حاصل ہوا بلکہ کچھ عرصہ ان کی ماتحتی میں کام کرنے اور بہت کچھ سیکھنے کا شرف بھی پایا۔ ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی کا ایک سالانہ اجتماع کراچی اور لاہور کے مابین ایک گمنام قصبے ماچھی گوٹھ میں ہوا تھا۔ اس اجتماع کے بعد کچھ ایسے لوگ جماعت اسلامی سے نظریاتی اختلاف کی بنا پر علیحدہ ہوئے جنہیں جماعت کی تنظیم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی جیسے مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم عبدالرحیم اشرف، سعید ملک، مصطفےٰ صادق، ڈاکٹر اسرار احمد وغیرہم۔ انہی میں جناب ارشاد احمد حقانی بھی تھے۔ یہ حضرات جماعت سے الگ کیوں ہوئے اس کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ موقع ملا تو کسی اور صحبت میں بیان کروں گا۔ مقصد تو ارشاد صاحب کا مختصر تعارف آپ سے کرانے کا تھا۔

مصافحے کی رسم ختم ہوتے ہی ارشاد صاحب کے ساتھی نے بے تکلفی سے کہا :۔

"میں عبدالعزیز خالد ہوں میرا تبادلہ لاہور ہو گیا ہے آج آپ سے ملنے چلا آیا۔ ہمارے آنے سے آپ کے کام میں کچھ ہرج تو نہیں ہوا۔ آپ کے مضامین اکثر پڑھتا رہتا ہوں"

لیجئے بدگمانیوں اور شکایتوں کا جو محل میں نے کئی برسوں میں کھڑا کیا تھا وہ خالد صاحب کے پہلے ہی حملے میں دھڑام سے نیچے آ رہا وہ آدھ پون گھنٹہ بیٹھے رہے اور جب گئے تو دل و دماغ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک بڑا سرکاری افسر اور اتنا با اخلاق، اتنا منکسر المزاج اتنا شریف اتنا وضعدار ایسی محبت والا۔ یا اللہ یہ خواب ہے یا بیداری یہ کوئی قلندر تھا یا کوئی پہنچا ہوا درویش۔ معلوم ہوا کہ خالد صاحب کو میرا کوئی خط نہیں ملا نہ کتاب ان تک پہنچی غالباً پتہ ہی صحیح نہ تھا۔ ورنہ وہ خطوں کا جواب دینے میں بڑے مستعد ہیں۔

پندرہ بیس دن بعد برادرم ضیا شاہد مدیر "کہانی" نے سہ پہر کی چائے پر طلب فرمایا، میں حاضر ہوا، پتہ چلا کہ خالد صاحب ان سے بھی ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے انہیں بڑوں کے یہاں حاضری دینے کا اتنا شوق نہیں جتنا اپنے سے، ہر طرح چھوٹوں سے ملنے کا اشتیاق رہتا ہے اور خالد صاحب کی بڑائی کا اصل سبب بھی ان کی یہی ادا ہے۔ تھوڑی دیر میں مولانا کوثر نیازی تشریف لے آئے۔ مولانا سے ملاقات مدت کے بعد ہوئی تھی۔ اُن کی سیاسی سرگرمیاں اس قدر تیز تھیں کہ میل ملاقات کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ یوں اُن سے بارہ چودہ برس کی دعا سلام تھی اور مولانا جب بھی ملتے خلوص، محبت، گرمجوشی اور ہمدردی کا وہی اظہار ہوتا جو دوستوں کے لئے ان کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے ۔۔ خالد صاحب کا ذکر ہوا، مولانا ان کے بے حد مداح نکلے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ یکایک عبدالعزیز خالد بھی آ گئے۔ ان کا آنا اس قدر غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لئے ہم مبہوت ہو گئے۔ پھر مصافحے بھی ہوئے اور معانقے بھی ۔۔ دلچسپ بات یہ کہ اس عاجز کو انہوں نے نہیں پہچانا۔ مولانا نے میرا نام لے کر خالد صاحب سے کہا کہ سنا ہے آپ اُن سے بھی ملنے گئے تھے اور فلاں فلاں بات ماننے پر زور دیا تھا۔ یہ سن کر خالد صاحب نے کہا بے شک میں اُن سے ملنے گیا تھا لیکن جس بات کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ بات ہرگز ان سے نہیں ہوئی۔ آپ

تک غلط اطلاع پہنچی ہے۔ مولانا نے کہا مجھ سے خود انہوں نے کہا ہے کہ یہ بات آپ نے اُن سے کہی۔ خالد صاحب بے حد سنجیدہ ہو گئے اور بولے: انہیں میرے سامنے لائیے۔ اگر وہ کہہ دیں کہ یہ بات میں نے اُن سے کہی تو تسلیم کر لوں گا۔ یہ سُن کر ہم تینوں ہنس پڑے۔ خالد صاحب حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ آخر مولانا نے کہا: آئیے ہم آپ کا تعارف معقول جہانگیر سے کراتے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا، مَیں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ خالد صاحب نے اب مجھے پہچانا اور نہ پہچاننے پر جس معصومیت سے نادم ہوئے، وہ انداز مجھے نہیں بھولتا۔

اس کے بعد خالد صاحب سے دوستی بڑھتی چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ محبت، شفقت سراپا مجسم ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی میری فرمائش پر اور کبھی خود بے تکلفی سے وہ اپنی کوئی نظم اشاعت کے لئے عطا کرتے۔ اس کی کتابت اور پھر تصحیح میں کاتب، مصحح اور مدیر تینوں کی جان پر بن جاتی۔ پہلی نظم چھپ گئی تو خالد صاحب نے فون کیا اور یہ کہہ کر حوصلہ بڑھایا کہ پہلا موقع ہے اور آپ کا پہلا جریدہ ہے جسے پورے پاکستان میں میری نظم شروع سے آخر تک صحیح چھاپنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔

خالد صاحب اپنی ہی دنیا کے آدمی ہیں۔ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے۔ کئی دانشوروں نے انہیں سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ شاعری چھوڑ دیں اور نثر کی طرف متوجہ ہوں، لیکن جس فنکار نے شاعری کو اپنی زندگی بنا لیا ہو، وہ یہ مشورہ کیسے مان لے گا۔ بقول میر تقی میرؔ

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

یہ الگ بحث ہے کہ وہ عوام کے نہیں خواص کے شاعر ہیں بلکہ خواص الخواص کے — اسی طرح وہ مشاعروں کے شاعر بھی ہرگز نہیں ہیں۔ اب وہ احباب کے اصرار پر مشاعروں میں شریک ہونے لگے ہیں، لیکن مشاعروں کے کتنے آدمی ہیں، جو کلام خالد سمجھنے کا شعور رکھتے ہوں؟ یہی سبب ہے کہ ان کا بہترین کلام سامعین کے سروں پر سے گزر جاتا ہے۔ ان کا ہر موضوع پر مطالعہ بے پناہ ہے اگر انہیں علم کا سمندر اور خاصا گہرا سمندر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ سرکاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر شعر و سخن اور مطالعے کے لئے مستعد رہنا ان کے اعلیٰ ذہنی قویٰ کی نشاندہی کرتا ہے۔ انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے نے ان کے اندر رعونت اور شخصی تصنع پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے شعبے میں نہایت ایماندار افسر کی حیثیت سے معروف ہیں اور ان سے یہ توقع ہی بیکار ہے کہ وہ کسی ناجائز کام کی حوصلہ افزائی یا سرپرستی کریں گے۔ ایک زمانے میں انہوں نے پاکستان کے کسی گورنر جنرل کو ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم پر نوٹس بھجوا دیا تھا۔ یوں وہ دستوں کے دوست ہیں اور ہر جائز مرحلے پر ان کا تعاون آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی غریب دوست ملاقات کے لئے ان کے دفتر چلا آئے تو بڑے تپاک سے ملیں گے۔ اس کا پورا احترام کریں گے اور اسے احساس کمتری میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھیں گے۔ وہ کسی نام نہاد بڑے آدمی کو اپنے غریب دوست پر ہرگز ترجیح نہ دیں گے۔ وہ زندگی میں محنت، استقلال، دیانت اور جد و جہد کے زبردست قائل ہیں اور یہ خوبیاں جس شخص میں پائی جائیں خالد صاحب، جی جان سے اس کے دوست ہیں۔ انہوں نے دیت نامی لیڈر ہوچی منہ کی نظموں کا ترجمہ "پرواز عقاب" کے عنوان سے کیا ہے اور انہی عظیم صفات کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے جو اس بڑے لیڈر کی شخصیت کا جزوِ اعظم تھیں۔ وہ بحث کرتے ہیں، اور مخاطب کو دلائل کی معقولیت سے قائل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے علم کا رعب نہیں جماتے اور نہ گرج چمک کے ذریعے دوسرے کو مرعوب و پست کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ ایک بار ان سے اس مسئلے پر بحث ہوئی کہ عشق کیا ہے اور فسق کیا ہے۔

میرا کہنا یہ تھا کہ عشق تو ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے اور ایک ہی سے ہوتا ہے، بار بار ہونے والا عشق نہیں فسق ہے۔ انہوں نے اس مفروضے کو تسلیم نہیں کیا اور دلائل سے ثابت کر دیا کہ عشق کئی بار ہو سکتا ہے۔

میں نے کبھی کبھی خالد کے چہرے کی سنجیدگی بلکہ کسی قدر افسردگی سے یہ جانا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس معاشرے میں تن تنہا پاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کی بات سمجھنے والے اور اس پر سر دھننے والے یا عمل کرنے والے خال خال ہیں۔ ایک عبقری کو ہمیشہ اس تکلیف دہ احساس کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں، کوئی اس کا ہم سخن اور کوئی اس کا رازداں نہیں ہے۔ حالی نے کہا تھا ؂

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

عبد العزیز خالد بھی اسی کرب کا شکار ہے ؂

حال کس سے بیاں کروں گا؟ محرمِ راز ہی نہیں ملتا!

عاصی کرنالی

عبدالعزیز خالد کا اُردو بازار

شیخ سعدی نے کہا، ہاں میاں تاجر کوئی سناؤنی سناؤ ــــــــــ میاں تاجر نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا ــــ یہ سامان ترکستان جائے گا، وہ مال ہندوستان۔ میں اب اسکندریہ جاؤں گا، چین اور روم اور حلب اور یمن اور فارس کا ارادہ بھی ہے۔ گندھک اور چینی برتن اور رومی دُنیا اور ہندی لولا اور حلبی آئینہ اور یمنی چادریں بیچ باوج کر ایک بہت بڑی دوکان کھول لوں گا۔ یا شیخ اب آپ کچھ سنائیں۔ شیخ سعدی آنکھوں میں آنسو لاکر میاں تاجر کو قناعت کا درس دینے لگے ــــ وہ تاجر درسِ قناعت کی تاب نہ لا سکا۔ باتوں بیچ ادھ بیچ میں بھاگا اور اس نے ملکِ پاکستان میں آکر اردو بازار کھول لیا۔ پھر اس تاجر نے کہ اس کا موجودہ نام عبدالعزیز خالد ہے، مجھے سناؤنی سُنائی، اور میں نے اسے حرص کا درس دیا کہ اس حرص میں اس کی زندگی کا اور مقبولیت کا راز پوشیدہ ہے۔ درسِ حرص کا آخری فقرہ یہ تھا۔

میاں تاجر! دکان پر جم کر بیٹھنا تو چھوڑیئے، اب تم بال پر تل، بھیر و بنگاہ پھر سے درست کرو اور اپنے اٹھارہ ہزار چالیسویں سفر پر نکل کھڑے ہو، تاکہ اردو بازار میں ایک نئی دکان کا اضافہ ہو۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی، اس نے کہا یا شیخ! تم میرے اردو بازار کی سیر کرو۔ میں چلا!

میرے قدم اردو بازار کی طرف ہوئے، ایک محرابی دروازے سے داخل ہوں تو اُردو بازار شروع ہو جاتا ہے، دروازے کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ اردو بازار ــــــــ ادبی عجائبات کا مرکز۔ دروازے سے اندر قدم رکھا، تو کشادہ بازار، فراخ سڑکیں، تاحدِ نظر دکانیں، دکانوں کی عمارتیں پر شکوہ و رفیع، ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا، کہ ہر دکان مالِ تجارت سے سجی ہوئی، بازار سیدھا لیکن بغلی گلیاں ہر طرف، گلیاں پیچ دار، پُراسرار کچ مچ وہاں سے بھی دکانیں جھانکتی ہوئی، اور اسی طرح مال و اسباب سے بھری ہوئی ــــــــ پھر ایک نظر میں اندازہ ہوا، کہ سیدھے بازار اور گلیوں کی دکانوں پہ کاؤنٹر بوائز اور کاؤنٹر گرلز موجود ــــــــ لیکن ہر طرف گاہک بہت کم، شاید یہ وجہ ہو، کہ میں بھری دوپہر چل پڑا تھا۔ شاید یہ بازار شام کو بھرتا ہو، اچھا تو کوئی بات نہیں، کسی دن شام کو آکر دیکھیں گے، آؤ اب ایک طرف چل پڑیں، چند دکانوں کا حال دیکھ لیں۔ یہ پہلی دکان ہے ــــــــ

بس میاں عاصی! یوں ٹھیک نہیں، پہلے ہر دکان کی پیشانی پڑھ لیں، پھر مطلب کی دکان میں قدم رکھیں گے، اور حسبِ ذوق خریداری کریں گے۔ اچھا یہ تو آسانی پیدا ہو گئی، مختلف زبانوں کی مناسبت سے نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ یعنی جس دکان میں جس زبان

کے علوم و ادبیات کا ذخیرہ موجود — وہاں اس زبان کا نام آویزاں۔ یہ لکھا ہے۔ عربیات اور یہ عبرانیات، یہ ادھر یونانیات یہ برابر میں علوم ہندی، وہ ساتھ میں ادبیاتِ سنسکرت یہ دائیں طرف ذخائرِ فارسی، وہ بالمقابل خزائنِ انگریزی، نظروں کے عین سامنے اردو دنیات نظر لوٹ کر آئی تو خزائنِ انگریزی کی دکان پر لمحہ بھر کو رکی، اس کی ساتھ کی دکانوں پہ لمحہ بھر کو رکی، اس کے ساتھ کی دکانوں پہ فرانسیسی، جرمن اور ایک دو اور یورپین زبانوں کے نام لکھے تھے، جو دور سے دھندلے نظر آتے۔ ہم نے اللہ کا نام لیا اور دکان یونانیات میں داخل ہو گئے۔ الماریوں اور طاقوں اور شیلفوں میں کتابیں سلیقے سے چُنی تھیں، ہر شیلف، ہر شعبے اور ہر خانے پر تعارفی چِٹ لگی تھی۔ چند چِٹوں پر یہ الفاظ لکھے تھے، دیومالائی قصہ جات، صنمیات، تلمیحات، تشبیہات، استعارات، تمثیلات، تجریات، کشفیات، سیفوئیات، پرومے تھیس، زیوس، اتھینا، پنڈورا ہلیری، اس دکان کے اندر سے ایک راستہ دوسری دکان میں جاتا تھا۔ وہاں دو موٹے موٹے الفاظ ہماری نظر پڑے، عہد نامہ عتیق، عہد نامہ جدید — ان جلی سرخیوں کے ساتھ ساتھ خفی سرخیوں میں بے شمار تمثیلی نام تھے۔ اور ان گنت کردار تھے اور یہ مالِ تجارت فرش سے چھت تک پٹا پڑا تھا، ہم بقدرِ ذوق ان موتیوں سے نظروں کو خیرہ کرتے اور بقدرِ استطاعت کچھ مال خریدتے جاتے تھے ——— قدم عربیات کی جانب چل پڑے۔ دکان میں داخل ہوتے ہی تھے، کہ جیسے عرفان و آگہی کے راستے کی ساری دیواریں گر گئیں اور روشنی جھلمل جھلمل کر کے دیدہ و دل میں جذب ہوتی چلی گئی، وہاں ایک صاحب صورت آشنا مل گئے۔ ہم نے کہا، حبیبی! یہ اتنا مال اس تاجرِ اعظم نے کہاں سے مارا ہے، وہ بولے تاجرِ اعظم نہ کہو،

سیّاح دیار دیار کہو

خالد کی زندگی سیاحت میں گزری باقی بھی انشاء اللہ سیاحت میں گزرے گی۔ میں نے پوچھا، حبیبی خالد کا کوئی تازہ سفر، وہ بولے یا اخی الباکستانی! سیاحِ اعظم ابھی ابھی ویت نام سے آئے ہیں، اور وہاں کا سارا خزانہ زنبیل میں لاد لائے ہیں۔ میں نے کہا: یا حبیبی یا رفیقی! یاد آیا۔ وہ پروازِ عقاب ——— وہ عربی دکاندار فخر سے متبسم ہوا اور گونجیلے لہجے میں بولا ——— حاتم طائی کے سات سفر اور رستم کے ہفت خوان مشہور ہیں، لیکن اس سیّاح کی سیاحتوں کا حساب رکھنا مشکل ہے، پھر جہاں گیا، اتنا خزانہ لایا کہ چار سو اونٹوں پر تو اس خزانے کی کنجیاں آتی تھیں ——— یا اخی الباکستانی! ہمارا سیاح کبھی ماضی کے نہاں خانوں میں جا پہنچتا ہے اور وہاں کے مدفون اسرار و عجائبات سے گمنامی کے پردے ہٹا کر انہیں اپنی زنبیل میں بھر لاتا ہے اور دکان پر لا سجاتا ہے۔ ساری مصریات، عجمیات، یونانی میتھ، ہندی دیومالا ——— سب حنوط شدہ لاشوں، بتوں اور مجسموں کو اس نے حیاتِ نو دے کر اردو بازار میں لا سجایا ہے۔

——— میں نے کہا کہ یا اخی العربی! یہ سیاح صرف ماضی کے مقابر میں جاتا ہے یا ——— ؟ مقابر کے لفظ پر وہ عربی آزردہ ہوا، اور اُس نے کہا۔ یا اخی! کیا ماضی کوئی مقبرہ ہے، مقبرہ تو ہمارا جہل ہے، ہماری غفلت، ورنہ ماضی کی آغوش میں تو ثقافت کے تمام مظاہر، تہذیب کے تمام ذخائر ——— انسانی فکر و ذہن کے تمام خزائن محفوظ ہیں، ہمارا سیاحِ اعظم ہمیں ہماری تاریخ، بلکہ ہماری اصل سے آگاہ کرتا ہے، ہماری روایت کے نقوش کو محفوظ رکھتا ہے، تاکہ ان نشاناتِ قدم پر چل کر ہم سفرِ ارتقا جاری رکھ سکیں اور اے باکستانی! اس سیاح کا سفر ماضی ہی کی وادیوں میں نہیں ہے بلکہ عصرِ جدید کی رہگزاریں اور مستقبل کے نادیدہ راستے بھی اس کے آتشیں رفتار قدموں سے پامال ہیں ——— وہ عربی اپنی گفتگو کے خنجر سے میرے سینے کو چاک کر کے میرے قلب کو باہر نکال کر آپ

حیات سے دھوکر، آگہی کے نور سے منور کر رہا تھا ——— میں نے کہا مجھے منحمنا آور فارقلیط دے دو، اس نے یہ کتابیں نکال کر میرے حوالے کیں، مجھ سے معانقہ کیا اور مجھے وداع کہی۔

اُردو بازار کو کہاں تک دیکھتا۔ کس کس دکان کی پڑتال کرتا، اس سیر عجائبات کو عمرِ خضر چاہیئے۔ لے لو یہ سامنے خالدیات لکھا ہے۔ یہ کیا؟ یہ تو سارا بازار ہی خالدیات ہے، پھر تخصیص کیا معنی۔ معلوم ہوا، اس دکان میں نقد و نظر کی کتابیں ہیں۔ خالد پر قلم اٹھانے والے نقادوں کی، تحریروں کا مال اسباب، یہاں پھر تعارفی چٹھوں کا انبار، اسلوب، عروضیات، لسانی تشکیل، ادبی اجتہادات، رومانیات، افادیت، وسعت علمی، بالغ نظری، تصرفات، ایجادات، تجربیت، انفرادیت جانے کیا کیا ——— میں نے ہیبت زدہ اور سحر زدہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھا اور مراجعت کی ٹھانی، واپسی میں جی چاہا معلوم کروں سیاح ابھی موجود ہے کہ جا چکا مہتمم نے کہا، وہ تو جا چکے، میں نے استفسار کیا، کہاں؟ مہتمم نے کہا، نادیدہ اور ناشنیدہ منزلوں کی طرف، ایسے راستوں میں جن کا ہمیں علم نہیں، اور شاید جن کی خبر خود سیاحِ اعظم کو بھی نہ ہو۔ میں نے دل میں کہا، حریص سیاح اتنے مال و اسباب کے باوجود پھر زنبیل بدوش نکل کھڑا ہوا ——— یہ اردو بازار ——— یہ علمی خزانے ——— آخر وہ اور کیا جنس تجارت لینے گیا ہے، وہ پاکستانیوں کے ہاتھ آخر کیا بیچنا چاہتا ہے، اچانک میری نظر اس کی خالی کرسی کے سامنے رکھی ہوئی میز کے شیشے پر پڑی، شیشے کے نیچے ایک کاغذ پر عبدالعزیز خالد کی اپنے ہاتھ کی تحریر میں ایک مصرع لکھا ہوا تھا ؎

من قائی فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

مولانا کوثر نیازی

عبدالعزیز خالد اس دور کا عظیم شاعر ہے اور اس کے فن سے "شہاب" کو اس لئے دلچسپی ہے کہ اس کے ذریعے سے اسلام کی بخشی ہوئی لازوال جمالیاتی قدروں کا اظہار ہوتا ہے۔

اسلامی ادب کا نعرہ تو بہت لوگوں نے بلند آہنگی کے ساتھ لگایا ہے لیکن اس کو عمل کی دنیا میں پیش کرنے کا سہرا خالد کے سر ہے اور کوئی شک نہیں کہ آج نہیں تو کل اپنے اس قومی شاعر کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

علامہ علاؤ الدین صدیقی

عبدالعزیز خالد پر اللہ تعالٰی کا احسان عظیم ہے کہ وہ ایک عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے شعر کہتے ہیں۔ جہاں تک ان کی مشکل گوئی کا تعلق ہے یہ دراصل ان کے فن کی عظمت اور ان کے وافر علمی ذخیرے کا ثبوت ہے۔ ایک شاعر جب اہم مسائل پر اہم باتیں کہنا چاہتا ہے تو وہ مختصر سے مختصر الفاظ میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کام کے لئے اسے مشکل الفاظ، استعمال کرنا پڑتے ہیں۔

میرا شاعر وہی ہے جس کا کلام اسلام کی تعلیمات کے لئے وقف ہے، اور جو رسول اللہ کے ارشادات کو عام کرتا ہے۔

عبدالعزیز خالد بلاشبہ یہی خدمت انجام دے رہا ہے

سردار جعفری

خالد اردو کا ایذرا پاؤنڈ ہے۔

شاہد احمد دہلوی

فلسفی شاعر عبدالعزیز خالد کو ہم نے قیام پاکستان کے بعد جانا پہچانا۔ وہ ایک بلند آہنگ کے ساتھ دنیائے شعر میں داخل ہوئے۔ اس نئی آواز میں نغمگی کے ساتھ گرج بھی تھی اور وہ چمک بھی جس کے آگے اندھیرے سمٹتے جاتے تھے۔ خالد میں قدیم یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پائی جاتی ہے۔ بلکہ بقول اقبال ـــــ عجم کا حُسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں ـــــ

ان کا ایک ایک مصرعہ، ایک ایک ترکیب بلکہ ایک ایک لفظ غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان کا وسیع علم مترنم الفاظ

کے سانچوں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے ۔

علامہ نیاز فتح پوری

عبدالعزیز خالد کی شاعری اس لحاظ سے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے کہ ہماری شاعری کو تخیل ، جذبہ اور احساس کے مخصوص دائروں سے نکال کر علم و فکر کی وسعتوں میں لے جانا ہی چاہتی ہے ۔

مولانا رازق الخیری

شاعر اسلام عبدالعزیز خالد پاکستان کے مایۂ ناز شعراء میں سے ہیں ۔ ان کی طبیعت غالب کی طرح مشکل پسند ہے ۔ اس کے باوجود ان کا خلوص دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا کیونکہ ان کے کلام میں اسلام کی سچی رُوح جلوہ گر ہے ۔

ڈاکٹر ابو الخیر کشفی

عبدالعزیز خالد نے محض اپنے جذبات کی دنیا ہی اپنی طویل نظموں اور تمثیلوں میں مرتب نہیں کی : بلکہ ہماری شاعری کی دنیا کو مشرق و مغرب کی صنمیات اور کرداروں سے بھی آباد کر دیا اور پھر وہ ان راستوں سے ہوتے ہوئے فارقلیط تک پہنچے ۔

رئیس امروہوی

عبدالعزیز خالد کی فکر عبرانی اور یونانی دیو مالا کی فضاؤں میں پرواز کرتی ہے ——— خالد اصولی طور پر رومانی اور جمالیاتی کردار کے شاعر ہیں ۔ ان کی نظموں کا رنگ رُوپ اور الفاظ کے ساتھ ان کا برتاؤ بڑا حسن کارانہ اور خوبصورت ہوتا ہے ۔
عبدالعزیز خالد اعیان و اَمثال کے شاعر ہیں ۔ افقوں کے اس پار اور کائناتوں کے اس سرے کی شاعری جس کی فضا میں فارسی عربی ، لاطینی اور یونانی تصورات کی شفقتیں جگمگاتی اور کہکشائیں جھلملاتی ہیں ——— کائنات کی رُوح سے حاملہ اور حیات کے ناقابل تصور گہرے معانی سے بوجھل جب شاعری فکر و تخیل کے اس معیار تک پہنچتی ہے تو وہ معجزے میں تبدیل ہو جاتی ہے ——— روایت کی بنیادوں پر ندرت کی جو دیوار اٹھائی جا رہی ہے عجب نہیں کہ اک تاج محل میں تبدیل ہو جائے ——— ہم سب بے چینی سے مستقبل کے منتظر ہیں کہ ؎

ستارہ می شکند آفتاب می سازند

شان الحق حقی

عبدالعزیز خالد اپنے معاصرین میں سب سے پُرگو ہیں ——— ان کے اس زورِ طبیعت کے علاوہ ان کا کلام الفاظ کی فراوانی ، ترکیبوں کی جدت اور الفاظ کے اچھوتے پن کی بنا پر قابل قدر ہے ۔ بعض کھولے کرلے الفاظ کو انہی نے شعر سے مشرف کیا ہے اور دوسری زبانوں کی نعمتوں سے بھی اکتساب کا دروازہ کھلا رکھا ہے ۔ وہ تلمیحات میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں [illegible]

مولانا سعید اشرف ندوی

نقتصر البحث عن الشاعر المطبوع عبد العزیز خالد الذی ضمن له الخلود۔ فی عالم الشعر الاردوی فقد امتاز شعرہ فی روعۃ الغزل، سلامۃ الاسلوب و دقۃ المعنی و عمق الفلسفۃ فی التاریخ و الادب و السیر ــــــــ

انہ استطاع ان یغیر المادۃ و یصہرھا فی شتی الکیفیات و استطاع ایضا ان یحمل الافکار و المعانی و یصبغھا بلون جذاب یاخذ مجامع القلوب۔ فھو من ھذہ الناحیۃ شاعر اسلامی مطبوع اصبح ملکا للامۃ الاسلامیۃ باسرھا فھو اینما صال و جال اتی بالاجادۃ و الکمال

ــــــــ ھو ایضا مترجم عبقری قدیر و فوق ذلک فقد کان ضلیعا فی علم الاقتصاد و الاجتماع ضرب فیہ بسھم وافر و تخصص فی دقائقہ و بالرغم من انہ کان موظفا حکومیا لم تشغلہ الوظیفۃ عن طموح نفسہ العالیۃ فی ھذا المیدان و غیرہ من میادین الشعر و الفلسفۃ و الاسلامیات

ڈاکٹر محمد حسن

عبدالعزیز خالد کے منظوم ڈرامے اور افسانے، طویل نظمیں ایک عظیم ابتدا کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آل احمد سرور

ہمارے اس نعت گو اور صاحب طرز شاعر کا مناسب اعتراف ضرور ہونا چاہیے۔

عبدالحمید صدیقی

انہوں نے شاعری کو نیا رجحان اور نیا انداز بیان دیا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انہیں عربی اور فارسی پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور نئے نئے الفاظ اور تراکیب خود بخود ان کے قلم سے ڈھلتی چلی جاتی ہیں۔

شفقت کاظمی

جناب عبدالعزیز خالد اپنی مومنانہ شاعری کی بدولت ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں بڑے مقبول ہو رہے ہیں۔ اس بات سے دلی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالےٰ انہیں خدمت ادب کی بیش از بیش توفیق ارزانی فرمائے۔ کاش وہ ذرا آسان اور عام فہم کہتے تا کہ مجھ جیسا کم پڑھا لکھا آدمی بھی ان کے مائدہ دردسے بقدر لب و دنداں حظ اٹھا سکتا۔

شاذ تمکنت

آغا شیر احمد خاموش

عالم اسلام میں دو ہی تو خالد گزرے ہیں۔ ایک خالد بن ولید اور دوسرا عبدالعزیز خالد ——————
ایک نے تلوار سے ظلمت کاٹی۔ دوسرا قلم سے جہاد کر رہا ہے۔

مشفق خواجہ

عبدالعزیز خالد ہمارے ان شاعروں میں سے ہیں جو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لئے نئے نئے پیرائے اختیار کرتے رہتے ہیں۔ موضوعات کا جو تنوع ان کے ہاں ملتا ہے

مولانا ماہر القادری

عبدالعزیز خالد کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں وسیع ہیں۔ جب کسی منظر اور کیفیت کو پیش کرتے ہیں، ایک ایک جزئیہ پران کی نگاہ رہتی ہے۔ فلسفہ کی بزم ہو۔ رزم کا میدان ہو۔ حسینوں کی خلوت اور جھانج اور مردنگ کی سبھا ہو۔ خالد ان تمام مناظر کا بیان پورے تلازمہ کے ساتھ کرتے ہیں ان کی شاعری لطف انگیز ہی نہیں فکر انگیز بھی ہے۔
جہاں تک تلمیحات کا تعلق ہے اس صنف میں وہ تمام اردو شاعری میں منفرد ہیں۔ کیسی کیسی حسین تشبیہیں اور تلمیحات ہیں جو اردو شاعری کے قالب میں ڈھل کر سحر حلال بن گئی ہیں۔ ان کی نظموں کا پس منظر اور پیش منظر سمجھنے کے لئے مختلف قوموں اور ملکوں کی تہذیب و تمدن کا مطالعہ ضروری ہے۔

حبیب اشعر

کچھ لوگ جانتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ کچھ لوگ نہیں جانتے اور بولتے ہیں اور کچھ لوگ جانتے بھی ہیں، اور بولتے بھی ہیں۔ عبدالعزیز خالد کا شمار اس تیسرے گروہ میں ہونا چاہیئے ۔ —————— دقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ "گلشن بے خار" کا مصنف نظیر اکبر آبادی کو اس لئے قبول نہیں کرتا کہ وہ "عوامی زبان" اور "بازاری محاورے" پر اپنے شعر کی بنیاد رکھتا ہے۔ اور آج کے نقاد کو عبدالعزیز خالد سے یہ شکایت ہے کہ وہ "علم و فضل کی زبان" اور خواص کے لہجے" میں شعر کیوں کہتے ہیں۔ وہ اپنے رنگ کے منفرد شاعر ہیں۔ یہ انفرادیت انہیں یونہی نہیں مل گئی۔ اس کے لئے انہوں نے بڑی ریاضت کی ہے۔ فارسی اور عربی عبارات کو کھنگالا ہے اور انہیں جذب و ہضم کیا ہے۔ لغت کی ضخیم مجلدات کی ورق گردانی کی ہے اور غرائب لغات کو ان کی معنوی باریکیوں سمیت نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ رکھا ہے۔ تب کہیں جا کر انہیں یہ مقام حاصل ہوا ہے کہ ہزاروں شعروں میں بھی ان کا شعر صاف پہچانا جاتا ہے۔

ط۔ انصاری

خالد کی شاعری میں بڑی شاعری کے قد و قامت کا اندازہ کرنے میں، اس کی طرف متوجہ کرنے میں، اور وہاں اپنے حوصلے کا اندازہ کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ وہ تجربے کی جس بھٹی میں کودے ہیں، وہاں دیر تک رہنے والوں رہ جاتی ہے

نعیم صدیقی

میرے نزدیک خالد کی فنی عظمت کا راز یہ ہے کہ بہ حیثیت ایک فنکار اس کی خودی بے حد مستحکم واقع ہوئی ہے۔ وہ آسمانِ ادراک و احساس سے آنے والے صرف اسی فنی القا کو قبول کرتا ہے جو کسی بیرونی آمیزش سے محفوظ رہ کر آئے اور اس کی رُوح خودی سے ہم آہنگ ہو جائے۔ وہ وقت کی رو سے بے نیاز ہو کر سوچتا ہے۔ اس نے مقبولیت عام اور حصولِ شہرت کے لئے کسی قائم شدہ مصنوعی خارجی معیار کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس دورِ نمائش نے پروپیگنڈے کی جو منحوس پرچھائیں شعر و ادب پر بھی مسلط کر دی ہیں اور بڑے بڑے اہلِ دل و نظر بھی اس پرچھائیں کا دامن تھامے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خالد اس کا منت کش نہیں ہوتا ——— دوسرے لفظوں میں اقبال کے بعد خالد بھی ایک زمانہ ستیز شاعر ہے۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والے زمرہ میں ہے اور وقت کی ذہنی ستیزہ گاہ میں اس کے قدم ڈگمگاتے نہیں بلکہ وہ آگے بڑھتا ہوا فاتح ہے۔

مجھے خالد اس لئے بھی پسند ہے کہ وہ ذوقِ ابہام پسندی کا شکار نہیں بلکہ بتین پسند ہے۔ وہ بیتقی اور بتین گر ہے ——— اس کا ایک جذبہ شاہانہ ہے اور دوسرا جذبہ درویشانہ۔ وہ فن کی سلطنت میں شاہی میں درویشی اور درویشی میں شاہی کا انداز رکھتا ہے۔ اس طرح اس کی شخصیت میں ایک توازن آگیا ہے اور جو شاعر یا فن کار عرش سے نازک تر ادب گاہ تک رسائی پالے وہ کیسے اس توازن سے محروم ہو سکتا ہے یا تعلّی کی مستی میں شکار انگکیار ہو سکتا ہے ——— مختلف زبانوں کے الفاظ اس کے سامنے صف بستہ حاضر رہتے ہیں

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

السنۂ شرقیہ میں انہیں گہرا درک حاصل ہے۔ بالخصوص عربی زبان میں۔ اپنے کلام میں عربی کے الفاظ کو اس چابکدستی سے سموتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور موضوع کا تقاضا ہو تو ہندی کے الفاظ بھی اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والے عش عش کر اٹھتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کا کلام پڑھتے ہوئے ہمیں مسلسل احساس ہوتا ہے کہ ان کا اسلوبِ نگارش اپنے ہمعصر شعراء سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ انہوں نے بالکل ایک نیا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ ایک ایسا راستہ جو عشق و محبت کے عام احساسات کے ساتھ ہمیں گہرے مطالعے کا شوق بھی دلاتا ہے۔

جب میں عبدالعزیز خالد کی حسین و جمیل کتابوں کے اوراق الٹتا ہوں۔ تو میرے ذہن کے پردوں پر ایک ایسی انوکھی، البیلی دنیا کی تصویر کھنچ جاتی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی تخلیقات میں ایک ایسا رس گھلا ہوا ہے جس کی لذت پکار پکار کر کہتی ہے کہ میری کشید کا سزاوار خالد اور صرف خالد ہے۔ وہ ایک شاعر ہے لیکن ایک مختلف قسم کا شاعر ——— جس نے بے پناہ ریاض کیا ہے۔ تحقیق کے سمندر میں غواصی کی ہے۔ فارسی، عربی، یونانی اور لاطینی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ عربی شاعری، یونانی دیومالا اور مختلف زبانوں کی قدیم داستانوں سے روشنی حاصل کی ہے۔ ان کے رومانی کرداروں کے حسین اور بدنما پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ پرانی تہذیبوں کے خد و خال سے آگہی میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور جو کچھ حاصل کیا اسے طبع زاد تخیل میں سمو کر ایک ایسی نئی شاعری کو جنم دیا ہے جو شاعری بھی ہے اور فلسفہ بھی۔

اس میں وہ تمام رنگینیاں قطار اندر قطار موجود ہیں جن سے شاعری کی دنیا آباد ہے۔ اور ان کے پہلو بہ پہلو وہ تمام فلسفیانہ تصورات بھی موجود ہیں۔ جو فکر انسانی کا موضوع بنے رہے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

شاعری کی شکل میں اردو شعر و ادب کے آسمان پر، چند برس پہلے جو ہلال نو طلوع ہوا تھا وہ بدر کامل بننے کی طرف بڑی سرعت سے رواں دواں ہے اور اگر ہیگل کا نظریہ صحیح ہے کہ ہر چیز اپنی ضد کو پیدا کرتی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ جدید شاعری کی ظلمتوں کے بطن سے ہی خالد کی شاعری کا آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ جدید ترقی پسند شاعری کے برخلاف خالد کی شاعری کا سارا تار و پود دین قیم کے اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار سے تیار ہوا ہے۔ تخیل میں بجائے ژولیدگی اور انتشار کے ایک تسلسل، قطعیت اور مقصدیت ہے۔ ابلاغ اس کا نمایاں ترین وصف ہے ـــــــــــ تلمیحات و تفہیمات کی وہ بھرمار ہے کہ قاری جب تک علامتہ نہ ہو پورے کلام کو سمجھ لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اس بنا پر خالد سے بھی لوگوں کو وہی شکایت ہو سکتی ہے جو ایک زمانہ میں غالب سے سخنوران کامل کو ہوئی تھی لیکن ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ جس طرح غالب کی شاعری نے نقطۂ عروج پر پہنچ کر خود ہی گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا حل پیدا کر لیا تھا خالد کی شاعری بھی وقت آنے پر ایک ایسا نہج اختیار کرے گی۔ جو اسے عوام سے قریب تر کر دے گی۔

نصر اللہ خان عزیز

آج سے دس پندرہ سال پہلے شاعری کی دنیا میں ایک اجنبی اور چونکا دینے والی آواز بلند ہوئی تھی۔ یہ آواز عبدالعزیز خالد کی تھی۔ وہ نادر و غریب لغات کا لشکر جرار لے کر اس میدان میں وارد ہوتے تھے اور بنوٹ اور گتکے کے فن کی طرح شاعری میں اس کمال کو آزمانا چاہتے تھے اور واقعی انہوں نے یہ کمال اس طرح آزمایا کہ بڑے بڑوں کے پتے پانی ہو گئے ـــــــــــ منحمنا اور فارقلیط جیسے ضخیم نعتیہ مجموعے پیش کر کے تو انہوں نے بلاشبہ اسلامی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

مکین احسن کلیم

عبدالعزیز خالد نے اردو کو ایک نیا اور منفرد اسلوب دیا ہے۔ اردو کے علاوہ انہیں عربی، فارسی، لاطینی اور عبرانی پر بھی پورا عبور حاصل ہے۔ اور اپنے اس علم سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اردو شاعری کے دامن کو نئے اور انوکھے موتیوں سے مالا مال کیا ہے۔ ان کے یہاں ایک غیر معمولی شوکت اور سطوت ملتی ہے۔ وہ ہماری ملی اور ثقافتی روایات کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ اور ان سب کے امتزاج سے ایک ایسی شاعری وجود میں آتی ہے۔ جو اردو میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

جیلانی کامران

قومی تشخیص کے سلسلے میں عبدالعزیز خالد کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ عبدالعزیز خالد نے اس عمر میں پہنچ کر عربی بھی سیکھی ہے

مقبول الٰہی

ان کا ذخیرۂ الفاظ نہایت وسیع ہے اور اس لحاظ سے وہ ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کو میں اردو شاعری کا "الاصمعی" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے اسلوبِ بیان میں ملٹن کی سی صلابت ہے۔

انور سدید

• عبدالعزیز خالد ہمارے ان جلیل القدر شعرا میں سے ہیں جن کی ہر کاوش کلاسکیت کی بلندی کو چھو سکتی ہے۔ جس کامیابی اور جس خوبی سے انہوں نے رفیع الشان اشعار کا وسیع ذخیرہ تخلیق کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لفظوں، رنگوں، کیفیتوں اور جذبوں کے طوفانی امتزاج کو نہ صرف محسوس کر سکتے ہیں بلکہ ان سب کو فکری لطافتوں کے ساتھ قاری تک پہنچانے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔

اختر انصاری اکبرآبادی

عبدالعزیز خالد صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک باخبر صاحبِ قلم ہیں۔ فارسی اور عربی کے مطالعے کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کی صحیح لذت سے بھی آشنا ہیں۔

——— خالد کی تجرِ علمی اور شخصیت کا اندازہ جن لوگوں کو ہے وہ ان کے منصب اور مسلک سے آگاہ ہیں کہ خالد بے نیازانہ طور پر اردو شاعروں میں ایک تحریک کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس تحریک کا مطالعہ اور مشاہدہ سے گہرا تعلق ہے جس کا اندازہ خالد کے کلام سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ خالد کے قد اور منصب کا صحیح اندازہ تو کوئی انہی کے قد اور منصب کا شخص لگا سکتا ہے۔ میں تو یہاں صرف اس قدر کہنے کی جسارت کروں گا کہ عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ ہستی اپنی جگہ خود ایک طویل و مسلسل اور طرحدار نظم ہے جس کی ہر سانس ایک فردوسی آہنگ بھی ہے اور شکست کی آواز بھی ———

ان کا فن، واقعہ اور تخیل کے حسین ترین امتزاج کا سنگم ہے۔ جہاں قدیم و جدید اور آسمان و زمین چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وہ افقِ فکر ہے جہاں سے ادبِ عالیہ کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ فکر و نظر کا یہ اتحاد زندگی آموز بھی ہے اور حیات افزا بھی — اور خالد کی تحریک بھی جو اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ پُرکشش انداز میں ابھر رہی ہے اور جس کے لئے خالد ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بلند ہو کر شب و روز مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔

اقبال سلیم گاہندری

• عبدالعزیز خالد نے اپنی شاعری کے ذریعے تنگنائے شعر کو بحرِ ناپیداکنار ہی نہیں کیا بلکہ اس میں اتنی وسعت اور گہرائی پیدا کی کہ ان سے پہلے ادب میں اس کا تصور نہیں ملتا۔ ان کے شعروں میں بعض نئی عربی فارسی ترکیبیں اس طرح بے ساختہ اور بے محابانہ سامنے آجاتی ہیں کہ پڑھنے والا بے اختیار ان کی معنویت پر دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بعض سنسکرت اور ہندی ترکیبوں کی آفرینش بھی پڑھنے والوں کو مسحور کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ واقعہ ہے کہ ان سے پہلے کسی نے اردو شاعری میں الفاظ کا اتنا بڑا ذخیرہ استعمال نہیں کیا۔ اس سلسلے میں جوش کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن اس کے یہاں ترکیبوں

جون ایلیا

خالد جس چابکدستی اور جگر کاوی سے لکھ رہے ہیں یہ معاشرہ اس کی بھلا کیا داد دے گا ؟ یہ معاشرہ جس میں تہذیبی، فکری اور تخلیقی قدروں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ ویسے بھی تخلیق کا فن خودگدازی اور خود آزادی کا فن ہے۔ سبک رُوی اور خنک عیش کا کوئی بھی راستہ ادب اور شاعری کی طرف سے نہیں گذرتا۔ یہ بات نسلوں اور قرنوں کی آزمائی ہوئی ہے مگر کچھ مغلوب و مقہور لوگ ہیں جو خود آزاری پر تلے ہوئے ہیں اور میں خالد کو انہی واقعہ طلب لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔ انہوں نے اپنے فن کی خاطر کڑی ریاضت کی ہے۔ کلک موج اسی کڑی اور کڑوی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ خالد نے تہذیب و تخلیق کے عالمی ورثوں کو اردو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی اثر پذیری کا دائرہ غیر معمولی وسعت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری کا قاری مطالعہ کے دوران یہ بات بار بار محسوس کرتا ہے کہ وہ ادب کے عالمی سماج میں سانس لے رہا ہے۔ ان کے فن کی حسیات اپنے تاریخی اور تہذیبی حوالوں کے اعتبار سے قوموں اور قرنوں کے قوام کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن کی ثقافت نو بہ نو الفاظ اور نوع بہ نوع مرکبات میں اپنا اظہار چاہتی ہے۔ ان کے الفاظ کا ذخیرہ بلا استثنا اردو کے ہر شاعر کے ذخیرے سے زیادہ ہے۔ اس طرح انہوں نے اردو کی ادبی فرہنگ میں جو اضافہ کیا ہے اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ______ ان کی شاعری کے بارے میں میرا مطالعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری بنیادی طور پر بدن کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں بدن کے بیان میں جس نوع کی سرشاری اور شادابی پائی جاتی ہے وہ مانوس اور دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اجنبی اور عجیب ہے۔ بدن کے اظہار میں ان کے یہاں ایک قبائلی شدت اور بدویانہ جسارت کا احساس ہوتا ہے۔ میرے خیال میں خالد بنیادی طور پر ایک قدرشکن شاعر ہیں اور یہ ان کی شاعری کا سب سے بڑا تضاد بھی ہے اور تجمّل بھی۔ تضاد اس لئے کہ وہ مذہب میں راسخ العقیدہ ہیں اور ان کی شاعری کا جمالیاتی مزاج ان کے مذہبی شعور کی ضد واقع ہوا ہے۔ ان کی قدرشکنی نے زمین اور زندگی کی برہنہ خوبصورتی کے بے مثال پیکر تراشے ہیں۔ خالد کے جمالیاتی نظام کے بارے میں میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ اپنے جوہر میں خالص مادی ہے جب کہ ہماری شاعری کا جنسی اور جمالیاتی نظام فارسی شاعری کے زیر اثر نو فلاطونی رہا ہے اور اس طرح اس کے ڈانڈے تصوریت اور رُوحانیت سے ملتے ہیں۔ خالد نے ادبی جمالیات کے نوفلاطونی مزاج سے کھل کر بغاوت کی ہے۔ ان کے احساسِ حُسن میں انفعال کے بجائے ایک نوع کی فعلیت بلکہ جارحیت پائی جاتی ہے ______ یہ شاعری اپنی تعبیر اور تخمیر کے لحاظ سے اردو کے لئے بالکل نئی ہے اور ذوقِ سلیم سے زیادہ ذوقِ مرتاض کی طالب ہے۔

انور گوئندی

عبدالعزیز خالد کی شاعری ہلکی پھلکی شاعری نہیں۔ اگر شاعری محسوسات اور جذبات کی عکاسی کا ہی نام ہے تو خالد کی شاعری اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے۔ مشکل راہوں پر چلنا اور بڑے بڑے موضوعات کو شعر بند کرنا آسان کام نہیں مگر خالد جب ان مشکل راہوں پر چل نکلتے ہیں تو پھولوں بھرے راستے بن جاتے ہیں اور جن ادق موضوعات پر وہ قلم اٹھاتے ہیں تو وہ یوں شعر کے قالب میں ڈھلتے جاتے ہیں جیسے وہ خالد ہی کے معجزاتی ہاتھ کے منتظر تھے۔

جانباز مرزا

علامہ عبدالعزیز خالد اس دور کے فاضل، محقق اور مفکر بزرگ ہیں۔ ان کی ہر نظم فکر انگیز ہے اور اپنے اندر دریائے معانی کو سموئے ہوئے ہے۔

راز سنتو کھ سری

خالد کو قدرت نے انوکھا ذہن عطا کیا ہے۔ اس نے مختلف اصنافِ شعر پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے موضوعات کی گوناں گونی دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تلمیحات اور حوالوں کی کثرت مزید حیرت افزا ہے۔ یہ سب امور اس کے ذہن رسا کی بے کرانی اور وسعت کے مظہر ہیں۔

وفا راشدی

خالد ان خوش نصیب انسانوں میں ہیں، جنہیں اللہ نے بے پناہ تخلیقی قوت اور غیر معمولی ذکاوت کی نعمتوں سے نوازا ہے ——— خالد نے اردو شاعری کو نئے موضوعات نئے اسالیب دیئے ہیں۔ فکر و لہجہ کا ایک نیا انداز، ایک نیا رجحان عطا کیا ہے۔

ان کی نظمیں زندگی آمیز بھی ہیں، زندگی آموز بھی۔ دلنشیں الفاظ، لطیف جذبات، دلکش تشبیہات اور بامعنی استعارات کا ایک دریا رواں ہے۔ خالد کی بساطِ فکر دنیائے نظم تک محدود نہیں۔ بلکہ ان کی پرواز تخیل افقِ غزل تک پہنچی ہے۔ وہ حسن کے پرستار ہیں۔ وہ حسن جس سے کائنات کی رنگین اور فطرت کی دلکشی وابستہ ہے۔ وہ زندگی کی وادیوں میں پاکیزہ محبت کے دلدادہ و شیدائی اور عشقِ حقیقی کے متلاشی ہیں ——— حیات و کائنات کی حقیقتوں، آرٹ کی بلندیوں، عشق و محبت کی سچی کیفیات، حسنِ روحانیت کی پاکیزگی، فلسفہ و حکمت کے اسرار و رموز کے فانوس رنگا رنگ سے ان کی شاعری کا محل جگمگا رہا ہے۔

شمیم لطیف رزمگہ

خالد صرف وسیع تناظرِ علمی، گہرے تفکر اور فلسفے کا ہی شاعر نہیں زندگی کی رومانی اور جمالیاتی قدروں کا بھی شاعر ہے۔ اس کے کلام میں جہاں فکر و فلسفے کی رفعت اور گہرائیاں نظر آتی ہیں وہاں جذبات و احساسات کی رنگا رنگی اور بوقلمونی بھی ملتی ہے جس نے اس کی شاعری کو آئینہ صد رنگ بنا دیا ہے۔ خالد کا ذوقِ جمال بہت بلند ہے جہاں اس کی بصیرت قطرہ میں دجلہ دیکھ لینے اور پھر اسے دوسروں کو دکھلانے کی قدرت اور صلاحیت رکھی ہے۔ قدرتِ کاملہ نے اسے دروں بینی اور ژرف نگاہی کے ساتھ حسن کاری اور شدید جمالیاتی احساس بھی ودیعت کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے یہاں جذبہ تخیل کی گرفت میں آتے ہی رنگین تجسیم اختیار کر لیتا ہے جو ذہن کے نگار خانے سے نکلتے ہی قوسِ قزح کا روپ دھار لیتا ہے ——— خالد بڑی قوی اور فعال شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی فردوس تخیل میں رعنائی بہار کے ساتھ ساتھ طلسم فکر و معانی کے تہ در تہ متعدد جہان آباد ہیں ——— اس کے یہاں سینکڑوں ایسے جواہر ریزے ہیں جن کی جودت نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے ———

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

خالد نے نظم میں نئی راہیں تلاش کی ہیں۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین

خالد صاحب کی شاعری کے مطالعے سے پہلا تاثر جو میں نے محسوس کیا وہ یہ تھا کہ خالد صاحب نے اپنی شاعری کو محض غیب سے آنے والے مضامین تک محدود نہیں رکھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انہوں نے اس مطالعے سے استفادہ کیا ہے۔ ——— نئے ماخذ تلاش کئے ہیں اور ان سے متاثر ہو کر شعر کہے ہیں۔ یہی ان کی انفرادیت ہے ——— خالد صاحب نے عربی الفاظ اور نامانوس تلمیحات کے بوجھ تلے دبے ہوئے شعر کہے ہیں اور بہت کہے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان میں وہ شعلہ (SPARK) موجود نہیں جو مفکر سے شعر کہلواتا ہے۔ خالد کی شاعری کا بڑا حصہ اسی شعلے کی درخشندگی سے عبارت ہے۔ ——— یہ صحیح ہے کہ ان کی شاعری کے بعض حصوں کو سمجھنے کے لئے ذرا محنت کی ضرورت ہے اور ہم مشرقی لوگ عرصہ دراز سے محنت کے عادی نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے ذریعے عرفان کچھ اسی طرح حاصل ہو کہ جیسے ایک بٹن دبانے سے "لفٹ" چند سیکنڈوں میں عمارت کی کئی منزلیں طے کر لیتی ہے۔ افسوس ہے کہ علم و فن کی منزلیں طے کرنے کے لئے ابھی تک اس طرح کی "لفٹ" تیار نہیں ہوئی ——— خالد نے بہت کچھ کہا ہے اور ابھی انہیں بہت کچھ کہنا باقی ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ریڈیو پاکستان

اردو کے نامور شاعر جناب عبدالعزیز خالد اپنے فنِ شاعری کی گہرائی اور گیرائی اپنی وسعتِ مطالعہ اور مختلف مشرقی زبانوں پر بے پناہ قدرت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے بعد پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کو اسلامی تہذیب و تمدن کی نشاۃ ثانیہ کے لئے انتہائی مؤثر طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری جو بیس کے قریب تصنیفات کے اوراق پر پھیلی ہوئی ہے تمام تر ملتِ اسلامیہ کی عظمتوں کی داستان ہے۔ خالد اردو اور انگریزی کے علاوہ، عربی، فارسی، عبرانی اور سنسکرت پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور تمام زبانوں کا ادب و شعر ان کے من میں رچا بسا ہوا ملتا ہے۔ ایک نقاد کے قول کے مطابق عبدالعزیز خالد ایک تحریک بن کر کام کر رہے ہیں اور اس تحریک کا منشا یہ ہے کہ اردو ادب کو اور خاص طور پر اردو شاعری کو دنیا کی منتخب ترین شاعری کی سطح کے برابر لایا جا سکے۔

اختر ماہ پوری

عبدالعزیز خالد نے علمی سطح پر اردو ادب کو جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہ بہت بلند سطح ہے اور خالد نے جو ادبی تخلیقات پیش کی ہیں انہیں ہم دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے جس تہذیبی محنت اور ریاضت سے کام لیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

ارشد ملتانی

خالد کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ اس کے ہاں فارسی الفاظ کا بے تحاشا استعمال ہے جس کی وجہ سے خیال و فکر بھی منظر میں چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب نئے نئے موضوعات کو اپنایا جائے گا تو اس کے ساتھ نئے نئے الفاظ بھی ڈھونڈنے پڑیں گے۔ یہ الفاظ باہر کے بھی ہو سکتے ہیں اور مقامی بھی۔ ادب موضوع اور اسلوب سے بنتا ہے اور زبان الفاظ سے ——— ہم نے دونوں کو بنانا ہے۔

شمس تسکین

——— کاش اس ظالم کو خبر ہوتی کہ وہ جس شاعر کے متعلق اظہار خیال کر رہا ہے وہ دورِ جدید کا ذہین شاعر ہے۔ عبدالعزیز خالد کو بنگالی، عربی، فارسی، اور کئی مغربی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ نئے موضوعات اور پیرایوں نے خالد کو صفِ اوّل کے شعرا میں جگہ دی ہے۔ ان کے موضوعات کئی زبانوں، ملکوں اور قوموں سے متعلق ہیں۔ عبدالعزیز خالد کا کلام پڑھ کر جہاں عام قارئین خوش ہوتے رہیں۔ وہاں اعجاز احمد اور ان کے رفیق نرم و نازک سطحی ذہن کے تن آسان شاعروں میں کھلبلی مچ رہی ہے۔

باقر مہدی

میں ان کی شاعری کے لئے بڑی اور عظیم کے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ایک تو یہ الفاظ کثرتِ استعمال سے اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھے ہیں۔ دوسرے خالد ایک تجرباتی شاعر ہیں۔ جنہیں سعیٔ پیہم کی عادت پڑ گئی ہے اور وہ محنتِ شاقہ، فکرِ بلیغ اور "سوختہ دلی" سے ایک ایسا کارنامہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ جو شاہکار کہلایا جا سکے۔

خالد کی شاعری بڑی شاعری کے لب و لہجہ، اقدار اور معیار کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے ——— ——— اور کیا یہ خالد کا ایک کارنامہ نہیں ہے؟

پرکاش فکری

عبدالعزیز خالد کی شاعری کی رُوح میں اترنے کے لئے ماہر لسانیات ہونا ضروری ہے۔

آغا سہیل

انہوں نے ابلاغ و ترسیل کی ایک بالکل نئی اور اچھوتی تکنیک دریافت کی ہے۔

محمود الرحمٰن

عبدالعزیز خالد نے بہت تھوڑے عرصے میں جو مقام بلند حاصل کیا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ ہمارے شاعروں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں خالد جیسا تبحرِ علمی حاصل ہے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں اُردو نظم کو عروج و ارتقا عطا کیا ہے او

اس کے دامن کو متنوع خیالات و جذبات اور افکار و موضوعات سے پُر کر دیا ہے۔ اُردو کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ، انہیں دنیا کی مختلف زبانوں اور متعدد علوم میں مہارت حاصل ہے اور انہوں نے اپنے کلام کو وسیع مطالعہ اور ہمہ گیر تجربات سے دقیع بھی بنایا ہے۔

ریاض احمد

عبدالعزیز خالد کی قوتِ شعر گوئی اور سرمایۂ لغت حیرت انگیز ہے۔

قمر سلطانہ

عبدالعزیز خالد اُردو شاعری میں ایک ایسی شاعرانہ حیثیت کے مالک ہیں جو سب سے الگ ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو ہر شاعر کو آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ خالد کے کلام اور ان کی پُر گوئی کو دیکھ کر ہمیں ان کی اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ وہ خالد آخر الزماں ہیں۔ اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو دیکھ کر ہمیں مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ عبدالعزیز خالد تخلیقی صلاحیتوں کے مالک، عبقری ہیں۔

عفت موہانی

خالد انسانیت نواز شاعر ہیں، ان کی شاعری رنگ برنگے پھولوں کا ایک وسیع گلستان ہے۔ اب یہ گلچیں کے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اپنے دامن کے لئے کس قسم کے پھولوں کا انتخاب کرتا ہے۔ گلاب کے ساتھ کانٹوں کا تصور ناگزیر ہے۔ ایک شاعر کا مرتبہ مداحین و معترضین متعین نہیں کرتے۔ ایک شاعر کا مرتبہ وقت عطا کرتا ہے۔ آج ہند و پاک میں یا دیگر ممالک میں کون ایسا شاعر ہے جو خالد کا مقابلہ کر سکے یا ان کا ہم پلّہ ہو؟ میں نے تو خالد کے معاصرین کو بھی پڑھ دیکھا، اور سبھی خالد کے مقابلے میں فرش کی پستیوں میں پڑے ہاتھ پیر مارتے نظر آئے —————— کیا غالب اور اقبال کا کلام ہر قسم کی غلطیوں سے پاک ہے؟ اگر پاک ہے تو بے شک خالد کا کلام بھی تمام برائیوں سے پاک ہے۔ اگر غالب و اقبال کے کلام میں کچھ عیب ہے تو بے شک خالد کے کلام میں بھی عیب ہے جو دُور کیا جا سکتا ہے۔

ن۔ خاتون

خالد کے ذہن میں جو موسیقی گونج رہی ہے یا جس موسیقی کو وہ اپنی نظموں میں ڈھالتے ہیں وہ غالب اور اقبال کی موسیقیت اور نغمگی سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس کی شاعرانہ تخلیق میں وجدانیت سے زیادہ ذہن کو دخل ہے۔ جس میں خیال پکتے رہتے ہیں اور ان میں ایک طرح کی گمبھیرتا پیدا ہو جاتی ہے جسے اپنے اظہار کے لئے شاندار الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔

ناصر زیدی

میں جناب جوش ملیح آبادی کی رائے سے بہر حال اتفاق ہے کہ بڑے افسر ہونے کے باوجود وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ ایسے اچھے انسان کہ ان سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور یہی چیز ان کی غیر معمولی شرافت کی سب سے قوی برہان ہے۔

شفیع عقیل

گزشتہ دس بارہ برس کے عرصے میں اردو شاعری میں جو چند نئی اور موثر آوازیں سنائی دی ہیں ان میں عبدالعزیز خالد کی آواز بھرپور بھی ہے اور ہمہ گیر بھی - انہیں جو چیز دوسرے شاعروں سے الگ کرتی ہے وہ ان کا اپنا اندازِ فکر اور منفرد طرزِ بیان ہے۔ طویل نظم گوئی میں انہیں جو ملکہ ہے وہ ان کے ہم عصر شاعروں میں شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔

زاھدہ حنا

زندگی کے اسرار جاننے ہوں اور زندگی کا سلیقہ سیکھنا ہو تو انسان عبدالعزیز خالد کے سامنے بیٹھے۔ میں نے انہیں اس عالم میں دیکھا کہ کتابوں میں گھرے ٹھنڈے فرش پر بیٹھے ہیں اور باتوں کے موتی رول رہے ہیں۔ سبزے پر کھڑے گفتگو کر رہے ہیں اور پھر جانے کب اپنے خدا کے سامنے سربسجود ہو گئے۔

اختر امان

جہاں تک عبدالعزیز خالد کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف مقدار کے شاعر بلکہ معیار کے بھی شاعر ہیں۔ ان کے منظوم تراجم، غزلیں، نظمیں، گراں مایہ نعتیں ہمارا ادبی سرمایہ ہیں۔ ان کی شاعری میں زبان، موضوع اور اظہار کے اعتبار سے اسلامی روایات کا عکس موجود ہے۔

اس دور میں جب شیکسپیئر سے ایلیٹ تک کی روایات کو اپنانا ہی قابلِ فخر سمجھتے ہیں انہوں نے مغرب کی بجائے مشرقی روایات کے سرچشمے تلاش کئے اور ان کا شعری اظہار کیا۔

شمس کنول

خالد کی ذات میں انوکھی تشبیہوں، نرالے استعاروں اور منفرد صنائع و بدائع کا ایک میوزیم چھپا ہوا ہے۔ یہ میوزیم اردو زبان کو وسعت، نیاپن اور تازگی بخش رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خالد نے نئی شاعری کی بصیرت کو اپنے منفرد انداز میں نرم اور ملائم لہجے میں اور نئے اسلوب اور اندازِ فکر کے ساتھ ادا کر کے ایک انوکھا، دلپذیر اور کامیاب تجربہ کیا ہے۔

آج کا ایشیائی زمانہ ایک ذہین، منفرد اور حساس انسان کے لئے انتہائی ناموافق ہے۔ صد افسوس کہ ایسے قدر ناشناس زمانے میں خالد جیسا انوکھا، دوسروں سے بہت مختلف اور خطرناک حد تک پڑھا لکھا انسان پیدا ہوا ہے۔

حسن اکمال

باقر مہدی اقبال کو مطعون کر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عدم مطابقت پر زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں مگر آگے چل کر عبدالعزیز خالد کی خالص اسلامی شاعری (جس پر غالباً حسن عسکری کی مہر بھی ثبت ہے) کو تھوڑا سا الزام دیتے ہوئے انہیں یک لخت بہت بڑا [illegible]

انور شعور

خالد کی شاعری فکری و ادبی اعتبار سے اردو زبان میں ایک تازہ توانا اور تحیر خیز تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔

حمید کوثر

منصب عبد العزیز خالد کی عظمت نہیں بلکہ اس کی شخصیت کو مجروح کرنے والی چیز ہے۔ وہ شاعر ہیں ——— اخوت، محبت اور مساوات کی تصویر ہیں۔ فارقلیطی اسوۂ حسنہ ان پر غالب آگیا ہے۔ وہ سیدنا محمدؐ کی تحریک جاریہ بن گئے ہیں۔ ان کے الفاظ، ان کے افکار، ان کے بیان میں زندگی ہے، تازگی ہے، ندرت ہے۔ وہ علم کے بحر بے پایاں کے شناور اور ارض و سما کی حکمتوں سے آگاہ ہیں۔ وہ نعت گو اور نعت سرا ہیں۔ ——— فائق العصر ساختۂ اسلامیہ کالج عبد العزیز خالد۔

ظفر علی ہادی

جناب عبد العزیز خالد کی شخصیت ان میں سے ایک ہے: جنہوں نے اپنی ذاتی کوشش، قابلیت اور اہلیت سے اس دنیا میں اپنا مقام حاصل کیا ہے۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے خالد صاحب کا زندگی کو گزارنے کا ایک خاص نظریہ ہے اور ان کے کلام میں یہ انفرادیت اپنی پوری آب و تاب کیساتھ نمایاں ہے۔ طرزِ ادائیگی میں، خیالات میں، غرض ہر بات میں ایک جدت ہے اور یہی انفرادیت ان کو ہم عصروں میں ممتاز بناتی ہے ———

اختر خیالی

خالد بلاشبہ خیال کے پھیلاؤ کو الفاظ کے متنوع جال میں سمیٹنے کی مثالی قدرت رکھتے ہیں۔ جذباتی حدت کے ساتھ ساتھ الفاظ میں تندی اور ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ دھیما پن آتا رہتا ہے اور قاری کا ذہن بھٹکنے نہیں پاتا۔ الفاظ کے انتخاب میں وہ بڑے محتاط ہیں۔

اعجاز احمد

— البتہ خالد صاحب کی ایک چیز کا میں معترف ہوں اور وہ ہے ان کا ذخیرۂ الفاظ

سرفراز صدیقی

عبد العزیز خالد کا نام ہماری شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک اسلامی شاعر ہیں بلکہ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ بھی دیا ہے۔ ان کی شاعری میں اردو کے ساتھ دوسری زبانوں کی آمیزش سے اس زبان کو نئی وسعت ملی ہے۔ عبد العزیز خالد نے اردو کو وسعت ہی نہیں دی بلکہ دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے ایک ایسا گلدستہ مرتب کیا ہے جس